[محرم الحرام ۱۳۸۸ھ]

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

موجودہ قیمت 5-00

سالانہ چندہ ہندوستان سے ۵۰/۷ پاکستان سے ۵۰/۷ ششماہی ہندوستان سے ۴/ پاکستان سے ۴/	ماہنامہ **الفرقان** لکھنؤ فی کاپی ۷۰ پیسے	سالانہ چندہ غیر ممالک سے ۱۵ شلنگ ہوائی ڈاک سے مزید محصول ڈاک کا اضافہ

جلد ۳۶	بابتہ ماہ محرم الحرام ۱۳۸۸ھ مطابق اپریل ۱۹۶۸ء	شمارہ ۱

اگر اس دائرہ میں ○ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہو، براہ کرم آئندہ کے لئے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی اطلاع ۲۰ اپریل تک آ جائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں، نئے خریدار بھی اسی طریقہ سے چندہ ارسال فرمائیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۱۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اسکی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آ جانی چاہیے۔ اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن (سنبھلی)

پتہ نہیں عالم اسلام میں صرف خوشی ہی منائی گئی یا شکر بھی ادا کیا گیا کہ خدا نے بے سان و گمان یہود کو ایک ذلت اور اردنی مسلمانوں کو ایک عزت سے ہمکنار کیا! یہ در اصل خوشی منانے سے زیادہ شکر ادا کرنے کی بات ہے۔ کوئی سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ ۲۱ مارچ کے اسرائیلی حملے کا نتیجہ اس شکل میں رونما ہوگا۔ حملے کے دن کی شاہ حسین کی عرب ملکوں سے اپیل ایک ایسے آدمی کے الفاظ اور لب و لہجہ میں ہے جو تمام جرأت و شجاعت کے باوجود اپنے آگے موت دیکھ رہا ہو۔ لیکن وہ خدا تھا جس نے اسرائیل کی لائی ہوئی اس "موت" کو اسی پر الٹ دیا۔ اور اردن کو فتح و ظفر کی اس معراج سے سرفراز کیا جس کی تحسین و آفرین میں دنیا ایک زبان ہے۔ اور اسرائیل منہ نوچ رہا ہے کہ یہ ایک پل میں کیا ہوگا!

عربوں نے اسرائیل کے مقابلے میں جس طرح بازی ہاری تھی اس کے بعد اردن کے ہاتھوں اسرائیل کی یہ شکست، بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ واقعہ یاد دلاتی ہے جس کے ذکر میں قرآن نے کہا ہے۔

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ   پھر لوٹا دی ہم نے ان کے اوپر تمہاری باری

یہ دشمن بنی اسرائیل شاہ جالوت تھا جس کی فلسطین پر قبضہ گیری کے بعد ایک وقت میں پانسہ پلٹ دیا گیا اور بنی اسرائیل کو ایک شاندار فتح سے ہمکنار کیا گیا ——— کیا اسرائیل اور عربوں کے معاملے میں خدا کی قدرت اتنی جلد پانسہ پلٹ دینے کا فیصلہ کر چکی ہے؟ اس کا علم خدا ہی کو ہے۔ مگر ہم اس واقعہ سے نیک فال ضرور لے سکتے ہیں۔ اور اس کا تقاضہ ہے کہ عرب مسلمان ہوں یا دوسرے کہیں کے مسلمان، انھیں اگر جون ۱۹۶۷ء کی شکست میں خدا کی قدرت نظر نہیں آئی تھی

تو مارچ ۶۷ء کی اس فتح میں بہرحال اس کے اقتدار اعلیٰ کا جلوہ دیکھیں۔ اور اظہار مسرت کے ساتھ ساتھ اس جلوہ کو تشکر و امتنان کی نذر بھی دیں۔ کیونکہ اگر یہ واقعہ صرف ایک امتحان ہو کہ اب بھی ہمارے دل خدا ہی کو سب کچھ ماننے کے لئے نرم ہوئے یا نہیں، تو اسے کرم نوازش تک لانے کے لئے یہ ثبوت دینا ناگزیر ہو کہ ہاں ہم بدل گئے ہیں! اور اگر یہ نوازش و کرم ہی کا آغاز ہو تو اس کی تکمیل ہی نہیں تکمیل کے بعد بقاء و استقرار کی ضمانت دینے والی چیز بھی یہی ہو کہ ہم شکر و سپاس کا حق پہچانیں۔ ورنہ بنی اسرائیل نے جب اس حق شناسی سے منھ پھیر لیا تو مذکورہ بالا آیت ہی کے سلسلۂ کلام میں سنایا گیا ہو کہ بازی پھر پلٹ دی گئی اور جالوت کے بجائے بخت نصر بنی اسرائیل پر آدھمکا۔

قرآن بنی اسرائیل کو ان کی تاریخ کا یہ اتار چڑھاؤ سنانے کے بعد کہتا ہو کہ :-

عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَکُمْ (اگر تم قرآن پر ایمان لے آؤ تو) خدا پھر تیار ہو کہ تم پر نوازش کرے۔ لیکن
وَ اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا اگر تم پھر وہی سرکشی دکھاؤ تو ہم پھر وہی گرفت کریں گے۔

(بنی اسرائیل ع ۱)

یہ قانون صرف بنی اسرائیل کے لئے نہ تھا، نزول قرآن کے بعد جنھیں ان کی جگہ انتخاب کیا گیا ان کے لئے بھی یہی قانون ہو۔ اور ساری سعادت اسی میں مضمر ہو کہ اس قانون کو سمجھا جائے۔

اس شمارہ میں "خاندانی منصوبہ بندی" کی دوسری قسط نے نگاہ اولیں میں کسی مفصل گفتگو کی گنجائش نہیں چھوڑی، بلکہ ۸ صفحے بڑھا کر یہ ۴ صفحے ضروری باتوں کے لئے نکالے گئے ہیں —— معارف الحدیث کی قسط بھی اس مضمون کی وجہ سے روکنا پڑی۔ اولاً تو خیال بھی نہ تھا کہ اس سلسلہ میں اور کچھ لکھنا ہو۔ پھر خیال پیدا ہوا تو بات اتنی پھیلتی چلی گئی —— اور یہ پھیلاؤ ضروری معلوم ہوا —— کہ اس دوسری قسط کے صفحات پہلی سے بھی بڑھ گئے۔ امید ہو کہ یہ تطویل ناظرین کو بھی مفید اور ضروری معلوم ہوگی، اور مسئلہ کا ایک اہم پہلو اتنی وضاحت سے سامنے آجائے گا جو شاید ابھی تک نہ آیا ہو —— ناظرین اگر مطالعہ کے بعد یہی رائے قائم کریں تو پھر ان سے درخواست ہو کہ اسے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو پڑھوائیں۔

گزشتہ اشاعت سے حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی بھوپالی دامت برکاتہم کے مجلسی ارشادات کا ایک دوسرا دور شروع کیا گیا ہے۔ ان ارشادات کا حق ہے کہ اپنے ناظرین کو بطور خاص ان کی طرف بھی متوجہ کیا جائے۔ بہت سے لوگوں کیلئے "خانقاہ" اور "شاہ صاحب" جیسے الفاظ حجاب بن جاتے ہیں۔ ایسے حضرات سے کہنا ہے کہ وہ اگر ان ارشادات کو پڑھیں گے تو ان میں نہ انھیں اپنے تصور کے "شاہ صاحب" نظر آئیں گے نہ اپنے تصور کی "خانقاہ"! خانقاہ کے لئے زمانہ کی تبدیلیوں اور امت کے حالات کے لحاظ سے اگر کوئی جدید ترین معیار ٹھیرایا جا سکتا ہے تو اس خانقاہی مجلس کے آئینہ میں اسی معیار کی ایک خانقاہ دیکھنے کو ملتی ہے اور اسی معیار کے صاحب سجادہ! نئے حالات کی ڈالی ہوئی وہ کونسی گرہ ہے جو اس میخانہ میں نہ کھولی جاتی ہو ـــــ ہم اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتے ہیں کہ ان فیوض کو کچھ دور تک پہنچانے کی سعادت ہمیں ملی۔

مولانا نسیم احمد صاحب فریدی کے قلم سے حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کے ملفوظات کا ایک سلسلہ کافی دن سے چل رہا تھا۔ اس اشاعت سے مکتوبات شروع ہو رہے ہیں۔ اور اسکے بعد "غیر مطبوعہ علمی و ادبی تبرکات" کا دور چلے گا۔ مکتوبات کی زیر نظر قسط بتاتی ہے کہ یہ سلسلہ اس سیاسی اعتبار سے بحرانی دور کی تاریخ کے بارے میں بھی کچھ اشارے اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ بالخصوص یہ جاننے کے لئے کہ ان حالات سے خانوادہ ولی اللٰہی کس طرح متأثر ہو رہا تھا (جو مسلمانان ہند کے لئے مرکز ثقل کی حیثیت رکھتا تھا) یہ مکتوبات نہایت قیمتی مأخذ ثابت ہو سکتے ہیں ـــــ مولانا فریدی دامت فیوضہم نے اپنے طرز پر صرف ترجمہ و تلخیص کا ارادہ فرمایا تھا۔ اور زیر نظر قسط اسی نوعیت کی ہے۔ لیکن مکتوبات کی اس اہمیت کے پیش نظر ان سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ ایسے ارشادات کی کچھ وضاحت بھی حاشیہ میں فرمائیں۔ مولانا نے لکھا ہے کہ اگرچہ یہ کام بعض پہلوؤں سے بہت دقت طلب ہے، مگر وہ اپنی صحت اور دوسرے عوائق کی اجازت کے بقدر آئندہ قسطوں میں اس کا التزام فرمائیں گے۔

گزشتہ شمارہ میں ذکر آسکا تھا مگر اس کی ضرورت نہیں سمجھی گئی کہ والد ماجد (حضرت مولانا نعمانی مدظلہم) امسال سفر حج میں تشریف لے گئے ہیں۔ بعد میں ان کے نام آنے والی ڈاک ایک

(باقی ص ۳۷ پر)

یک زمانہ صحبت با اہل دل

مجلس حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی مدظلہ العالی

مرتبہ :- مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

۱۲ شوال ۱۳۸۷ھ مطابق ۲۲ جنوری ۱۹۶۸ء (مابین ۱۱ و ۱۲ بجے دن)

خانقاہ شریف، حاضرین بدستور

راقم السطور ذرا تاخیر سے حاضر ہوا، عرض کیا ہم لوگ قصداً تاخیر سے حاضر ہوتے ہیں، تاکہ حضرت وظائف و معمولات سے باطمینان فارغ ہو جائیں، اور کچھ آرام فرمالیں۔ ارشاد ہوا کہ میرے وظائف کیا، اہم الوظائف تو یہ ہے، کہ اعمال ریا سے خالی ہوں، خالق سے نظر ہٹ کر مخلوق پر جم جانا، بلکہ مخلوق کا وجود ہی تسلیم کرنا شرک ہے، اور یہی وہ شرک ہے جس کو رات کی تاریکیوں میں چیونٹیوں کے رینگنے سے زیادہ دقیق اور نازک بتایا گیا ہے، بزرگوں کی خدمت میں پہنچکر یہی معلوم ہوا کہ سب سے بڑی بات یہی ہے کہ اپنے سے بھی بے نشان ہو جائے اور دوسروں سے بھی، جہاں یہ خیال آیا کہ میری تقریر کا حاضرین پر کیا اثر پڑا، بس ریا آیا، تخیل کے بال برابر سرک جانے سے سیکڑوں میل راستے کا فرق پڑ جاتا ہے، تخیل بہت لطیف اور نازک ہوتا ہے، لیکن ساری زندگی کے جہاز کو وہی چلاتا ہے، ایک بچہ ریل گاڑی کے بھاری بھاری پہیوں کو دیکھتا ہے، اپنے باپ سے پوچھتا ہے کہ ان بڑے بڑے پہیوں کو کون سی طاقت

چلاتی ہے، وہ کہتا ہے، بیٹا! کبھی سردی میں لحاف میں منہ ڈھانپ کر دیکھا ہے؟ دیکھا ہو کہ منہ سے کوئی گرم گرم شے نکلتی ہے؟ بیٹا کہتا ہے کہ ہاں، باپ کہتا ہے کہ یہی بھاپ یا اسٹیم پورے جہاز یا پوری ریل گاڑی کے پہیوں کو حرکت دیتی ہے، کپتان، یا ڈرائیور اس لطیف اور نازک بھاپ کی بڑی نگہداشت رکھتا ہے، یہ ہلکی ہو جائے تو نقصان پہونچے، تیز ہو جائے تو خرابی پیدا کرے بس ہر وقت اس کو اعتدال اور نظم میں رکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔

فرمایا، جو چیز مفت مل جاتی ہے، اس کی قدر نہیں ہوتی، بڑے بڑے معارف اور حقائق بے محنت و مشقت مل جائیں تو ان کی وقعت نہیں رہتی، اور محنت کر کے یہی پانی جو بہا پھرتا ہے حاصل ہو تو اسکی بھی قدر اور حفاظت ہوتی ہے۔ منّے میاں (صاحبزادہ) بڑی محنت اور اہتمام سے کنواں کھدوا رہے تھے، کئی بار اس میں مٹی آ چکی تھی، صاف اور میٹھا پانی نکلا، اس کو شیشی میں رکھ کر بڑے تحفہ کے طور پر لائے، اور مجھے دیا، قرآن مجید میں کیسے کیسے علوم و معارف بیان کیے گئے ہیں، کوئی ان کے لئے مشقت نہیں اٹھاتا، اور قدر نہیں کرتا، ابھی کوئی کہدے کہ فلاں مکان میں جو کھنڈر ہو گیا ہے، خزانہ گڑا ہوا ہے، تو لوگ اس زمین کو خرید لیں گے اور دفینہ برآمد کریں گے، اس پر آپ نے حضرت ابن سیرین کے تعبیر کے واقعات سنائے، قرآن مجید میں بالکل ابتدا ہی میں کتنی بڑی حقیقت بیان کی گئی ہو" ذالك الكتاب لاريب فيه"، آپکے پاس کسی خوشی یا غمی کا تار آتا ہے، اگر خوشی کا تار ہے تو سارے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے، اگر غم کی کوئی اطلاع ہوتی ہے تو سارے گھر پر اُداسی چھا جاتی ہے، حالانکہ "تار" اطلاع ہے، واقعہ نہیں، لیکن آثار و قرائن سے اس خبر پر یقین پیدا ہو جاتا ہے، یہ اسی کا کرشمہ ہو، پھر اللہ کی دی ہوئی اطلاعات اور قرآن کے علوم و معارف میں کیا شک ہے؟

فرمایا، ہماری عبادتیں بھی عادتیں بن گئی ہیں، نماز کا وقت آیا نماز پڑھ لی، روزہ کا زمانہ آیا روزہ رکھ لیا، عبادت یہ ہے کہ نفع کا یقین اور اجر کا اشتیاق ہو، دیکھئے منی آرڈر لانے والے ڈاکیہ کا کس طرح استقبال کیا جاتا ہے، اور کس طرح اسکے لئے راحت و آرام کو قربان کیا جاتا ہے، میں نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ تہجد کے لئے بیدار ہوئے تو کہا چائے لاؤ، میں نے کہا یہ بھی ایک طرح کا انجکشن ہے، نماز کے لئے نشاط اور تازگی پیدا کرنے کے لئے کسی

خارجی مدد کی ضرورت نہیں، فرمایا نماز کبھی پرانی نہیں ہوتی، ہر دن کی نماز نئی نماز ہے۔ جو نماز کل تھی وہ آج نہیں، اسی طرح ہر نماز نئی ہے، اور ہر ذکر نیا، اگر محبت اور نفع کی امید ہو تو ہر روز نئی بات، ہر روز نیا چہرہ، فضل الرب (صاحبزادہ) بیمار تھا، میں نے اس کو دیکھا بالکل نیا چہرہ معلوم ہوا، برسوں سے میرے پاس منی آرڈر آتے ہیں، لیکن منی آرڈر لانے والا ڈاکیہ ہر روز نیا معلوم ہوتا ہے، اُنس و محبت وہ چیز ہے کہ مانوس اور محبوب کا نام آتے ہی نبض تیز ہو جاتی، مولانا روم نے مثنوی میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک بادشاہ ایک عورت پر عاشق ہوا، اس نے اس سے شادی کر لی، اور محل میں لے آیا، کچھ دنوں کے بعد وہ عورت بیمار ہوئی، اور کوئی دوا کارگر نہ ہوئی، شاہی حکماء نے ہزار تدبیریں کیں، کوئی راس نہ آئی، مرض بڑھتا ہی گیا، آخر بادشاہ نے درباری طبیبوں کو دھمکایا، اور کہا کہ اگر علاج سے فائدہ نہ ہوا تو میں سب کے منصب اور تنخواہیں بند کر دونگا، جب کبھی تو تمھاری حذاقت کام نہ آئی تو وہ کس دن، اور کس کے لئے ہے؟ حکماء بہت گھبرائے ایک تجربہ کار حکیم نے بادشاہ سے کہا کہ میں تخلیہ میں مریضہ کی نبض دیکھنا اور اس سے باتیں کرنا چاہتا ہوں، بادشاہ نے اجازت دیدی، حکیم نے باتوں باتوں میں اس کا وطن، شہر، خاندان وغیرہ پوچھا، پھر مختلف محلوں اور وہاں کے رہنے والوں کے نام لینا شروع کئے، اور نبض پر ہاتھ رکھے رہا، آخر جب ایک زرگر کا نام آیا، تو عورت کی نبض تیز ہو گئی، اور زور زور سے چلنے لگی، حکیم نے بادشاہ سے کہدیا کہ یہ عورت فلاں زرگر پر عاشق ہے، قصہ تو اس کے بعد بھی چلتا ہے، لیکن میرا مدعا اسی سے حاصل ہے، قرآن مجید نے یہی تھرما میٹر[1] ہم کو دیا ہے، فرمایا:-

إنما المؤمنون الذين إذا ذكر الله وجلت قلوبهم
وإذا تليت عليهم آياته زادتهم إيمانا وعلى ربهم يتوكلون

"وجلت قلوبهم" یعنی ان کی نبض تیز ہو جاتی ہے، اور دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے، کہ ان کو اس نام کی لذت حاصل ہے، اور اس ذات سے عشق ہے" اِذا تلیت

---

[1] اس آیت میں اہل ایمان کا حال بیان کیا گیا ہے کہ جب اللہ کا ذکر ہو اور کلام الٰہی پڑھا جائے تو انکی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ (الفرقان)

علیھم آیاتہ زادتھم ایمانا" یعنی ان کو ایک نیا لطف اور نیا ذوق حاصل ہوتا ہے، اسی لئے کہتا ہوں کہ ہر نماز نئی ہوتی ہے، اور ہر بار کا ذکر نیا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور صفات ایسے دل فریب اور دلربا ہیں کہ ان کا ذکر کرنے سے نبض کی حرکت تیز نہیں ہوتی، بلکہ عجیب نہیں کہ نبض چھٹ جائے اور جگر شق ہو جائے، اگر قبرستان میں پڑھی جائے تو مُردے کفن پھاڑ کر باہر آجائیں،

دیکھئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

ھو الذی لا الہ الا ھو	وہ اللہ ہے جس کے سوا بندگی نہیں کسی
عالم الغیب والشھادۃ	کی، جانتا ہے چھپا اور کھلا، وہ ہے
ھو الرحمٰن الرحیم، ھو اللہ	بڑا مہربان رحم والا۔ وہ اللہ ہے جس
الذی لا الہ الا ھو،	کے سوا کوئی معبود نہیں، صاحب قدا
الملک القدوس السلام	پاک ذات، مجسم سلامتی، امان دیتا،
المؤمن المھیمن العزیز الجبار	پناہ میں لیتا، زبردست دباؤ والا،
المتکبر سبحان اللہ عما یشرکون	صاحب عظمت۔ پاک ہے اللہ اس سے
ھو اللہ الخالق الباری المصور	جو شریک بتاتے ہیں۔ وہ اللہ ہے
لہ الاسماء الحسنیٰ یسبح لہ	بنانے والا، نکال کھڑا کرتا، صورت
ما فی السمٰوات والارض	کھینچتا، اسی کے پاس سب نام خاصے
وھو العزیز الحکیم ۞	اس کی پاکی بولتا ہو جو کچھ ہے آسمانوں اور
	زمینوں میں۔ وہی ہو زبردست حکمت والا۔

کوئی ٹھکانا ہے ان کے حسن و جمال، اور لطف و اثر کا، میں قبرستان میں قرآن شریف پڑھتے ہوئے گھبراتا ہوں، (علاوہ ان آیات کے جن کی تعلیم دی گئی ہے) کہ معلوم نہیں مردوں پر کیا گزرے، ان کو کیسی کیسی حسرتیں ہوں گی، کہ ہماری سلطنت پر اغیار کا قبضہ ہو جو چیزیں ہماری ملکیت میں تھیں، وہ دوسروں کی ملکیت میں ہیں، ہم خدا کا نام لے سکتے تھے، ہم ذکر کر سکتے تھے، ہم قرآن شریف پڑھ سکتے تھے، آج بالکل مجبور و معذور ہیں، ان کو کیسی

تڑپ اور بے چینی ہوتی ہوگی، آج وہ ایک بار کلمہ پڑھنے سے بھی عاجز ہیں، اور ترستے ہیں کہ ایک بار کلمہ کا، یا ایک آیت کی تلاوت کا ثواب کوئی ان کو پہونچا دیتا، قصہ ہے کہ ایک بادشاہ خاصۂ شاہی تناول فرما رہے تھے، ایک پہرہ دار کھڑا تھا، اس میں ایک دم سے ایک اضطراری کیفیت پیدا ہوئی، اور وہ اس طرح تڑپ گیا، جیسے بجلی کوندے، بادشاہ نے اسکی تڑپ دیکھی، اور کہا کیا بات ہے؟ اس نے بہت سی باتیں بنائیں، اور کہا کہ مجھ پر کبھی کبھی ایک بیماری کا دورہ پڑتا ہے، بادشاہ نے کہا نہیں، سچ سچ کہو، ہم لوگ قیافہ شناس اور تجربہ کار ہوتے ہیں، یہ بیماری نہیں، کچھ اور بات ہے، زیادہ اصرار کرنے سے اس نے بتایا کہ میں بھی کسی وقت میں بادشاہ تھا، اور میں بھی کبھی اسی طریقہ سے خاصہ تناول کرتا تھا، اور چوبدار و غلام اسی طرح کھڑے رہتے تھے، وہ منظر یاد کرکے میرے اندر بجلی سی کوند گئی، بادشاہ نے اس کا امتحان لیا، جس سے معلوم ہوا، کہ وہ شاہی کھانوں کا ذائقہ شناس ہے، اور ان کی باریکیوں کو جانتا ہے، جب بادشاہ کو اس کی تصدیق ہوگئی، تو اس نے اس کو اپنے ساتھ شاہی دسترخوان پر بٹھایا، اور شریک طعام کیا، ایک دوسرا پہرہ دار یہ منظر دیکھ رہا تھا، اس نے کچھ عرصہ کے بعد یہی سوانگ بھرا اور ایسی ہی اضطراری کیفیت اس نے اپنے اندر تکلفاً پیدا کی، بادشاہ نے اس کا بھی امتحان لیا، جب معلوم ہوا کہ مدعی اور جعل ساز ہے، تو اس کو ذلیل کرکے نکال دیا، بس جس طرح سے اس پہرہ دار کے اندر جو کبھی بادشاہت کرتا تھا، یہ شاہانہ منظر دیکھ کر حسرت و بے قراری پیدا ہوئی، اور اس کو اپنا پرانا زمانہ یاد آگیا، اسی طرح ان اہل قبور کو اپنا وہ پرانا زمانہ یاد آجاتا ہے، جب وہ بھی اللہ کا نام لینے، قرآن شریف کی تلاوت کرنے، اور ذکر و عبادت کے قابل تھے، وہ بے چین ہو جاتے ہیں۔

فرمایا میں نے بھوپال میں تین دور دیکھے ہیں، ایک دور تھا جب یہاں شاہجہاں بیگم صاحبہ کی حکومت تھی، اس وقت جب کوئی کہتا تھا کہ ہم شاہجہاں[۱] آباد جا رہے ہیں تو

---

[۱] بھوپال کا وہ محلہ جہاں شاہجہاں بیگم صاحبہ کے زمانہ میں حکومت کے دفاتر تھے اور جہاں دربار ہوتا تھا۔

چہرہ خوشی سے چمک جاتا تھا، پھر سلطان جہاں بیگم صاحبہ کا دور آیا، اس وقت جب کوئی کہتا تھا کہ ہم احمد آباد[1] جا رہے ہیں تو آنکھوں میں چمک محسوس ہوتی تھی، پھر یہ دور دیکھا کہ محمود علی خاں، محفوظ علی خاں خانقاہ میں عید ملنے آتے اور کہتے کہ ہم شملہ کوٹھی[2] جا رہے ہیں تو چہرہ پر بشاشت ظاہر ہوتی، دنیا کے نام اور اس سے نسبت رکھنے والی چیزوں کا یہ اثر ہوتا ہے، تو پھر خدا کے نام اور اس سے نسبت رکھنے والی چیزوں کا مومن پر کیا اثر ہونا چاہیئے۔

فرمایا، قرآن مجید مشیخت اور بزرگی کی نفی کرتا ہے، وہ سب کو بندہ، اور خدا کا محتاج ثابت کرتا ہے، وہ صاف اعلان کرتا ہے:۔

یا ایھا الناس انتم الفقراء　　اے لوگو تم محتاج ہو اللہ کی طرف۔
الی اللہ واللہ ھو الغنی الحمید　　اور اللہ وہ بے نیاز ستودہ صفات ہے۔

اسی لئے خانقاہوں میں قرآن مجید کے بجائے تصوف کی کتابیں پڑھی جاتی ہیں، وہاں کسی کو قدوۃ السالکین کسی کو زبدۃ العارفین کا لقب دیا جاتا ہے اور کوئی مرشد کے قدم لیتا ہے، وہاں جب یہ شعر پڑھے جاتے ہیں، تو ساری مجلس جھوم جاتی ہے، ؎

اے کہ کردی ذات مرشد را قبول
ہم خدا در ذاتش آمد ہم رسول
در بشر رو پوش آمد آفتاب
فہم کن واللہ اعلم بالصواب

---

[1] سلطان جہاں بیگم صاحبہ کے زمانہ کا دارالحکومت، یہ محلہ بیگم صاحبہ کے شوہر نواب احمد علی خاں معروف بہ سلطان دولہا کے نام پر موسوم تھا۔ [2] شملہ کوٹھی سلطان جہاں بیگم صاحبہ کے منجھلے صاحبزادہ جنرل عبیداللہ خاں صاحب کی رہائش گاہ جہاں ان کے دونوں بیٹے سعید میاں اور رشید میاں رہتے تھے یہ جگہ بھوپال میں شملہ پہاڑی پر واقع تھی۔

فرمایا، ایک دن حاجی فضل الرحمٰن صاحب جامع مسجد میں جمعۃ الوداع کی نماز پڑھ کر آئے، اور کہنے لگے کہ آج جامع مسجد میں بہت آدمی تھا، میں نے کہا کہ ریت کے ذرّوں کی طرح تھے، یا پتھر کی طرح؟ ریت کے ذرّے تو ہوا کے جھونکوں سے ایک سمت سے دوسری سمت کی طرف اڑتے رہتے ہیں، میں نے ۱۳۲۲ھ میں پہلا حج کیا، میں جدہ اور مکہ کے راستہ میں دیکھتا تھا، کہ کبھی ریت کا پہاڑ راستہ کے دائیں طرف کھڑا ہے، کبھی بائیں طرف، جدھر کی ہوا ہوئی ریت اسی طرف چل دیتی، لیکن جب یہ ذرے ایک دوسرے سے پیوست ہو جاتے ہیں تو پتھر کا ایک ٹکڑا ہو جاتا ہو، جو اگر کسی کے منہ پر مار دیا جائے، تو کام تمام کردے، اسی کو کہا گیا ہے :-

کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ　　کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو غالب
کثیرۃ باذن اللہ، واللہ　　آئیں بڑی جماعتوں پر اللہ کے حکم سے،
مع الصابرین ۝　　اور اللہ صبر والوں کے ساتھ ہے۔

فرمایا، مجھ پر کئی مرتبہ موت کی سی کیفیت طاری ہوئی، کئی مرتبہ مرمر کر بچا، بعض مرتبہ گھر والے بالکل مایوس ہوگئے، میں نے کہہ دیا تھا کہ ذہول کی حالت میں زور زور سے کلمہ پڑھا جائے، تا کہ اس غفلت اور بے ہوشی میں بھی سنا جائے، ایک مرتبہ ایسی ہی حالت تھی، تیمار دار مایوس ہو رہے تھے، حکیم ضیاء الحسن[۱] صاحب آئے، انھوں نے نبض دیکھی تو کہا گھبرانے کی کوئی بات نہیں، میں نے کہا کہ موت بھی کوئی گھبرانے کی چیز ہے، جو موت سے گھبرایا اس نے لکھا پڑھا سب غارت کیا، اور ساری عمر کی محنت پر پانی پھیر دیا، گھبرانے کی چیز معصیتیں اور گناہ ہیں، گھبرانے کی چیز تو یہ شادیاں ہیں جن میں خدا اور رسول کو گھر سے رخصت کر دیا جاتا ہے، اور قرآن و حدیث کو طاق پر بٹھا دیا جاتا ہے، من مانی کی جاتی ہے۔

فرمایا کہ دو چیزیں بڑی عبادت تھیں، ایک نکاح، ایک کھانا، اب دونوں

---

[۱] بھوپال کے مشہور طبیب افسر الاطباء حکیم ضیاء الحسن صاحب مرحوم۔

میں سے دین و شریعت کے احکام، اور ایمان و احتساب کی روح نکل گئی، کھانے کی یہ اہمیت و عظمت، اور اس کا عمل و عبادت ہونے کا تصور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کے یہاں دیکھا، میں ایک دن دوپہر کے کھانے میں شریک تھا، ایک صاحب آئے ہوئے تھے جن سے ان کے سلسلہ اور مشائخ کے تعلقات تھے، انھوں نے کھانے میں کسی مقدمہ یا عدالتی قصہ کا ذکر چھیڑا، فرمایا، ابھی کھانا کھائیے، پھر سنیں گے۔

فرمایا، ایک بڑی بی والد صاحب کے پاس اکثر آتی تھیں اور اپنا دکھڑا روتی تھیں، ہمیشہ رام کہانی سناتی تھیں ایک بار ایسی ہی رام کہانی سنانے لگیں۔ وہ بہت سی تکلیفیں اور پریشانیاں بیان کرکے کہنے لگیں، یہ نہیں ہے، وہ نہیں ہے، کہنے لگیں میرا تو اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے، میں نے کہا کہ آپ نے خوب کہا، مجھے بادشاہ اپنی گود میں بٹھالے، اور میں ہزاروں شکایتیں کرکے کہوں کہ میرا تو بادشاہ کے سوا کوئی نہیں، یہ بادشاہ کی تعریف ہوئی کہ ہجو؟

قسط (۹)

سراج الہند حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ

مکتوبات، علمی و ادبی تبرکات (۱)

مرتبہ ——— مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

اس مضمون کے شروع میں صرف بیاضِ رشیدی کے اہم مندرجات کو ترجمے کے ساتھ ناظرینِ الفرقان کی خدمت میں پیش کرنے کا ارادہ تھا۔ پھر خیال آیا کہ اس سے پہلے حضرت شاہ صاحب کا مختصر تذکرہ ہو جائے۔ تذکرہ کے بعد ملفوظاتِ عزیزیہ کا سلسلہ چلا۔ وہ اگرچہ مطبوعہ ہیں لیکن نسخۂ مخطوطہ سے مقابلہ کرنے اور اُس کے تراجم دیکھنے کے بعد ضروری سمجھا گیا کہ اس کی تلخیص بھی اس طرح کر دی جائے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مجلسی ارشادات کے صحیح مطلب و مفہوم سمجھنے میں کوئی اُلجھن پیدا نہ ہو، اور اسکے خاص اور اہم نمونے دیکھ کر مجلس مبارک کی تصویر نظر دل کے سامنے آجائے، صاحب ملفوظات سے رابطہ قائم ہو اور جس مقصد کے ماتحت بزرگوں کے اقوال جمع کئے جاتے تھے وہ مقصد بھی حاصل ہو۔ ملفوظات کی تلخیص سے فارغ ہونے کے بعد اب بیاضِ رشیدی کا نمبر آیا ہے۔

بیاضِ رشیدی کا مطالعہ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں میں نے دار العلوم دیوبند کی طالبعلمی کے زمانے ۵۵-۱۳۵۶ھ میں کیا تھا ——— اسکے کچھ عرصہ بعد بریلی کے زمانۂ قیام میں جب کہ الفرقان کا شاہ ولی اللہ نمبر نکل رہا تھا مجھے دوبارہ اس کے مطالعہ کی اہمیت محسوس ہوئی۔ اس مرتبہ

میں نے اس بیاض کے کچھ حصے کو نقل کر لیا تھا اور اس میں جو مکتوبات، علمی تحریرات اور سوالات کے جوابات ہیں اُن کی ایک فہرست بنالی تھی ——— درمیان میں توفیق نہ ہوئی کہ اس بیاض پر کوئی مقالہ لکھتا اب تقریباً تیس سال کا زمانہ گزرنے پر یہ کام کر رہا ہوں ——— خود اصل بیاض ہی میں بعض مقامات کرم خوردہ تھے اور بعض بمشکل پڑھے جاتے تھے۔ یادٗ صدی کے اندر میری نقل کردہ عبارات میں بھی کہیں کہیں تغیر آگیا اور کاغذ کی دریدگی نے بھی دو ایک جگہ اہم معلومات کو نظروں سے غائب کر دیا ہے ——— یہ بیاض' جو اب کتب خانہ دارالعلوم دیوبند کے کثیر التعداد قلمی نسخوں کے ذخیرے میں مل نہیں رہی ہے (خدا کرے مل جائے) ——— مشہور مناظر و محقق مولانا رشید الدین خاں دہلویؒ کے آثار قلمیہ میں سے ہے۔ اس پر جمعیۃ الانصار کی مہر بھی ثبت ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دلدادۂ خاندانِ ولی اللہی حضرت مولانا سندھیؒ کو کہیں سے دستیاب ہوئی ہوگی۔ انھوں نے ہی جمعیۃ الانصار کے دفتر سے دارالعلوم کے کتب خانے میں داخل کیا ہوگا۔ مکرمی مولانا سلطان الحق صاحب قاسمی ناظم کتب خانہ اور محترمی سیّد محبوب رضوی کی مہربانی اور رہنمائی سے میں نے اس بیاض کا مطالعہ کیا تھا۔

بیاض کے شروع میں دو ورق پر ایک اہم سوال کا جواب ہے ——— یہ دراصل شاہ صاحب کی ایک علمی تقریر ہے جس کو مولانا رشید الدین دہلویؒ نے ضبط کیا ہے۔

اس کے بعد چوالیس ورق پر مکتوبات ہیں ——— جن کی مجموعی تعداد (۸۰) ہے تفصیل حسب ذیل ہے:-

مکتوبات حضرت شیخ جمال الدین ابو الطاہر محمد بن ابراہیم الکُردی المدنی ——— ۲

مکتوبات حضرت شاہ ابو الرضا محمد عمری ہندیؒ ——— ۲

مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ ——— ۹

مکتوبات شاہ اہل اللہ فاروقی دہلویؒ بنام شاہ عبد العزیزؒ ——— ۵

مکتوبات و مراسلات شاہ عبد العزیزؒ ——— ۵۴

مکتوبات شیخ احمد الجبار دبا باعثمان ابن فاروق الکشمیری۔ بنام شاہ عبد العزیزؒ ۷

ایک مکتوب کے متعلق پتہ نہ چل سکا کہ کس کا ہے؟ مجموعہ اسّی ہوا۔

ان میں حضرت شاہ ابوالرضا محمدؒ کے دونوں مکتوب حاجی رفیع الدین فاروقی مرادآبادیؒ کے پرداداملّا عصمت اللہ المرادآبادیؒ (قاضی مرادآباد) کے نام ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے مکتوبات ان حضرات کے نام ہیں۔

(۱) الفاضل العلامہ المخدوم معین الملۃ والدین السندھیؒ ۔۔۔ ۱

(۲) شارح معارف ولی اللہی شیخ محمد عاشق پھلتیؒ ۔۔۔ ۱

(۳) شیخ عبدالقادر جونپوری[۲] ۔۔۔ ۱

(۴) قدوۃ المحدثین شیخ ابوالطاہر کردی المدنی استاذ حضرت شاہ ولی اللہؒ ۔۔۔ ۲

(۵) استاذ حرمین شیخ وفد اللہ المالکی المکی استاذ حضرت شاہ ولی اللہؒ ۔۔۔ ۱

(۶) شیخ ابراہیم ابن شیخ ابوطاہر مدنیؒ ۔۔۔ استاذ کے صاحبزادے ۔۔۔ ۱

ایک مکتوب ولی اللہی کے متعلق بیاض سے یہ معلوم نہ ہوا کہ کس کے نام ہے؟

قدوۃ المحدثین حضرت شیخ ابوطاہر مدنیؒ نے جو دو مکتوب حضرت شاہ ولی اللہؒ کے نام اُن کے حجاز کے زمانۂ قیام میں مکہ معظمہ روانہ کئے ہیں ان میں سے ایک مکتوب کی تاریخ تحریر ۱۶ ؍ شوال ۱۱۴۴ھ ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے مکتوبات جن حضرات کے نام ہیں اُن کے ناموں کی فہرست یہ ہے :-

شاہ اہل اللہ دہلوی ، شاہ نوراللہ پھلتی (خسر شاہ عبدالعزیز) ، بابا عثمان

---

[۱] ملّا محمد معین ابن محمد امین سندھی علم حدیث و کلام اور علم ادب میں بڑے پائے کے عالم تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ سے نسبت تلمذ حاصل تھی شیخ ابوالقاسم نقشبندیؒ سے سلسلۂ نقشبندیہ کی تعلیم حاصل کی۔ شاعر بھی تھے۔ کئی کتابوں کے مؤلف و مصنف تھے ۱۱۶۱ھ میں وفات پائی۔ (نزہۃ الخواطر جلد ۶) [۲] مولانا عبدالقادر ابن خیرالدین العادی الجونپوری۔ شیخ حقانی امیٹھویؒ سے غالباً ٹانڈہ ضلع فیض آباد میں پڑھا۔ شیخ وحید الحق پھلواریؒ سے سلوک طے کیا نیز شیخ باسط علی الہ آبادی سے بھی فیض حاصل کیا۔ قریہ سوگھر پور میں ۱۲۰۲ھ میں انتقال فرمایا۔ (نزہۃ الخواطر جلد ۷)۔

ابن فاروق الکشمیری، محمد جواد پھلتی، صاحب الحقائق والمعارف شیخ محمد عاشق پھلتی، جامع الفضائل مولانا حفیظ اللہ الکشمیری، صدر الافاضل مولانا محمد مغربی مفتی دہلی، فرید الدین بن عبدالسلام الکشمیری، رشید الملۃ مولانا رشید الدین دہلوی، سید طٰہٰ بغدادی، (ان کے نام کے بعد بیاض میں یہ عبارت ہے :- من وُلدِ غوث الثقلین ورد فی الدھلی سنہ ۱۲۱۴ھ ـــ یعنی یہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کی اولاد سے ہیں ۱۲۱۴ھ میں دہلی تشریف لائے تھے)

حضرت شاہ عبدالعزیز کے مکتوبات ان حضرات میں سے بعض کے نام گئی ہیں بہت سے مکتوبات کے شروع میں اس طرح لکھا ہوا ہے۔

مکتوب الشیخ عبدالعزیز　الیٰ بعض خلانہ

"　"　"　الیٰ بعض الافاضل

"　"　"　الیٰ بعض الاکابر

"　"　"　الیٰ بعض اصحابہ

"　"　"　الیٰ بعض اصحابہ من فضلاء الافاغنۃ

"　"　"　الیٰ بعض احبابہ

"　"　"　الیٰ بعض اصدقائہ

"　"　"　الیٰ بعض الشعراء

ان ۵۷ تحریرات میں دو تین تحریریں بھی شامل ہیں جن میں ایک کا عنوان ہے فصل دوسری کا عنوان ہے من رشحات اقلام قدوۃ الادباء الشیخ عبدالعزیز مد ظلہٗ ـــــ تیسری کے شروع میں ہے من عبارات الشیخ الاجل عبدالعزیز مد ظلہ، فی تعریف الدھلی ـــ

تقریباً ۷ صفحات پر ستہ نظم ہے جو حضرت شاہ عبدالعزیز کے عربی کلام پر مشتمل ہے۔ شاہ صاحب کا کلام بڑا کیف آور اور وجد انگیز ہے افسوس کہ میں کل اشعار نقل نہ کرسکا۔ چند اشعار نقل کئے ہیں جو اپنے موقع پر پیش کئے جائیں گے۔

چار ورق پر سوالات و جوابات ہیں جو استفتاء اور فتویٰ کی شکل میں ہیں۔
۴۲ صفحات پر تحقیقات و تدقیقات حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا سلسلہ ہے۔
تفصیل حسب ذیل ہے:۔

(۱) ایک سوال کا جواب جو بعض اعزاء نے کول (علی گڑھ) سے بھیجا تھا۔
(۲) قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کے سوال کا جواب (مدت سلطنت بنی امیہ کے بارے میں)
(۳) جواب سوال قاضی صاحب مذکورؒ (ہندوستان کی زمین کس قسم کی ہے؟)
(۴) سجدہ سہو کے بارے میں ایک تحقیق۔
(۵) جواب سوال حاجی رفیع الدین خاں فاروقی مرادآبادیؒ (وضع میزان در محشر سے متعلق)
(۶) سید صاحب عالی مراتب کے مرسلہ ایک استفتاء کا جواب (سید صاحب کا نام درج نہیں ہے)
(۷) ایک مسئلہ (محرم کے انتقال کے بعد اس کے ساتھ محرم کا معاملہ کیا جائے یا نہیں؟)
(۸) ایک سوال کا جواب جو قطع ید سے متعلق ہے اور جس میں روایت عالمگیری کے تعارض کو رفع کیا گیا ہے۔
(۹) مولانا رشید الدین دہلویؒ کے ایک سوال کا جواب۔
(سوال کا خلاصہ یہ ہے کہ حنفیہ بعض مسائل میں صاحبین کا تو اقتداء کرتے ہیں اور تقلید امام شافعیؒ نہیں کرتے اس کی کیا وجہ ہے؟)
(۱۰) ایک صفحہ پر توریت کی ایک عبارت اور اس کی تشریح و توضیح اس کے شروع میں شاہ صاحب کی یہ عبارت ہے — قد نزل علینا رجلٌ کان اسمهٗ ملا فیض اللہ

بن...... وکان من فضلاء کابل ___ عالمٌ بالتوراة ___ فسألته، عن بعض قواعد العبرانیة فاجابنی نحفظتها فاذا هی اوفق بلسان العرب۔
یعنی ہمارے پاس ایک عالم مہمان کی حیثیت سے آئے جو توریت سے اور عبرانی زبان سے واقف تھے اُن کا نام ملا فیض اللہ تھا وہ فضلاء کابل سے تھے۔ میں نے اُن سے کچھ قواعد عبرانی زبان کے معلوم کئے انھوں نے مجھے بتائے میں نے ان کو یاد کرلیا۔ عبرانی زبان عربی زبان سے بہت قریب ہے)

(۱۱) بعض علماء رام پور کے سوال کا جواب — یہ سوال بوساطت حاجی رفیع الدین فاروقی مرادآبادی آیا تھا۔

(۱۲) ایک کتاب کے بعض مقامات کا رد (تقریباً چار ورق پر)

(۱۳) جواب سوال قاضی ثناء اللہ پانی پتی (عبارت صواعق سے متعلق)

(۱۴) غلام حیدر خاں[1] کاکوروی کے سوالات کے جوابات۔

(۱۵) مولانا عبدالحئی بڈھانوی کے ایک سوال کا جواب۔

(۱۶) خواجہ حسن[2] مودودی لکھنوی کا استفسار اور اس کا مفصل جواب اس سوال کے جواب پر بیاض ختم ہوگئی ہے۔

اس بیاض میں ایک تحریر حضرت شاہ ولی اللہ کی ہے اس کے آخر میں ہے من افادات الشیخ الاجل ولی اللہ قدس سرہٗ نقلتہا من خطہ الشریف — یعنی یہ شیخ اعظم حضرت شاہ ولی اللہ کے افادات میں سے ہو جس کو میں نے اُن کی دستخطی تحریر سے نقل کیا ہے۔

بیاض کے دو صفحوں میں تفسیری و تجویدی مضامین و تحقیقات ہیں — ایک مراسلہ قاضی محمد اعلیٰ تھانوی (مؤلف کشاف اصطلاحات الفنون) کے نام ہے جس میں قرأت سے متعلق ایک تحقیقی جواب تحریر فرمایا ہے اس کے آخر میں ہے:-

ھٰذا ما قال بفمہ وکتب بقلمہ الفقیر الی اللہ عبد العزیز الدہلوی العمری عفی اللہ عنہ —

---

[1] اعتماد الدولہ غلام حیدر خاں ابن رفعت الدولہ بخشی رفعت اللہ خاں بہادر نصرت جنگ عباسی کاکوروی مولانا محمد فاخر الہ آبادی سے علم حاصل کیا۔ سرکار اودھ میں بڑے منصب پر فائز تھے ۱۲۵۲ھ میں وفات پائی۔ (تذکرہ مشاہیر کاکوری)

[2] شیخ حسن بن ابراہیم الحسینی المودودی اللکھنوی طریقۂ قادریہ کے مجاز اور کئی کتابوں کے مصنف تھے ۱۲۴۱ھ میں لکھنؤ میں انتقال ہوا (نزہۃ الخواطر جلد ۷)

اس کے بعد مولانا رشید الدین دہلویؒ کی یہ عبارت ہے ۔

هذه مراسلة كتبها الشيخ الاجل الانجل الشيخ عبد العزيز

إلى قاضي محمد اعلى

اس بیاض کا جتنا حصہ میں نے نقل کیا ہے اس میں انتخاب و تلخیص کرتے ہوئے اصل فارسی یا عربی عبارت کو درج کرکے اُس کا ترجمہ پیش کروں گا ــــــ یہ بھی عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس بیاض کی جتنی تحریریں ہیں وہ نادر و غیر مطبوعہ ہیں سوائے چند کے جو فتاویٰ عبد العزیز، حیات دہلی اور آثار الصنادید میں موجود ہیں اگر ایسے ایک دو مضمون نظم و نثر آئیں گے تو یا تو مطبوعہ کی غلطی کا اظہار کرنے کے لئے یا اسکی افادیت اور اہمیت کو پیش نظر رکھ کر ناظرین کو اُسکے مفہوم سے واقف کرنے کے لئے ــــ

اب میں بیاض کے مندرجہ مکاتیب شاہ عبد العزیزؒ میں سے اُن مکاتیب کو سامنے لا رہا ہوں جو شاہ اہل اللہؒ (عم شاہ عبد العزیزؒ) و شاہ نور اللہؒ (خسر شاہ عبد العزیزؒ) کے نام ہیں ــــ ان کے بعد شاہ اہل اللہؒ کے مکتوبات بنام شاہ عبد العزیزؒ کا اندراج ہوگا۔ ان خطوط سے تاریخ کے بہت سے گوشے واضح ہوں گے۔

مکتوب شاہ عبد العزیزؒ اپنے چچا شاہ اہل اللہؒ کے نام

(بزبان عربی منظوم)

الى المجلس المحفوف بالمكارم	سیدنا و سندنا عم محترم حضرت
والمعالي اعني به سيدنا	شاہ اہل اللہ مد ظلہ، کی
وسندنا ومعتمدنا مكان الروح	خدمت میں ـــ
في جسدنا وذخيرة يومنا	
ولغدنا سيدنا العم سلمه	
الله تعالى ظلاله عن الافول	

عربی	اردو
وَاَحَلَّہٗ محال القبول۔ آمین	
بعد رفع السلام والاکرام	بعد سلام مسنون یہ گنہگار فقیر
یقول الفقیر والاٰثام	عرض کرتا ہے۔
اِنَّ ھٰذَا الفقیر محفوظٌ	کہ میں بحمد اللہ زمانے کے
عن شرورِ الزمانِ الاسقامَ	شرور سے محفوظ ہوں
یسئل اللہَ بعدَ کلِّ صلوٰۃٍ	ہر نماز کے بعد میں اللہ تعالےٰ
ان یعافیہ فائضُ الانعامِ	سے عافیت کا سوال کرتا ہوں
ویعافی جمیعَ رفقہٖ	نیز یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ
من ذُکورٍ ونِسوۃٍ وغُلامٍ	تمام رفقاء و متعلقین کو عافیت سے رکھے
خصوصاً جناب حضرتکم	خصوصاً جناب عالی کو تمام بلاؤں
من جمیع البلاء والآلامِ	اور مصیبتوں سے محفوظ رکھے
ثم ان البلاد فاسدۃٌ	اس کے بعد عرض ہو کہ ہماری طرف کے علاقے
من ایادی الغشوم والظلامْ	ظلم وستم کے ہاتھوں برباد ہو رہے ہیں
غیرُ خافٍ علیک[1] ما صنعت	آپ پر یہ بات مخفی نہ ہوگی کہ ایک
قومُ سکھٍ بجانبِ التوشامْ	قوم نے توشام کی جانب کیا کچھ کیا ہو

[1] حیات ولی ص ۳۳۵ و ۳۳۶ پر یہ منظوم مکتوب پورا درج ہے مگر اس میں کاتب کے قلم سے اور غالباً کچھ مؤلف کے تصرفات سے اغلاط ہیں چنانچہ اس شعر کے دوسرے مصرعے کو یوں لکھا ہو:۔

ع قوم سکھٍ کاٰیتَ التوشام — بجانب کا کاٰیت بنا دیا گیا — توشام مغربی پنجاب کا ایک شہر ہو ملاحظہ ہو معیار الاوقات مؤلفہ پروفیسر عبد الکواسع مرحوم شعر کے غلط چھپنے اور توشام کے معنی معلوم نہ ہونے کی وجہ سے اس کا سمجھنا مشکل تھا حضرت مولانا گیلانیؒ کو بھی اس شعر کا مطلب سمجھنے میں اسی بنا پر دقت پیش آئی۔ مولانا گیلانیؒ نے اپنی ذہانت کی مدد سے اسکا مطلب بیان کرنے کے بعد یہ نوٹ دیا ہو "جہاں تک تصحیح عقلاً ممکن تھی کی گئی...... اس لفظ کا صحیح مطلب سمجھ میں نہیں آیا" الخ (الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر ص۱؎) حضرت گیلانیؒ کی زندگی میں یہ تصحیح سامنے آجاتی تو وہ کس قدر مسرور ہوتے؟

خفضوا کلّ قریۃٍ ومضوا	اُس نے آبادیوں کو پست
یفتحون الحصونَ والآطامِ	کر دیا اور قلعے فتح کر لئے
نهبوا عُدّۃً من الاموال	کتنا کچھ مال لوٹ لیا اور
اوثقوا عِدّۃً مِن الایتام	کتنے ہی نفوس قید کر لئے

مکتوب شاہ عبدالعزیزؒ ــــ بنام شاہ اہل اللہ (کچھ حصّہ)

..... وبعد فانی احمد اللہ	بعد سلام مسنون عرض ہے کہ میں
علی ما کسانی من سرابیل الصحۃ	اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اس
وقُمُصِ العافیۃ واطعمنی	احسان پر کہ اُس نے مجھے صحت و عافیت
اقوات الامن والرزق	کا لباس پہنایا اور امن و رفاہیت
الرفاهیته وانّها نعمۃٌ	سے نوازا ــــ در اصل یہ ایک بڑی نعمت
عظیمۃٌ ومنحۃٌ جسیمۃٌ	ہے جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے نصیب
کما قیل ؎	ہو۔ ایک شاعر کہتا ہے :۔
وما العیش الّا فی الخمولِ مع الغنیٰ	اصل زندگی تو یہ ہے کہ گوشۂ گمنامی
وعافیۃٍ یغدو بہا ویروح	ہو اور غنیٰ و عافیت صبح و شام نصیب ہو
بید ان قرۃ العین عائشۃ	نورچشمی عائشہ سلمہا اللہ تعالیٰ
سلمہا اللہ تعالیٰ کانت	بیمار تھی اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا کہ
ذات علۃٍ فتفضل اللہ تعالیٰ	بیماری کا بڑا حصہ زائل ہو گیا اور جو کچھ
بازالۃ اکثرها وهو المرجو	بیماری کا اثر باقی رہ گیا ہے اللہ ہی سے
لازالۃِ غیرِها الخ	امید ہے کہ وہ اس کو بھی زائل فرمائے گا۔

مکتوب شاہ عبدالعزیزؒ ــــ بنام شاہ نوراللہ

(بعد السّلام) بعد سلام ــــ ......

قد ورد علینا مکتوبکم المکرم۔

(سات سطروں کے بعد)

ان الاکابر قد استقرت	بڑوں کی رائیں متوکلاً علی اللہ
آراؤھم .... متوکلاً علی اللہ	بڑھانہ رہنے کی ہو رہی ہیں۔
الی البدھانہ جعل ان	البتہ ان کا ایک طبقہ وہاں
کانت طائفۃ منھم	کی اقامت کو اس لئے پسند
لا یطبع للاقامۃ ھناک	نہیں کرتا کہ کہیں وہاں کی
لانھا تدعی البغضا والشحنا	سکونت وہاں کے رہنے والوں
الی اھالی تلک الاطراف	کے بغض و حسد کا باعث نہ
والاملاک وطائفۃ	بن جائے۔ ایک گروہ ہر
رجح تلک المواضع علی کل	حال میں انھیں مقامات
مکان سواھا وتغمض	(بڑھانہ وغیرہ) کو ترجیح
عن مفاسدھا ومنافع	دیتا ہے فقیر کے نزدیک
غیرھا واما الفقیر فالبلدان	دونوں شہر ہیں اور وہ ذہن
عندہ ھما ماھما الخ	میں ہیں۔

مکتوب شاہ عبدالعزیزؒ بنام شاہ نوراللہ صدیقی پھلتیؒ

...... من الفقیر عبدالعزیز	فقیر عبدالعزیز بعد سلام و اظہار
بعد رفع السلام والغرام	اشتیاق عرض پرداز ہے کہ میں
...... ان ھذا الفقیر مع	تمام متعلقین و لاحقین کے ساتھ
جمیع توابعہ ولواحقہ	امن و عافیت سے ہوں۔ البتہ
داخلٌ فی حوزۃ العافیۃ	برخوردار .... سلمہ اللہ الصمد
نائمٌ فی مھد الرفاھیۃ ۔	کے دونوں ہاتھوں پر سرخی
بیدان قرۃ العین فلان	اور کھجلی ہو گئی ہے۔ اور

سلمہ اللہ الصمد قدمد	اسی کے باعث اُس کو بخار ہو گیا۔
علی یدیہ الحمرۃ والجرب	نورچشمی ..... سلمہا اللہ تعالےٰ کو
وعرضت لہٗ بذلک الحمّیٰ	بہت سے امراض نے چاروں
وما یتبعہا من الاذیٰ	طرف سے گھیر لیا تھا ان میں سے
والتعب واما قرۃ العین	چند یہ ہیں ــــ اسہال ،
فلانتہ سلمہا اللہ تعالیٰ	سوء القنیہ[1] ، کھانا کھانے کے
فقد کان احاطت بہا	بعد نفخ ، بدہضمی ــــ اللہ تعالیٰ
الامراض من کلِّ جانب	نے اپنے فضل سے ان میں سے
منہا الاسہال وسوءُ القِنیَہ	بہت سے امراض کو زائل
والنفخ عند تناول الغذأ	کر دیا جو باقی رہ گئے ہیں
وسوءُ الہضم فازال اللہ	ان کو بھی امید قوی ہے کہ
بفضلہ اکثرھا وھوالمرجو	وہی رفع فرمائے گا ــــ
لازالۃ غیرھا ــــ فالملتمس	آپ سے یہ التماس ہو کہ
من مجلسکم السامی لازال	آپ ان دونوں کی شفاء
سامیاً ان یدعو اللہَ	کے لئے دعا فرئیں ــــ
لِشِفائِہما ــــ ومِن	ان دونوں اللہ تعالےٰ کے
اجلّ نعم اللہ فی ھذہٖ	بڑے انعامات میں سے
الایّام ما ردّ اللہ کید الکفرۃ	ایک انعام یہ ہے کہ اس
فی نحورھم وحفظنا من	نے دشمنان دین کے حیلوں
شرورھم ذلک ان	کو انھیں کی طرف پلٹ دیا
جماعۃ من السکہہ قصدوا	اور ہم کو ان کے شرور سے

---

[1] فسادِ خون کی وہ نوعیت جو مرض استسقاء کا مقدمہ ہوتی ہے۔ اصطلاحِ طب میں سوء القنیہ کہلاتی ہے۔

اوطانهم بعد ما قضوا
من بلاد جات اوطارهم
فمروا في اثناء السبيل
على هذا البلد الذي
ليس له سوى الله حافظ
ولا كفيل فارادوا منه
ما يريدون من غيره
من البلاد فحال الله
تعالى بينهم وبين
ما يشتهونه من النهب
والفساد ونهض
افضل خان وغيره
من رؤساء البلد لمقابلتهم
ودفعهم فلم يتعرضوهم ومضوا.
بسبيلهم وكفى الله المؤمنين
القتال وكان الله قويا عزيزا.
ولكن مرورهم في تلك الاطراف
وعبورهم على بلاد المسلمين الضعاف
يشوشنا ويدفعه ما شاهدناه
من لطيف صنع الله وعسى
ان لا يكون لهم سلطان
عليهم ان شاء الله تعالى.

محفوظ رکھا — ایک جماعت سکھ
نے جاٹوں کے علاقے پر کامیاب
چھاپہ مارنے کے بعد جب اپنے
وطنوں کا قصد کیا تو اثنائے راہ
میں ہمارے اس شہر سے ہو کر گذرے
جس کا حافظ و والی سوائے اللہ تعالیٰ
کے کوئی نہیں۔ اس شہر میں پہونچ کر
انھوں نے حسب عادت غارتگری
کا ارادہ کیا اللہ تعالیٰ نے اُن
کا ارادہ پورا نہ ہونے دیا،
افضل خاں وغیرہ رؤسائے شہر
اُن کے مقابلے کے لئے کھڑے
ہو گئے پھر تو ان کو مجالِ مقاومت
نہ ہوئی اور اپنا راستہ اختیار کیا۔
"اللہ تعالیٰ نے مومنین سے قتال کی نوبت
نہ آنے دی۔ اللہ تعالیٰ زبردست اور غالب
ہے اگرچہ دشمنان دین کا ان اطراف سے
گزرنا اور ضعیف مسلمانوں کے شہروں سے عبور
کرنا اور تشویش پیدا کرتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کی
اس طرح کی نصرت دیکھ کر تشویش ختم ہو جاتی ہے۔
اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے توقع یہی ہے
کہ ان لوگوں کو اہل اسلام پر غلبہ نہیں ہوگا
انشاء اللہ تعالیٰ۔

تقسیمِ دولت کا اسلامی نظام

(حضرت مولانا محمد شفیع مدظلہ، مفتی اعظم پاکستان)

(یہ مقالہ ۲۱ر فروری کو راولپنڈی کی بین الاقوامی اسلامی کانفرنس میں پڑھا گیا تھا ——)

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی۔

"تقسیم دولت" کی بحث معاشی زندگی کے ان اہم ترین مباحث میں سے ایک ہے جنھوں نے آج کی دنیا میں عالمگیر انقلابات کو جنم دیا ہے۔ اور عالمی سیاست سے لے کر ایک فرد کی نجی زندگی تک ہر شعبہ اس سے متاثر ہوا ہے۔ صدیوں سے اس موضوع پر زبانی قلمی اور حربی معرکے گرم ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ "وحی الٰہی" کی رہنمائی کے بغیر نری عقل کے بل پر اس موضوع کے سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس نے اس الجھی ہوئی ڈور کے خم و پیچ میں کچھ اور اضافہ کر دیا ہو۔

زیر قلم مقالے میں پیش نظر یہ ہے کہ قرآن و سنت اور مفکرین اسلام کی کاوشوں سے اس معاملے میں "اسلام" کا جو نقطۂ نظر سمجھ میں آتا ہے اسے واضح کیا جائے۔ وقت کی تنگی اور صفحات کے محدود ہونے کی وجہ سے یہ تو ممکن نہیں ہے کہ اس موضوع کو پورے بسط اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ البتہ اس کے اہم نکات کو اختصار مگر جامعیت کے ساتھ عرض کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

قرآن و سنت اور اسلامی فقہ سے "تقسیم دولت" کے بارے میں اسلام کا جو موقف احقر نے سمجھا ہے اسے بیان کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کچھ بنیادی باتیں واضح کر دی جائیں جو اسلامی معاشیات کے تقریباً ہر مسئلے میں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں، انھیں آپ "نظریہ

تقسیم دولت کے اصول" کہہ لیجئے اس کا "فلسفہ" سمجھ لیجئے یا اس نظریئے کے مقاصد قرار دیجئے، بہرحال یہ چند وہ باتیں ہیں جو قرآن کریم سے اصولی طور پر سمجھ میں آتی ہیں۔ اور اسلام کے معاشی طرزِ فکر کو غیر اسلامی معاشیات سے ممتاز کرتی ہیں۔

معاشی مسئلہ کا مقام | اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام رہبانیت کا مخالف ہے اور انسان کی معاشی سرگرمیوں کو جائز، مستحسن، بلکہ بسا اوقات واجب اور ضروری قرار دیتا ہے۔ انسان کی معاشی ترقی اس کی نگاہ میں پسندیدہ ہے اور "کسب حلال" اس کے نزدیک "فریضۃ بعد الفریضۃ" یعنی دوسرے درجہ کا فرض قرار دیتا ہے لیکن ان تمام باتوں کے ساتھ یہ حقیقت بھی اتنی ہی صداقت رکھتی ہے کہ اس کی نظر میں انسان کا بنیادی مسئلہ "معاش" نہیں ہے اور نہ معاشی ترقی اس کے نزدیک انسان کا مقصدِ زندگی ہے۔

معمولی سوجھ بوجھ سے یہ حقیقت سمجھ میں آسکتی ہے کہ کسی کام کا جائز، مستحسن یا ضروری ہونا ایک الگ بات ہوتی ہے۔ اور اس کا مقصدِ زندگی اور غور و فکر کا محور ہونا بالکل جدا چیز ——— اسلامی معاشیات کے معاملے میں بہت سی غلط فہمیاں ان ہی دو چیزوں کو خلط ملط کرنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے پہلے قدم پر اس بات کا صاف ہو جانا ضروری ہے۔ درحقیقت اسلامی معاشیات اور مادی معاشیات کے درمیان ایک بڑا گہرا بنیادی اور دور رس فرق یہی ہے کہ مادہ پرستانہ معاشیات میں "معاش انسان کا بنیادی مسئلہ" اور معاشی ترقیات اس کی زندگی کا منتہائے مقصود ہیں۔ اور اسلامی معاشیات میں یہ چیزیں ضروری اور ناگزیر سہی لیکن انسان کی زندگی کا اصل مقصد نہیں ہیں۔ اس لیے جہاں ہمیں قرآن کریم میں "رہبانیت" کی مذمت اور "وابتغوا من فضل اللہ" کے احکام ملتے ہیں۔ جہاں ہمیں تجارت کے لیے "فضل اللہ" اموال کے لیے "خیر" اور "التی جعل اللہ لکم قیاماً" خوراک کے لیے الطیبات من الرزق لباس کے لیے "زینۃ اللہ" رہائش کے لیے سکن کے احترامی القاب ملتے ہیں۔ وہاں دنیوی زندگی کے لیے "متاع الغرور" کے الفاظ بھی نظر آتے ہیں اور ان سب چیزوں کے لیے "الدنیا" کا لفظ ملتا ہے جو اپنے لغوی مفہوم کے اعتبار سے کچھ اچھا تاثر نہیں دیتا اور قرآن کریم کے مجموعی اسلوب سے بھی اس کی دناءت اور حقارت سمجھ میں آتی ہے۔

کوتاہ نظری اس موقع پر تضاد کا شبہ پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن درحقیقت اسکے پیچھے اصل راز یہی ہے کہ قرآن کریم کی نظر میں تمام وسائل معاش انسان کی رہگزر کے مرحلے ہیں۔ اس کی اصل منزل درحقیقت ان سے آگے ہے، اور وہ ہے کردار کی بلندی اور اس کے نتیجے میں آخرت کی بہبود۔ انسان کا اصل مسئلہ اور اس کی زندگی کا بنیادی مقصد ان ہی دو منزلوں کی تحصیل ہے لیکن چونکہ ان دو منزلوں کو دنیا کی شاہراہ سے گزرے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے وہ تمام چیزیں بھی انسان کے لیے ضروری ہو جاتی ہیں جو اس کی دنیوی زندگی کے لیے ضروری ہیں۔ چنانچہ جب تک وسائل معاش انسان کی اصلی منزل کے لیے رہگزر کا کام دیں وہ "فضل اللہ" "خیر" "زینۃ اللہ" اور "سکن" ہیں۔ لیکن جہاں انسان اسی رہگزر کی بھول بھلیوں میں الجھ کر رہ جائے اور اس پر اپنی اصل منزل مقصود کو قربان کر ڈالے یا بالفاظ دیگر وسائل معاش کو "رہگزر" بنانے کے بجائے اپنی منزل مقصود کے راستے میں رکاوٹ بنا دے تو پھر یہی وسائل معاش "متاع الغرور" "فتنہ" اور "عدو" بن جاتے ہیں۔

قرآن کریم نے ایک مختصر جملے "وابتغ فیما آتاک اللہ الدار الآخرۃ" میں اس بنیادی حقیقت کو بیان فرمایا ہے۔ اس کے علاوہ اس مضمون کی بہت سی آیات ہیں۔ اہل علم کے سامنے تمام آیات کو ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ احقر کی رائے میں "انسانی معاش" کے متعلق قرآن کریم کی یہ روش اور اس کے دو مختلف پہلو نظر میں رہیں تو اسلامی معاشیات کے بہت سے مسائل حل کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

دولت اور ملکیت کی حقیقت دوسری بنیادی بات جو خاص طور سے "تقسیم دولت" کے مسئلے میں بڑی اہمیت رکھتی ہے یہ ہے کہ قرآن کریم کی تصریح کے مطابق "دولت" خواہ کسی شکل میں ہو، اللہ کی پیدا کردہ اور اصلاً اسی کی ملکیت ہے۔ انسان کو کسی چیز پر ملکیت کا جو حق حاصل ہوتا ہے وہ اللہ ہی کی عطا سے ہوتا ہے۔ سورہ نور میں قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

وآتوھم من مال اللہ الذی آتاکم۔	اور انھیں اللہ کے اس مال میں سے دو جو اس نے تم کو عطا کیا ہے۔

اس کی وجہ بھی قرآن کریم نے ایک دوسری جگہ بتلا دی ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ یہی

تو کر سکتا ہے کہ عمل پیدائش میں اپنی کوشش صرف کرے۔ لیکن اس کوشش کو بار آور کرنا اور اس سے پیداوار کا مہیا کرنا خدا کے سوا کون کر سکتا ہے۔ انسان کے بس میں اتنا ہی تو ہے کہ وہ زمین میں بیج ڈال دے لیکن اس میں بیج کو کونپل اور کونپل کو درخت بنانا تو کسی اور ہی کا کام ہے ارشاد ہے:۔

اَفرئیتم ما تحرثونہٗ ءأنتم تزرعونہٗ	دیکھو تو جو کچھ تم کاشت کرتے ہو۔ کیا تم اسے
اَمْ نحن الزارعون	اگاتے ہو یا ہم ہیں اگانے والے۔

نیز ارشاد ہے:۔

اولم یروا انا خلقنا لھم مما	کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کیلئے
عملت ایدینا انعاماً فھم لھا	جانوروں کو اپنے ہاتھ سے بنا کر پیدا کیا۔ پھر
مالکون۔	وہ اس کے مالک بن گئے۔

یہ تمام آیات اس بنیادی نکتے پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالتی ہیں کہ دولت خواہ کسی شکل میں ہو، اصلاً اللہ کی ملکیت ہے، اور اسی کی عطا سے انسان کو ملی ہے۔ پھر اسلام کی نظر میں چونکہ "دولت" پر اصل ملکیت اللہ کی ہے اور اس نے انسان کو اس میں تصرف کرنے کا حق عطا کیا ہے اس لیے اسی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس دولت پر انسان کے تصرفات کو اپنی مرضی اور مصالح عالم کا پابند بنائے۔ چنانچہ انسان کو اپنی زیر تصرف اشیاء پر "ملکیت" تو حاصل ہے مگر یہ ملکیت آزاد خود مختار اور بے لگام نہیں ہے۔ اس پر "دولت" کے اصل مالک کی طرف سے کچھ حدود و قیود اور پابندیاں عائد ہیں۔ جس جگہ وہ اس دولت کو خرچ کرنے کا حکم دیدے وہاں اس کے لیے خرچ کرنا ضروری ہے اور جہاں خرچ کی ممانعت کردے، وہاں رک جانا لازم ہے۔ اسی بات کو سورہ قصص میں زیادہ وضاحت کے ساتھ کھول دیا گیا ہے۔

وابتغ فیما آتاک اللہ الدار الآخرۃ	جو تجھ کو اللہ نے دیا ہے اس سے پچھلے گھر
ولا تنس نصیبک من الدنیا و	(آخرت) کا توشہ کمالے اور دنیا سے اپنا
احسن کما احسن اللہ الیک ولا	حصہ نہ بھول اور بھلائی کر جیسے اللہ نے
تبغ الفساد فی الارض۔	تجھ سے بھلائی کی اور ملک میں خرابی ڈالنی مت چاہ۔

اس آیت نے اسلام کے فلسفہ ملکیت کو خوب کھول کر بیان فرمادیا ہے۔ اس سے مندرجہ ذیل ہدایات واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

۱۔ انسان کے پاس جو کچھ دولت ہے وہ اللہ کی دی ہوئی ہے (آتاک اللہ)

۲۔ انسان کو اس کا استعمال اس طرح کرنا ہے کہ اس کی منزلِ مقصود دارآخرت ہو۔ (وابتغ .... الدار الآخرۃ)

۳۔ چونکہ دولت اللہ کی دی ہوئی ہے۔ لہٰذا اس پر انسان کا تصرف حکمِ خداوندی کے تابع ہوگا۔ اب حکمِ خداوندی کی دو شکلیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ انسان کو اس بات کا حکم دیدے کہ یہ مال کسی دوسرے کو دیدو۔ اس کی تعمیل اس لیے ضروری ہے کہ اللہ نے تم پر احسان کیا ہے تو وہ تمہیں دوسرے پر احسان کا حکم دے سکتا ہے (واحسن کما احسن اللہ الیک)

۴۔ دوسری شکل یہ ہے کہ وہ تم کو اس دولت کے کسی تصرف سے منع کرے۔ اس کا بھی اس کو اختیار ہے کیونکہ وہ تمہیں دولت کے کسی ایسے استعمال کی اجازت نہیں دے سکتا جس سے اجتماعی خرابیاں پیدا ہوں اور زمین میں شر و فساد پھیلے (ولا تبغ الفساد فی الارض)

یہی وہ چیز ہے جو اسلام کو سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کے نظریۂ ملکیت سے ممتاز کرتی ہے۔ سرمایہ داری کا ذہنی پس منظر چونکہ نظری یا عملی طور پر مادیت ہے اس لیے اس کے نزدیک انسان کو اپنی دولت پر آزاد اور خود مختار ملکیت حاصل ہے۔ وہ اس کو جس طرح چاہے رکھ سکتا ہے لیکن قرآن کریم نے قوم شعیب علیہ السلام کا ایک مقولہ نقل فرماتے ہوئے اس نظریے کا مذمت کے پیرائے میں ذکر کیا ہے۔ وہ لوگ کہا کرتے تھے۔

اصلاتک تأمرک ان نترک	کیا تمہاری نماز تمہیں اس بات کا حکم دیتی ہے
مایعبد آباءنا وان نفعل	کہ ہم اپنے باپ دادوں کے معبودوں کو چھوڑ
فی اموالنا مانشاء	دیں یا اپنے اموال میں اپنی مرضی کے مطابق
(سورۂ ہود)	تصرف کرنا ترک کردیں۔

وہ لوگ چونکہ "اموال" کو حقیقۃً اپنا (اموالنا) سمجھتے تھے اس لیے نفعل مانشاء (جو چاہیں کریں) کا دعویٰ اس کا لازمی نتیجہ تھا۔ یہی فکر سرمایہ داری کی روح ہے۔ اور قرآن کریم نے

سورۃ نور میں "اموالنا" (اپنے اموال) کے لفظ کو "مال اللہ" (اللہ کا مال) سے بدل کر سرمایہ دارانہ فکر کی اس بنیاد پر ضرب لگائی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی "الذی آتاکم" (جو تمہیں دیا ہے) کی قید لگا کر اشتراکیت کی بھی جڑ کاٹ دی ہے۔ جو سرے سے انسان کی انفرادی ملکیت ہی کا انکار کرتی ہے۔ اسی طرح سورہ یٰسین کی آیت "فہم لہا مالکون" نے بذریعہ عطا رحق تعالیٰ انفرادی ملکیت کو واضح کر دیا ہے۔

اب اسلام، سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان واضح خط امتیاز اس طرح کھینچا جا سکتا ہے کہ:

سرمایہ داری ـــــ آزاد اور خود مختار انفرادی ملکیت کی قائل ہے۔
اشتراکیت ـــــ انفرادی ملکیت کا سرے سے انکار کرتی ہے۔

اور حق ان دو انتہاؤں کے درمیان ہے یعنی:

اسلام ـــــ انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے۔ مگر یہ ملکیت آزاد اور خود مختار نہیں جس سے "فساد فی الارض" پھیل سکے۔

تقسیم دولت کے اسلامی مقاصد اسلام نے تقسیم دولت کا جو نظام مقرر کیا ہے اور جس کا خاکہ انشاء اللہ آگے پیش کیا جائے گا۔ قرآن کریم پر غور کرنے سے اس کے تین مقاصد معلوم ہوتے ہیں۔

الف۔ ایک قابل عمل نظام معیشت کا قیام ـــــ تقسیم دولت کا سب سے پہلا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ دنیا میں معیشت کا ایک ایسا نظام نافذ کیا جائے جو فطری اور قابلِ عمل ہو اور جس میں ہر انسان، جبر و تشدد کی بجائے قدرتی طور پر اپنی لیاقت، اپنی استعداد، اپنے اختیار اور اپنی پسند کے مطابق خدمات انجام دے تاکہ اس کی خدمات زیادہ موثر، مفید اور صحت مند ہوں۔ اور یہ بات تاجر (جسے مروجہ معاشی اصطلاح میں آجر کہا جاتا ہے) اور "آجر" کے صحت مند رشتے اور "رسد" و "طلب" کی فطری قوتوں کے صحیح استعمال[1] کے بغیر

---

[1] صحیح استعمال کی قید اس لیے لگائی گئی ہے کہ ان قوتوں کا غلط استعمال بھی ممکن ہے اور سرمایہ داری میں ہوتا رہا ہے۔ اسلام نے انفرادی ملکیت کی بے لگامی کو ختم کر کے اس غلط استعمال کی بیخ کنی کی ہے۔

ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اسلام نے انہیں تسلیم کیا ہے۔

ا۔ اس بات کی طرف مندرجہ ذیل آیات میں جامع اشارہ فرمایا گیا ہے۔

نحن قسمنا بینھم معیشتھم فی الحیوۃ الدنیا ورفعنا بعضھم فوق بعض درجات لیتخذ بعضھم بعضا سخریا۔ ......

ہم نے ان کے درمیان ان کی معیشت کو دینوی زندگی میں تقسیم کیا ہے اور ان میں سے بعض کو بعض پر درجات کے اعتبار سے فوقیت دی ہے تاکہ ان میں سے ایک دوسرے سے کام لے سکے۔

ب۔ حق کا حقدار کو پہونچانا ـــــــ اسلام کے نظام تقسیم دولت کا دوسرا مقصد حق کا حقدار کو پہونچانا ہے لیکن اسلام میں استحقاق کا معیار دوسرے نظام ہائے معیشت سے قدرے مختلف ہے۔ مادی معاشیات میں دولت کے استحقاق کا صرف ایک راستہ ہوتا ہے اور وہ ہے عمل پیدائش میں شرکت، جتنے عوامل دولت کی پیدا وار میں شریک ہوتے ہیں انھیں کو دولت کا مستحق سمجھا جاتا ہے، اور بس! اس کے برخلاف اسلام کا بنیادی اصول چونکہ یہ ہے کہ دولت اصلاً اللہ کی ملکیت ہے اور وہی اس کے استعمال کے قوانین مقرر فرماتا ہے اس لیے اسلام میں، دولت کے حقدار صرف عاملین پیدائش ہی نہیں ہوتے بلکہ ہر وہ شخص بھی دولت کا مستحق ہے جس تک دولت کا پہونچانا اللہ نے ضروری قرار دیا ہے ـــــ لہذا فقراء و مساکین اور معاشرے کے نادار او بیکس افراد بھی دولت کے حقدار ہیں، اس لیے کہ جن عوامل پیدائش پر اولاً دولت تقسیم ہوتی ہے ان کے ذمے اللہ نے لازم کیا ہے کہ وہ ان تک اپنی دولت کا کچھ حصہ پہونچائیں اور قرآنی تصریحات کے مطابق یہ مفلسوں اور ناداروں پر ان کا کوئی احسان نہیں ہے، بلکہ وہ فی الواقعہ دولت کے مستحق ہیں۔ ارشاد ہے:

فی اموالھم حق معلوم للسائل والمحروم۔

اور ان کے اموال میں سائل اور محروم کا ایک متعین حق ہے۔

اس حق کو بعض مقامات پر اللہ کا حق قرار دیا گیا ہے کھیتیوں کے بارے میں فرمایا جاتا ہے:

وآتوا حقہ یوم حصادہ

اور اس (کھیتی) کے کٹنے کے دن اس کا حق ادا کرو۔

ان دونوں آیتوں میں "حق" کا لفظ ظاہر کر رہا ہے کہ استحقاق دولت کا ماخذ صرف عمل پیدائش ہی نہیں ہے بلکہ مفلس و نادار افراد بھی دولت کے ٹھیک اس طرح مستحق ہیں جس طرح اس کے اوّلین مالک ــــ لہٰذا اسلام دولت کو اس طرح تقسیم کرنا چاہتا ہے کہ اس سے تمام عوامل پیدائش کو ان کے عمل کا حصہ بھی پہونچ جائے اور اس کے بعد ان لوگوں کو بھی ان کا حصہ مل جائے جنھیں اللہ نے مستحق دولت قرار دیا ہے (ان دونوں قسم کے حقداروں کی تفصیل آگے انشاء اللہ آئے گی)

ج۔ ارتکازِ دولت کی بیخ کنی ــــ تقسیم دولت کا تیسرا مقصد جس کو اسلام نے بہت اہمیت دی ہے یہ ہے کہ دولت کا ذخیرہ چند ہاتھوں میں سمٹنے کی بجائے معاشرے میں زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر گردش کرے۔ اور اس طرح امیر و غریب کا تفاوت جس حد تک فطری اور قابلِ عمل ہو کم کیا جائے۔ اس سلسلے میں اسلام کا طرزِ عمل یہ ہے کہ دولت کے جو اوّلیں ماخذ اور دہانے ہیں ان پر اس نے کسی فرد یا جماعت کا پہرا نہیں بیٹھنے دیا بلکہ معاشرے کے ہر فرد کو ان سے استفادے کا مساوی حق دیا ہے، کانیں، جنگل اور غیر مملوکہ بنجر زمینیں، جنگل اور پانی کا شکار، خود رو گھاس، دریا اور سمندر، مال غنیمت وغیرہ یہ تمام پیدائشِ دولت کے اوّلیں ماخذ ہیں، اور ان میں ہر فرد کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ان سے اپنے کسب و عمل کے مطابق فائدہ اٹھائے اور اس پر کسی کی اجارہ داری قائم نہ ہو۔

کیلا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم ؎	تاکہ (یہ دولت) تم میں سے (صرف) مالداروں کے درمیان دائر ہو کر نہ رہ جائے۔

اس کے بعد جہاں انسانی عمل کی ضرورت پیش آتی ہے اور کوئی شخص اپنے کسب و عمل سے کوئی دولت حاصل کرتا ہے تو وہاں اس کے کسب و عمل کا احترام کر کے اس کی ملکیت

؎ واضح رہے کہ یہ آیت مال غنیمت کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جو حصولِ دولت کے اوّلین ماخذ میں سے ہے۔

کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اور اس میں ہر ایک کو اس کے کسب و عمل کے مطابق حصہ دیا گیا ہے اور اس معاملے میں ارشاد یہ ہے کہ:

نحن قسمنا بینھم معیشتھم ورفعنا بعضھم فوق بعض درجات لیتخذ بعضھم بعضا سخریا۔ ۔۔۔۔

ہم نے ان کے درمیان ان کی معیشت کو تقسیم کیا ہے اور ان میں سے بعض کو بعض پر درجات کی فوقیت دی ہے تاکہ ایک دوسرے سے کام لے سکے۔

لیکن درجات کے اس فرق کے باوجود کچھ ایسے احکام دیدیئے گئے ہیں کہ یہ فرق اس قدر رہے جتنا ایک قابل عمل نظم معیشت کے قیام کے لیے ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ دولت کا ذخیرہ صرف چند ہاتھوں میں سمٹ آئے۔

تقسیم دولت کے ان تین مقاصد میں سے پہلا مقصد اسلامی معیشت کو اشتراکیت سے ممتاز کرتا ہے۔ تیسرا مقصد سرمایہ دارانہ نظام سے اور دوسرا دونوں سے جس کی تفصیل عنقریب عرض کی جائے گی۔

اسلامی نظم معیشت کے ان چند بنیادی اصولوں کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اب میں مختصراً تقسیم دولت کا وہ نظام بیان کرنے کی کوشش کروں گا جو قرآن و سنت اور فقہاء امت کی کاوشوں سے سمجھ میں آتا ہے۔

تقسیم دولت کا سرمایہ دارانہ نظریہ اسے پوری طرح سمجھنے کے لیے سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں "تقسیم دولت" کا جو نظام مقرر کیا گیا ہے۔ پہلے اس پر ایک نظر ڈال لینا مناسب ہوگا۔ مختصر لفظوں میں اس نظریے کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ دولت ان ہی لوگوں پر تقسیم ہونی چاہیے جنھوں نے اس کی پیداوار میں حصہ لیا ہے اور جنھیں معاشی اصطلاح کے مطابق "عاملین پیداوار" کہا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ معاشیات میں یہ کل چار عوامل ہیں۔

۱۔ سرمایہ —— جس کی تعریف "پیدا کردہ ذریعہ پیدائش" سے کی گئی ہے۔ یعنی وہ شے جس پر ایک مرتبہ انسانی عمل پیدائش ہو چکا ہو۔ اور اسے ایک دوسرے عمل

پیدائش کے لیے ذریعہ بنایا جا رہا ہو۔

۲۔ محنت ——— یعنی انسانی عمل۔

۳۔ زمین ——— جس کی تعریف "قدرتی وسائل" سے کی گئی ہے۔ یعنی وہ اشیاء جو انسان کے کسی سابقہ عمل پیدائش کے بغیر پیدائش کا وسیلہ بن رہی ہوں۔

۴۔ آجر یا منتظم، یعنی وہ جو مذکورہ بالا تینوں عوامل کو جوڑ کر انھیں کام میں لگاتا اور نفع و نقصان کا خطرہ مول لیتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں ان چار عاملین پیداوار کے مشترکہ عمل سے جو پیداوار ہوتی ہے، اس کو ان ہی چاروں پر اس طرح تقسیم کیا جاتا ہے کہ ایک حصہ سرمایہ کو سود کی شکل میں دیا جاتا ہے، دوسرا حصہ محنت کو اُجرت کی شکل میں دیا جاتا ہے، تیسرا حصہ زمین کو لگان یا کرایہ کی صورت میں ملتا ہے۔ اور چوتھا حصہ آجر کے لیے منافع کی صورت میں باقی رکھا جاتا ہے۔

تقسیم دولت کا اشتراکی نظریہ اس کے برخلاف اشتراکی معیشت میں چونکہ سرمایہ اور زمین کسی کی انفرادی ملکیت ہونے کی بجائے قومی ملکیت ہوتے ہیں۔ اس لیے سود اور لگان کا اس نظام کے فلسفے[1] میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آجر بھی اشتراکی نظام میں کوئی فرد واحد ہونے کی بجائے خود حکومت ہوتی ہے۔ اس لیے منافع بھی اس کے یہاں نظری طور پر خارج از بحث ہے، اب صرف "محنت" رہ جاتی ہے۔ اور اشتراکی نظام میں دولت کی وہی مستحق ہے جو اُسے "اجرت" کی شکل میں ملتی ہے۔

تقسیم دولت کا اسلامی نظریہ اسلام کا نظام تقسیم دولت ان دونوں سے مختلف ہے۔ اس کے نزدیک دولت کے مستحقین دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک اوّلین مستحق، یعنی وہ لوگ جو کسی عمل پیدائش کے بعد بلا واسطہ اس کے مستحق ہوتے ہیں۔ یہ مستحقین وہی عوامل

---

[1] یہاں یہ واضح رہے کہ اس وقت گفتگو اشتراکیت کے اصل فلسفے سے ہو رہی ہے اس کے موجودہ عمل سے نہیں۔ اشتراکی ممالک کا موجودہ طرز عمل اس فلسفے سے بہت مختلف ہے۔

پیداوار ہیں جنھوں نے کسی پیداوار کے عمل پیدائش میں حصہ لیا۔ دوسرے ثانوی مستحقین یعنی وہ لوگ جو براہ راست عمل پیدائش میں شریک نہیں تھے۔ لیکن عاملین پیدائش کے ذمے لازم کیا گیا ہے کہ وہ اپنی دولت میں ان کو بھی شریک کریں۔ یہاں مستحقین دولت کی ان دونوں قسموں کو ہم قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

دولت کا اوّلیں مستحق | جیسا کہ عرض کیا گیا، دولت کے اوّلین مستحق عوامل پیداوار ہوتے ہیں۔ لیکن عوامل پیداوار کی تعیین ان کی اصطلاحات، اور ان پر تقسیم دولت کے طریقے اسلام میں بعینہٖ وہ نہیں ہیں جو سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں مقرر کیے گئے ہیں۔ بلکہ بہت مختلف ہیں۔ اسلامی نظریے کے مطابق پیدائش کے حقیقی عوامل چار کے بجائے تین ہیں۔

۱۔ سرمایہ ـــــ یعنی وہ وسائل پیداوار جن کا عمل پیدائش میں استعمال اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ انھیں خرچ نہ کیا جائے یا ان کی شکل وصورت میں تبدیلی نہ کی جائے۔ اور اس لیے ان کا کرایہ پر چلانا ممکن نہیں ہے۔ مثلاً نقد روپیہ یا اشیائے خوردونی وغیرہ

۲۔ زمین ـــــ یعنی وہ وسائل پیداوار جن کا عمل پیدائش میں اس طرح استعمال کیا جاتا ہے کہ ان کی اصلی شکل وصورت برقرار رہتی ہے اور اس لیے انھیں کرایہ پر دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً زمین، مکان، مشینری وغیرہ۔

۳۔ محنت ـــــ یعنی انسانی فعل، خواہ وہ اعضاء وجوارح کا ہو، یا ذہن اور قلب کا۔ لہٰذا اس میں تنظیم اور منصوبہ بندی بھی داخل ہے۔

ان تین عوامل کے مشترکہ عمل سے جو پیداوار ہوگی وہ اوّلاً ان ہی تینوں پر اس طرح تقسیم کی جائے گی کہ اس کا ایک حصہ سرمایہ کو بہ شکل منافع (نہ کہ بشکل سود) ملے گا۔ دوسرا حصہ بشکل کرایہ دیا جائے گا۔ اور تیسرا حصہ محنت کو بہ شکل اُجرت۔

اشتراکیت اور اسلام | تقسیم دولت کا یہ نظام اشتراکیت سے بھی مختلف ہے اور سرمایہ داری سے بھی۔ اشتراکیت سے تو اس کا فرق بالکل ظاہر ہے کہ اشتراکیت

میں چونکہ انفرادی ملکیت کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ اس لیے اس میں تقسیمِ دولت صرف اُجرت کی شکل میں ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف اسلامی نظریۂ تقسیم دولت کے جو اصول ہم نے شروع میں بیان کیے ہیں، ان کی روشنی میں کائنات کی تمام اشیاء اصلاً اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں۔ پھر ان اشیاء میں سے ایک کثیر حصہ تو وہ ہے جسے اس نے وقفِ عام کے طور پر تمام انسانوں کو مساوی طور پر دے دیا ہے۔ آگ، پانی، مٹی، ہوا، روشنی، خود رو گھاس، جنگل اور پانی کا شکار، معادن اور غیر مملوکہ بنجر زمین وغیرہ اس قسم میں داخل ہیں، جن پر کسی کی انفرادی ملکیت نہیں۔ بلکہ وہ وقفِ عام ہیں۔ ہر انسان ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اور ان کا مساوی طور پر حقدار ہے۔

دوسری طرف بعض اشیاء وہ ہیں جن میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کیے بغیر وہ قابلِ عمل اور فطری نظامِ معیشت قائم نہیں ہو سکتا، جس کی طرف ہم نے تقسیم دولت کے پہلے مقصد میں اشارہ کیا ہے۔ اشتراکی نظام کو اختیار کرتے ہوئے تمام سرمایہ اور زمین کو کلیتہً حکومت کے حوالے کر دینے کا نتیجہ آل کار اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ چھوٹے چھوٹے بے شمار سرمایہ داروں کو ختم کر کے ملکی دولت کے عظیم الشان ذخیرے کو ایک بڑے سرمایہ دار کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو من مانے طریقے پر دولت کے اس تالاب سے کھیلتا ہے۔ اور اس طرح اشتراکیت کا نتیجہ بدترین ارتکازِ دولت کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اس کے علاوہ اس سے دوسری بڑی خرابی یہ پیدا ہوتی ہے کہ انسانی محنت چونکہ اپنے اختیار اور مرضی کے فطری حق سے محروم ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس کے استعمال کے لیے جبر و تشدد ناگزیر ہے جس کا برا اثر محنت کی کارکردگی پر بھی پڑتا ہے۔ اور اس کی ذہنی صحت پر بھی۔ اس سے واضح ہو گیا کہ اشتراکی نظام میں اسلامی نظریۂ تقسیم دولت کے دو مقاصد مجروح ہوتے ہیں، ایک فطری نظامِ معیشت کا قیام اور دوسرے حقدار کو حق پہونچانا۔

غرض اشتراکیت کے غیر فطری نظام کی ان چند در چند خرابیوں کی وجہ سے اسلام نے انفرادی ملکیت کو سرے سے ختم کر دینا پسند نہیں کیا۔ بلکہ کائنات کی جو اشیاء وقفِ عام نہیں ہیں، ان میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کر کے اس نے سرمایہ اور زمین کی جداگانہ

حیثیت بھی برقرار رکھی ہے اور ان میں "رسد و طلب" کے فطری نظام کو بھی سند بنا کر استعمال کیا ہے چنانچہ اس کے یہاں اشتراکیت کی طرح تقسیم دولت صرف اجرت کی شکل میں نہیں ہوتی، بلکہ منافع اور کرایہ کی صورت میں بھی ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی اس نے "سود" کی مد کو ختم کر کے اور دولت کے ثانوی مستحقین کی ایک طویل فہرست بنا کر ارتکاز دولت کی اس زبردست خرابی کو بھی ختم کر دیا ہے جو سرمایہ داری کا خاصہ لازمہ ہے اور جسے دور کرنے کا دعویٰ اشتراکیت کرتی ہے۔

سرمایہ داری اور اسلام | یہ تھا اسلامی نظریہ تقسیم دولت کا وہ بنیادی فرق جو اسے اشتراکیت سے ممتاز کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس فرق کو بھی اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے جو سرمایہ داری اور اسلام کے نظام تقسیم دولت میں پایا جاتا ہے۔ یہ فرق چونکہ بڑے دقیق اور پیچیدہ ہے۔ اس لیے اسے نسبتہً زیادہ تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت ہوگی۔

(باقی آئندہ)

بقیہ ص ۴

متعلق مسئلہ بن گئے۔ جہاں تک ہو سکا رفع انتظار کے لئے جواب دیدیا گیا۔ کچھ حضرات کے خطوط پھر بھی باقی ہیں اس لئے اب یہ اطلاع دینا ضروری ہوئی کہ مولانا کی واپسی ان شاء اللہ وسط اپریل میں ہوگی۔ لہٰذا اب اس سے پہلے نہ جواب کا انتظار فرمایا جائے اور نہ مزید خط لکھا جائے۔

الفرقان کو پسند کرتے ہیں؟

تو اس کی اشاعت بڑھانے میں ہماری مدد کیجیے

آپ کی یہ کوشش الفرقان کو استحکام بخشے گی

الفرقان کو پسند کرنے کا مطلب ہے

اس کی دینی افادیت کو ماننا

دینی فائدہ پہونچانے والی کسی چیز کو آپ تک محدود نہیں رہنا چاہیے

الفرقان کی اشاعت میں جس قدر زیادہ ترقی ہوگی

ہم اس کی افادیت کے معیار کو بھی اتنا ہی اور بلند کر سکیں گے!

آپ کی اس کوشش کے سلسلے میں دفتر کا کیا تعاون آپ کیلئے مفید ہو سکتا ہے

ہمیں لکھیے ہم منتظر رہیں گے!

ادارہ الفرقان

کچہری روڈ، لکھنؤ

خاندانی منصوبہ بندی

از عتیق الرحمٰن سنبھلی

(۲)

> گزشتہ شمارہ میں نس بندی پر بحث کے ضمن میں خاندانی منصوبہ بندی پر بھی گفتگو آ گئی تھی، مگر وقت کی تنگی سے اور کچھ اس خیال سے کہ مسئلہ صرف نس بندی کا ہے، نفس خاندانی منصوبہ بندی پر اس سے پہلے ہی لکھنے والے کافی تفصیل سے لکھ چکے ہیں، اجمالی اشارات ہی پر اکتفا کر لیا گیا تھا، لیکن بعد میں احساس ہوا کہ ایک اہم ترین پہلو پر لکھنے والوں نے اتنا زور نہیں دیا ہے جس کا وہ مستحق تھا، اس لیے مضمون کی ایک دوسری قسط کا فیصلہ کیا گیا تاکہ دینی نقطۂ نظر سے وہ تمام ضروری پہلوؤں پر حاوی ہو جائے۔

خاندانی منصوبہ بندی کی خاص ضرورت یہ بتائی جاتی ہے کہ آبادی کی شرح جتنی تیزی سے بڑھ رہی ہے غذائی پیداوار اس کا ساتھ دینے سے عاجز ہے، زرعی منصوبوں سے اس پیداوار میں جو اضافہ کیا جاتا ہے وہ اضافۂ آبادی کے اثر سے صفر بن جاتا ہے، لہٰذا اس مسئلہ پر قابو پانے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں کہ انسانی آبادی کو ایک حد کے اندر رکھا جائے۔

ہمارے پیش نظر مسئلہ کے دینی پہلو سے بحث ہے، معاشی اور اقتصادی پہلو سے نہیں۔

اس لیے اس جائزہ کی یہاں کوئی ضرورت نہیں کہ آیا فی الواقع زمین کی صلاحیت کا خزانہ اضافۂ آبادی کی موجودہ شرح کی ضرورتیں پوری کرنے سے قاصر ہے، یا زرعی منصوبے، منصوبہ بندی کی خامی، عملدرآمد میں بدعنوانی اور بیا درمیانی لوگوں کی منافع خوری اور ذخیرہ اندوزی کی وجہ سے کارگر نہیں ہو رہے ہیں۔! لیکن یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ زمین کی صلاحیت کے بارے میں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ بس یہ اس کی حد ہے۔ ہم صرف ابتک کے تجربے کی بنا پر کسی زمین کا اوسط پیداوار بتا سکتے ہیں۔ لیکن صلاحیت پیداوار کی حد بتانے والا کوئی علم اور کوئی آلہ انسان نے دریافت نہیں کیا ہے۔ کل تک جو زمینیں ۱۵ من فی بیگہ گندم پیدا کر رہی تھیں آج وہ نئے تخم کے تجربے سے ۳۰ من فی بیگہ کا اوسط دے رہی ہیں اور کل کسی نئے تجربے سے یہ اوسط کیا ہو جائے گا؟ اس کی خبر خدا ہی کو ہے۔ اس لیے انسانی آبادی کے متعلق کسی بھی حد پر یہ کہنا کہ اس سے زیادہ کا بار زمین کی صلاحیت پیداوار نہیں اٹھا سکتی، ایک بے بنیاد بات ہوگی۔

پس اب اگر یہ صورت ہمارے سامنے آتی ہے کہ انسان زیادہ ہیں اور غلہ کم، اور ہم اس بارے میں بھی مطمئن ہیں کہ یہ عدم توازن کچھ لوگوں کی ذخیرہ اندوزی اور منافع خوری کی وجہ سے نہیں ہو رہا ہے، بلکہ پیداوار خود ہی کم پڑ رہی ہے، نیز یہ اطمینان بھی ہم نے کر لیا ہے کہ انسانی محنت اور دوسرے ضروری شرائط کا جو اعلیٰ سے اعلیٰ معیار ہم فراہم کر سکتے تھے وہ ہم نے پیداوار بڑھانے کے لیے پورا کر دیا ہے، تو پھر ایک غیر مؤمن کا راستہ تو وہ ہے جسے قرآن کہتا ہے۔

مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَاۗءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ۔

(الحج۔ ع ۲)

جو سمجھتا ہو کہ اللہ نہیں اس کی مدد کرے گا دنیا اور آخرت میں، تو اسے چاہیے کہ ایک رسی تانے آسمان میں (جس میں لٹکائے اپنے آپ کو) پھر اسے کاٹ دے اور تب دیکھے کہ کیا اس تدبیر سے اس کی گھٹن کا سبب دور ہو گیا؟۔

ایک خدا ناآشنا قوم جب رزق کے معاملے میں اپنی تدبیروں سے قابو نہ پا سکے تو اُس کیلئے واقعۃً اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ بچوں کی پیدائش کو گھٹانے (یعنی قومی خودکشی) کا راستہ ڈھونڈھنے لگے اور اس راستہ کی کوششیں بھی کامیاب نہ ہوں تو پھر قدیم جاہلیت کی تقلید کر کے سیدھے سیدھے قتل اولاد ہی میں نجات سمجھی جائے۔

اس کے برعکس اہلِ ایمان کا راستہ وہ ہے جس کی تلقین اللہ کا ایک پیغمبر اپنی قوم کو ان الفاظ میں کرتا ہے۔

اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا،	معافی چاہو اپنے رب سے، بے شک وہ
يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا،	بہت معاف کرنے والا ہے، کھول دے گا
وَيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ	وہ تم پر آسمان کا دہانہ اور بڑھائے گا
لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا،	تم کو مال واولاد سے، بنائے گا تمہارے
مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا،	لیے باغ اور بنا دے گا تمہارے لیے
وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ۝	نہریں ـــ کیا ہوا ہے تم کو کہ نہیں امید
(نوح۔ع ۱)	کرتے اللہ سے بڑائی (اور کرم فرمائی) کی
	حالانکہ اُس نے بنایا ہے تم کو کتنے اطوار
	چڑھا کے۔

یہ اپنی قوم کو نوح علیہ السلام کی تلقین ہے۔ زمانۂ نوح ماقبل تاریخ کا زمانہ ہے، ہمیں تاریخی شہادت سے نہیں معلوم کہ قوم کے کس حال میں آپ نے اس سے یہ خطاب فرمایا تھا۔ مگر ان الفاظ کے اندر تقریباً صاف ہی نظر آتا ہے کہ قوم قحط وافلاس سے دوچار تھی۔ اللہ کا کوئی طویل عتاب تھا کہ کھیتوں اور باغوں سے لے کر گھروں اور بازاروں تک میں خاک اُڑ رہی تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے "استغفروا" سے اس طرف توجہ دلائی کہ یہ اللہ کا عتاب اور اس کی گرفت ہے۔ اور اس سے خلاصی کی راہ یہ بتائی کہ اسے راضی کرو، یہ ساری مصیبت ٹل جائے گی[ف] ـــــ خدا سے ناآشنا یہ قوم

ف آیت میں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اللہ نے اپنے نبی کی زبان سے غذائی قلت کو (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بھی نہیں سمجھتی تھی کہ اس معاملہ میں اللہ کی مدد بھی کوئی معنیٰ رکھتی ہے۔ حضرت نوحؑ نے فرمایا کہ آخر تم کیوں اس معاملے میں اس کی کارسازی کا خیال نہیں لاتے ہو؟ کیا اسی نے تم کو رحم مادر میں ہستی کے کتنے ہی نشیب و فراز طے نہیں کرائے!

ایمان کا مطلب ہی یہ ہے کہ کائنات کی باگیں اللہ کے ہاتھ میں سمجھی جائیں۔ اور "اِذنُ اللہ" کے بغیر یہاں کچھ گھٹنے اور کچھ بڑھنے، کچھ رونما ہونے اور کچھ فنا ہو جانے کا تصور بھی نہ کیا جائے، کسی مؤمن سے بھی پوچھئے تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ رزق کا گھٹانا اور بڑھانا خدا کے ہاتھ میں ہے پھر ایک مؤمن یہ بھی سمجھتا ہے کہ زمین سے لے کر آسمان تک ہر قدرتی چیز انسان کی خدمت کے لیے مسخر ہے، اس کی غرض و غایت ہی یہ ہے کہ انسان کی ضرورت پوری کرے۔ اور کوئی چیز اگر انسان کی صحیح کوشش کے باوجود اپنا یہ وظیفہ ادا نہیں کرتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی طرف سے روک لگا دی گئی ہے، ان عقائد کے ساتھ اگر ہم دیکھ رہے ہوں کہ ہماری بہترین کوششوں کے باوجود رزق نہیں بڑھتا، ہماری زمینوں کی پیداوار بقدر کفایت نہیں ہوتی — حالانکہ وہ ہو سکتی ہے — تو کیا ہم خدا کی لگائی ہوئی روک کا توڑ اس طرح کر سکتے ہیں کہ بچوں کی پیدائش گھٹا دیں، یا خدا نخواستہ کسی تدبیر سے موجودہ آبادی کو بھی گھٹا دیں؟ کیا خدا اس بات پر قادر نہیں کہ وہ اسی نسبت سے ہمارا رزق اور گھٹا دے یا اس میں بے برکتی کا تناسب کچھ اور بڑھا دے؟

کہیں سے کہیں تک بھی سوچئے تو ایمان اور اسلام کے دعوے کے ساتھ رزق کے خیال سے تحدید نسل اور خاندانی منصوبہ بندی اپنے عقیدوں کے ساتھ ایک بے جوڑ مذاق سے کم نہیں ہے۔ افزائش رزق کی کوششیں اگر صحیح نہیں ہیں تو ان کو صحیح کیجئے۔ اگر صحیح ہیں اور پھر بھی پوری نہیں پڑتی تو اللہ کی کتاب اور اس کے پیغمبروں کے صاف

(حاشیہ بر صفحہ گزشتہ) دور کرنے کی جو یقین دہانی کرائی ہو اسی کے ساتھ ساتھ اولاد میں برکت کا بھی مژدہ سنایا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہی ہوا کہ خدا اگر رزق دینے پر آئے تو اولاد کی کثرت اس کی اس عطا کو کالعدم نہیں کر سکتی بلکہ یہ کیفیت ہو سکتی ہے کہ انسان اس دوسری عطا کو کرم بالائے کرم سمجھے۔

صاف اعلان پر نظر رکھتے ہوئے یقین کیجئے کہ رزق کی کمی آبادی کی زیادتی سے نہیں، گناہوں اور نافرمانیوں کی زیادتی سے ہے۔ یہ ایک تنبیہہ اور یاد دہانی ہے کہ باز آجاؤ اور اس ذات کی طرف رجوع ہو جو رزق کا حقیقی سرچشمہ ہے۔ جہاں تک مسلم ممالک کا سوال ہو وہاں ایسی حالت پیدا ہوجانے کی عمومی توجیہہ قرآن وحدیث کی رو سے یہی ہوتی ہے۔ رہے غیر مسلم ممالک تو ان کے لیے اللہ کی طرف سے عمومی قانون ڈھیل کا ہے۔ انھیں رزق کی مار صرف کچھ خاص قسم کے جرائم ہی پر دی جاتی ہے۔ اور اس کی نوعیت تنبیہہ کی نہیں ہوتی، سزا اور گرفت کی ہوتی ہے، کہ ان کے شر و فساد کا تدارک کیا جائے۔

بہرحال ہم ایسی (پیداواری) حالت والے کسی مسلم ملک میں رہتے ہوں تب اور غیر مسلم کے باشندے ہوں، تب، دونوں ہی صورتوں میں اس حالت کا علاج یہ ہے کہ قوم کی جس عملی حالت پر یہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے اسے درست کرنے کی کوشش کی جائے نہ یہ کہ خدا کی تنبیہی یا تعزیری تدبیر کو ناکام کرنیکی کوئی تدبیر سوچی جائے! قرآن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے اس عالم میں رزق رسانی کا نظام صرف طبیعی قانون پر ہی استوار نہیں کیا ہے، بلکہ ایک اخلاقی قانون بھی اس نظام کا جزو ہے۔ طبیعی قانون یہ ضرور ہے کہ زمین پر صحیح طریقے سے محنت کی جائے تو وہ اپنے خزانے اُگلے اور انسان کو نہال کر دے۔ مگر اس سے بالاتر ایک اخلاقی قانون بھی ہے جس کے ماتحت کسی قوم کے حق میں کسی مدت کے لیے طبیعاتی قانون کا عمل کمزور یا معطل کر دیا جاتا ہے۔ زمین کی بارآوری کا طبیعی قانون خدا کی طرف سے پرورش کا انتظام ہے۔ مگر خدا صرف پروردگار اور روزی رساں ہی نہیں ہے وہ ان اخلاقی حدود کا نگراں اور نگہبان بھی ہے جن کے تحفظ پر اس عالم کی بقا اور اس کی تخلیق سے پیش نظر مقاصد کی تکمیل موقوف ہے، چنانچہ وہ رزق کے اتھاہ خزانے یوں ہی اندھا دھند نہیں لٹاتا، بلکہ عمومی طور پر تو اس پیمانے سے دیتا ہے جو نوع انسانی کو مجموعی طور پر اس کی حد میں رکھ سکے اور خصوصی طور پر ان قوموں اور گروہوں کے رزق کو جن کا عملی رویہ انسانیت کے لیے شر و فساد کی کچھ خاص نوعیتوں کا موجب بننے لگے، ایک غیر معمولی اور تکلیف دہ حد تک بھی کھینچ لیتا ہے! شر و فساد ایک خاص حد پر پہونچ

جاتا ہے تو اس کا تدارک کی یہ کون کون سی صورتیں ہیں اور کس کس درجہ پر یہ قابل گرفت ہوجاتی ہیں اس کا تفصیلی علم ہمیں نہیں دیا گیا ہے۔ البتہ امم سابقہ سے حالات کے ضمن میں قدرت کے اس قانون سے اصولی واقفیت کا موقع ہمیں دے دیا گیا ہے۔ بہرحال رزق کے معاملہ میں اللہ کی یہ عمومی اور خصوصی سنت اخلاقی قانون کے ماتحت ہے جو عالم انسانیت کے کچھ ناگزیر مصالح کی حفاظت کے لیے طبیعی قوانین سے اوپر ٹھہرا دیا گیا ہے۔ قرآن میں اس کے جو شواہد ہمیں ملتے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:۔

ہم میں سے ہر شخص کا مشاہدہ ہے کہ حصول رزق کی یکساں کوششوں کے نتائج لازماً یکساں نہیں ہوتے بلکہ اکثر فرق ہوتا ہے، حالانکہ جہاں تک طبیعی ذرائع سے حصول رزق کا تعلق ہے، اس میں تو دو مساوی اور یکساں کوششوں کے نتائج اسی طرح مساوی ہونے چاہئیں جس طرح قانون ریاضی کے ماتحت دو اور دو کے ملانے سے ہر وقت اور ہر حال میں چار ہی کا مجموعہ حاصل ہوتا ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ اس فرق کا باعث وہ اخلاقی مصلحت کا قانون ہے جو طبیعاتی قوانین سے اوپر حکمراں ہے۔ فرمایا گیا۔

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا	اگر اللہ پھیلا دے روزی اپنے بندوں کے
فِی الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ	لیے تو وہ اُدھم مچائیں زمین میں (چنانچہ
بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ۔	وہ ایسا نہیں کرتا) بلکہ اُتارتا ہے ناپ
(الشوریٰ رع ۳)	کر جتنی چاہتا ہے۔

یہ "بسط رزق" اور فراخیٔ رزق جس کی نفی کی جارہی ہے، غور کیجئے تو اس کے معنیٰ صرف یہی نہیں گے کہ یکساں قدرتی ذرائع اور یکساں محنت و تدابیر کے ملنے سے جو یکساں نتائج طبیعی قانون کے تحت حاصل ہونے چاہئیں وہ لازماً اس لیے نہیں حاصل ہونے دیئے جاتے کہ اگر ایسا ہوا تو دنیا کے اس حمام میں تقریباً سب ہی ننگے ہو جائیں گے اور رزق کا مسئلہ جو خدا کو یاد دلانے یعنی انسان کو اپنے حدود میں رکھنے والی سب سے بڑی چیز ہے اس کی طرف سے عمومی بے فکری کے بعد خدا کی یاد اس زمین پر مشکل ہی سے کی جائے گی اور شر و فساد کی وہ تمام حدیں ٹوٹ جائیں گی جن کے بعد انسانوں کی اس سرزمین پر انسان

ہی دیکھنے کو نہیں ملے گا۔

یہ آیت رزق کے معاملہ میں اللہ کی عمومی سنّت کو بتانی تھی کہ ایک خاص پیمانے سے دیا جاتا ہے۔ بعض شریر اور مفسد قوموں کے ساتھ خصوصی معاملہ کی مثالیں بھی قرآن میں موجود ہیں۔ بغیر نام لیے ایک آبادی کے بارے میں فرمایا گیا۔ جس کا اشارہ مفسرین نے اہلِ مکہ کی طرف قرار دیا ہے:۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً	اور بیان کرتا ہے اللہ بطور مثال ایک
كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا	بستی کا کہ تھی چین امن سے، چلی آتی تھی
رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ	اس کی روزی فراغت کے ساتھ ہر طرف
فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا	سے، پس ناشکری کی اس نے اللہ کے
اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ	احسانوں کی تو چکھایا اس کو اللہ نے مزا
بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ۔	بھوک اور خوف کے لباس (لپٹ جانے)
(النحل ع ۱۵)	کا، اُن کی حرکتوں کے بدلے میں۔

دوسری جگہ قوم فرعون کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

وَلَقَدْ اَخَذْنَا اٰلَ فِرْعَوْنَ	اور پکڑ لی ہم نے آل فرعون کی قحط
بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ	سالیوں اور پھلوں کی قلت میں، کہ شاید
لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ۔ (الاعراف ع ۱۶)	وہ دھیان دیں۔

یہاں یہ شبہ درست نہ ہوگا کہ قحط جیسے حالات تو طبیعی قانون ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ وہ تمام طبیعی اسباب جن کے اجتماع سے طبیعی قانون کا عمل رونما ہوتا ہو جمع نہ ہوں یا اُن کے اثر کو باطل کر دینے والا کوئی طبیعی سبب ہی حائل ہو جائے تو اس کے جو نتائج نکلیں گے وہ بھی ایک طبیعی قانون ہی کے نتائج کہلائیں گے۔ اور قحط سالی میں یہی صورت ہوتی ہے! یہ شبہ اس لیے غلط ہے کہ قرآن تو دراصل یہ حقیقت ہی اس آیت میں (اور اس جیسی دوسری آیتوں میں) کھولنا چاہتا ہے کہ وہ قحط جیسی صورتوں کے اسباب آپ سے آپ نہیں پیدا ہو جاتے ہیں بلکہ خدا اپنے اخلاقی قانون کے ماتحت اور اس کی مصلحتوں کے تحفظ کے لیے کسی قوم پر ایسے اسباب مسلّط کرتا ہے۔

پس جس طرح کچھ طبیعی اسباب رونما کر کے قحط اور سوکھے جیسی صورتوں سے کسی ملک اور قوم کو دوچار کیا جاتا ہے. اسی طرح یہ بھی ہوتا ہے اور ہوتا رہا ہے کہ زمین کی بار آوری میں مزاحم سبب کوئی نہیں اور اُسے تجربہ کی شہادت اور وعدہ الٰہی کے مطابق صحیح کوششوں کی صورت میں اپنے اوپر بسنے والے تمام جانداروں کی روزی کا کفیل ہونا چاہیے، مگر وہ نہیں ہوتی تو اب ایک کافر کا راستہ تو یہ ہے کہ وہ ملک کی آبادی گھٹانے یا اُس میں اضافہ کو محدود کرنے کی تدبیریں سوچے. لیکن مومن کا راستہ یہ نہیں ہو سکتا. اُس کا راستہ ہے خدا کو راضی کرنے کی کوشش اور اس کی نافرمانیوں سے اجتناب. وہ خدا جو ایک حقیر قطرے سے انسان بنا کر نکالتا اور ایک دانے سے سیکڑوں دانے اٹھاتا ہے، وہ بلاشبہ اس بات پر قادر ہے اور تجربہ اس پر شاہد ہے کہ سیکڑوں کی جگہ ہزاروں دانے اٹھائے" وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللهِ رِزْقُهَا کی ضمانت کا راز اسکی اسی قدرت اور زمین کو بخشی ہوئی صلاحیت میں پوشیدہ ہے۔

بہت سے علماء کا کہنا ہے کہ ضبطِ ولادت ایک طرح سے قتلِ اولاد ہی ہے اور قرآن کی نہی "لَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ" ____ (معاشی خوف سے اپنے بچوں کو قتل نہ کرو) اس پر بھی عائد ہوتی. اس رائے کو مانیے یا مت مانیے لیکن اس آیت میں صرف قتل اولاد ہی کی ممانعت نہیں ہے بلکہ یہ اصولی حکم بھی اس سے نکلتا ہے کہ معاشی خوف سے کوئی غلط کام کرنا نہیں چاہیے اور اتنی بات عام اسلامی شعور[1] کے تحت بھی مسلّم ہے کہ ضبطِ ولادت کی مصنوعی تدبیروں میں کچھ کراہت ضرور ہے، اسلامی مزاج ان سے ابا بہر حال کرتا ہے پس جب یہ کسی درجہ میں بھی ایک نامناسب اور غیر اسلامی فعل ٹھہرا تو معاشی خوف کے تحت اس کا ارتکاب اس آیت کی نہی کے ذیل میں ضرور آجائے گا اور اس صورت میں خاندانی منصو

---

[1] ہم نے تو صرف اسلامی شعور کی بات لکھی ہے لیکن دراصل یہ ہر مذہبی انسان کا شعور ہے. چنانچہ ہر مذہبی سوسائٹی اول وہلہ میں ان تدبیروں کو اپنانے سے ابا کرتی ہے. کافی معتبر ذرائع سے سننے میں آیا کہ ہمارے ایک صوبہ کے وزیر اعلیٰ کے سامنے جب صوبہ میں خاندانی منصوبہ بندی کی مرکزی اسکیم کے نفاذ کا مسئلہ آیا تو انھوں نے نفاذ کا حکم تو تحریر کیا مگر اپنے اس احساس کا بھی اظہار کیا کہ فی نفسہ وہ اسے ایک غیر انسانی فعل سمجھتے ہیں.

بندی کی تدبیر صرف ایک مکروہ کام نہیں رہے گی بلکہ ایک صریح حکم کی خلاف ورزی بھی ٹھہرے گی!۔۔
اسی آیت میں آگے فرمایا گیا ہے "نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ" (رزق تو انھیں ہم دیتے ہیں اور تمھیں بھی) "إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْأً كَبِيرًا" (ان کا قتل بڑی ہی غلطی ہے) قتل اولاد میں جس قدر شناعت ہے اُسے کس استدلال کی حاجت؟ اور اس کے سامنے اس سوال کی کیا وقعت کہ محرّک قتل کیا اور کیسا ہے؟ مگر قرآن پھر بھی یہ کہنے پر اکتفا نہیں کرتا کہ کیسی بہیمانہ حرکت کر رہے ہو۔ روزی کے خوف سے بچوں کو مار ڈال رہے ہو! وہ روزی کے خوف کی حماقت پر بھی برابر کا زور دیتا ہے اور کہنا چاہتا ہے کہ اولاد کا قتل تو جیسی بے رحمانہ حرکت ہے وہ ہے ہی یہ ذہن بھی کچھ کم قابل اصلاح نہیں ہے کہ انسان خدا کو درمیان میں سے نکال کر اپنے معاشی مسئلہ پر سوچے۔ خدا کے بغیر تو رزق کا تصور ہی غلط ہے۔ رزق تو اُتارنے والا بھی وہی ہے اور تقسیم کرنے والا بھی وہی نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ (ہم نے تقسیم کی ہے لوگوں کے درمیان ان کی گزران)۔

ہمارے اس مضمون کا نشانہ بھی دراصل یہی ذہنیت ہے کہ انسان رزق کے معاملے میں خدا کو درمیان سے ہٹا کر سوچے۔ خاندانی منصوبہ بندی یعنی تحدید نسل کے نظریہ میں فی ذاتہٖ جو قباحت دینی اور ایمانی نقطۂ نظر سے ہے اس کی وضاحت مضمون کے پہلے حصے میں کی جا چکی ہے۔ اس طرح تحدید نسل کا جو خاص طریقہ "نس بندی" کا لایا گیا ہے اُس کی ذاتی قباحتیں بھی حتی الامکان شرح و بسط کے ساتھ ظاہر کر دی گئی ہیں۔ ان بحثوں کی روشنی میں نس بندی جیسے کسی فعل کی نوعیت ایک سخت مجرمانہ عمل کی ٹھہرتی ہے، خاندانی منصوبہ بندی کا تخیل ایک ایسا تخیل قرار پاتا ہے جس کا اسلامی عقیدے کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں لگتا۔ لیکن جب اس منصوبہ سازی اور اس کے خاص طریقہ کار کو اس کے خاص محرک، معاشی خوف کے ساتھ رکھ کر دیکھا جائے تو بات صرف ایک سخت قسم کے عملی گناہ کی اور ایک منصوبہ سازی کی نہیں رہتی جسے اسلامی عقیدے کا کوئی جز رد کرتا ہے۔ بلکہ مسئلہ ایک ملحدانہ ذہنیت کا ہو جاتا ہے کہ گویا انسانی کوششوں سے اوپر رزق کا ناظم و منتظم کوئی اور نہیں ہے۔ ہمیں جو کچھ پانا ہے اپنی محنت و تدبیر سے پانا ہے اور جہاں یہ تدبیر و محنت جواب دے جائے وہاں گویا راستہ بند ہے۔ عملی کجروی اور فکر و نظر کی وہ جہدی غلط کاری

جو براہ راست کسی عقیدے سے نہیں بلکہ اس کے لوازم اور تقاضوں سے ٹکراتی ہو وہ بھی بری ہو اور بہت قابل فکر و اصلاح ہو۔ مگر وہ شکل کہ براہ راست ایک معلوم و معروف عقیدے سے ٹکراؤ ہو اور بہ زبان حال گویا اس کی نفی کا انداز پیدا ہو رہا ہو، اس کا فاصلہ اول تو بہ زبان قال انکار سے بہت ہی کم رہ جاتا ہے۔ لیکن یہ نوبت نہ آئے تب بھی ایک ملحدانہ ذہنیت جڑ پکڑ لیتی ہے اور دین و ایمان کی بات واقعی معنیٰ میں محض زبان پر رہ جاتی ہے۔

قلت رزق کی بنا پر مسلمانوں میں بھی خاندانی منصوبہ بندی کا خیال پیدا ہو جائے تو یہ اُن کے دین و ایمان کے لیے وہ آفت ہے جس کے سامنے تمام معاشی اور اقتصادی آفتیں ہیچ ہیں۔ سارے دین کی بنیاد اللہ کو "رب العالمین" ماننے پر ہے۔ قرآن کا آغاز ہی "حمدِ رب العالمین" سے ہوتا ہے۔ یعنی اللہ کی ربوبیت کا تخیل ہی وہ بیج ہے جس سے فطرت انسانی میں اللہ کی رضا جوئی کی وہ طلب رونما ہوتی ہے جس کا جواب دینی ہدایت کی شکل میں اترتا ہے اور فطرت انسانی اُسے قبول کر کے پورے معنیٰ میں حمدِ رب العالمین کا حق ادا کرتی ہے۔ رب العالمین کے مفہوم کا پہلا بنیادی جزو رزاقیت ہی ہے۔ وہ اتھاہ اور ہمہ گیر رزاقیت جس کا اظہار کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا — کوئی جاندار روئے زمین کا نہیں ہے مگر

عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا۔ (ہود ع ۱) — یہ کہ اللہ پر ہے اس کی روزی۔

قرآن اور پیغمبر قرآن نے ان اعلانات سے اس غلط فہمی کی تو کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو، رزق خوان میں لگ کر آسمان سے آئے گا۔ لیکن ایسے خدا پرستی کی اولین بنیاد ٹھہرایا ہے کہ رزق دینے والا خدا ہی کو سمجھا جائے اور کسی بھی مخلوق کی رزق رسانی سے اس کی عاجزی کا خیال دل میں نہ لایا جائے۔ کیونکہ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا، جس ذہن میں خدا "رزاق" نہیں رہے گا، اس ذہن میں اس کی پرستش کا داعیہ ہی باقی نہیں رہ سکتا۔ —— اسی طرح قرآن اور پیغمبر قرآن نے یہ سمجھنے کی گنجائش بھی نہیں دی ہے کہ سعی و تدبیر کا حق ادا کر دیا جائے تو رزق کا توڑا کبھی نہیں ہوگا، بلکہ صفائی سے جتا دیا ہے کہ بعض وقت ہر سعی و تدبیر کے باوجود رزق کے لالے پڑ جائیں گے اور کچھ بنائے

انسان سے نہ بنے گا. لیکن اس باب میں بھی عقلِ ایمانی کے لیے کامل اطمینان کا سامان یہ بتا کر دیا ہے کہ رب العالمین کا مفہوم اپنے دوسرے اجزا کے اعتبار سے بعض حالات میں بالکل یہی چاہتا ہے۔ رزاقیت کے ساتھ ان حدود کی نگہداشت بھی رب العالمین کے لیے لازم ہے جن کے تحفظ پر عالم انسانی کا قیام و استقرار موقوف ہے اور اس شمعِ ہدایت کو فروزاں رکھنا بھی اس پر لازم ہے جس سے انسان کو راہ حق نظر آئے اور زندگی اپنی اصل راہ پر چلے. چناں چہ ایک طرف وہ انسانی سرکشی کی اُن صورتوں کو لگام دینے کے لیے جن سے اس کی نظر میں بقائے انسانی کو خطرہ لاحق ہوتا ہے دوسرے طریقوں کے علاوہ بھی یہ طریقہ بھی اس کی حکمت اختیار کرتی ہے کہ ایسے مفسد گروہوں کو رزق کی مار دی جائے. علیٰ ہٰذا جو انسانی گروہ شمع ہدایت کے درپے ہوتے ہیں یا جو اس شمع ہدایت کو فروزاں رکھنے کی ذمہ داری لینے کے بعد وہ طرزِ حیات اختیار کرتے ہیں جس میں وہ خود سب سے بڑا حجاب باقی انسانیت کے لیے بن جائیں، تو دشمنانِ ہدایت کا حصار توڑنے یا غافل ذمہ داروں کو چونکانے کے لیے بھی یہ ایک طریقہ اس کی حکمت کا ہے۔

بہر حال خدائی ربوبیت کا تصور اساس دین و ایمان ہے۔ اور اس ربوبیت کا مطلب ہے وہ رزّاقیتِ مطلق جس کے فیضان میں رزّاق کی حکمت تو کبھی آڑے آتی ہے ورنہ کوئی چیز نہ اسے عاجز رکھنے والی ہے، نہ اُس کے خزانۂ رزق میں قلت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا تحدیدِ نسل کی بات جب قلت رزق کے خیال سے سوچی جانے لگے تو یہ صرف ایک جزوی غلط اندیشی نہیں رہتی بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے دین و ایمان کی بنیاد ہی کھودڈالنے میں لگ گئے. خاندانی منصوبہ بندی کی تحریک کا سب سے زیادہ خطرناک پہلو یہی ہے. جو لوگ جواز کی طرف کوئی رجحان رکھتے ہوں انھیں فقہی موشگافیوں کے بجائے اس پہلو سے بھی مسئلہ کو دیکھنے کی ضرورت ہے. مسئلہ صرف جواز و عدم جواز کا نہیں ہے۔ اس سے کہیں زیادہ خدا پرستی کی بقاء اور عدم بقاء کا ہے اور مستقبل میں اس کے دینی نتائج کا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ اس نقطۂ نظر سے سوچنے کے بعد ایسے تمام سوالات بھی ختم ہو جاتے ہیں جن کی بنیاد فقہی موشگافیوں کے بجائے عقل جدید کی وسوسہ اندازیوں پر ہو، مثلاً

وہ سوال جس کا ذکر مضمون کے پہلے حصے میں کیا جا چکا ہے کہ انسان اپنی ضرورت کے مطابق جب زرعی منصوبہ بندی کرنے کا مجاز ہے تو پھر انسانی پیدائش کے معاملہ میں کیوں قباحت پیدا ہو جاتی ہے؟ اس سوال کا جہاں ذکر آیا تھا وہاں اس کا جواب بھی دے دیا گیا تھا اور اس جواب کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا جائے تو اس میں اس اشکال کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ قدرت کی پیدا کردہ کتنی ہی اشیاء اور احوال میں انسان اپنی ضرورت کے لیے تغیر و تبدل کر کے ذرا بھی گنہگار نہیں ہوتا تو اپنے جسم میں تصرف کیوں ناجائز ہو سکتا ہے؟ ہم نے مذکورہ جواب میں کہا تھا کہ زمین اللہ نے اسی لیے بنائی ہے کہ اس سے انسان اور دیگر حیوانات کی غذائی ضرورتیں حاصل ہوں اس لیے اس تحصیلی جدوجہد میں اپنی ضرورتوں کے مطابق منصوبہ بندی کا حق بھی انسان کو ہونا چاہیے۔ اسی پر دوسری قدرتی اشیاء اور قدرتی احوال کو بھی قیاس کر لیجئے۔ یہ سب انسان کی ضرورت کے لیے بنائے گئے ہیں۔ ان کی حیثیت ایک خام مواد اور ذرائع و وسائل کی ہے۔ جنھیں ضرورت کے مطابق ڈھالنے اور ضرورت کے مطابق استعمال کرنے ہی پر ان سے پورا استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ زمین کو کھودئیے اور پانی نکالئے، اس کو جوتیے اور بیج ڈالیے، اس میں پختہ سڑکیں بنائیے۔ دریاؤں پر بند باندھیے اور اس روک تھام سے بجلی بنائیے۔ خود ساختہ نہروں میں ان کا پانی گرائیے اور اشیاء سے آگے آکر احوال کے دائرہ میں، مثلاً اپنے اندھیرے کو اجالے میں بدلیے۔ یہ سب اس لیے روا ہے کہ آپ کی ضرورت ہی کے لیے تو ان کی تخلیق عمل میں آئی ہے۔ خدا کو تو ان سے کچھ لینا نہیں! ——— پھر اس سلسلہ میں باقاعدہ اذن (AUTHORITY) بھی آپ کے پاس موجود ہے، کہ سَخَّرَ لَکُمۡ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ[ع] فرما دیا گیا ہے۔ یہ تسخیر جہاں تکوینی طور پر ہمیں یہ قدرت دیتی ہے کہ یہ سب کچھ کریں اور اشیاء و احوال کی یہ

ع اور مسخر کیا خدا نے تمہارے لیے وہ سب کچھ جو زمین و آسمان میں ہے (جاثیہ ع ۲) یعنی پوری ہی کائنات، جس میں سے وہ چیزیں جو انسان کی دسترس سے بالاتر ہوں وہ از خود ایسی بنائی گئی ہیں کہ ہماری ضرورتوں میں اپنا حصہ بغیر ہمارے تصرف اور کنٹرول کے ادا کرتی ہیں مثلاً چاند سورج وغیرہ۔

فطرت بنائی ہے کہ ہمیں اپنے اوپر قابو دیں، وہاں صاف طور سے یہ قانونی اجازت بھی اس میں پائی جاتی ہے کہ ہم اپنی ضرورت کے مطابق ان چیزوں میں تصرفات کریں۔

اس سے بھی زیادہ صاف اذن اور استعارتی یہ ہے کہ انسان کو "فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً" (زمین پر اللہ کا نائب) قرار دیا گیا ہے۔ (بقرہ۔ ع ۴) بالغرض زمینی کائنات پر تو ایک طرح کی حکمرانی کا پروانہ انسان لیے ہوئے ہے۔ اس لیے اس میں ہر وہ تصرف جائز جو انسان اپنی ضرورت سمجھے۔ لیکن کوئی چیز خود اپنے لیے نہیں پیدا ہوتی انسان کو ایک جاندار اور صاحب ارادہ مخلوق ہونے کی وجہ سے اس کی تو ضرورت تھی کہ اس کے وجود میں کچھ متحرک قوتیں اور اعضاء و جوارح رکھے جائیں مگر ان سے کام لینے یا ان میں تصرف کرنے کی آزادی کا قانونی دائرہ وہی ہوگا جسے وہ ذات (یعنی ذات الٰہی) پسند کرے جس نے انسان کو اپنے مقاصد سے پیدا کیا ہے، یا جس سے انسان کے مقصد تخلیق کو نقصان پہونچے بغیر اس کی ذاتی یا نوعی بقا میں مدد ملے۔

یہ ہر اس شک و شبہ کا مکمل جواب ہے جو جدید عقلیت اس مسئلہ میں کسی انسان کے دل میں پیدا کرتی ہو۔ مگر جیسا کہ اوپر کہا گیا، ایک مومن کے لیے یہ تمام موشگافیاں اس وقت ختم ہو جانی چاہیں جب اس کے سامنے مسئلہ کا یہ پہلو آئے کہ رزق کم پڑ جانے کے خوف سے تحدید نسل جیسی (کم از کم مکروہ) منصوبہ بندی کا ارتکاب، اور وہ بھی نس بندی جیسے غیر معمولی طریقہ سے کرنے والی قوم ہرگز خدا پرست نہیں رہ سکتی۔ اس منصوبہ بندی کا خیال ہی جب آسکتا ہے جب انسانیت کی نظر خدا کی رزاقیت سے ہٹ جائے۔ اور جب یہ خیال عمل کی شکل اختیار کرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بیج سرزمین دل سے نکال کر پھینک دیا گیا جس سے خدا پرستی کا پودا اُگتا ہے اور اس ملحدانہ ذہنیت کی پہلی اینٹ رکھ دی گئی کہ اس کائنات کا کوئی پالنہار نہیں ہے۔ یہاں انسان ہے اور اس کے اردگرد کی کائنات، اس سے اوپر کوئی ہستی نہیں جو اس کی مددگار ہو، اسے اپنے ہی بل پر اپنی زندگی کا ہفت خواں طے کرنا ہے اور سامانِ زیست کم ہوتا دکھائی دینے لگے تو پھر اپنا گلا گھونٹ کر مر جانا ہے، کہ ایک بے سہارا اور درماندہ انسان کو یہی آخری چارہ کار ہے۔

ممالک اسلامیہ کے وہ ارباب اقتدار جو صاحب ایمان ہیں مگر معاشی مسئلہ کے سلسلہ میں اس رخ پر چل پڑے ہیں، انھیں سوچنا چاہیے کہ وہ اپنی قوم کے ساتھ کیا کرنے جارہے ہیں! کیا معاشی مسئلہ کے سلسلہ میں خدا کی کتاب میں کچھ نہیں ہے؟ کیا اُس نے بسط و قدر رزق (تنگی و فراخی) کے کچھ مافوق الطبعی اصول بیان نہیں کیے ہیں؟ اور کیا وہ قوموں کے معاشی مسئلہ میں کوئی رہنمائی نہیں کرتے؟ مسلمانوں کی معاشی جدوجہد میں اُن کی رعایت کے بغیر کوئی حقیقی فلاح ممکن ہے؟

یورپ کے ماہرین معاشیات نے کہدیا کہ آبادی میں اضافہ کی فلاں شرح کسی قوم کے لیے خطرناک ہے تو ہم برتھ کنٹرول شروع کردیں۔ لیکن خدا کی کتاب ورق ورق پر سنارہی ہے کہ فلاں اخلاق وعادات اور فلاں طرز زندگی ہی کسی قوم کو مقدور بھر معاشی جدوجہد کے باوجود معاشی مصیبت میں مبتلا کرسکتے ہیں (ورنہ اللہ کے خزانۂ رزق میں کوئی کمی نہیں اور نہ اس کا جوشِ ربوبیت کسی دم ٹھنڈا ہوتا ہے) مگر ایک دفعہ ہمارے دل میں یہ عزم نہیں انگڑائی لیتا کہ قوم کو "سیلف کنٹرول" (Self Control) کی راہ دکھانا اور اُس طرزِ زندگی کے لیے مہم چلانا ہے جس پر "رِزْقِ لَا یَحْتَسِبُ"[1] کے دروازے کھلتے ہیں۔ اپنے ارضی وسائل ناکافی ہوں تو یَاْتِیْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ"[2] کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔

زمانہ کی مسموم فضا نے یہ حال کر رکھا ہے کہ آدمی ایمانداری سے مومن و مسلم ہے مگر ذہن غیر ایمانی لائنوں ہی پر دوڑتا ہے۔ اس لیے جہاں تک ہو سختی اور درشتی ٹھیک نہیں مگر آدمی کے لیے اپنے آپ سوچنے کی بات ضرور ہے کہ یہ کیسا ایمان اور اسلام ہے جس نے بالکل بنیادی معاملے میں کتاب اللہ سے آنکھ بند کر رکھی ہے! قرآن میں صرف یہی نہیں ہے کہ رزق کا معاملہ تمام تر خدا کے

---

[1] قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَمَنْ یَتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ اور جو کوئی ڈرتا ہے اللہ سے کرتا ہے وہ اس کے لیے راستہ اور روزی دیتا ہے اس کو جہاں سے اس کو خیال نہ ہو (طلاق رع ۱) [2] ... آتی ہے اس کی روزی فراغت کے ساتھ ہر جگہ سے۔ سورہ نحل کی یہ پوری آیت پیچھے گزر چکی ہے۔

ہاتھ میں بتایا گیا ہو۔ بلکہ وہ ذہن کو اور بھی صاف کرنے کے لیے جگہ جگہ "فِی رِزْقِکُمْ مِنَ السَّمٰوٰتِ" اور رَزَقَکُمْ مِنَ السَّمَاءِ کہتا ہو یعنی رزق تم ہزار زمین سے نکلتا ہوا دیکھتے ہو۔ مگر حقیقت میں وہ آسمان سے اترتا ہو اور زمین کے پردے سے تمہیں ملتا ہو۔

کہاں تک گنایا جائے اور کتنی آیتیں نقل کی جائیں؟ یہ تو قرآن کا بنیادی مضمون ہے اس سے یہ صرف نظر اور ماہرین یورپ کی تخمینی باتوں پر وہ ایمان! آخر بات کہاں جاتی ہو؟ اور الحادی افکار کے آگے ایمانی دعووں کو کہاں تک بے اثر ہونا ہو! دنیا قلت رزق کے خوف سے تھرا رہی ہو اور بزعم خود تسخیر کائنات کی چوٹیاں سر کر لینے کے باوجود انسان کو اپنے اس خوف کا کوئی مداوا سوائے اس کے نظر نہیں آرہا کہ نسل کشی کی راہ آزمائے۔ یہ تسخیر کائنات کے نشہ سے چور انسان کے منہ پر قدرت کی ایک چپت ہے۔ اور صرف ایک چپت نے اُسے زعم کبریائی سے عاجزی کی اس سطح پر اتار پھینکا ہو کہ بہ زبانِ حال اپنی بے بسی کا اعلان کرے!

——— وہ "اُمّتِ وسط" اور "خیرِ اُمّت" جس کا فریضہ تھا کہ حق نمائی سے انسان کا یہ خود فراموشانہ رُخ بدلے وہ اپنے فریضہ کی ادائیگی سے قاصر رہی اور اب خود کو اس سے بالکل عاجز محسوس کرنے لگی تھی کہ انسان کو اس نشہ سے نکالا جا سکتا ہو، بلکہ اپنا منصب فراموش کر کے اُن تماشائیوں کی شریک بن گئی تھی جو داد و تحسین کے ڈونگرے برسا رہے ہوں کہ زندگی کا مصرف ہے تو یہ ہے اور خود شناسی و کامرانی ہے تو یہ ہے۔ رحمت خداوندی کے قربان، کہ اُس نے خود بڑھ کر یہ طلسم توڑ دیا۔ اور ایک بار پھر زمین ہموار ہو گئی کہ شہادت حق بلند ہو تو کان اس پر لگیں۔ اُمّتِ مسلمہ کو وقت کی نبض پہچاننی چاہیئے اور طلسم زدہ صفوں ہی میں شریک رہ کر اب مذبوحی حرکات میں بھی ان مداریوں کی اقتدا کرنے کے بجائے وہ اسوۂ حیات دُنیا کے سامنے پیش کرنا چاہیئے جو رزق کو اس وقت زمینوں سے کھینچ نکالتا ہے جب وہ اُٹھ کے آسمانوں پر جا چکا ہو! ——— قدرت انسان کو گھیر کر لائی ہے کہ وہ آستانۂ حق پر سر جھکائے۔ اب یہ حاملانِ حق کا کام ہے کہ وہ اسے حق کا آستانہ بتائیں اور اپنے طرز حیات کی برکتوں سے اس یقین کا سامان پیدا کریں کہ اُن کی نشان دہی حق ہے اور اس حق پر سر رکھ دینے کے بعد رزق کی کوئی مشکل نہیں جو فطری تدابیر سے حل نہ ہو۔

بگڑی ہوئی ذہنیت چوٹیں کھا کر بھی اپنے آپ نہیں سنبھلتی، اس کے پاس وہ آنکھ ہی نہیں رہتی جو راہِ نجات کو دیکھ سکے۔ اس وقت انسانیت جہاں پہونچ گئی ہے وہ ایک دوراہہ ہو کہ یا تو خدا کے سامنے سر جھکا کر قلتِ رزق کے چکر سے نکلے اور یا تحدیدِ نسل کے زہراب سے زندگی کا سلسلہ مختصر کرے۔ بگڑے ہوئے مزاج کی تسخیری علت اُسے دوسرے راستہ ہی کی طرف لیے جا رہی ہو کہ اس میں بھی ایک تسخیری جد و جہد ہو اور طبیعت اسی کی خوگر ہو چکی ہو۔ یہ اب اُمتِ مسلمہ کا کام ہو کہ اُسے دوسرے راستہ پر روشنی دکھائے۔ اور اُس جنگ مغلوبی میں خدا سے نبرد آزمائی کے خلاف آگاہی دے جس کا مطلب خود کشی کے سوا کچھ نہیں۔

ہندوستان جیسے غیر اسلامی ملکوں کا مسئلہ ذرا سا مختلف ہو۔ یہاں مسلمان سب کے سب وہ طرزِ حیات اختیار کرلیں جس پر اللہ کی طرف سے ہر معاملہ میں مدد کا وعدہ ہو۔ تب بھی معاشی مسئلہ میں وہ ملک کے عام حال سے کچھ مختلف حال والے "جزیرے" نہیں پا سکتے۔ انھیں پورے ملک کے معاشی حال سے متاثر رہنا ہی پڑیگا اس لیے انھیں اپنے ساتھ ساتھ پورے ملک کو اس طرزِ حیات پر لانے کی جد و جہد کرنا ہوگی۔ ان کا کام صرف جد وجہد ہو۔ اگر اس جد وجہد کا وہ حق ادا کر دیں گے تو جسکو ہدایت ملنی ہوگی ملے گی اور جن کو نہیں ملے گی ان کے طرزِ حیات کو قانونِ خداوندی کے مطابق مغلوب ہو کر رہنا ہوگا ۔۔۔ اور خدا کے قانون میں اعتبار غالب طرزِ حیات ہی کا ہو۔ بلکہ اسکے طفیل مغلوب طرز سے وابستہ بھی اسکی برکتوں میں حصہ پاتے ہیں ۔۔۔ بہر حال راستے ان مسلمانوں کے سامنے بھی دو ہی ہیں، کہ یا تو وہ اپنے منصب کے مطابق اپنی ہم ملک اکثریت کو خدا کی رحمت کا راستہ دکھائیں، ورنہ انھیں اس حد تک اکثریت کا تابع مہمل بن کر رہنا ہوگا کہ اپنے بنیادی عقیدوں تک کے خلاف اسکی ہمرکابی اختیار کریں۔ اسکے لیے اکثریت کے کسی جبر کی بھی ضرورت نہیں ہوگی، حالات ہی کا جبر یہ کام انجام دے گا۔

ےہ۔ ہونا تو نہیں چاہیئے مگر پوری طرح غور نہ کرنے والوں سے اس شبہ کا خطرہ ہو کہ انسان کیلئے تسخیر کائنات تو خود قرآن سے ثابت ہو اور خود اس مضمون میں اس کا ذکر کیا ہو۔ پھر انسان کی تسخیری جد وجہد کو یہاں برائی کیوں ٹھیرایا جا رہا ہو؟ یہ شبہ اسلئے نہیں ہونا چاہیئے کہ قرآن میں جو آیا ہو وہ یہ ہو کہ خدا نے کائنات کو انسان کے لیے مسخر کیا ہو کہ وہ اس کے کام آئے۔ جبکہ آج کی تسخیری علت کا ذہن یہ ہو کہ ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا ہم خود اپنی طاقت سے کائناتی قوی کو مسخر کر رہے ہیں۔ چنانچہ یہ ذہن خود کو اس کائنات کا آزاد فرمانروا سمجھتا ہے، جبکہ اپنی تسخیری قوت کو من جانب اللہ ماننے والا خدا کے مقرر کردہ حدود کی پابندی کرتا اور اپنی حیثیت ایک اطاعت گزار غلام کی سمجھتا ہے۔

دوسری اور آخری قسط

مولانا سندھیؒ کا سفرِ روس ٹرکی

ظفر حسن ایبک کی آپ بیتی سے اخذ و تلخیص

(ع - س)

ترکی میں مولانا سندھیؒ کے ابتدائی چند مہینے انقرہ میں گزرے، اسکے بعد جب اکتوبر ۲۳ء میں ترک فوجوں نے استانبول بھی اتحادیوں سے واپس لے لیا تو مولانا مرحوم کا بعد کا پورا قیام استانبول ہی میں رہا۔ اگست ۲۴ء تک جب تک مسٹر ظفر حسن روس سے ترکی نہیں نہیں پہنچ گئے مولانا کی سرگرمیوں سے زیادہ باخبر نہیں رہ سکے۔ اس عرصہ سے متعلق انھوں نے مولانا کے بھتیجے عزیز احمد صاحب کے ایک خط کے حوالہ سے بس اتنا لکھا ہے کہ مولانا انقرہ کے قیام کے دوران میں ترکی کے وزیر اعظم عصمت انونو پاشا سے ملے۔ لیکن یہ ملاقات کچھ زیادہ سودمند اس لئے نہیں ہوسکی کہ مولانا یا عزیز احمد انگریزی نہیں بول سکتے تھے، اور کوئی اردو داں ترک میسّر نہیں تھا جو ترجمانی کے فرائض انجام دیتا۔ ناچار ایک عربی داں ترجمان کے واسطے سے گفتگو ہوئی مگر ترجمان کی بھی عربی سے واقفیت کم تھی۔ اور مولانا بھی اس زمانہ میں عربی بولنے پر بہت زیادہ قادر نہ تھے۔ اس وجہ سے عصمت پاشا پر مولانا کا مدعا اچھی طرح واضح نہ ہوسکا، اور صرف اتنا فائدہ ہوا کہ مولانا کو استانبول میں قیام کی اجازت مل گئی۔

اگست ۲۴ء میں ظفر حسن صاحب بھی استانبول پہنچ گئے۔ اور یہاں سے ہم مولانا کے حالات تفصیل سے سامنے آتے ہیں۔ مولانا کی قیام گاہ کے بارے میں ظفر صاحب لکھتے ہیں کہ یہ محلہ آقائے سرائے میں ایک ہندوستانی خانقاہ تھی جس کی پہلی منزل کے ایک کمرہ میں

مولانا کا قیام تھا۔ خانقاہ کے بارے میں ظفر صاحب لکھتے ہیں:۔

"یہ خانقاہ دو منزلہ ہے۔ اسکے اردگرد ایک چھوٹا سا باغ اور ایک قبرستان ہے، .... گو یہ عمارت بہت ہی معمولی نظر آتی ہے۔ لیکن اسکی تاریخی قیمت بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ یہاں سلطان ٹیپو مرحوم کا ایک کمانڈر مدفون ہے، جس کی قبر پر سر کی طرف ایک پتھر پر یہ کتبہ لکھا ہوا ہے۔

ہوالخلاق الباقی

مرحوم ومغفور

محمد امام سردار

عسکر ایلچی ٹیپو سلطان ہند

روحنہ فاتحہ

۱۲۰۲ ہجری

یہ سردار محمد امام سلطان ٹیپو شہید کے بھیجے ہوئے اُس وفد کے ایک رکن تھے جو انگریزوں کے خلاف سلطنت عثمانیہ سے اتحاد کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ سردار موصوف نے وہاں مرض طاعون میں انتقال کیا۔ اور اس خانقاہ کے باغ میں دفن کئے گئے۔

ظفر صاحب نے استانبول آکر محلہ "سرکہ جی" میں قیام کیا تھا جو ہندوستانی خانقاہ سے دور تھا مولانا کے ایما پر ظفر صاحب نے "محلہ فاتح" کے ایک ہوٹل "رشادیہ" میں قیام اختیار کیا جو نسبتاً کم فاصلے پر تھا۔ اس زمانہ میں مولانا نے ہندوستان کی قومی تحریک کے لئے ایک پروگرام مرتب کرنا شروع کیا تھا، جسے آزاد ہندوستان کا دستور اساسی بھی کہا جا سکتا ہے، اس میں ظفر صاحب ان کے خاص مددگار رہے۔

لالہ لاجپت رائے کا سفر ترکی

ظفر صاحب نے لکھا ہے کہ ان کے ترکی پہنچنے سے قبل کانگریسی لیڈر لالہ لاجپت رائے بھی استانبول پہنچے تھے، اور مولانا سے بھی ملے تھے ۱۹۲۴ء میں جب ہندو مسلم فسادات کی خبر مولانا کو پہنچی جس سے تحریک خلافت کا ہندو مسلم اتحاد تباہ ہو کر رہ گیا تھا تو مولانا نے خیال ظاہر کیا کہ اس میں لالہ لاجپت رائے

کا دخل ہے کیونکہ ان سے جب مولانا نے روسی وزیر خارجہ چیچرن سے اپنی بات چیت کا ذکر کیا جس میں افغانستان کو بیچ کی کڑی بنانا طے کیا گیا تھا تو افغانستان کا نام سن کر لالہ جی بہت سیخ پا ہوئے تھے۔ انھیں ہندوستان کی آزادی میں ایک مسلمان ملک کا دخل پسند نہیں آیا تھا۔ مولانا کا خیال تھا کہ اس اسکیم کو تباہ کرنے ہی کے لئے لالہ لاجپت رائے اور ان کے سیاسی گرو پنڈت مدن موہن مالوی نے ہندو مسلم افتراق کی داغ بیل ڈالی۔

کانگریس لیڈروں سے رابطہ کی کوشش

ظفر صاحب نے نہیں لکھا لیکن قیاس یہ ہے کہ لالہ لاجپت رائے سے یہ گفتگو مولانا نے اس مقصد سے کی ہو گی کہ وہ جاکر کانگریسی لیڈروں سے اسکی منظوری حاصل کریں تاکہ سوویت گورنمنٹ سے باقاعدہ معاہدہ ہو سکے۔ مگر ظاہر ہے کہ لالہ لاجپت رائے یہ کام کیونکر انجام دے سکتے تھے۔ ایسی ہی ایک ناکام کوشش مولانا نے اور کی۔ اس میں رابطہ کا ذریعہ مسٹر عبدالرحمٰن صدیقی بنائے گئے تھے جو اسی زمانہ میں استانبول آئے۔ ظفر صاحب نے لکھا ہو کہ مولانا نے صدیقی صاحب کو چیچرن سے اپنی گفتگو بتائی اور کہا کہ وہ پوری بات ڈاکٹر انصاری صاحب کو پہنچا دیں۔ صدیقی صاحب کو واپسی کے لئے سفر خرچ کی ضرورت تھی اسکے لئے بھی سو پونڈ مولانا نے روسی قنصل خانہ سے حاصل کر کے صدیقی صاحب کو دیے۔ مگر کچھ ہی دن بعد جب خود ڈاکٹر انصاری صاحب خلافت کمیٹی کے نمائندہ کی حیثیت سے استانبول آئے تو پتہ چلا کہ عبدالرحمٰن صدیقی نے بھی انھیں کچھ نہیں بتایا۔

افسوس ہو کہ کتاب سے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ خود ڈاکٹر انصاری صاحب سے گفتگو کا نتیجہ کیا نکلا اور انھوں نے روسی حکومت سے مولانا کی قرارداد پر کیا رائے ظاہر کی۔

رؤف بک سے ملاقات اور انٹرنیشنل مسلم یونیورسٹی کا خواب

ترک لیڈروں میں عصمت پاشا (وزیر اعظم) سے مولانا کی ملاقات ظفر صاحب کی غیر موجودگی میں ہوئی تھی — ظفر صاحب کے ترکی آجانے کے بعد مولانا کی ملاقات سابق وزیر اعظم رؤف بک سے ہوئی، یہ ۱۹۲۶ء ہی کی بات ہے۔ ۱۹۲۴ء میں مصطفیٰ کمال پاشا نے خلافت ختم کر دی اور اس بڑی تبدیلی کے بعد وزارت عظمیٰ کا عہدہ رؤف بک کے بجائے

عصمت پاشا کو ملا۔ رؤف بک اور جنرل کاظم قرہ بک پاشا نے حزب ترقی پرور جمہوریت خلق پارٹی کے مقابلہ میں جمہوریت ترقی پرور پارٹی قائم کی۔ ظفر صاحب نے لکھا ہے کہ " یہ پارٹی پرانی ترکی روایات کو قائم رکھنے کی طرفدار تھی۔ اگرچہ بظاہر اس نے خلافت اسلامیہ کے ترکی سے ہٹائے جانے کو منظور کر لیا تھا، لیکن ان تمام اصلاحات کے برخلاف تھی جو جمہوریت خلق پارٹی ملک میں ہر روز جاری کر رہی تھی۔"

عبدالرحمٰن پشاوری جو مولانا کے زمانہ قیام کابل میں ترکی سفیر تھے وہ ان دنوں سفارت سے واپس آکر استانبول میں رؤف بک کے ہی پاس مقیم تھے۔ اور مولانا کے پاس ان کی آمد و رفت تھی۔ مولانا نے ان کو رؤف بک سے ملاقات کا وسیلہ بنایا۔ ملاقات میں جنرل کاظم قرہ بک پاشا بھی موجود تھے۔ مولانا کا منصوبہ یہ تھا کہ ان ترک لیڈروں کو ایک انٹرنیشنل مسلم یونیورسٹی استانبول میں قائم کرنے پر آمادہ کریں، تاکہ الغائے خلافت کے بعد رابطہ عالم اسلامی کا جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ کسی حد تک پُر ہو جائے۔ ظفر صاحب جو اس ملاقات میں موجود تھے لکھتے ہیں:۔

قبلہ مولانا صاحب نے رؤف بک کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ وہ اپنی پارٹی کے پروگرام میں استانبول میں ایک انٹرنیشنل مسلم یونیورسٹی کے قیام کو بھی داخل کر لیں۔ (لیکن) رؤف بک نے اس تجویز کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ اگر ایسی تجویز انھوں نے اپنی پارٹی کے پروگرام میں داخل کی تو جمہوریت خلق پارٹی جو ان کی پارٹی پر پہلے ہی قدامت پسندی کا الزام لگا رہی ہے ان پر اتحاد اسلام اور پرانی روایتوں کو پھر زندہ کرنے کی تہمت لگائے گی۔ اور اس طرح ان کی پارٹی کو ترکی تعلیم یافتہ طبقہ کی نگاہ سے گرا دے گی۔" (صہ ۹۴)

ظفر صاحب مولانا پر اس جواب کا اثر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

" قبلہ مولانا صاحب نے یہ جواب سن کر اس ملاقات کو اور طول دینا مناسب نہیں سمجھا...... ان کو رؤف بک کے اس جواب سے اتنی مایوسی ہوئی کہ میں نے عمر بھر کبھی اتنا ناامید نہ دیکھا تھا۔..............................

...... میں ان سے جدا ہو کر شام کو اپنے ہوٹل چلا گیا اور رات بھر اس سوچ میں

لگا رہا کہ قبلہ مولانا صاحب (مرحوم) کو میں کس طرح تسلی دوں۔ لیکن اگلے روز جب میں پھر ان سے ملا تو میں نے دیکھا کہ ان کی طبیعت میں ذرا سکون آگیا ہے اور انھوں نے خدائے لایزال کے کرم سے اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے کوئی نیا راستہ پانے کی امید پر سہارا لگا لیا ہے۔"

آزاد ہندوستان کا دستور اساسی

مولانا نے آزاد ہندوستان کا جو دستوری ڈھانچہ اور اس کیلئے ایک سیاسی پروگرام مرتب کرنا شروع کیا تھا وہ ۱۹۲۴ء ہی میں تکمیل کو پہنچ گیا۔ یہ اُردو میں لکھا گیا تھا اور پھر انگریزی اور ترکی دو زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا گیا۔ ترکی ترجمہ کا مقصد یہ تھا کہ ترک حکومت کا محکمہ خارجہ مولانا کی سیاسی سرگرمیوں کے اندازہ سے آگاہ ہوسکے۔ اور کسی قسم کے بے اطمینانی مولانا اور ان کے ساتھیوں کی طرف سے نہ رہے۔ انگریزی کی ضرورت ہندوستان کے لئے بھی تھی اور شاید روسی حکومت کے لئے بھی اس کی ضرورت محسوس کی گئی ہوگی۔ بہرحال یہ سیاسی پروگرام یا دستور اساسی پہلے اُردو میں چھاپا گیا۔ یہ استانبول (قسطنطنیہ) کے محمود بے پریس کے ذریعہ ۱۹۲۴ء ہی میں چھپ کر تیار ہوگیا۔

غلام ہندوستان میں ضبطی

اس مطبوعہ پروگرام کو مولانا ہندوستان بھیجنا چاہتے تھے۔ اس کا محفوظ طریقہ ان کی نظر میں یہ تھا کہ دستی بھیجا جائے۔ مگر اس کام کے لئے جو روپیہ مولانا نے روسی قنصل خانہ سے حاصل کیا تھا وہ مولانا کی قیام گاہ سے چوری ہوگیا۔ مجبوراً کم خرچ یعنی ڈاک کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ جس کی وجہ سے مرسل حضرات کو یہ تو پتہ نہیں چل سکا کہ یہ کسی کو پہنچا یا نہیں البتہ ہندوستان میں اس کی ضبطی کا حکم ان کے علم میں آیا۔ اس کے متعلق ظفر صاحب نے اخبار زمیندار اور ریاست (مورخہ ۱۰ر مئی ۱۹۲۵ء) کے تراشے اپنی کتاب میں دیئے ہیں، جن میں حکومت ہند کی طرف سے اس رسالہ کی ضبطی کا اعلان کیا گیا ہے۔

سیاسی پروگرام کے خطوط

کتاب میں مطبوعہ پروگرام کا سرورق اور آخری صفحہ نقل کیا گیا ہے۔ پروگرام کے مقاصد

کا خلاصہ ظفر صاحب نے چار نکات میں بیان کیا ہے۔

۱۔ ہندوستان کے لئے کامل آزادی حاصل کرنا اور آزاد ہندوستان میں ایک وفاقی (FEDERAL) نظام حکومت قائم کرنا۔

۲۔ ہندوستان میں مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کو محفوظ کرنا۔

۳۔ وسیع معنی میں "محنت کش" طبقے کی اکثریت رکھنے والی حکومت قائم کرنا، اور زمینداری و سرمایہ داری کو ملک سے ختم کر دینا تاکہ کمیونزم کو اثراندازی کا موقع نہ ملے۔

۴۔ امپیریلزم کا توڑ کرنے کے لئے ایشیاٹک فیڈریشن بنانا۔

"سرودراجیہ پارٹی" ان مقاصد کے لئے کوشش کرنے کے واسطے پروگرام میں ایک پارٹی کا قیام بھی تجویز کیا گیا تھا جس کا نام "بھارت سرودراجیہ پارٹی" طے کیا گیا تھا، یعنی "سب کا راج" قائم کرنے والی پارٹی۔

پارٹی کی ممبرشپ پارٹی کے ممبروں کے لئے شرط لگائی گئی تھی کہ وہ اپنے معیار زندگی کو ملک کے کسانوں کے معیار سے بلند نہ کریں گے، یعنی اتنی ہی آمدنی پر گزارہ کریں گے جتنی کہ ایک اوسط درجہ کے کسان کی ہوتی ہے۔

پارٹی کے پروگرام کا خلاصہ ظفر صاحب نے ص ۱۰۰ سے ص ۱۰۲ تک حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

"نظام توافق:۔

پارٹی ہندوستان کو ایک ملک فرض نہ کرے گی اور نہ ہندوستان میں واحد قومیت کو پیدا کرنے کی کوشش کو اساس آزادی مانے گی۔ بلکہ ملک میں نظام توافق (فیڈرل سسٹم) پر حکومت قائم کرے گی جس کے لئے مندرجہ ذیل طریقہ اختیار کیا جائے گا۔

جغرافیائی حیثیت سے ہندوستان شمال مغربی، مشرقی اور جنوبی تین قدرتی حصوں سے متشکل ہونے کی وجہ سے ان حصوں کو ایسے صوبوں میں تقسیم کیا جائے جہاں ایک ہی زبان بولی جاتی ہو اور جہاں ایک ہی قسم کے رسم ورواج اور ایک ہی تمدن رکھنے والے لوگ آباد ہوں۔ ان صوبوں کو بعد میں ایک (جمہوری ملک)

قرار دیا جائے گا جس کی جمہوری حکومت کو معاملات خارجہ، معاملات جنگ اور خارجی تجارت کے سوا اپنے تمام امور پر اختیار حاصل ہوگا (مثلاً اس طرح شمالی مغربی ہندوستان، مشرقی پنجاب، مغربی پنجاب، صوبہ سرحد، کشمیر، سندھ، بلوچستان اور گجرات، جیسے جمہوری ملکوں میں تقسیم ہو جائے گا) مشرقی اور جنوبی ہندوستان بھی اسی طرح کے جمہوری ملکوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

یہ جمہوری ملک مرکزی وفاقی (فیڈرل) حکومت ہند میں شامل ہونے سے پہلے اگر چاہیں تو اپنے تمدن اور رسم ورواج کی وحدت کی بنا پر باہم مل کر متحدہ ایک وفاقی نظام میں منسلک ہو سکتے ہیں مثلاً مغربی پنجاب، صوبہ سرحد، کشمیر، سندھ بلوچستان آپس میں مل کر اور ایک وفاقی نظام بنا کر مرکزی حکومت ہند میں شامل ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح مشرقی اور جنوبی ہند کی جمہوری حکومتیں اگر چاہیں باہم مل کر، مرکزی حکومت میں داخل ہو سکتی ہیں۔

مجلس قانون ساز

ان جمہوریتوں میں ہر عاقل بالغ مرد اور عورت کو حق انتخاب دیا جائے گا۔ لیکن ہر اجتماعی طبقہ (SOCIAL CLASS) یعنی کسان، مزدور، دماغی کام کرنے والے لوگ، تاجر اور کارخانہ دار مجلس قانون ساز میں اپنی آبادی کے تناسب سے اور اپنے ہی طبقہ سے نمائندے چنے گا اس طرح ان جمہوریتوں کی پارلیمنٹ میں کسان، مزدور اور دماغی کام کرنے والے لوگوں کی اکثریت ہوگی اور یہ مجلس محنت کشوں کے مفاد کی حفاظت کر سکے گی۔

اقتصادی اور سماجی بنیادی اصول

نوائد ہدامہ کے تمام ذرائع قومی ملکیت میں دیدیئے جائیں گے۔ انفرادی و ذاتی ملکیت (منقولہ اور غیر منقولہ) محدود کر دی جائے گی (یعنی معین حد سے زیادہ

جائداد اور مال قومی ملکیت ہوگا)

مال داروں پر سپر ٹیکس لگایا جائے گا جس کی آخری حد (۵۰) فیصدی ہوگی۔

ملک کی زمینیں قومی ملکیت قرار دی جائیں گی اور نظام زمینداری منسوخ کردیا جائے گا (ان جمہوریتوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی پارٹی فاروق اعظم کے فیصلہ کے مطابق زمینداروں کو زمین کی ملکیت چھوڑنے پر اور امام ابو حنیفہ کے فیصلہ کے مطابق مزارعۃ چھوڑنے پر مجبور کرے گی۔)

ہر کاشتکار خاندان کو اس قدر زمین ضرور دی جائے گی جس قدر کہ وہ خود کاشت کرسکے۔

سودی لین دین بالکل ختم کر دیا جائے گا اور محنت کش طبقہ کے پرانے قرض بے باق کردیئے جائیں گے۔

قومی ملکیت میں دیئے ہوئے کارخانوں کو مزدوروں کی انجمنوں کے ذریعہ چلایا جائے گا اور مزدوروں کو نفع میں سے حصہ دیا جائے گا۔

محنت کش طبقہ کو مفت طبی امداد دی جائے گی اور اسکے لئے صاف ستھرے گھر مہیا کئے جائیں گے۔

ابتدائی اور مڈل اسکولوں کی تعلیم مجبوری (جبری) اور مفت ہوگی۔

داخلی تجارت کوآپریٹیو (COOPERATIVE) سوسائٹیوں کے ہاتھوں میں ہوگی لیکن سوداگران کوآپریٹیو سوسائٹیوں میں داخل ہوکر ان کے ممبر بن سکیں گے۔

خارجی تجارت مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہوگی۔

ہر ایک جمہوریت اپنی اکثریت کے مذہب کو اپنا اسٹیٹ مذہب قرار دے سکتی ہے، بشرطیکہ وہ مذہب پارٹی کے مندرجہ بالا اقتصادی اور اجتماعی اصولوں کا مخالف نہ ہو۔

....

مرکزی حکومت وفاقی جمہوریت

CENTRAL GOVT. OF THE FEDERATED

REPUBLICS OF INDIA

مرکزی حکومت ہند کا مذہب سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اور نہ اس کو ان مذاہب میں دخل دینے کا حق ہوگا جو پارٹی کے مندرجہ بالا اقتصادی اور اجتماعی اصولوں کو مانتے ہیں (یعنی مرکزی حکومت ایک لادینی حکومت ہوگی۔)

مرکزی حکومت خارجی اور جنگی معاملات اور خارجی تجارت اپنے ہاتھ میں رکھے گی۔

مختلف جمہوریتیں مرکزی حکومت میں اپنے تناسب آبادی، اقتصادی، تمدنی اور فوجی اہمیت کی بنا پر حق نمائندگی حاصل کرینگی۔

بین المللی تعلقات

امپیریالزم کو توڑنے اور ایشیا میں مندرجہ بالا اصولوں پر آزاد حکومتیں قائم کرنے کے لئے ایشیاٹک فیڈریشن بنائے جائے گی جس میں روس کو بھی شامل کیا جائے گا۔"

ترمیم شدہ انگریزی ترجمہ ہندوستان میں اس رسالہ کی ضبطی کی اطلاع ملنے کے بعد مولانا نے اسکے انگریزی ترجمہ میں تھوڑی سی تبدیلی کرائی تاکہ اسے ہندوستان بھیجا جائے تو وہ ضبطی کے اس حکم کے ماتحت نہ آسکے سنہ ۲۶ء میں اسے طبع کراکے دستی ذرائع سے ہندوستان بھیجا گیا۔ جس کے متعلق ظفر صاحب لکھتے ہیں کہ اس کی ضبطی کی کوئی اطلاع ہمیں آج تک نہیں ملی۔ لیکن یہ بھی نہ معلوم ہوسکا کہ وہ کہاں کہاں پہنچا۔

حجاز کو روانگی سنہ ۲۶ء ہی میں مولانا کو ہندوستانی اخبارات سے اطلاع ملی کہ اس

سال حج کے موقع پر مکہ مکرمہ میں مؤتمر اسلامی منعقد ہو رہی ہے[۱]۔ مولانا نے اس کی شرکت کا قصد فرمایا۔ لیکن سفر بہت مشکل تھا، مصر کا راستہ جو سیدھا تھا اس پر انگریز قابض تھے۔ مجبوراً اٹلی کا راستہ طے کیا اور سٹراقیال بیدائی کے ذریعہ اطالوی حکومت کا ویزا حاصل کرنے میں بھی کامیابی ہو گئی۔

مولانا ۵ر جون ۱۹۲۶ء کو استانبول سے اٹلی روانہ ہوئے۔ خیال تھا کہ کوئی اطالوی جہاز براہ راست بصرہ جانے کے لئے مل جائے گا۔ مگر وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ براہ راست کوئی اطالوی جہاز نہیں جاتا۔ نتیجہ میں اتنا وقت مولانا کو جدہ پہنچنے میں لگ گیا کہ حج اور مؤتمر میں شریک نہ ہو سکے۔ مولانا جب پہنچے تو ہندوستانی حج اور نمائندگان بھی واپس ہو چکے تھے۔ اور مولانا کی ساری حسرت دل میں رہ گئی تھی۔

ظفر حسن ایبک کی زبانی ہندوستان کے ایک عالی دماغ اور درویش مزاج مجاہد کی حسرتوں بھری کہانی یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ پوری کہانی جہاں اُن کے عزم و ثبات اور مجاہدانہ صفات کی آئینہ دار ہے وہاں آزاد ہندوستان کے لئے اُن کے ذہن کا دستوری خاکہ تدبر کی ایک درخشاں مثال۔ اس خاکہ کے پہلو میں ظفر صاحب نے مولانا کا جو ایک فوٹو دیا ہے اُسے دیکھ کر بے اختیار منہ سے نکلتا ہے ؎

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

آزاد ہندوستان کے لئے مولانا کا سیاسی خاکہ جسے ہم نے صرف نقل کر دیا ہے، دراصل ایک تشریحی مضمون کا طالب ہے۔ ان تشریحات ہی سے یہ بات پوری طرح روشنی میں آسکتی ہے کہ مولانا نے ہندوستانی تنوع کے مختلف اور متضاد پہلوؤں کے درمیان اپنے پیش نظر مقاصد کو کس قدر بلند تدبر کے ساتھ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہندوستان کے موجودہ سیاسی خلفشار کے سلئے بھی اس سے بہت کچھ رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ ضرورت ہے کہ اہل نظر اسے تبصرہ وتحلیل کا موضوع بنائیں۔

[۱] وہ معرکہ آرا موتمر جس میں وفد خلافت اور وفد جمعیۃ وغیرہ شریک ہوئے تھے

موجودہ قیمت 3-75

Regd. No. L-353

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow

VOL. 36 NO. 1 APRIL 1968

[صفر ۱۳۸۸ھ]

مرتبہ

عتیق الرحمٰن سنبھلی

مجلد ۵، قیمت 5-00

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۵۰/۷
پاکستان سے ۵۰/۷
ششماہی
ہندوستان سے ..... -/۴
پاکستان سے ..... -/۴

فی کاپی ......۷۰ پیسے

جلد ۳۶ | بابت ماہ صفر المظفر ۱۳۸۸ھ مطابق مئی ۱۹۶۸ء | شمارہ ۲

اگر اس دائرہ میں سرخ نشان ہو تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ مئی تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع نہ دیں۔ نئے خریدار بھی اسی طریقہ سے چندہ ارسال فرمائیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۱۵ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں، اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

آزاد ہندوستان میں بیس سال ایک مضبوط حکومت رہی، پھر بھی مسلمانوں کے معاملہ میں لاءاینڈ آرڈر کی حالت ایک نہایت کمزور حکومت کے لاءاینڈ آرڈر سے مختلف نہیں تھی۔ آج ہندوستان میں حکومت کا ادارہ واقعۃً کمزوری اور بے یقینی کی حالت سے دوچار ہو تو مسلمانوں کے لیے عدم تحفظ کا مسئلہ جس درجہ کو بھی پہونچ جائے کم ہے۔

اس نئے دور میں عدم تحفظ کا سب سے زیادہ شکار بہار کے مسلمانوں کو ہونا پڑا۔ اور اب معلوم ہوتا ہے کہ یو، پی کی باری ہے۔ یو، پی میں صدر راج چل رہا ہے، مگر اس کے الہ آباد جیسے شہر میں جو نہرو، شاستری اور اندرا ــــ سابق اور موجودہ وزرائے اعظم ــــ کا وطن ہے اور جس کے خیال سے وزیر اعظم اندرا بہت تیزی سے الہ آباد پہونچ گئی تھیں، جس آزادی کے ساتھ غارت گری، آتش زنی اور چھرے بازی کا بازار ایک مہینے تک گرم رہا وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ شہری حکام حکومت کی کمزوری اور بے یقینی کی طرف سے اس درجہ مطمئن ہیں کہ صدر راج بھی ان کے اس اطمینان میں خلل نہیں ڈال سکا ــــ انتظامیہ کی نچلی سطح پر اس کیفیت کے ساتھ جب ان تقاضوں کو بھی دیکھئے جو ہندو راشٹر کا خواب دیکھنے والوں کو اُکسا رہے ہیں کہ وہ اپنے منصوبہ کی رفتار تیز کر دیں تو یہ اندیشہ کچھ غیر حقیقی نظر نہیں آتا کہ نہ صرف یو، پی بلکہ پتہ نہیں کہاں کہاں مسلم دشمنی کی آگ تیزی سے نمودار ہوا چاہتی ہے۔ اور اس آگ کو اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کا موقع مل گیا تو مسلمانوں کا مسئلہ کس درجہ اور پیچیدہ ہو جائے گا۔

اس صورت حال میں زندہ رہنے کی شرط اول یہ ہو کہ مسلمان خطرہ کے مقابلے میں متحد ہوں، وہ ایک مربوط اور منظم زندگی بسر کریں، ان حالات سے عہدہ برآ ہونے کیلئے جن مختلف صلاحیتوں کی ضرورت ہو وہ ایک تنظیم کے ساتھ بروئے کار آئیں، ایک قیادت ہو جو مختلف افراد اور متنوع صلاحیتوں میں تنظیم و ترتیب کا فرض انجام دے۔ یہ سب ضروری اور انتہائی ضروری ہو۔ اس میں جتنی دیر ہوگی اتنی ہی ہلاکت خیز ہوگی۔ لیکن اسکے لیے ایک واضح اسکیم کی بھی ضرورت ہو، جس سے مطلوبہ نتائج کا سرا ملتا ہوا نظر آتا ہو۔ ورنہ مجرد تنظیم کسی مرض کی دوا نہیں۔ یہ ایک جسد بے روح ہوگی جو کسی خطرہ کا علاج نہیں بن سکتی۔

واضح اسکیم کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اس بات کا واضح شعور ہونا چاہیئے کہ ہم کس طریق کار کے ذریعہ موجودہ حالات سے عہدہ برآ ہونا چاہتے ہیں، ہماری تنظیم کن خطوط پر سرگرم عمل ہوگی، ان سرگرمیوں (ان سرگرمیوں (Actions) کا کیا اثر ہمارے ماحول پر پڑے گا۔ اور کیونکر ہمارے مطلوبہ نتائج اس تنظیم اور طریقہ کار سے حاصل ہوں گے؟

عرب اور اسرائیل کی ایک تازہ مثال ہمارے سامنے ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف تیاری کی۔ برسوں اپنے آپ کو منظم کرتے رہے، طاقت جمع ہوتی رہی۔ لیکن اسرائیل کی جنگی تنظیم اور تیاری حالات کے گہرے جائزے کے ساتھ تھی، عالمی ماحول کے اچھے اور برے رد عمل کی نزاکتوں پر اس کی نظر تھی، عربوں یا جس کسی کو بھی صرف تنظیم اور تیاری سے دلچسپی تھی، حالات کا تقابلی جائزہ گویا مفقود تھا اور عالمی ماحول کی رعایت سے ان کی قولی اور عملی سرگرمیوں کو جیسے کوئی واسطہ نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عرب میدان جنگ میں بھی ہارے اور برسرحق ہونے کے باوجود دنیا میں ملزم قرار پائے کہ یہ اسرائیل کے خلاف جارحانہ عزائم رکھتے تھے، اسرائیل نے تیاری سے لے کر عمل تک جو کچھ کیا وہ مدافعانہ کارروائی تھی۔ اقوام متحدہ میں عربوں کے دوستوں کی آواز پست تھی، وہ عالمی رائے عامہ کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے، وہ عربوں کا مقدمہ اس طرح نہیں لڑ سکے جیسے ایک مضبوط مقدمہ لڑا جاتا ہے۔ وہ کھلے طور پر ایک کمزور مقدمہ کے وکیل نظر آتے تھے۔ حالانکہ حقیقت کے اعتبار سے مقدمہ بیحد جاندار تھا۔

یہ فرق ہے ایک باشعور تنظیم کا اور ایک بے شعور تنظیم کا! تنظیم دونوں طرف تھی، مگر ایک طرف مجرد تنظیم جس میں اپنے قدم کے آگے نگاہ نہیں تھی، دوسری طرف وہ تنظیم جو چار آنکھوں سے دیکھتی ہے۔ آگے بھی دیکھتی ہے پیچھے بھی دیکھتی ہو۔ دائیں بھی دیکھتی ہو، بائیں بھی دیکھتی ہو۔ اپنے تحفظ کی صلاحیت کا بھی اطمینان کرتی ہے اور اس صلاحیت کا بھی، کہ کم سے کم نقصان اٹھائے بغیر وہ زیادہ سے زیادہ منزل طے کر سکتی ہے۔ جس تنظیم میں یہ وصف نہ ہو وہ عربوں کے جیسے موافق حالات میں بھی کارگر نہیں ہوتی۔ اور یہ وصف موجود ہو

تو اسرائیل کے جیسے ناموافق حالات میں بھی عجیب و غریب کام دیتی ہے۔ عرب نہ صرف یہ کہ اپنی تنظیم کی اس خامی کی وجہ سے اسرائیل کا کچھ بگاڑ نہیں سکے بلکہ بیس برس کی بے تنظیمی میں جتنا کھویا تھا اس سے کہیں زیادہ اور کھو بیٹھے۔ یہ بات صرف جنگی تنظیم کے لیے ہی درست نہیں ہے بلکہ مقابلہ کی تنظیم خواہ وہ جنگی ہو یا غیر جنگی دونوں میں مطلوبہ نتائج کا حصول اس بات پر موقوف ہے کہ موافق و ناموافق حالات پر گہری نظر کے ساتھ ایک واضح اور مرتب منصوبہ اس تنظیم کے اندر کام کر رہا ہو۔

مسلمانان ہند خصوصاً شمالی ہند کے مسلمانوں کا سابقہ بہت پیچیدہ حالات سے ہے۔ یہاں اپنے سیاسی، سماجی یا جانی، مالی اور اقتصادی و معاشی تحفظ کے لیے ان کا ہر قدم بہت غور و فکر پر مبنی ہونا چاہیے۔ انھیں حرکت اور تنظیم کی ضرورت اور شدید ضرورت ہے۔ مگر اس سے زیادہ ضرورت فکر و نظر کی ہے۔ فکر و نظر کی روشنی کے بغیر اگر قدم اٹھائے جائیں گے تو ہر تھوڑے عرصہ کے بعد ہمیں نظر آئے گا کہ حالات کی دشواریاں سے ہم وہیں پہونچ گئے ہیں جہاں سے چلے تھے۔ اور پھر شاید یہ عزم سفر بھی باقی نہ رہے گا جو آج موجود ہے۔

مسئلہ تو بہت تفصیل طلب ہے مگر تفصیل میں جائے بغیر یہ مختصر بات اس محدود جگہ میں بھی کہی جا سکتی ہے کہ مقابلہ کی تنظیموں کے جو نظریات لوگوں کے ذہن میں آ رہے ہیں ان کے کارگر ہونے کے لیے موجودہ ہندوستان میں کوئی واضح گنجائش نہیں ہے۔ البتہ دینی تنظیم وہ ایک واحد طریقہ ہے جس کے لیے اس ملک میں پوری گنجائش موجود ہے۔ اور یہ تنظیم جس میں جذبات کی فوری تسکین کا سامان نہیں ہے، مسئلہ کو صرف اُس حد تک نہیں حل کر سکے گی جو ہمارا انتہائے مقصود بن گیا ہے۔ بلکہ اس حد تک حل کرنے کی طاقت اس میں پائی جاتی ہے جو ہمارا انتہائے مقصود ہونا چاہیے۔ ہم فوری دوا چاہتے ہیں جو نایاب ہے، کاش ہم کچھ صبر سے کام لیکر وہ دوا شروع کریں جو ہمارے گھر میں موجود ہے اور ہمارے مقصود سے زیادہ ہمیں دے سکتی ہے۔

حضرت مولانا نعمانی مدظلہ سفر حج سے واپس آ گئے ہیں۔ اس سفر سے متعلق کچھ لکھنے کا بھی مولانا کا ارادہ ہے جو انشاء اللہ آئندہ اشاعت میں پیش کیا جائے گا۔

کتاب الاذکار والدعوات

معارف الحدیث

(مسلسل)

جامع اور ہمہ گیر دُعائیں :- (۲)

اس عنوان کے تحت چند حدیثیں گزشتہ اشاعت میں پیش کی جا چکی ہیں

اُن سے آگے آج درج کی جا رہی ہیں

عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
عَلَّمَهَا هٰذَا الدُّعَاءَ اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَسْأَلُكَ مِنَ الْخَيْرِ
كُلِّهٖ عَاجِلِهٖ وَاٰجِلِهٖ مَا عَلِمْتُ مِنْهُ وَمَا لَمْ اَعْلَمْ وَاَعُوْذُبِكَ
مِنَ الشَّرِّ كُلِّهٖ عَاجِلِهٖ وَاٰجِلِهٖ مَا عَلِمْتُ مِنْهُ وَمَا لَمْ
اَعْلَمْ اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَا سَأَلَكَ مِنْهُ عَبْدُكَ
وَنَبِيُّكَ، وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا اسْتَعَاذَ مِنْهُ عَبْدُكَ وَنَبِيُّكَ
اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَسْأَلُكَ الْجَنَّةَ وَمَا قَرَّبَ بِنْهَا مِنْ قَوْلٍ
وَعَمَلٍ، وَاَعُوْذُبِكَ مِنَ النَّارِ وَمَا قَرَّبَ اِلَيْهَا مِنْ قَوْلٍ
وَعَمَلٍ، وَاَسْأَلُكَ اَنْ تَجْعَلَ كُلَّ قَضَاءٍ تَقْضِيْهِ لِیْ خَيْرًا۔

(رواہ ابن ابی شیبہ وابن ماجہ)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے مجھے یہ جامع دعا تعلیم فرمائی اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَسْأَلُكَ من الخیر کلہ ....

لہ ۱۰ رمضان ۸۸ھ جنوری ۶۹ء

.... تا ..... كل قضاء تقضيه لى خيراً" (یعنی اے اللہ میں تجھ سے ہر قسم کی خیر اور بھلائی مانگتی ہوں، دنیا کی خیر بھی اور آخرت کی خیر بھی، وہ خیر بھی مانگتی ہوں جس کو میں جانتی ہوں اور وہ بھی جس کو میں نہیں جانتی اور میں تیری پناہ چاہتی ہوں ہر قسم کے شر اور برائی سے، دنیا کے بھی شر سے اور آخرت کے بھی شر سے، اُس شر سے بھی جس کو میں جانتی ہوں اور اس سے بھی جس کو میں نہیں جانتی۔ اے میرے اللہ تیرے خاص بندے اور پیارے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جس جس خیر کا بھی تجھ سے سوال کیا میں تجھ سے اُسکی سائل ہوں اور جس جس شر سے انھوں نے تیری پناہ چاہی اے اللہ میں بھی اس شر سے تیری پناہ چاہتی ہوں۔ اے اللہ میں تجھ سے جنت مانگتی ہوں اور اس قول و عمل کی توفیق کی سائل ہوں جو مجھے جنت سے قریب کر دے اور میں تجھ سے دوزخ سے پناہ چاہتی ہوں اور ہر اُس قول و عمل سے جو دوزخ سے قریب کرنے والا ہو ۔ اور اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتی ہوں کہ جو فیصلہ تو میرے حق میں فرمائے وہ میرے لئے خیر اور بھلائی کا ضامن ہو۔

(مصنف ابن ابی شیبہ وسنن ابن ماجہ)

(تشریح) اس دعا کے ایک ایک جزء پر غور کیا جائے، انسان کو دنیا اور آخرت میں جس چیز کی بھی ضرورت ہو سکتی ہے یہ سب اس پر حاوی ہے۔

عَنْ أَبِي أُمَامَةَ قَالَ دَعَا النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِدُعَاءٍ كَثِيرٍ لَمْ نَحْفَظْ مِنْهُ شَيْئًا فَقُلْنَا يَا رَسُولَ اللهِ دَعَوْتَ بِدُعَاءٍ كَثِيرٍ لَمْ نَحْفَظْ مِنْهُ شَيْئًا، قَالَ أَلَا أَدُلُّكُمْ عَلَى مَا يَجْمَعُ ذَالِكَ كُلَّهُ؟ تَقُولُ اللَّهُمَّ إِنَّا نَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَا سَأَلَكَ مِنْهُ نَبِيُّكَ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا اسْتَعَاذَ مِنْهُ نَبِيُّكَ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَنْتَ الْمُسْتَعَانُ وَعَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ ـــــــــ رواہ الترمذی

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی دعائیں فرمائیں جو ہمیں یاد نہیں رہیں، تو ہم نے آپ سے عرض کیا یا رسول اللہ آپ نے بہت سی دعائیں فرمائی تھیں ان کو ہم یاد نہیں رکھ سکے (اور چاہتے یہ ہیں کہ اللہ سے وہ سب دعائیں مانگیں، تو کیا کریں؟) آپ نے فرمایا میں تمہیں ایسی دعا بتائے دیتا ہوں جس میں وہ ساری دعائیں آجائیں! اللہ تعالیٰ کے حضور میں یوں عرض کرو کہ "اے اللہ ہم تجھ سے وہ سب مانگتے ہیں جو تیرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تجھ سے مانگا اور ہم اُن سب چیزوں سے تیری پناہ چاہتے ہیں جن سے تیرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تیری پناہ چاہی بس تو ہی ہو جس سے مدد چاہی جائے، اور تیرے ہی کرم پر موقوف ہے مقاصد اور مرادوں تک پہنچنا۔ اور کسی مقصد کے لئے سعی و حرکت اور اس کو حاصل کرنے کی قوت و طاقت بس اللہ ہی سے مل سکتی ہے۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) دنیا میں ایسے ہی بندوں کی تعداد زیادہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول شدہ زیادہ دعائیں یاد نہیں رکھ سکتے، ان کے لئے اس حدیث میں نہایت آسان طریقہ بتادیا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اس طرح مانگا کریں کہ اے اللہ تجھ سے جو کچھ تیرے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مانگا میں وہ سب تجھ سے مانگتا ہوں اور، جن چیزوں سے انھوں نے تیری پناہ چاہی میں ان سب چیزوں سے تیری پناہ چاہتی ہوں۔ ناچیز راقم سطور عرض کرتا ہے کہ اس میں بھی کوئی خسارہ اور مضائقہ نہیں ہے کہ یہ بات اپنی ہی زبان میں کہی جائے، مگر اللہ تعالیٰ کے حضور میں دل سے عرض کیا جائے، در اصل دعا وہی ہے جو دل سے ہو۔

عن ابن مسعود مرفوعاً: اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْأَلُكَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِكَ وَعَزَائِمَ مَغْفِرَتِكَ وَالسَّلَامَةَ مِنْ كُلِّ اِثْمٍ وَالْغَنِيْمَةَ مِنْ كُلِّ بِرٍّ وَالْفَوْزَ بِالْجَنَّةِ وَالنَّجَاةَ مِنَ النَّارِ۔

(رواہ الحاکم)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا

روایت کی ہے "اللّٰھُمَّ انّا نسألک...... تا...... من النّار" (اے اللہ ہم تجھ سے سوال کرتے ہیں تیری رحمت کو واجب کر دینے والے، اور تیری مغفرت کو پکا کر دینے والے اعمال کا اور ہر گناہ سے محفوظ رہنے کا اور ہر نیکی کی توفیق کا اور تجھ سے مانگتے ہیں جنت کا حصول اور دوزخ سے نجات۔)

(مستدرک)

عَنْ ابْنِ مَسْعُوْدٍ مَرْفُوْعًا "اَللّٰھُمَّ احْفَظْنِیْ بِالْاِسْلَامِ قَائِمًا وَاحْفَظْنِیْ بِالْاِسْلَامِ قَاعِدًا وَاحْفَظْنِیْ بِالْاِسْلَامِ رَاقِدًا وَلَا تُشْمِتْ بِیْ عَدُوًّا وَلَا حَاسِدًا اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُکَ مِنْ کُلِّ خَیْرٍ خَزَائِنُہٗ بِیَدِکَ وَاَعُوْذُ بِکَ مِنْ کُلِّ شَرٍّ خَزَائِنُہٗ بِیَدِکَ۔

(رواہ الحاکم)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی ہے "اللّٰھُمَّ احْفَظْنِیْ...... تا...... خزائنہ بیدک (اے اللہ میری حفاظت فرما اسلام کے ساتھ کھڑے ہونے کی حالت میں اور بیٹھے ہونے کی حالت میں اور سونے کی حالت میں یعنی میں کھڑے، بیٹھے اور سوئے ہر حال میں ایمان و اسلام کے ساتھ محفوظ رہوں اور میرے دشمنوں اور حاسدوں کو تیرے کسی فیصلہ سے شماتت کا موقع نہ ملے، اے میرے اللہ تیرے ہاتھ میں خیر کے جو خزانے ہیں میں تجھ سے ان کو مانگتا ہوں اور تیرے قبضہ میں جو شر ہے اس سے میں تیری پناہ چاہتا ہوں۔

عَنْ بُرَیْدَۃَ مَرْفُوْعًا "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ شَکُوْرًا وَاجْعَلْنِیْ صَبُوْرًا وَاجْعَلْنِیْ فِیْ عَیْنِیْ صَغِیْرًا وَفِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ کَبِیْرًا۔

(رواہ البزار)

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی ہے "اللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ...... تا...... کبیرًا (اے اللہ مجھے اپنا شکر کرنے والا اور صبر کرنے والا بندہ بنا، اور مجھے اپنی نگاہ میں چھوٹا اور دوسرے لوگوں کی نگاہ میں بڑا بنا دے۔

(مسند بزار)

(تشریح) اس دعا کا آخری جز خاص طور سے قابل غور ہے، بندہ کو چاہیئے کہ اپنے کو وہ چھوٹا اور حقیر و ذلیل سمجھے اور ساتھ ہی اللہ سے دعا کرتا رہے کہ دوسروں کی نگاہ میں وہ ذلیل نہ ہو۔

عَنِ الْاَوْزَاعِیِّ مُرْسَلاً "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ التَّوْفِیْقَ لِمَحَابِّكَ مِنَ الْاَعْمَالِ وَصِدْقَ التَّوَكُّلِ عَلَیْكَ وَحُسْنَ الظَّنِّ بِكَ ــــــــــ رواہ ابونعیم فی الحلیہ

امام اوزاعیؒ نے بطریق ارسال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی ہے۔ "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ ...... تا ...... وحسن الظن بك" (اے اللہ میں تجھ سے استدعا کرتا ہوں تو مجھے توفیق دے اُن اعمال کی جو تجھے محبوب ہیں، اور عطا فرما مجھے سچا توکل، اور اپنی ذات پاک کے ساتھ حسن ظن۔

(حلیہ ابونعیم)

عَنْ عَلِیٍّ مَرْفُوْعاً "اَللّٰهُمَّ افْتَحْ مَسَامِعَ قَلْبِیْ لِذِكْرِكَ وَارْزُقْنِیْ طَاعَتَكَ وَطَاعَةَ رَسُوْلِكَ وَعَمَلاً بِكِتَابِكَ ــــ

رواہ الطبرانی فی الاوسط

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا روایت کی گئی ہے "اَللّٰهُمَّ افْتَحْ مَسَامِعَ قَلْبِیْ ..... تا ...... وعملاً بكتابك" (اے اللہ اپنے ذکر کے لئے اور اپنی نصیحت کے لئے میرے دل کے کان کھول دے اور مجھے اپنی فرمانبرداری اور اپنے رسول پاک کی تابعداری نصیب فرما اور اپنی مقدس کتاب پر عمل کی توفیق دے۔ (معجم اوسط طبرانی)

عن ابی هریرة مرفوعاً "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ صِحَّةً فِیْ اِیْمَانٍ وَاِیْمَاناً فِیْ حُسْنِ خُلُقٍ وَنَجَاحاً تُتْبِعُهُ فَلَاحاً وَرَحْمَةً مِّنْكَ وَعَافِیَةً وَمَغْفِرَةً مِّنْكَ وَرِضْوَاناً۔

رواہ الطبرانی فی الاوسط والحاکم فی المستدرک۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا روایت کی

گئی ہے " اَللّٰھُمَّ اِنِّی اسأ لک صحۃ ..... تا ...... وَرضوانا "
(اے اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں صحت ایمان کے ساتھ، اور استدعا کرتا ہوں
ایمان کی حسن اخلاق کے ساتھ، اور سوال کرتا ہوں تجھ سے مقاصد میں کامیابی
کا آخرت کی فلاح کے ساتھ، اور سائل ہوں تجھ سے رحمت اور عافیت کا
اور تیری مغفرت اور رضامندی کا۔

(معجم اوسط للطبرانی و مستدرک حاکم)

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ مَرْفُوْعاً " اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُکَ اِیْمَاناً یُّبَاشِرُ قَلْبِیْ
وَیَقِیْناً صَادِقاً حَتّٰی اَعْلَمَ اَنَّہٗ لَا یُصِیْبُنِیْ اِلَّا مَا کَتَبْتَ لِیْ وَرِضًا
مِنَ الْمَعِیْشَۃِ بِمَا قَسَمْتَ لِیْ " ——— (رواہ البزار)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا روایت
کی گئی ہے " اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْأَ لُکَ ..... تا ..... بما قسمت لِی "———
(اے اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں ایسا ایمان جو میرے دل میں پیوست ہو جائے
اور ایسا یقین صادق، جس کے بعد یہ حقیقت میرا علم بن جائے کہ مجھ پر صرف وہی
تکلیف آئے گی جو تو نے میرے لئے لکھدی ہے، اور میں تجھ سے استدعا کرتا
ہوں کہ میرا یہ حال کردے کہ زندگی کا جو سامان تو مجھے دے میں اس پر دل سے
راضی ہوں۔) (مسند بزار)

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ مَرْفُوْعاً " اَللّٰھُمَّ الْطُفْ بِیْ فِیْ تَیْسِیْرِ
کُلِّ عَسِیْرٍ فَاِنَّ تَیْسِیْرَ کُلِّ عَسِیْرٍ عَلَیْکَ یَسِیْرٌ وَ اَسْأَلُکَ
الْیُسْرَ وَ الْمُعَافَاۃَ فِی الدُّنْیَا وَ الْآخِرَۃِ۔

رواہ الطبرانی فی الاوسط

حضرت ابوہریرہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا روایت کی گئی ہو
" اللھم الطف بی .... تا .... وَالآخرہ " (اے اللہ میری ہر دشواری
کو آسان فرما کے مجھ پر مہربانی فرما، ساری دشواریوں مشکلوں کو آسان کرنا تیرے لئے

بالکل آسان ہے اور میں تجھ سے التجا کرتا ہوں دنیا اور آخرت میں سہولت اور آسانی کے لئے اور کامل عافیت کے لئے۔ (معجم اوسط للطبرانی)

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ مَرْفُوعاً "اَللّٰهُمَّ عَافِنِیْ فِیْ قُدْرَتِكَ وَ اَدْخِلْنِیْ فِیْ رَحْمَتِكَ وَ اقْضِ اَجَلِیْ فِیْ طَاعَتِكَ وَاخْتِمْ لِیْ بِخَیْرِ عَمَلِیْ وَاجْعَلْ ثَوَابَهُ الْجَنَّةَ۔" (رواہ ابن عساکر)

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا روایت کی گئی ہے" اللهم عافنی فی قدرتك ....تا...... واجعل ثوابه الجنة "۔ (اے اللہ مجھے عافیت عطا فرما اپنی قدرت سے اور مجھے اپنی رحمت کے آغوش میں لے لے اور اپنی اطاعت و فرمانبرداری میں میری عمر تمام کردے اور بہترین عمل پر میرا خاتمہ کردے اور جنت کو اس کا صلہ ٹھیرا دے۔

(ابن عساکر)

عَنْ مَالِكٍ قَالَ بَلَغَنِیْ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كَانَ یَدْعُوْ "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ فِعْلَ الْخَیْرَاتِ وَتَرْكَ الْمُنْكَرَاتِ وَحُبَّ الْمَسَاكِیْنِ وَاِذَا اَرَدْتَ بِقَوْمٍ فِتْنَةً فَاقْبِضْنِیْ اِلَیْكَ غَیْرَ مَفْتُوْنٍ" ——— مالک فی الموطا

امام مالکؒ سے مروی ہے انھوں نے بیان کیا کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمایا کرتے تھے " اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ ....تا.... غیر مفتون " (اے اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں اچھے عمل کرنے کی توفیق، اور برے اعمال کو چھوڑ دینے کی توفیق اور تیرے مسکین بندوں کے ساتھ محبت کرنے کی توفیق اور اے اللہ جب تیرا فیصلہ کسی قوم کو فتنہ اور عذاب میں مبتلا کرنے کا ہو تو مجھے اس فتنہ میں مبتلا کئے بغیر اپنی طرف اٹھا لے۔)

(موطا امام مالک)

(تشریح) اس سلسلۂ معارف الحدیث میں پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ

جو تبع تابعین میں سے ہیں، کبھی کبھی بعض حدیثیں سند کا ذکر کئے بغیر "بلغنی" کے عنوان سے بھی بیان کرتے ہیں، ان کو اصطلاح میں "بلاغات مالک" کہا جاتا ہے اور محدثین کے نزدیک یہ سب قابل قبول ہیں، یہ روایت بھی انھیں "بلاغات" میں سے ہے۔

عَنْ بُسْرِ بْنِ اَرْطَاةَ (مرفوعًا) اَللّٰهُمَّ اَحْسِنْ عَاقِبَتَنَا فِی الْاُمُوْرِ كُلِّهَا وَاَجِرْنَا مِنْ خِزْيِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الْاٰخِرَةِ ـــــــ

(رواہ احمد و ابن حبان والحاکم)

بسر بن ارطاۃ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا نقل فرمائی "اَللّٰهُمَّ اَحْسِنْ ..... تا ..... وَعَذَابِ الْاٰخِرَةِ" (اے اللہ ہمارے سارے کاموں کا انجام بہتر کر اور دنیا کی رسوائی اور آخرت کے عذاب سے ہمیں بچا اور ہماری حفاظت فرما۔ (مسند احمد، صحیح ابن حبان، مستدرک حاکم)

(تشریح) یہ دعا بہت ہی مختصر اور بہت جامع ہے۔

عَنْ اُمِّ مَعْبَدِ الْخُزَاعِيَّةِ (مرفوعًا) "اَللّٰهُمَّ طَهِّرْ قَلْبِىْ مِنَ النِّفَاقِ وَعَمَلِىْ مِنَ الرِّيَاءِ وَلِسَانِىْ مِنَ الْكَذِبِ وَعَيْنِىْ مِنَ الْخِيَانَةِ فَاِنَّكَ تَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِى الصُّدُوْرُ ـــــــ

(رواہ الحکیم الترمذی والخطیب)

ام معبد خزاعیہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی ہے "اَللّٰهُمَّ طَهِّرْ قَلْبِىْ ..... تا ..... وَمَا تُخْفِى الصُّدُوْرُ" (اے اللہ میرے دل کو نفاق سے، میرے اعمال کو ریاء کی آمیزش سے، میری زبان کو جھوٹ سے، اور میری آنکھوں کو نظر کی خیانت سے بالکل پاک صاف کر دے، تو آنکھوں کی خیانت اور دلوں کے رازوں کو بھی جانتا ہے تجھ سے میری کوئی چیز مخفی نہیں)

(نوادر حکیم ترمذی، خطیب)

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ دُعَاءُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِىْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ عَشِيَّةَ عَرَفَةَ۔

"اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ تَسْمَعُ كَلَامِي وَتَرَىٰ مَكَانِي وَتَعْلَمُ سِرِّي وَعَلَانِيَتِي لَا يَخْفَىٰ عَلَيْكَ شَيْءٌ مِنْ أَمْرِي وَأَنَا الْبَائِسُ الْفَقِيرُ الْمُسْتَغِيثُ الْمُسْتَجِيرُ الْوَجِلُ الْمُشْفِقُ الْمُقِرُّ الْمُعْتَرِفُ بِذَنْبِهِ أَسْأَلُكَ مَسْأَلَةَ الْمِسْكِينِ وَأَبْتَهِلُ إِلَيْكَ ابْتِهَالَ الْمُذْنِبِ الذَّلِيلِ وَأَدْعُوكَ دُعَاءَ الْخَائِفِ الضَّرِيرِ مَنْ خَضَعَتْ لَكَ رَقَبَتُهُ وَفَاضَتْ لَكَ عَبْرَتُهُ وَذَلَّ لَكَ جِسْمُهُ وَرَغِمَ لَكَ أَنْفُهُ اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْنِي بِدُعَائِكَ شَقِيًّا وَكُنْ بِي رَؤُوفًا رَحِيمًا يَا خَيْرَ الْمَسْئُولِينَ وَيَا خَيْرَ الْمُعْطِينَ" ——— (رواہ الطبرانی فی الکبیر)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حجۃ الوداع میں عرفہ کی شام کو میدان عرفات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا بھی فرمائی تھی۔ "اللھم انک تسمع کلامی ..... تا ...... ویا خیر المعطین (اے میرے اللہ! تو میری بات سنتا ہے اور میں جس جگہ جس حال میں ہوں وہ تیری نظر میں ہے۔ اور میرا ظاہر و باطن سب تیرے علم میں ہو اور میری کوئی چیز بھی تجھ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اور میں مصیبتوں و دکھوں کا مارا ہوا ہوں، تیرے در کا فقیر ہوں، تیرے ہی پاس فریاد لے کر آیا ہوں اور تجھ ہی سے پناہ کا طالب ہوں، تیرا خوف اور ڈر مجھ پر چھایا ہوا ہے، میں اپنے گناہوں کا اقراری ہوں، میں تجھ سے بیکس اور بے وسیلہ مسکین کی طرح سوال کرتا ہوں اور ایک ذلیل گناہگار بندہ کی طرح تیرے حضور میں گڑگڑاتا ہوں، اور خوف زدہ اور دکھ درد میں مبتلا کسی بندہ کی طرح تجھ سے دعا کرتا ہوں۔ اس بندہ کی سی دعا جس کی گردن تیرے سامنے خم ہو، اور جس کے آنسو تیرے حضور میں بہہ رہے ہوں اور جس کا جسم جھکا ہوا اور جو تیرے سامنے اپنی ناک رگڑ رہا ہو، اور زمین پر سر رکھے پڑا ہو۔ اے میرے اللہ! میری دعا کو رد کر کے مجھے شقی بے نصیب نہ بنا اور مجھ پر مہربانی اور رحم فرما، اے سب سے اچھے سب سے بڑے داتا، اے خیر المسئولین۔

معجم کبیر للطبرانی

(تشریح) ان سب دعاؤں کی جامعیت اور ہمہ گیری ظاہر ہے۔ ان کے مضامین بھی کسی خاص تشریح اور وضاحت کے محتاج نہیں، غور کرنے والوں اور سمجھنے والوں کے لیے ان کا ہر جز معرفت کا خزانہ ہے، خاصکر یہ آخری دعا جس کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حجۃ الوداع میں وقوف عرفات کے دن شام کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا کی تھی۔ اس کا تو ایک ایک لفظ کمال عبدیت اور کمال معرفت کا ترجمان ہے۔ دنیا کے دینی و مذہبی ادب میں اور کسی بھی زبان کی دعاؤں اور مناجاتوں میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی ـــــ اس عاجز کو زندگی میں کئی دفعہ اس کا موقعہ ملا کہ بعض خدا پرست غیر مسلموں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا سنائی اور اس کا ترجمہ کرکے بتایا تو وہ اپنا یہ تاثر ظاہر کرنے پر مجبور ہوگئے کہ یہ دعا اسی دل سے نکل سکتی ہے جسے اللہ نے اپنے علم کا خاص حصہ دیا ہو اور اس کو معرفت نفس اور معرفت رب کا اعلیٰ سے اعلیٰ مقام حاصل ہو۔

اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس محفوظ اور نہایت قیمتی ورثہ کی قدر کریں اور ان دعاؤں کے ذریعہ دنیا اور آخرت کی برکتیں اور رحمتیں براہ راست مالک الملک کے خزانہ سے حاصل کیا کریں۔

یک دو ساعت صحبتے با اہلِ دل

مجلس حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی مدظلہ العالی

مرتبہ:- مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

۲۲ شوال ۱۳۸۷ھ مطابق ۲۳ جنوری ۱۹۶۸ء خانقاہ شریف بھوپال

(چوتھی مجلس)

فرمایا اس فضا میں فیوض ہر طرح کے موجود ہیں فیوض ہی نہیں میں تو کہتا ہوں وجود بھی ہر طرح کے موجود ہیں، لیکن ان فیوض کے ادراک اور ان سے استفادہ کرنے کے لئے استعداد اور اس حاسہ کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے جس سے ان کا تعلق ہے، قوت سامعہ سب کو ملی ہے لیکن اس سامعہ کے اندر ایک اور سامعہ ہے جو اگر بیدار نہیں ہو تو بہت سی اصوات اور مسموعات کا ادراک نہیں کر سکتا اس قوت اور اس کے مدرکات کے درمیان ایک رابطہ کی ضرورت ہے، اگر وہ رابطہ موجود ہے تو وہ قوت اُن کو اخذ کر لے گی ورنہ اس کو ان کا ادراک بھی نہیں ہوگا، دیکھئے آوازیں ہمیشہ سے فضا میں موجود تھیں لیکن جب تک وہ رابطہ پیدا نہیں ہوا ان کا کسی کو بھی احساس نہ تھا اور نہ کوئی ان کو سنتا تھا، اب آپ یہاں بیٹھے بیٹھے کراچی کی، مکہ کی، اور لندن کی آوازیں سنتے رہتے ہیں، یہ حاسہ سب کو ملا ہے صرف بیدار کرنے نہ کرنے، ترقی دینے نہ دینے کا فرق ہے اسی کو لوگ بزرگی اور ولایت سمجھنے لگتے ہیں۔ ایک شخص آپ کے سامنے انگریزی کا خط فر فر پڑھتا چلا جاتا ہے، آپ

انگریزی پڑھے ہوئے نہیں ہیں آپ اس کو کرامت یا بزرگی سمجھنے لگیں گے کہ آپ دو لفظ نہیں پڑھ سکتے آپ کو معلوم نہیں اس میں کیا لکھا ہوا ہے اور وہ سبق کی طرح اس کو ناتا چلا جاتا ہے، لیکن اگر آپ بھی اس علم کو سیکھ لیں اور اس حاسہ کو بیدار کرلیں تو آپ بھی پڑھ سکتے ہیں۔ ولایت اور بزرگی کے جو مراتب و کمالات بیان کئے گئے ہیں اور بزرگوں کے جن کمالات کا ذکر ہم سنتے ہیں ان سب کی استعداد عام مسلمانوں میں موجود ہے صرف نبوت، شرف صحابیت اور اسی طرح سے تابعی ہونے کی سعادت اس زمانہ میں ممکن نہیں کہ ان کا ایک زمانہ پر اختتام ہو چکا ہے، باقی سب ممکن ہے، البتہ استعدادیں مختلف ہیں، یہ ضروری نہیں کہ جو مرتبہ حضرت مجدد صاحبؒ کو حاصل ہوا وہ آپ کو حاصل ہو جائے۔ استعدادوں کا تفاوت برحق ہے۔

لوگوں کی عادت ہے کہ ایک کو بزرگ مان لیتے ہیں اور اسی سے دعا کراتے ہیں، باقی نہ اپنے کو دعا کے قابل سمجھتے ہیں نہ عام مسلمانوں میں کوئی بزرگی مانتے ہیں، میں تو سمجھتا ہوں کہ گناہگار مسلمانوں میں بھی اثر و قبولیت ہے، ولایت ہر مسلمان کے لئے ذاتی ہے اور گناہ عارضی، اللہ نے تو بزرگ ہی پیدا کیا، ہم شیطان ہو گئے، دیکھئے جب ہم بچے تھے تو گناہوں سے معصوم ولی قطب سب تھے۔ بڑھ کر شیطان ہو گئے مگر یہ عارضی چیز ہے۔ مسلمانوں نے ہر چیز میں تقسیم کر رکھی ہے، امامت کے لئے بھی وہ کسی کو مخصوص کر دیتے ہیں حالاں کہ امامت بھی کسی کے ساتھ مخصوص نہیں، ہر مسلمان امامت کر سکتا ہے، مجھے یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ ایک شخص کو امامت کے لئے نوکر رکھ لیا جائے اور وہی نماز پڑھاتا رہے، یہ کیا امام و موذن؟ ہر ایک امام و موذن ہے، اسی طرح دعا ہر مسلمان کر سکتا ہے اور اس کی دعا سے بڑے بڑے کام ہو جاتے ہیں، پیر صاحب ہی دعا کرنے کے لئے نہیں ہیں تم بھی ہو، یہاں ایک معزز آدمی تھے ریاست کے انضمام کے بعد بہت سے معزز مسلمانوں پر دار و گیر ہوئی ان پر بھی چیف کمشنر صاحب نے ایک مقدمہ قائم کر دیا بیچارے نماز روزہ اور ذکر و تلاوت سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے تھے، ایک حافظ صاحب کو لے کر میرے پاس آئے اور کہا کہ مجھ پر مقدمہ قائم

ہو گیا ہے آپ جو کچھ بتائیں ان حافظ صاحب کو بتا دیجئے یہ پڑھ لیں گے، میں نے کچھ پڑھنے کو بتا دیا، کئی روز پڑھتے ہوئے ہو گئے کوئی اثر ظاہر نہیں ہوا، ایک دن انھوں نے ان حافظ صاحب کو موٹر پر بٹھایا اور جنگل میں لے گئے اور کہنے لگے کہ تم اتنے دن سے اللہ کا کلام پڑھ رہے ہو ابھی تک کوئی نتیجہ نہیں نکلا، میں یہ نہیں مان سکتا کہ اللہ کے کلام میں اثر نہ ہو اللہ کا کلام اور اس سے ابھی تک نتیجہ نہ نکلے یہ ممکن نہیں! اب میں تم سے صاف صاف کہتا ہوں کہ اگر میں نہ چھوٹا تو میں تمھارے قتلے قتلے کر دونگا، میں نے معلوم نہیں کتنے خون کئے ہیں، میں تمھاری بوٹی بوٹی کر کے کسی کنویں میں ڈال دوں گا، کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا اب تم جانو تمھارا کام! وہ گھبرائے ہوئے میرے پاس آئے اور قصہ سنایا، میں نے کہا کہ اب تم اپنی فکر کرو، میں کچھ نہیں جانتا، بہر حال انھوں نے اس بیقراری میں جو کچھ دعا کی ہو، وہ رئیس صاحب صاف بری ہو گئے، مجھے تو انکے اس یقین اور ایمانی قوت کا لطف آیا کہ خدا کا کلام اور اس کے پڑھنے سے کچھ نہ ہو نہیں ہو سکتا!۔

فرمایا کہ تنگی کا وقت بڑی برکت کا ہوتا ہے، انقباض کا وقت انشراح کے وقت سے بہتر ہے، انشراح کی حالت میں عبادت بلا تکلف اور فطرتاً ہوتی ہے، انقباض کے وقت جب فتوحات کے دروازے بند ہو جائیں بندگی اور وفاداری بڑی مردانگی ہے اور اس کی بڑی قدر کی جاتی ہے اگر کوئی کسی کا خیال کرے اور وہ اس کا دم بھرے یہ تو ایک قدرتی بات ہے اس وقت کی عبادت و خدمت خلوص سے نہیں ہوتی، جو شخص اس موقع پر اپنے محسن کی خدمت کرے تو اس کو ذات سے محبت نہیں، انعامات و عطایا سے محبت ہے اور جب بظاہر نگاہ پھر جائے تو اس وقت جو محبت کا دم بھرے تو یہ محبت ذاتی ہے، محبت ذاتی میں دوام ہے پختگی ہے ثبات و استقامت ہے، خلوص تو یہ ہے سب بند کر دو پھر بھی دروازہ نہ چھوڑیں گے۔ حافظ فرماتے ہیں:۔

ہنگام تنگ دستی در عیش کوش و مستی
کیں کیمیائے ہستی قارون کند گدا را

لوگ کہتے ہیں کہ اسلام پر بڑا نازک وقت آیا ہے، مسلمانوں پر بڑی پریشانی کا دور ہے، میں کہتا ہوں بڑی فرحت کا دور ہے، اسلام مسلمانوں کے لئے ہر وقت فرحت ہی کا زمانہ ہے، دیکھئے اسلام کی تاریخ میں جنگ احد سے زیادہ کوئی سخت وقت نہیں آیا، ستر جلیل القدر صحابی شہید ہوئے، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا مثلہ کیا گیا، دندان مبارک شہید ہوئے چہرہ مبارک پر ایسے گہرے زخم آئے کہ حضرت فاطمہؓ نے چٹائی جلا کر اس کی راکھ بھری، ان سب کے بعد ابو سفیان، اور حضرت خالد نے جو اس وقت کفار کے قائد تھے للکارا کہ ابھی کیا ہوا ہے ایک اور فوج آرہی ہے وہ تمھارا رہا سہا کام تمام کرے گی لیکن اس حالت میں صحابہؓ کرام کے ایمان و یقین اور فرحت و انبساط میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ اضافہ ہوا اللہ تعالےٰ فرماتا ہے، اَلَّذِیْنَ قَالَ لَہُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ فَاخْشَوْھُمْ فَزَادَھُمْ اِیْمَانًا وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ " یہ جو مٹی ایمان ہے جاپانی نہیں جب ٹھکر لگی تو معلوم ہوا کہ کتنا پختہ ہے۔ مسلمان کی شان تو یہ ہے کہ اس کو کسی نے پچھاڑ دیا اسکے سینہ پر سوار ہو گیا اور چھرا نکال کر اس کو دکھایا کہ اب تیری مدد کون کرے گا اور تجھے اس وقت کون بچا سکتا ہے اس نے کہا اللہ، چنانچہ ایک تیر پیچھے سے آیا اور وہ شخص گرا مسلمان نے اس کا چھرا لے کر اس کو ذبح کر دیا، اس طرح کے واقعات تاریخ اسلام میں بہت آئے ہیں، یہاں تو یہ حال ہے کہ جدھر کی ہوا چلی ادھر کو مڑ گئے۔

فرمایا کہ وظائف و اذکار سے بعض مرتبہ فتوحات کا دروازہ کھلتا ہے اس وقت یہ دیکھنے کی بات ہے کہ یہ حلال ہے یا حرام، شریعت کا حکم ہے یا نہیں، اگر اس امتحان میں آدمی پورا اترا تو پھر اللہ کی مدد ہوتی ہے اور دروازہ کھل جاتا ہے، دہلی میں ایک زرکوب تھے نیک اور صالح آدمی، ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ جب سے میرا ہاتھ بیکار ہو گیا ہے اور ورق کوٹنے سے میں معذور ہو گیا ہوں تنگ دستی اور ناداری نے پریشان کر دیا ہے، میں نے کچھ پڑھنے کو بتا دیا چند دن کے بعد وہ ملے اور بہت خوشی سے کہنے لگے کہ آپ نے پڑھنے کو جو کچھ بتایا تھا اس سے بڑا فائدہ ہوا میں سڑک پر جا رہا تھا کہ

ایک پڑیا پڑی ہوئی دکھائی دی میں نے اٹھایا تو اس میں سو سو کے نوٹ تھے میں نے کہاکہ یہ اس پڑھنے کی برکت ہے اور رکھ لیا' میں نے جواب دیا کہ تم کو اس وقت سمجھنا چاہیئے تھا کہ یہ ناجائز ہے اگر تم اس امتحان میں پورے اترتے تو پھر اللہ کی مدد ہوتی۔

فرمایا ایک چیز کے سمجھنے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ جہاں آپ بیٹھے ہیں اس کو سمجھ لیں کہ اس کا کیا حق اور کیا آداب ہیں پھر کسی نصیحت اور وعظ کی ضرورت نہیں، صرف زبان مکان کو دیکھنے کی ضرورت ہے پھر کسی وعظ و تلقین کی ضرورت نہیں، اگر کوئی شخص مسجد میں بیٹھا ہو تو اس سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میاں یہاں بیڑی سگرٹ نہ پینا' یہاں پیشاب و پاخانہ نہ کرنا اس کو صرف یہ بتانے اور معلوم کرانے کی ضرورت ہے کہ وہ خانہ خدا میں ہے اگر اس کو کوئی یہ نصیحت کرنے لگے کہ وہ گھر اور بازار والے کام یہاں نہ کرے تو یہ ایک مجنونانہ بات ہوگی اور وہ اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگے گا کہ کیا کہہ رہا ہے اب ہم کو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ہم اسلام کے مکان میں بیٹھے ہیں ہم اسکے حقوق و آداب کی پابندی خود کریں گے بہت سے حضرات ہیں جو نماز روزہ ذکر و اذکار ورد و وظیفہ بہت کرتے رہتے ہیں لیکن ان کو حلال و حرام مشتبہ و غیر مشتبہ کا کوئی خیال نہیں' ہمارے دوستوں میں ایک صاحب بڑے ذاکر و شاغل تھے' صاحبزادہ بینک میں ملازم تھے ان کی تخفیف ہوگئی وہ ایک دن صاحبزادے کو میرے پاس لے کر آئے اور کہاکہ دعا کیجیے کہ یہ بچہ بحال ہو جائے' میں نے کہاکہ اللہ کرے وہ راستہ ہی بھول جائے جو بینک کو جاتا ہے' میں نے اکثر دیکھا ہے کہ گنہگار اور عام مسلمانوں پر بات کا بڑا اثر ہوتا ہے لیکن متقیوں پر کلام کا اثر نہیں ہوا کرتا' وجہ یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ سب کچھ جانتے ہی ہیں اور سب کچھ کرتے ہی ہیں کہنے والے نے غلط نہیں کہا۔

آں کس کہ نداند و بداند کہ بداند
در جہل مرکب ابدالدہر بماند

پیری نے اسلام کے اندر جو تلاطم پیدا کیا وہ کسی نے نہیں پیدا کیا، راہ پر تو کم آئے ہوں گے بے راہ بہت ہو گئے، جہاں بھی ہم پہونچے وہاں یہی دیکھا کہ پیر و مرشد جو گوٹ چلیں گے بس وہی شطرنج ہے حالاں کہ شطرنج کے اصول و ضوابط متعین ہیں کوئی ال

میں ترمیم نہیں کرتا"، یہ تو حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ ہی کا کمال ہے کہ انھوں نے شریعت کو طریقت وحقیقت پر ہر جگہ مقدم رکھا عام قاعدہ ہے کہ آدمی جس فن کی وکالت کرتا ہے اور جس موضوع پر کتاب لکھتا ہے اسی کو سراہتا ہے اور اسکے مقابلہ میں ہر چیز کی نفی کرتا ہے اور یہی دکھانے کی کوشش کرتا ہے کہ یہی سب کچھ ہے باقی سب ہیچ، مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ طریقت وحقیقت پر مکاتیب تحریر فرماتے ہیں لیکن یہی کہتے ہیں کہ "پس شریعت متکفل جمیع سعادات دنیویہ واخرویہ آمد ومطلبے نماند کہ باوراے شریعت دراں مطلب احتیاج افتد طریقت وحقیقت کہ صوفیہ بآں ممتاز گشتہ اند ہر دو خادم شریعت اند[1]"۔۔۔۔۔

البتہ جہاں حضرت طریقہ نقشبندیہ کو تمام طرق پر کھلی ترجیح دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جو اور طریقوں کی نہایت ہے وہ اس طریقہ کی بدایت ہے اور اس میں اندراج النہایۃ فی البدایۃ ہے اور یہ کہ اقرب واعلیٰ طرق ہے، تو یہ ادب سے عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ آپ بھی دوسرے طرق میں بعیت ہوئے ہیں سلسلہ چشتیہ کے مشائخ کیسے کیسے باکمال اور صاحب فیض گذرے ہیں، بیسوں واقعات ہیں کہ جس پر نظر پڑ گئی وہ ولی بن گیا خلق اللہ کو اس کی نظر کیمیا اثر سے کیسے کیسے مراتب عالیہ حاصل ہوئے حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک جگہ جنگل میں خیمہ ڈالے ہوئے تھے جنگل میں ایک بھنگ پینے والے فقیر نے اپنے چیلے سے کہا بھنگ لا اس نے کہا کہ بھنگ تو اس وقت کٹیا میں موجود نہیں، کہا کہ یہی تو میرے پینے کا وقت ہے میں کیا پیوں جا کہیں سے ڈھونڈ کر لا، وہ ڈھونڈھنے نکلا اس نے دیکھا کہ ایک جگہ چراغ جل رہا ہے، حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلوی رونق افروز تھے اس نے پکار کر کہا کہ کیا یہاں بھنگ ملے گی؟ جواب میں ارشاد ہوا کہ یہاں بھنگ نہیں، ولایت ہے اس نے کہا وہی دیدو، فرمایا جاؤ وضو کر کے دو رکعت پڑھو، وہ نماز پڑھ کر آیا تو توجہ دی وہ مست ہو گیا، جب

---

[1] شریعت تمام دنیوی اور اخروی سعادتوں کی کفیل ہے۔ سعادت کا کوئی شعبہ ایسا نہیں کہ اس میں شریعت کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت پڑتی ہو۔ صوفیا کی طریقت وحقیقت دونوں کی دونوں خادم شریعت ہیں۔

اپنے گرو کے پاس پہونچا تو اس نے دیکھتے ہی کہا "ارے میں نے کہا تھا لے کر آنا تو پی کر آیا، اچھا چل مجھ کو بھی پلوا، وہ گیا اور اس پر بھی وہی رنگ چڑھ گیا، شاہ گل صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک مسجد میں بیٹھے تھے، ایک بی بی نے بناؤ سنگار کر کے کھڑکی سے چہرہ نکالا، خدام نے عرض کیا حضرت یہ بڑی بے ادب اور گستاخ ہے، ایک مرتبہ کہا دو مرتبہ کہا توجہ نہ کی تیسری مرتبہ کہنے پر نظر اٹھا کر دیکھا قدموں میں آکر گر گئی اور تائب ہوئی، ان حضرات کے ایسے بیسیوں واقعات ہیں، کسی نے خوب کہا کہ نقشبندیہ ایک مکان بناتے ہیں، سجاتے ہیں، سنوارتے ہیں، چشتی اس کو کھود کر میدان کر دیتے ہیں"

حضرت شاہ احمد سعید صاحبؒ نے اربعہ انہار[1] میں چاروں نسبتوں کا فرق خوب بیان کیا ہے، دراصل طریقہ نقشبندیہ کوئی الگ طریقہ نہیں، سب طریقوں کا مرکب ہے، سب طریقوں کی تعظیم اور سب کی خوبیوں کا اعتراف کرنا چاہئیے، رکابی کا حسن جبھی ہے جب وہ سب طرف سے ثابوت اور مکمل ہو اگر کوئی کونا ٹوٹ گیا اگرچہ اسکو استعمال کیا جا سکتا ہے، مگر وہ حسن، موزونیت اور اس کی وہ قیمت نہیں رہتی، پھر ہر ایک کے کہنے کی نقل بھی نہیں کی جا سکتی، ہر ایک اپنے لحاظ سے کہتا ہے، ایک خاتون بیٹھی ہوئی ہیں، شوہر ان کو بیوی کی طرح خطاب کرتا ہے بیٹا والدہ کہتا ہے، بھانجا خالہ کہتا ہے، اور سب صحیح کہتے ہیں، ہم تو یہی کہیں گے کہ یہ اربعہ انہار ہیں ہر کمال اور ہر مقام ہر ایک کی تقلید کا نہیں ہوتا، حکیم ابوحبیب صاحب[2] ایک دن فرمانے لگے کہ حضرت نے مراقبہ ذات مع قطع صفات کی تلقین کی ہے، میں نے عرض کیا کہ حکیم صاحب اس جھپیٹے میں نہ آ جانا، جن مشائخ نے یہ کیا ہے جہاں ٹھیرے ہیں

---

[1] یہ ملفوظ الفرقان کے کسی پچھلے نمبر میں گذر چکا ہے۔ [2] مولانا سید سلیمان ندویؒ کے بڑے بھائی، مولانا سید ابوظفر ندوی مرحوم کے والد حضرت شاہ ابو احمد صاحب مجددی کے مخصوص مجازین و خلفاء میں سے تھے عرصہ تک خانقاہ میں مقیم رہے، مکتوبات شریف سے عشق اور اس پر بڑا عبور تھا۔

وہاں بلا آگئی ہے، صفات ہی حفاظت و بقا کا سبب ہیں، حکیم صاحب کو بڑا تعجب ہوا، میں نے کہا کہ یہ حضرت مجدد صاحب کی مخالفت نہیں ہے بلکہ یہ ایسا ہی ہے کہ ایک ماہر پیرنے والا چڑھے ہوئے دریا میں پیر رہا ہے، معمولی آدمی کا کام نہیں کہ وہ بھی دریا میں کود پڑے، یہ علو مراتب کی بات ہے تردید و مخالفت نہیں، دراصل مکتوبات کے مطالعہ کے لئے قرآن مجید سمجھنے کی ضرورت ہے، سب سے بڑا مکتوب قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے ایسے مضامین اور مکتوبات کے بارے میں صحیح اصول یہی ہے کہ جو سمجھ میں آئے اس پر عمل کرو، ورنہ ادب سے کترا کر نکل جاؤ، یہاں ایک صاحب تشیع سے متاثر تھے ایک دن کہنے لگے کہ کیا امام حسینؓ کی شہادت کی ذمہ داری حضرت معاویہؓ اور ان کے طرز عمل پر بھی عائد نہیں ہوتی؟ میں نے کہا کہ اسکی مثال ایسی ہے کہ ایک مرتبہ ایک بڑے عالم اور ان کی بیوی میں رات کو کچھ تکرار ہوگئی اور سخت درشت کلامی کی نوبت آئی ایک صاحب جھانک کر یہ منظر دیکھ رہے تھے صبح کہنے لگے کہ صاحب شریعت گھر کی بیٹی، آپ عالم آپ اس کو اتنا سخت وسست کہہ رہے تھے اور زدو کوب کی نوبت آگئی، ان بزرگ نے فرمایا کہ آپ کو اسکی اطلاع کیسے ہوئی کہا کہ میں جھانک کر دیکھ رہا تھا، کہا کہ میں اپنے عمل کی توجیہ بعد میں کروں گا، پہلے آپ اپنے عمل کا جواز ثابت کیجئے کہ آپ کو کسی کے خلوت خانہ میں جھانک کر دیکھنے کی اجازت کس نے دی؟ اس کی تو ممانعت ہے، میں نے کہا کہ اسی طرح ہم کو صحابۂ کرامؓ پر اعتراض کرنے اور ان کو برا بھلا کہنے کی ممانعت ہے" اللہ اللہ فی اصحابی لا تتخذ و اھم من بعدی غرضا" اب آپ بتائیے کہ آپ کو قانون و عدالت کی کرسی پر کس نے بٹھایا کہ آپ صحابہ کرامؓ پر فیصلہ صادر کریں، بہت لوگ قرآن و حدیث کے بجائے تاریخ پڑھ کر گمراہ ہوئے، کسی نے سلف میں کسی بزرگ سے سوال کیا کہ حضرت علیؓ حضرت معاویہ میں کون حق پر تھا کہا تلک امۃ قد خلت لھا ما کسبت ولکم ما کسبتم، ہم کو اپنے اعمال و اخلاق کی فکر چاہیئے۔ ان کی فکر میں رہنے سے کوئی فائدہ نہیں، نواب صاحب کے یہاں شادی ہے میں احمد آباد و وڑا

جا رہا ہوں کو کچھ فکر کر دں، کوئی کہے حضرت آپکے یہاں تو ن تیل بھی ہے یا نہیں، آپ اپنے گھر کی فکر کیجئے، بیگم صاحبہ نے اپنی بیٹی کے لئے بہت کچھ سامان کر رکھا وہاں سب انتظامات ہو رہے ہیں، کسی کی ایک حرکت دیکھ کر پوری زندگی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، مدتوں کے بعد ہی کچھ اندازہ ہو سکتا ہے، ایک حدیث دیکھ کر کیسے اندازہ کر لیا جائے، کبھی آپ غصہ میں ہوتے تھے، کبھی ترحم اور شفقت کی حالت میں، صحابہؓ کی غلطیاں بھی ہمارے لئے رحمت ہیں۔

فرمایا ہر چیز کی علت غائی دیکھنی چاہئیے جس کے لئے بنائی گئی ہے، ایک شخص مسہری بچھاتا ہے، اس پر نہایت تکلف بستر لگاتا ہے بڑا نرم گدا، بڑی اجلی چادر بڑا نفیس منقش تکیہ لیکن آدمی جب رات کو اس پر سوتا ہے تو اتنے کھٹمل اور جھینگر بال کہ بھن جاتا ہے اور پلک سے پلک نہیں لگتی، اب اس مسہری اور گدے کو لے کر کوئی کیا کرے، اس سے تو یہ کہیں اچھا ہے کہ زمین پر معمولی بستر ڈال کر سو جائے جہاں نہ کھٹمل ہوں، نہ پسو، مقصود تو آرام ہے چاہے زمین پر ہو چاہے مسہری پر، آج کل کی زندگی تعلیم سب ایسے ہی ہیں کہ ٹیپ ٹاپ تو بہت ہے، مگر قبر میں اس سے آرام دہ ملے گا، اس سے تو وہ تکلف و بے سر و سامانی مبارک ہے کہ جس کے نتیجہ میں قبر میں آرام سے سونا نصیب ہو، وہاں گدا تکیہ سب مل جائے گا اور آدمی ایسا مسرور اور بآرام ہوگا کہ کہے گا "یا رب أقم الساعة حتی ارجع الی اهلی ومالی"۔

فرمایا دنیا کا سب آرام اور ہر طرح کی راحتیں ہمارا حق ہیں، لیکن ان سے فائدہ اٹھانے کا ایک وقت ہے، ایک وقت دیکھنے کو بھی منع کرتے ہیں، دوسرے وقت نہ دیکھنے کو برا سمجھتے ہیں جس کی ابھی صرف نسبت ہوئی اس کا جھانکنا بھی معیوب ہے اور گھر کے اندر چلا جانا بھی ممنوع ہے لیکن شادی کے بعد الگ رہنا قابل اعتراض ہے، یہی تمام لذات کا حال ہے کہ ان سے تمتع کا ایک وقت اور محل ہے، لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ بے موقع اور قبل از وقت فائدہ اٹھاتے ہیں بلوغ کے

بعد جو چیزیں حاصل ہوتی ہیں وہ بلوغ سے پہلے ممکن نہیں، جس کو ہم فسق و فجور کہتے ہیں وہ درحقیقت وقت سے پہلے کسی کام کو کرنا اور اعلیٰ چیز کو چھوڑ کر ادنیٰ پر قناعت کرنا، یہ ایسی بات ہے جیسے کوئی تاڑی یا ٹھرا پی رہا ہو اور کوئی کہے یہ شراب نہ پیو، ہم ولایت سے منگائے دیتے ہیں، وہ کہے پھر منگا دو، تو اس سے کہا جائے گا کہ ٹھیرو ذرا لانے میں وقت لگے گا اللہ تعالیٰ نے ان جذبات کو اپنے محل میں صرف کرنے کا حکم دیا ہے قرآن شریف میں آتا ہے وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ [علہ] دیکھئے یہ نہیں فرمایا وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي اَرواحکم، معلوم ہوا کہ ان لذات کی اشتہا نفوس کا کام ہے نہ کہ ارواح کا، مومن جنت میں ترقی کرتے کرتے ایسے مقام میں پہونچ جائے گا کہ وہ اس محل میں رکھا جائے گا جہاں صرف دیدارِ الٰہی ہو نہ حور نہ قصور۔

فرمایا قرآن مجید میں حکم ہے وَاذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا، ذکر کی کثرت کرنے سے ذکر ذہن میں جم جاتا ہے اور جو چیز ذہن میں جم جاتی ہے سامنے آتی ہے۔ ایک ٹائپسٹ نوجوان کہنے لگے کہ سونے میں بھی اور نماز میں بھی وہی حرف سامنے آجاتے ہیں اور بغیر ذہن میں جمے ہوئے کوئی ٹائپ نہیں کر سکتا، اسی کا نام مراقبہ ہے۔

فرمایا کہ جب میں کسی (کھاتے پیتے) آدمی کی نبض دیکھتا ہوں اور وہ کمزور معلوم ہوتی ہے تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ یا تو ان کے پاس مال زیادہ ہے یا مال کی محبت، اکثر لوگ اس مرض میں مبتلا ہیں جس کا قرآن میں ذکر کیا گیا "يَا لَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَا أُوتِيَ قَارُونُ إِنَّهُ لَذُو حَظٍّ عَظِيمٍ" یعنی اہل دولت پر رشک اور مال کی کثرت کی تمنا، میں نے ایسے بہت سے لوگوں کا ہارٹ فیل ہوتے ہوئے دیکھا۔ جو اس مرض سے آزاد ہو وہ تندرست اور قوی و توانا ہو، میرے بعض ساتھی کہنے لگے کہ آپ کی تندرستی بہت اچھی ہے، میں نے کہا کہ آپ بھی یاقوتی کھا یا کرو تندرست رہوگے۔ ایک ڈاکٹر صاحب نے مجھے دیکھکر کہا آپ جھکے نہیں [علہ]؟ میں نے کہا میں جھکتا رہتا ہوں اس لئے نہیں جھکا، جو شخص بھی ننانوے کے پھیر میں پڑا [علہ] الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ" وہاں اسکو تفکرات پریشانیوں نے گھیرا شیخ سعدی فرماتے ہیں کہ ایک بادشاہ اور ایک درویش کا انتقال ہوا کسی نے خواب میں دیکھا کہ بادشاہ

علہ تمہارے واسطے جنت میں وہ سب کچھ ہے جو تمہارا نفس چاہے اور جو تم مانگو ۱۲

(باقی صفحہ ۴۶ پر) علہ علہ علہ صفحہ ۴۶ پر پڑھئے

تقسیمِ دولت کا اسلامی نظام

(از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی، پاکستان)

(۲)

سرمایہ داری اور اسلام اوپر ہم نے اسلام اور سرمایہ داری کے نظام تقسیم دولت کے جو اجمالی خاکے پیش کیے ہیں ان کا تقابل کرنے سے اسلام اور سرمایہ داری کے درمیان مندرجۂ ذیل فرق واضح ہوتے ہیں۔

(۱) عوامل پیداوار کی فہرست سے آجر کو مستقل عامل ہونے کی حیثیت سے ختم کر دیا گیا ہے۔ اور صرف تین عوامل پیداوار تسلیم کیے گئے ہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ آجر کے وجود سے انکار کیا گیا ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ کوئی الگ عامل نہیں بلکہ ان تین عوامل میں سے کسی نہ کسی میں شامل ہے۔

(۲) سرمایہ کا صلہ "سود" کے بجائے "منافع" قرار دیا گیا ہے۔

(۳) عوامل پیدائش کی تعریفیں بدل دی گئی ہیں "سرمایہ" کی تعریف سرمایہ دارانہ معیشت میں "پیدا شدہ ذریعہ پیدائش" سے کی جاتی ہے۔ لہٰذا نقد روپیہ اور اشیائے خوردنی کے علاوہ مشینری وغیرہ بھی اس میں داخل ہے۔ لیکن ہم نے اسلامی نظریۂ تقسیم دولت کی توضیح کرتے ہوئے "سرمایہ" کی جو تعریف کی ہے اس میں صرف وہ چیزیں شامل ہیں جنھیں خرچ کیے بغیر ان سے استفادہ ممکن نہیں، یا بالفاظ دیگر جنھیں کرایہ پر نہیں چلایا جا سکتا مثلاً روپیہ۔ مشینری اس

تعریف کی رو سے "سرمایہ" میں داخل نہیں۔

(۴) اسی طرح "زمین" کی تعریف زیادہ عام کردی گئی ہے۔ یعنی اس میں ان تمام چیزوں کو شامل کرلیا گیا ہے جن سے استفادہ کے لیے انھیں خرچ کرنا نہیں پڑتا۔ لہٰذا مشینری بھی اس میں داخل ہوگئی ہے۔

(۵) محنت کی تعریف میں بھی زیادہ عموم پیدا کردیا گیا ہے اور اس میں ذہنی محنت اور منصوبہ بندی بھی شامل ہوگئی ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہو کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں "آجر" کی سب سے بڑی خصوصیت جس کی بنا پر اسے "منافع" کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ کاروبار کے نفع و نقصان کا خطرہ برداشت کرتا ہے، گویا سرمایہ دارانہ نقطۂ نظر سے "منافع" اس کی اس ہمت کا صلہ ہے کہ اس نے ایک ایسی کاروباری مہم کا آغاز کیا جس میں اگر نقصان ہوجائے تو وہ تن تنہا اسی پر پڑے گا، باقی تینوں عوامل پیدائش میں سے سرمایہ کو معین سود۔ زمین کو معین لگان اور محنت کو معین اُجرت مل جاتی ہے۔ اس لیے وہ نقصان سے بری ہیں۔

اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ درحقیقت "نقصان کا خطرہ مول لینے" کی یہ صفت خود سرمایہ میں موجود ہونی چاہیے۔ اس خطرے کا بار کسی اور پر نہیں ڈالا جاسکتا۔ جو شخص کسی کاروبار میں اپنا سرمایہ لگانا چاہتا ہے اس کو یہ خطرہ مول لینا پڑے گا۔ اس لیے جو سرمایہ دار ہے وہی خطرہ مول لینے کے لحاظ سے آجر بھی ہے اور جو شخص آجر ہے وہی سرمایہ دار بھی ہے۔

اب سرمایہ کے کسی کاروبار میں لگنے کی تین صورتیں ہیں۔

۱ انفرادی کاروبار۔ سرمایہ لگانے کا اولا شرکتِ غیرے خود ہی کاروبار بھی چلائے گا۔ اس صورت میں اس کو جو صلہ ملے گا وہ خواہ عرفی اور قانونی اعتبار سے صرف "منافع" کہلائے۔ لیکن معاشی اصطلاح کے مطابق وہ صلہ دو چیزوں کا مجموعہ ہوگا۔ سرمایہ لگانے کی وجہ سے "منافع" کا اور کاروبار چلانے کی محنت کے لحاظ سے "اجرت" کا۔

شرکت۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کئی آدمی مل کر سرمایہ لگائیں، کاروبار

چلانے میں سبھی سب شریک ہوں اور نفع و نقصان میں بھی، اسے فقہی اصطلاح میں "شرکۃ العقود" کہا جاتا ہے۔

اس صورت میں بھی معاشی اصطلاح کے مطابق تمام شرکاء سرمایہ لگانے کی حیثیت سے "منافع" کے حق دار ہوں گے اور کاروبار چلانے کی حیثیت سے "اُجرت" کے یہ صورت بھی اسلام نے جائز قرار دی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل تجارت کا یہ طریقہ رائج تھا۔ آپ نے لوگوں کو اس پر برقرار رکھا۔ اور اس کے جواز پر اجماع منعقد ہوگیا۔[1]

(۳) **مضاربت** ۔ تیسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص سرمایہ لگائے اور دوسرا کاروبار چلائے اور نفع میں دونوں شریک ہوں۔ اسے فقہی اصطلاح میں "مضاربت" کہا جاتا ہے اس صورت میں معاشی اصطلاح کے مطابق سرمایہ لگانے والے (رب المال) کو اس کا حصہ "نفع" کی صورت میں ملے گا اور کاروبار چلانے والے (مضارب) کو اجرت کی صورت میں۔ ہاں اگر کاروبار چلانے والے مضارب کو .... کاروبار میں نقصان ہو جائے تو جس طرح رب المال کا سرمایہ بیکار گیا اسی طرح مضارب کی محنت بیکار رہی۔

یہ صورت بھی اسلام میں جائز ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہؓ کے ساتھ نکاح سے قبل یہی معاملہ فرمایا تھا۔[2] اس کے بعد اس کے جواز پر بھی فقہائے امت کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔[3] ان تین صورتوں کے سوا کاروبار میں سرمایہ کے شریک ہونے کی اسلام میں کوئی اور صورت نہیں ہے۔

سود کا کاروبار

شغل سرمایہ کی چوتھی صورت جو غیر اسلامی معاشروں میں شروع سے رائج چلی آتی ہے۔ سود کا کاروبار ہے۔ یعنی ایک شخص سرمایہ بطور قرض دے۔ دوسرا محنت کرے۔ نقصان ہو تو محنت کا ہو اور سرمایہ کا سود ہر صورت میں کھرا رہے، اس

---

[1] ملاحظہ ہو المبسوط للسرخسی ص ۱۵۱ ج ۱۱ مطبع السعادۃ مصر۔ [2] زرقانی شرح المواہب ص ۱۹۸ ج اول الازہریہ مصر ۱۳۲۵ھ ۔ [3] المبسوط للسرخسی ص ۱۸ ج ۲۲۔

کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔

"یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ و	"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو۔ اور سود میں سے
ذروا ما بقی من الربوا ان کنتم	جو کچھ باقی رہ گیا ہو اسے چھوڑ دو۔ اگر تم مومن
مومنین۔ فان لم تفعلوا فاذنوا	ہو، پس اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول
بحرب من اللہ و رسولہ۔	کی طرف سے اعلان جنگ سن لو۔"

اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ

"فان تبتم فلکم رؤس	پس اگر تم رسود سے) توبہ کرو تو تمہیں تمہارے
اموالکم لا تظلمون	اصل اموال مل جائیں گے۔ نہ تم کسی پر ظلم کرو
ولا تظلمون۔"	اور نہ کوئی تم پر ظلم کرے۔

ان دو آیتوں میں "ما بقی من الربوا" اور فلکم رءوس اموالکم کے الفاظ نے پوری وضاحت کے ساتھ یہ بات صاف کر دی ہے کہ سود کی ادنیٰ سی مقدار کا باقی رہنا بھی اللہ کو گوارا نہیں ہے اور سود کو چھوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ قرض دینے والے کو صرف "راس المال" واپس ملے: لہٰذا اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ اسلام کی نظر میں صفر کے سوا سود کی ہر شرح نامعقول ہے۔

جاہلیت میں بعض قبائل عرب دوسرے قبیلوں سے سود پر قرض لے کر کاروبار کرتے تھے۔ اسلام نے ان تمام معاملات کو یکسر موقوف کر دیا۔ ابن جریرؒ فرماتے ہیں۔

"کانت بنو عمرو بن عوف یاخذون الربا	جاہلیت میں بنو عمرو بن عوف بنو المغیرہ سے سود لیا کرتے
من بنی المغیرۃ وکانت بنی المغیرۃ یربون لھم	تھے اور بنو المغیرہ ان کو سود دیتے تھے جب
فی الجاھلیۃ فجاء الاسلام ولھم علیھم مال کثیر"	اسلام آیا تو ان کا ان پر بہت سارا مال واجب تھا۔

اور ———

"کان بنو المغیرۃ یربون لثقیف"[۵] "بنو مغیرہ بنو ثقیف کو سود دیا کرتے تھے۔"

واضح رہے کہ قبائل عرب کی حیثیت مشترکہ کمپنیوں کی سی تھی جو افراد کے مشترکہ سرمایہ سے کاروبار کرتی تھیں اس لیے ایک قبیلے سے دوسرے قبیلہ کا اجتماعی طور پر قرض لینا عموماً کاروبار کے لیے ہوتا تھا اور اس کو بھی قرآن کریم نے ممنوع قرار دیدیا۔

---

[۵] تفسیر الدر المنثور بحوالہ ابن جریر ج ۱ ص ۳۶۶

غرض اسلامی نظام معیشت میں جو شخص کاروباری آدمی کو اپنا روپیہ کاروبار میں لگانے کیلئے دینا چاہتا ہے۔ اسے پہلے یہ متعین کرنا پڑے گا کہ وہ روپیہ کاروبار کے نفع میں خود حصہ دار ہونے کے لیے دے رہا ہے۔ یا وہ اس روپیہ سے اس کاروباری آدمی کی امداد کرنا چاہتا ہے اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ روپیہ دے کر کاروبار کے نفع سے مستفید ہو تو اسے "شرکت" یا "مضاربت" کے طریقوں پر عمل کرنا پڑے گا۔ یعنی اسے کاروبار کے نفع و نقصان کی ذمہ داری بھی اٹھانی پڑیگی کاروبار کو نفع ہوا تو وہ نفع میں شریک ہوگا اور اگر کاروبار کو خسارہ ہوا تو اسے خسارے میں بھی حصہ دار ہونا پڑے گا۔

اور اگر وہ روپیہ دوسرے کی امداد کی غرض سے دے رہا ہے تو پھر ضروری ہے کہ وہ اس امداد کو امداد ہی سمجھے۔ اور "نفع" کے ہر مطالبہ سے دستبردار ہو جائے۔ وہ صرف اتنے ہی روپے کی واپسی کا مستحق ہوگا جتنے اس نے قرض دئیے تھے۔ اسلام کی نظر میں اس ناانصافی کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ وہ اپنے "سود" کی ایک شرح متعین کر کے نقصان کا سارا بوجھ مقروض پر ڈالے۔

اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ اسلام میں "نقصان کا خطرہ مول لینے" کی ذمہ داری "سرمایہ" پر ہے۔ جو شخص کاروبار میں سرمایہ لگائے گا اسے یہ خطرہ ضرور مول لینا پڑے گا[1] لہٰذا اگر "آجر" کی بنیادی خصوصیت یہ ہے (جیسا کہ بیشتر ماہرین معاشیات کا خیال ہے) کہ وہ "خطرہ مول لیتا ہے" تو یہ خصوصیت اسلام کی نظر میں درحقیقت "سرمایہ" کی ہے۔ اس لیے اسلامی نظام معیشت میں سرمایہ اور آجر ایک ہی چیز ہو جاتے ہیں، اور تقسیم دولت میں ان کا حصہ منافع ہے نہ کہ سود۔

اور اگر آجر کی بنیادی خصوصیت یہ سمجھی جائے کہ وہ تنظیم اور منصوبہ بندی کرتا ہے (جیسا کہ بعض ماہرین معاشیات کا خیال ہے) تو پھر یہ کام "محنت" میں داخل ہے اور اسے الگ عامل پیدا وار سمجھنا طول لاطائل ہے۔

کرایہ اور سود کا فرق

مذکورہ بحث سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اسلام کی رو سے منافع اور اجرت جائز ہے اور سود ناجائز۔ اب چوتھی چیز "کرایہ" رہ جاتی ہے۔

---

[1] اگر کسی شخص نے قرض حسن لے کر کاروبار میں سرمایہ لگایا ہے اور دائن کیساتھ شرکت یا مضاربت کا معاملہ نہیں کیا تو قرض لینے کے بعد مدیون خود اس روپے کا مالک ہو گیا اب وہ خود سرمایہ دار کی حیثیت سے روپیہ لگا رہا ہے اسلیے نقصان کی ذمہ داری اسی پر ہوگی۔

اسلام نے اسے بھی جائز قرار دیا ہے۔ بعض حضرات کو یہاں یہ اشکال ہونے لگتا ہے کہ جب سرمایہ پر سود کا لین دین متعین ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے تو زمین کا کرایہ (واضح رہے کہ ہماری اصطلاح میں زمین کے اندر مشینری وغیرہ بھی داخل ہے) کیوں جائز ہے جبکہ وہ بھی متعین ہوتا ہے؟

اس سوال کے جواب کے لیے پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ معیشت کے مادی وسائل دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک تو وہ جنھیں استعمال کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے انھیں خرچ کرنا نہیں پڑتا۔ بلکہ وہ اپنا وجود برقرار رکھتے ہوئے فائدہ دیتے ہیں۔ مثلاً زمین، مشینری، فرنیچر، سواری وغیرہ کہ ان کے وجود کو باقی رکھتے ہوئے ان سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ ان سے مستفید ہونے کے لیے انھیں خرچ یا فنا کرنا نہیں پڑتا۔ ایسی چیزیں چونکہ بذات خود قابل استفادہ ہوتی ہیں۔ اور ان کے بہت سے فوائد ہیں جنھیں حاصل کرنے کے لیے کرایہ پر لینے والے کو ذرہ برابر محنت نہیں کرنی پڑتی۔ دوسری طرف ان کے استعمال سے ان کی قدر گھٹتی ہے۔ اس لیے ان کے منافع کی اجرت کا لین دین بالکل معقول اور درست ہے۔ اور اسی "منافع" کی اجرت کو اسلام "کرایہ" کہتا ہے۔

اس کے برخلاف نقد روپیہ وہ چیز ہے جس سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے اسے خرچ یا فنا کرنا پڑتا ہے۔ اس سے کسی قسم کا فائدہ اس وقت تک نہیں اٹھایا جا سکتا جب تک کہ اس سے کوئی چیز خریدی نہ جائے۔ لہٰذا روپیہ چونکہ بذات خود قابل استفادہ نہیں ہوتا۔ اس لیے ایک طرف اس سے جس قسم کا فائدہ بھی مقروض اٹھانا چاہے اسے خرچ کر کے خود کچھ عمل کرنا پڑتا ہے۔ دوسری طرف مقروض کے استعمال کی وجہ سے روپیہ کی قدر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اس لیے اس پر کوئی معین "شرح سود" مقرر کرنے میں کوئی معقولیت نہیں ہے۔ روپیہ کے مالک کو اختیار ہے کہ وہ چاہے تو قرض نہ دے یا چاہے تو اس کے ذریعہ روپے کے حاجتمند کے ساتھ شرکت و مضاربت کا کاروبار کرے۔ لیکن اگر وہ قرض دیتا ہے تو اس پر معین "شرح" سے سود لینے کی اسلام اجازت نہیں دے سکتا۔

اسی بنا پر ہم نے یہ اصطلاح مقرر کی ہے کہ جو چیزیں بذاتِ خود خرچ کیے بغیر قابل استفادہ نہیں ہوتیں وہ سرمایہ کہلائیں گی اور جب وہ عامل پیداوار کی حیثیت سے کاروبار میں شریک ہوں گی تو "منافع" کی مستحق ہوں گی اور جو چیزیں خرچ کیے بغیر قابل استفادہ ہوتی ہیں وہ

"زمین" کہلائیں گی اور عمل پیدائش میں حصہ دار ہونے کی وجہ سے انھیں "کرایہ" کی صورت میں دولت تقسیم کی جائے گی۔

حرمت سود کا اثر تقسیم دولت پر

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہوئی ہے کہ اسلام اور سرمایہ داری کے نظام تقسیم دولت میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معاشیات میں سود جائز ہے اور اسلام میں ناجائز اب مختصراً اس پہلو پر نظر ڈال لینا بھی مناسب ہوگا کہ حرمت سود کے معاشی اثرات کیا ہیں؟

یوں تو "سود" کی حرمت سے "پیدائش دولت" کے نظام پر بھی بڑے گہرے دور رس اور مفید اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اس لیے یہاں اس کے صرف ان اثرات کی طرف مجمل اشارے عرض کیے جاتے ہیں جو "تقسیم دولت" کے نظام پر مرتب ہوتے ہیں۔ حرمت سود کا ایک سادہ اثر تو یہ ہے کہ اس کی وجہ سے تقسیم دولت کے نظام میں توازن اور ہمواری پیدا ہو جاتی ہے۔ سودی نظام معاشیات کا یہ خاصہ لازمہ ہے کہ اس میں ایک فریق (سرمایہ) کا نفع تو معین صورت میں بہرحال کھرا رہتا ہے لیکن اس کے مقابل دوسرے فریق (محنت) کا نفع مشتبہ اور موہوم رہتا ہے۔ وسیع پیمانہ کی تجارتیں خواہ کتنی ہی نفع بخش کیوں نہ ہو جائیں، انھیں بہرحال "خطرے" سے خالی نہیں کہا جا سکتا بلکہ جہاں موجودہ وسائل معیشت کی فراوانی سے بڑے پیمانہ کی تجارتوں کے خطرات کم ہوئے ہیں۔ وہاں کچھ خارجی عوامل کی بنا پر ان میں اضافہ بھی ہوا ہے اور تجارت جتنے بڑے پیمانے کی ہوتی ہے۔ یہ خطرات بھی اتنے وسیع ہو جاتے ہیں۔ اس لیے سرمایہ دارانہ معیشت میں تقسیم دولت کا توازن نہایت ناہموار ہو جاتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قرض لینے والے کو سخت نقصان اٹھانا پڑا لیکن قرض دینے والے کی تجوری بھرتی ہی چلی گئی اور کبھی اس کے برعکس یہ ہوتا ہے کہ آجر کو بے انتہا منافع ہوا اور سرمایہ دینے والے کو اس میں سے بہت معمولی سا حصہ مل سکا۔

اس کے برخلاف اسلامی نظام میں چونکہ سود حرام ہے اس لیے موجودہ دنیا میں عموماً شغل سرمایہ کی صرف دو صورتیں ہوں گی۔ شرکت اور مضاربت اور یہ دونوں صورتیں تقسیم دولت کی اس غیر منصفانہ ناہمواری سے خالی ہیں۔ ان صورتوں میں نقصان ہوتا ہے تو فریقین کو ہوتا

ہے۔ اور نفع ہوتا ہے تو دونوں فریق تناسب طریقے سے اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ "ارتکاز دولت" جو سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی بدترین خرابی ہے۔ اس طریقے کی بدولت اس کی بڑی حد تک موثر روک تھام ہو جاتی ہے۔ اور دولت کا ذخیرہ چند ہاتھوں میں سمٹنے کے بجائے معاشرے کے افراد میں اس طرح پھیلتا ہے کہ اس سے کسی شخص پر کوئی ظلم نہیں ہو پاتا۔ سرمایہ داری میں سود کی وجہ سے سرمایہ دار صرف یہ کہ دولت کے بڑے خزانے پر قابض ہو جاتے ہیں بلکہ وہ پورے بازار پر بھی پوری خود غرضی کے ساتھ حکمرانی کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں "رسد اشیاء" اور "قیمتوں" کا نظام بھی قدرتی رہنے کے بجائے مصنوعی ہو جاتا ہے۔ اور معیشت و اخلاق سے لے کر ملکی سیاست تک زندگی کا کوئی گوشہ اس کے برے اثرات سے محفوظ نہیں رہتا۔

اسلام نے "سود" کو ممنوع قرار دے کر ان تمام خرابیوں کی بنیاد کو منہدم کر دیا ہے۔ اسلامی نظام میں ہر روپیہ لگانے والا کاروبار اور اس کی پالیسی میں شریک ہوتا ہے۔ نفع و نقصان کی ذمہ داریاں بھی اٹھاتا ہے۔ اور اس طرح اس کی کاروباری مرضی بے لگام نہیں ہونے پاتی۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

یہاں ایک شبہ کا ازالہ کر دینا مناسب ہوگا۔ "سود" کے نقصانات کے بارے میں جو یہ کہا گیا ہے کہ اس کی وجہ سے تقسیم دولت میں ناہمواری پیدا ہوتی ہے اور فریقین میں سے کوئی نہ کوئی اس سے متاثر ہوتا ہے۔ اس پر بعض حضرات کے دل میں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ سودی کاروبار میں جس شخص کو بھی نقصان پہونچتا ہے وہ اس کی مرضی سے پہونچتا ہے اور جب وہ خود یہ خطرہ مول لینے پر راضی ہے تو اس میں قانون شریعت کیوں دخل انداز ہوتا ہے؟

حالانکہ ذرا سا غور کیا جائے تو اس کا جواب سمجھنا کوئی مشکل نہیں۔ اسلامی نظام زندگی کا معمولی سا مطالعہ بھی یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ اسلام میں فریقین کی باہمی رضامندی ہمیشہ کسی معاملہ کی وجہ جواز نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص دوسرے کے ہاتھوں قتل ہو جانے پر راضی ہو تو یہ بات قاتل کو جرم سے بری نہیں کر سکتی۔ یہاں تک کہ "زنا" جسے مغربی تہذیب کی تنگ نظری نے خالص نجی زندگی کا مسئلہ سمجھا ہے۔ اس میں بھی فریقین کی رضامندی مجرموں کو بری نہیں کر سکتی۔ دولت کی تقسیم اور معاشی نظام کی بہبود کا معاملہ تو اس سے

کچھ آگے ہی ہے۔ شروع میں قرآن کریم کے حوالوں سے عرض کیا جا چکا ہے کہ

دولت اصلاً اللہ کی ملکیت ہے اور اس نے انسان کو جو ملکیت عطا کی ہے وہ آزاد اور بے لگام ہونے کے بجائے اصولوں کی پابند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر وہ معاملہ جو اسلام کی نظر میں فی نفسہ غیر منصفانہ ہے یا جس کا اثر معاشرے کی اجتماعی بہتری پر پڑ سکتا ہے۔ اس میں اسلام نے فریقین کی رضامندی کو وجہ جواز قرار نہیں دیا۔ احادیث میں فریقین کی رضامندی کے باوجود "تلقی الجلب" "بیع الحاضر للباد" "محاقلہ" "مزابنہ" اور "مخابرہ" وغیرہ کی شدید ممانعت آئی ہے۔ اس کے پیچھے یہی حکمت کارفرما ہے اس لیے "سود" کے معاملہ کو بھی محض اس بنا پر جائز قرار نہیں دیا جا سکتا کہ فریقین اس پر رضامند ہیں۔

جاہلیت کے لوگ حرمت سود پر اس قسم کا اعتراض کرتے تھے کہ

"انما البیع مثل الربوا" "بیع ربوا ہی کی طرح تو ہے"

قرآن کریم نے مختصر لفظوں میں اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ

"واحل اللہ البیع وحرم الربوا" "اور اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور ربا کو حرام"

یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ان کے اعتراض کے جواب میں "حرمت سود" کی کوئی حکمت اور مصلحت نہیں بیان فرمائی۔ بلکہ صرف یہ فرمایا ہے کہ جب اللہ نے بیع کو حلال اور ربوا کو حرام کر دیا ہے تو خواہ اس کی مصلحت تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے اس حکم کو ماننا پڑے گا۔ یہاں قرآن کریم نے حکمتوں کو بیان فرمانے کے بجائے حاکمانہ اسلوب اختیار فرمایا ہے جس سے حرمت سود پر ہر قسم کے اعتراض کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ سود کی حرمت اسلام کا وہ حکیمانہ فیصلہ ہے جس کی وجہ سے سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی بہت سی خرابیاں بھی دور ہو جاتی ہیں اور اس کے بعد اشتراکیت کے ستبد اور غیر فطری نظام معیشت کو اختیار کرنے کی بھی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہی وہ اعتدال کی راہ ہے جو موجودہ دنیا کو افراط و تفریط سے نجات دلا کر ایک متوازن اور منصفانہ نظام معیشت کی طرف رہنمائی کر سکتی ہے۔ فرانسیسی پروفیسر لوئی ماسین نون نے بڑی سچی بات کہی ہے کہ

سرمایہ داری اور اشتراکیت کے تصادم میں اسی تمدن اور تہذیب کا مستقبل

محفوظ اور درخشاں رہے گا جو سود کو ناجائز قرار دے کر اس پر عمل بھی کرا رہا ہو۔[1]

اجرتوں کا مسئلہ

یہاں تک تقسیم دولت کے معاملہ میں اسلام اور سرمایہ داری کا ایک بنیادی فرق واضح ہوا ہے اور وہ ہے مسئلہ سود۔ اس کے بعد ان دونوں کے درمیان ایک اور فرق کو ذہن میں رکھنا بھی ضروری ہے جو آجر اور اجیر کے رشتے سے متعلق ہے اور جس میں اجرتوں کا مسئلہ زیر بحث آتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف موجودہ دنیا میں جو شدید ردعمل ہوا ہے اس کی بہت بڑی وجہ آجر اور اجیر کے جھگڑے اور اجرتوں کی تعین کے مسائل تھے۔ سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی بنیاد ہی چونکہ خودغرضی اور بے لگام انفرادی ملکیت پر ہے۔ اس لیے اس نظام میں آجر اور اجیر کے درمیان "رسد و طلب" کا ایک ایسا خشک، کھردرا اور رسمی تعلق ہے جس کی بنیاد خالص خودغرضی پر استوار ہوئی ہے۔ آجر صرف اسی حد تک اجیر کی انسانیت کا احترام کرتا ہے، جب تک وہ اپنے کاروبار کے لیے اس کے ہاتھوں مجبور ہے۔ لہٰذا جہاں یہ مجبوری ختم ہو جاتی ہے وہاں وہ اس پر اپنے ظلم کا شکنجہ کس دیتا ہے۔ دوسری طرف اجیر صرف اس وقت تک آجر کے کام اور اسکے احکام سے دلچسپی رکھتا ہے جب تک اس کا روزگار کسی آجر پر موقوف ہو، لہٰذا جہاں اس کی یہ مجبوری ختم ہو جاتی ہے وہاں وہ کام چوری اور ہڑتال سے نہیں چوکتا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مزدور اور سرمایہ دار میں ایک ابدی کشمکش قائم رہتی ہے اور دونوں کے درمیان کوئی صحت مند رابطہ قائم نہیں ہو پاتا۔

اس کے برخلاف اسلام نے اگرچہ آجر اور اجیر کے درمیان رسد اور طلب کے نظام کو ایک حد تک تسلیم کیا ہے لیکن ساتھ ہی محنت کی رسد اور طلب دونوں پر کچھ ایسی پابندیاں عائد کر دی ہیں کہ ان کا کاروباری رابطہ ایک خشک رسمی تعلق نہیں رہا۔ بلکہ بڑی حد تک بھائی چارہ بن گیا ہے آجر کا نقطۂ نظر اجیر کے بارے میں کیا ہونا چاہیے؟ اس کو قرآن کریم نے حضرت شعیب علیہ السلام کا ایک مقولہ نقل فرماتے ہوئے مختصر لفظوں میں واضح فرما دیا ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے "آجر" تھے اور انھوں نے فرمایا۔

[1] ڈاکٹر یوسف الدین۔ اسلام کے معاشی نظریے ص ۲۸۰ ج ۱ بحوالہ ڈاکٹر حمید اللہ مجمن امدائے قرضہ حسنہ کی اہمیت مجلہ طیلسانین عثمانیہ ج ۲، حصہ معاشیات رج ۳ سنہ ۱۹۴۳ء۔

"وما اريد ان اشق عليك ستجدنی ان شاء الله من الصالحين"۔	"میں تم پر (غیر ضروری) مشقت ڈالنا نہیں چاہتا۔ خدا نے چاہا تو مجھے نیکو کار پاؤ گے"

اس آیت نے واضح فرما دیا کہ ایک مسلمان آجر جس کی اصلی منزل مقصود "صالح" ہونا ہے اس وقت تک "صالح" نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے اجیر کو غیر ضروری مشقت سے بچانے کا داعیہ نہ رکھتا ہو، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو مزید واضح الفاظ میں اس طرح کھول دیا ہے کہ

"ان اخوانکم خولکم جعلهم الله تحت ايديكم فمن كان أخوه تحت يده فليطعمه مما يأكل وليلبسه مما يلبس ولا تكلفوهم ما يغلبهم فان كلفتموهم ما يغلبهم فاعينوهم"[1]۔	"تمہارے بھائی تمہارے خادم ہیں جنھیں اللہ نے تمہارا زیردست کیا ہے۔ لہٰذا جس شخص کا بھائی اس کا ماتحت ہو اسے چاہیے کہ جو کچھ وہ خود کھائے اس میں سے اس کو بھی کھلائے اور جو خود پہنے اس میں سے اس کو بھی پہنائے اور ان پر کسی ایسے کام کا بوجھ نہ ڈالو جو ان کی طاقت سے زیادہ ہو۔ اور اگر کسی ایسے کام کا بوجھ ڈالو تو خود ان کی مدد کرو۔"

نیز ارشاد فرمایا کہ

"اعطوا الاجير أجره قبل ان يجف عرقه"[2]۔	"مزدور کی اجرت اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دو۔"

اسی طرح آپ کا ارشاد ہے کہ تین شخص ایسے ہیں جن کا میں قیامت کے دن دشمن ہوں گا۔ ان میں سے ایک وہ ہے کہ

"رجل استاجر اجيراً فاستوفى منه ولم يعطه اجره"[3]	"وہ شخص جو کسی مزدور کو اجرت پر لے۔ پھر اس سے کام پورا لے۔ اور اس کو اس کی اجرت نہ دے"

---

[1] صحیح بخاری کتاب العتق ص ۳۴۹ ج اول [2] ابن ماجہ و طبرانی عن ابن عمر، جمع الفوائد ص ۲۵۹ جلد اول۔ میرٹھ ۱۳۴۵ھ [3] صحیح بخاری کتاب الاجارہ بروایت ابو ہریرہ ص ۳۰۲ جلد اول

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مزدور کے حق کا کس قدر احساس تھا۔ اس کا اندازہ حضرت علیؓ کی ایک روایت سے ہوتا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ وفات سے قبل آپؐ کے آخری الفاظ یہ تھے۔

"الصلوٰۃ وما ملکت ایمانکم"[۱]　　"نماز کا خیال رکھو۔ اور ان لوگوں (کے حقوق) کا خیال جو تمہارے زیر دست ہیں"

ان ہدایات کے نتیجے میں "مزدور" کو اسلامی معاشرہ میں جو باوقار اور برادرانہ مقام حاصل ہوا اس کی بے شمار مثالیں قرون اولی کی اسلامی تاریخ میں ملتی ہیں اور پورے وثوق اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ "مزدور" کے حقوق کی رعایت اس سے بہتر طریقے پر ممکن ہی نہیں ہے۔

دوسری طرف اسلام نے "اجیر" کو بھی کچھ احکام کا پابند بنا کر آجر سے اس کے تعلقات کو مزید خوشگوار کر دیا ہے۔ مزدور آجر کے جس کام کی ذمہ داری اٹھاتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے وہ ایک ایسا معاہدہ ہوتا ہے جس کی پابندی اسے صرف اپنا پیٹ بھرنے کے لیے نہیں کرنی ہے بلکہ اس کی اصل منزل مقصود یعنی آخرت کی بہتری بھی اس پر موقوف ہے قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

"یا ایھا الذین اٰمنوا اوفوا بالعقود"　　"اے ایمان والو۔ تم اپنے معاہدوں کو پورا کرو"

اور ـــــــ

"ان خیر من استاجرت القوی الامین"　　"بہترین اجیر وہ ہے جو قوی بھی ہو اور امانتدار بھی ہو۔"

نیز ارشاد ہے۔

"ویل للمطففین الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون واذا کالوھم او وزنوھم یخسرون۔"　　"دردناک عذاب ہے ان ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے جو اپنا حق لینے کے وقت پورا پورا وصول کریں اور جب انھیں ناپ یا تول کر دینے کا موقع آئے تو کمی کر جائیں"

فقہائے امت کی تصریحات کے مطابق اس آیت "تطفیف" یا ناپ تول میں کمی کرنے

---

[۱] ابن ماجہ (جمع الفوائد ص ۲۹۴ جلد اول)

والے کے مفہوم میں وہ مزدور بھی داخل ہے جو طے شدہ اجرت پوری وصول کرنے کے باوجود کام چوری کا مرتکب ہو، اور اپنے جو اوقات اس نے آجر کو دے دیے ہیں انھیں آجر کی مرضی کے خلاف کسی اور کام میں صرف کرے۔ اس لیے ان احکام نے "کام چوری" کو گناہ عظیم قرار دے کر اجیر کو بھی یہ جتلا دیا ہے کہ جس آجر کا کام کرنا اس نے قبول کیا ہے۔ اس کی ذمہ داری اٹھا لینے کے بعد اب وہ خود اس کا اپنا کام بن گیا ہے اور اس کے ذمے ضروری ہے کہ وہ پوری دیانتداری مستعدی اور لگن کے ساتھ اسے انجام دے۔ ورنہ وہ آخرت کی اس بہتری کو حاصل نہ کر سکے گا جو اس کا اصل منتہائے مقصود ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسلام نے اجرتوں کے سلسلے میں "رسد وطلب" کے نظام کو ایک حد تک تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ آجر اور اجیر دونوں کے لیے کچھ ایسے احکام دیے ہیں کہ ان کی وجہ سے "رسد وطلب" کا یہ نظام خود غرضی کے بجائے اخوت وہمدردی پر مبنی ہو گیا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ یہاں کسی صاحب کو یہ شبہ پیدا ہو کہ آجر اور اجیر دونوں پر پابندیاں عائد کرنے کے لیے قرآن وسنت نے جو احکام دیے ہیں ان کی حیثیت اخلاقی ہدایات کی سی ہے۔ جو ٹھیٹھ معاشی اور قانونی نقطۂ نظر سے خارج از بحث ہیں ___ لیکن یہ اعتراض اسلام کے مزاج کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہوگا۔ یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اسلام محض ایک معاشی نظام ہی نہیں ہے بلکہ وہ زندگی کا ایک مکمل دستور العمل ہے جس میں زندگی کے تمام شعبے باہم مربوط ہو کر ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک شعبے کو دوسرے تمام شعبوں سے کاٹ کر سمجھنے کی کوشش لازماً غلط فہمیاں پیدا کرے گی۔ اس کے ہر شعبہ کا صحیح رد کار اسی وقت سامنے آسکتا ہے جب اسے اس کے مجموعی نظام زندگی میں فٹ کر کے دیکھا جائے اس لیے اسلامی معاشیات کی بحث میں ان اخلاقی ہدایات کو خارج از بحث قرار نہیں دیا جا سکتا۔

پھر اسلام کا ایک امتیاز یہ ہے کہ اگر ذرا وسیع نظر سے دیکھا جائے تو اس کی اخلاقی ہدایات بھی درحقیقت قانونی احکام ہیں اس لیے کہ ان پر بالآخر آخرت کی جزا و سزا مرتب ہوتی ہے جس کو ایک مسلمان کی زندگی میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہ "عقیدۂ آخرت" ہی وہ چیز ہے جس نے نہ صرف یہ کہ اخلاق کو قانون کا درجہ عطا کیا ہے بلکہ اصطلاحی قوانین کی پشت پناہی بھی کی ہے

قرآن کریم کے اسلوب پر اگر آپ غور فرمائیں تو نظر آئے گا کہ اس کے ہر قانونی اور اخلاقی حکم کے ساتھ "خوف خدا" اور "فکر آخرت" کے مضامین لگے ہوئے ہیں۔ اس میں اصلی راز یہی ہے کہ درحقیقت قانون کی پابندی محض انسانی ڈنڈے کے زور سے کبھی نہیں کرائی جا سکتی تا وقتیکہ انسان کی ہر نقل و حرکت اور ہر فکر و عمل پر پہرہ دینے کے لیے "فکر آخرت" موجود نہ ہو، یوں تو دنیا کی ہزار سالہ طویل تاریخ جو پوری قانونی جکڑ بندیوں کے باوجود مظالم اور جرائم کی داستانوں سے بھری ہوئی ہے اس ناقابل انکار حقیقت کی تصدیق کرتی ہے۔ لیکن خاص طور سے آج کی مہذب دنیا نے تو اسے روز روشن کی طرح عیاں کر دیا ہے کہ جس رفتار سے قانونی مشینریوں میں اضافہ ہو رہا ہے اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے جرائم بڑھ رہے ہیں۔

اس لیے یہ سمجھنا کہ "اجیر" اور "آجر" کے تعلقات محض قانونی جکڑ بندیوں سے درست ہو سکیں گے انتہا درجہ کی خود فریبی کے سوا کچھ نہیں، اس کا اصلی علاج صرف اور صرف "فکر آخرت" ہے اور اس معاملہ میں اسلام نے اسی پر زیادہ زور دیا ہے۔

آج کا ذہن جو محض دنیوی زندگی کے اُلٹ پھیر میں اُلجھ کر مادے کے اس پار جھانکنے کی صلاحیت کھو چکا ہے۔ اس کے لیے شاید اس بات کو سمجھنا مشکل ہو لیکن یقین ہے کہ اگر امن و سکون انسانیت کے لیے مقدر ہے تو وہ سینکڑوں ٹھوکریں کھا کر بالآخر اس حقیقت تک پہونچے گی جس کی طرف قرآن کریم نے بار بار توجہ دلائی ہے۔ جس زمانے میں اسلام ایک عملی نظام کی حیثیت سے اس دنیا میں کار فرما تھا، اس وقت دنیا اس قرآنی نظریہ کی صداقت کو خوب اچھی طرح دیکھ چکی ہے۔ اس دور کی تاریخ میں "آجر" اور "اجیر" کے جھگڑوں کی یہ کیفیت ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی جس نے کچھ عرصہ سے پوری دنیا کو تہ و بالا کر رکھا ہے۔ قرآن و سنت کی یہی وہ اخلاقی ہدایات تھیں جنھوں نے اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل پیش کر کے دکھا دیا اور جن کی وجہ سے اسلام کے قرون اولیٰ کی تاریخ آج کے جبر و تشدد اور اجیر کی ہڑتالوں سے تقریباً خالی نظر آتی ہے۔

تقسیم دولت کے ثانوی مدّات

اب تک ہماری بحث تقسیم دولت کے اولین حقداروں سے متعلق تھی۔ اسلامی نظریہ تقسیم دولت کی ایک

نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے معاشرے کے کمزور عناصر کو قوی کرنے اور بیکار افراد کو کام کے قابل بنانے کے لیے عاملین پیداوار کے ساتھ دولت کے ثانوی مستحقین کی ایک طویل فہرست دی ہے اور اس کا ایک باقاعدہ نظام بنایا ہے۔

مقالے کی تمہید میں اس بات کی طرف اشارے کیے جا چکے ہیں کہ دولت اصلاً اللہ کی ملکیت ہے۔ وہی اس کا پیدا کرنے والا ہے۔ اور اسی نے انسان کو اس پر ملکیت کے حقوق عطا کیے ہیں۔ انسان کو اس کے کسب و عمل کا جو بھی صلہ ملتا ہے وہ اس کا مالک ضرور ہے لیکن چونکہ کسب و عمل کی تمام توفیق اللہ دیتا ہے اور دولت کی تخلیق بھی اسی نے کی ہے۔ اس لیے انسان اپنی ملکیت کے استعمال میں قطعی طور پر خود مختار نہیں ہے۔ بلکہ اللہ کے احکام کا پابند ہے۔ لہٰذا جس جگہ خرچ کرنے کا وہ حکم دیدے انسان کے لیے وہاں خرچ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

اس بنیادی نظریے سے عمل پیدائش کے علاوہ استحقاق دولت کی ایک دوسری مد خود بخود نکل آتی ہے یعنی ہر وہ شخص اسلامی نقطۂ نظر سے دولت کا مستحق ہے جس تک دولت کا پہونچانا اللہ نے دولت کے اولین مالکوں کے ذمہ فرض قرار دیا ہے اس طرح تقسیم دولت کے ثانوی مدات کی ایک طویل فہرست مرتب ہو جاتی ہے۔ جن میں سے ہر ایک دولت کا مستحق ہے۔

ان مدات کو مقرر کر کے اسلام در حقیقت یہ چاہتا ہے کہ دولت کو معاشرے میں زیادہ سے زیادہ گردش دی جائے اور ارتکاز دولت پر جو پابندیاں "سود" کی حرمت کے ذریعہ عائد کی گئی ہیں ان کو مزید توسیع دی جائے۔ ان مدات کا تفصیلی بیان تو اس مختصر مقالے میں ممکن نہیں ہے تاہم انہیں اختصار کے ساتھ شمار کیا جاتا ہے۔

زکوٰۃ:۔ ان میں سب سے پہلا اور سب سے زیادہ وسیع مد "زکوٰۃ" ہے قرآن کریم نے بے شمار مقامات پر اس فریضہ کو "نماز" کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ہر وہ شخص جو سونے چاندی۔ مویشی اور مال تجارت کا مقدار نصاب کی حد تک مالک ہو۔ اس کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ سال گزرنے پر اپنی ان مملوکات کا ایک حصہ دوسرے ضرورت مند افراد پر صرف کرے۔ اور جو شخص اس فریضہ کو ادا نہ کرے اس کے لیے قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ۔

"الذین یکنزون الذهب والفضة — جو لوگ سونے اور چاندی کو جمع کر کے رکھتے ہیں اور

ولا ینفقونہا فی سبیل اللہ	اور اسے اللہ کے راستہ میں خرچ نہیں کرتے
فبشرھم بعذاب الیم یوم	ان کو آپ دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے۔
یحمیٰ علیہا فی نار جہنم	جس دن اس (دولت) کو جہنم کی آگ میں
فتکویٰ بہا جباھہم وجنوبہم	گرم کیا جائے گا۔ پھر اس سے انکی پیشانیوں
وظہورھم ھذا ما کنزتم	اور پہلوؤں اور پشتوں کو داغا جائے گا۔ یہ
لانفسکم فذوقوا ما کنتم	وہ مال ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا۔
تکنزون"	چکھو جسے تم جمع کیا کرتے تھے۔

پھر اس زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے قرآن کریم نے آٹھ مصارف خود مقرر فرما دیے ہیں۔

اس طرح "زکوٰۃ" کے اس مد کے لیے آٹھ مصارف مقرر فرما کر قرآن کریم نے دولت کی زیادہ سے زیادہ گردش کا دروازہ کھول دیا ہے۔

"زکوٰۃ" کے مصارف میں استحقاق کی قدر مشترک "ناداری" اور "افلاس" ہے اور اس مد میں افلاس ہی کے خاتمہ پر زور دیا گیا ہے۔ اس طریقے سے نادار اور مفلس افراد کے درمیان کس قدر وسیع پیمانہ پر تقسیم دولت ممکن ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۶۵ء میں پاکستان کی قومی آمدنی تقریباً پندرہ ارب تیس کروڑ روپے تھی۔ زکوٰۃ کی ادنیٰ ترین شرح یعنی ۲٫۵ فیصد کے حساب سے اگر قومی آمدنی کی پوری زکوٰۃ نکالی جائے تو کم از کم اڑتیس کروڑ پچیس لاکھ روپیہ سالانہ صرف غریبوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر تمام عالمی پیداوار ہر سال باقاعدگی کے ساتھ زکوٰۃ نکالیں تو سالانہ کتنی خطیر رقم سرمایہ داروں کی جیب سے نکل کر غریبوں اور ناداروں کے پاس پہونچتی ہے۔ اور اس طرح تقسیم دولت کی ناہمواری کتنی تیزی سے رفع ہو سکتی ہے۔

(۲) عُشر:- "عشر" درحقیقت زمینی پیداوار کی "زکوٰۃ" ہے لیکن چونکہ اس پیداوار میں انسانی محنت کا دخل نسبتہً کم ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی شرح ۲٫۵ فیصد کے بجائے ۱۰ فیصد رکھی گئی ہے۔ "عشر" صرف ان زمینوں کی پیداوار پر واجب ہوتا ہے جو فقہی تفصیلات کے مطابق عشری ہوں اور اس کو زکوٰۃ ہی کے مصارف پر خرچ کیا جاتا ہے۔

(۳) **کفّارات:** معاشرے کے سینکڑوں افراد تک دولت پہونچانے کا ایک مستقل راستہ اسلام نے کفارات کے ذریعہ مقرر کیا ہے۔ کوئی شخص بلا عذر رمضان کا روزہ توڑ دے، یا کسی مسلمان کو بلا عمد قتل کر دے یا اپنی بیوی سے ظہار کرے یا قسم کھا کر اسے توڑ دے تو بعض صورتوں میں لازمی اور بعض صورتوں میں اختیاری طور پر اسے حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے مال کا کچھ حصہ ناداروں پر خرچ کرے۔ یہ نقد روپے کی شکل میں بھی ہو سکتا ہے اور کھانے کپڑے کی صورت میں بھی۔

(۴) **صدقۃ الفطر:** اس کے علاوہ جو لوگ صاحب نصاب ہوں ان کے لیے عید الفطر کے موقع پر لازم کیا گیا ہے کہ نماز عید کو جانے سے پہلے فی کس پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت مفلسوں ناداروں یتیموں اور بیواؤں پر خرچ کریں، یہ رقم نہ صرف اپنی طرف سے بلکہ اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے بھی نکالی جاتی ہے، اور اس کے وجوب کے لیے مقدار نصاب کا "لازمی" ہونا یا اس پر پورا سال گزرنا بھی ضروری نہیں ہے، لہٰذا اس فریضہ کا دائرہ "زکوٰۃ" سے بھی زیادہ وسیع ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ خاص طور سے ایک اجتماعی مسرت کے موقع پر زیادہ سے زیادہ مساوات پیدا کی جا سکتی ہے۔

مذکورہ بالا چار مدّات غریبوں اور مفلسوں میں دولت تقسیم کرنے کے لیے تھے۔ اس کے علاوہ دو مدّ وہ ہیں جن سے اعزہ و اقربا کی امداد اور ان تک دولت کا پہونچانا مقصود ہے ان میں سے ایک مد نفقات کی ہے اور دوسری وراثت کی۔

(۵) **نفقات:** اسلام نے ہر انسان پر یہ ذمہ داری عائد کی ہے کہ وہ اپنے خاص خاص رشتہ داروں کی معاشی کفالت کرے، پھر ان میں سے بعض تو وہ ہیں جن کی کفالت بہر صورت واجب ہے خواہ انسان تنگدست ہو یا خوش حال مثلاً بیوی نابالغ اولاد، اور بعض وہ ہیں جن کی کفالت کی ذمہ داری وسعت کے ساتھ مشروط ہے ایسے رشتہ داروں کی ایک طویل فہرست اسلامی فقہ میں موجود ہے، اور اس کے ذریعہ خاندان کے نادار اور کمزور افراد کی معاشی کفالت کا بڑا اچھا نظام بنایا گیا ہے۔

(۶) **وراثت:** اسلام کا نظام وراثت، اس کے نقطۂ تقسیم دولت میں ایک بنیادی امتیاز رکھتا ہے، وراثت کی مرتکز تقسیم سے تقسیم دولت میں جو ناہمواری پیدا ہوتی ہے۔ وہ

محتاج بیان نہیں مغربی ممالک میں اس ناہمواری کا ایک بہت بڑا سبب یہ ہے جس کا اقرار بہت سے ماہرین معاشیات نے کیا ہے۔

یورپ میں بالعموم اکبرالاولاد کی جانشینی کا طریقہ رائج ہے، جس میں سارا ترکہ بڑے لڑکے کو مل جاتا ہے، باقی سب محروم ہو جاتے ہیں۔ پھر بعض مقامات پر اگر مرنے والا چاہے تو کسی دوسرے شخص کے نام اپنے سارے ترکہ کی وصیت کر سکتا ہے، اور اس سلسلہ میں اسے نرینہ اولاد کو بھی محروم کرنے کا حق ہے۔ اس طریقہ کے نتیجہ میں دولت پھیلنے کے بجائے سمٹتی ہے، اس کے برعکس ہندو مذہب میں تقسیم وراثت کو مردوں میں تو اشتراکی حد تک مساوی کر دیا گیا ہے، لیکن عورتیں بہرحال وراثت سے محروم رکھی گئی ہیں جس سے ان پر ظلم ہونے کے علاوہ گردش دولت کا دائرہ اسلام کی بہ نسبت سمٹ جاتا ہے۔

اس کے برخلاف اسلام نے تقسیم وراثت کا جو نظام بنایا ہے اس میں ان تمام خرابیوں کا انسداد ہو جاتا ہے، اس نظام کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) قرابت کے لحاظ سے وارثوں کی ایک طویل فہرست رکھی گئی ہے جس کی وجہ سے متروکہ دولت زیادہ وسیع پیمانہ پر پھیلتی ہے۔ یہاں یہ بات قابل نظر ہے کہ دولت کے وسیع پھیلاؤ کے پیش نظر یہ حکم دیا جا سکتا تھا کہ سارا ترکہ غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے یا بیت المال میں داخل کر دیا جائے، لیکن اس صورت میں ہر مرنے والا کوشش کرتا کہ وہ اپنی زندگی ہی میں سارا مال ختم کر جائے۔ اور اس سے معیشت کے نظام میں ابتری پیدا ہو جاتی۔ اس لیے اسلام نے اُسے میت کے رشتہ داروں میں تقسیم کرنے کا نظام بنایا ہے جو مالک سرمایہ کی فطری خواہش ہے۔

(۲) دنیا کے تمام نظام ہائے وراثت کے برخلاف عورتوں کو بھی میراث کا مستحق قرار دیا گیا ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

للرجال نصيب مما ترك	مردوں کے لیے (بھی) ایک حصہ ہے۔ اس
الوالدان والاقربون و	مال میں جو والدین اور اقربا چھوڑ کر جائیں
للنساء نصيب مما ترك	اور عورتوں کے لیے بھی ایک حصہ ہے۔

الوالدان والاقربون مما	اس مال میں جو والدین اور اقارب چھوڑ کر
قل منہ او کثر نصیباً مفروضاً	جائیں، تھوڑے میں سے بھی اور زیادہ میں
(النساء)	سے بھی ایک معین حصہ ہے۔

(۳) مرنے والے کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ کسی وارث کو محروم کر دے یا کسی کے حصہ میں ترمیم کر سکے۔ اس طرح وراثت کے راستے سے ارتکاز دولت کا امکان ختم کر دیا گیا ہے ارشاد ہے:۔

اٰباؤکم و ابناؤکم لاتدرون	تمہارے باپ بیٹوں میں کون نفع کے اعتبار
ایّھم اقرب لکم نفعاً فریضۃ	سے تم سے قریب تر ہے؟ تم نہیں جانتے؟
من اللہ۔	یہ اللہ کا مقرر کیا ہوا قانون ہے۔

(۴) چھوٹی اور بڑی اولاد میں کوئی تفریق نہیں کی گئی بلکہ سب کو برابر حصہ دیا گیا ہے۔

(۵) کسی وارث کے لیے اس کے حصہ رسدی کے علاوہ کسی مال کی وصیت کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ اس طرح کوئی وارث متوفی کے مال سے اپنے حصہ وراثت کے سوا کچھ نہیں پا سکتا۔

(۶) متوفی کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ وارثوں کے سوا دوسرے لوگوں کے لیے وصیت کر جائیں؟ اس سے بھی دولت کے پھیلاؤ میں مدد ملتی ہے۔ اور تقسیم وراثت سے قبل دولت کا ایک حصہ وصیت پر صرف ہو جاتا ہے۔

(۷) لیکن وصیت کرنے والے کو اس بات کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ پورے مال کی وصیت کر جائے۔ بلکہ اسے اپنے مال کے صرف ایک تہائی حصہ میں ایسا کرنے کی اجازت دی گئی ہے؛ اس سے زیادہ کی وصیت کا وہ مجاز نہیں۔ اس طرح ارتکاز دولت کے اس خطرے کا سدباب بھی کر دیا گیا ہے جو پورے مال کی وصیت کی اجازت کی صورت میں پیدا ہو سکتا تھا اور اقرباء کے حقوق کو بھی محفوظ کر دیا گیا ہے۔

(۷) خراج و جزیہ:۔ مذکورہ بالا مدات کے علاوہ دو مد ایسے ہیں جن میں مالکان دولت کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی دولت کا کچھ حصہ حکومت وقت کو ادا

کردیں ایک خراج اور دوسرا جزیہ۔

خراج ایک قسم کا زمینی لگان ہے جو صرف ان زمینوں پر عائد کیا جاتا ہے جو فقہی تفصیلات کے مطابق خراجی ہوں اور اس کو حکومت اجتماعی کاموں میں صرف کرسکتی ہے اور جزیہ ایک تاوان غیر مسلم افراد سے وصول کیا جاتا ہے جو اسلامی حکومت کے باشندے ہوں۔ اور حکومت نے ان کے جان و مال اور آبرو کی حفاظت کا ذمہ لیا ہو۔ نیز ان غیر مسلم ممالک سے بھی جزیہ وصول کیا جاسکتا ہے جن سے جزیہ کی ادائیگی پر صلح ہو گئی ہو۔ یہ رقم بھی حکومت کے اجتماعی مقاصد میں صرف ہوتی ہے۔

اوپر تقسیم دولت کے جو قانونی مدات بیان کیے گئے ہیں۔ یہ سب وہ ہیں جن میں دولت صرف کرنا دولت کے اولین مالکوں کے ذمے شخصی طور پر واجب قرار دیا گیا ہے غربا و مساکین پر اور مسلمانوں کے اجتماعی مقاصد میں خرچ کرنے کی جو ترغیبات قرآن و سنت میں وارد ہوئی ہیں وہ ان کے علاوہ ہیں۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ	لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ
قُلِ الْعَفْوَ۔	کریں آپ فرما دیجئے کہ جو بچ رہے۔

اس ارشاد نے واضح فرما دیا ہے کہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ بات یہ ہے کہ انسان صرف مقدار واجب خرچ کرنے پر اکتفا نہ کرے، بلکہ جس قدر دولت اس کی ضرورت سے زائد ہو وہ سب معاشرے کے ان افراد تک پہونچانے کو اپنی سعادت سمجھے جو دولت سے محروم ہیں۔ قرآن کریم اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "انفاق فی سبیل اللہ" کے احکام و فضائل سے بھرے ہوئے ہیں۔

پیشہ ورانہ گداگری کا انسداد

معاشرہ کے کمزور افراد کو سرمایہ داروں کے اموال میں حق دلانے سے دوسری طرف معاشرہ میں اس خرابی کے امکانات تھے کہ معاشرہ کا یہ طبقہ مفلوج ہو کر ہمیشہ قوم پر بار بنا رہے۔ شریعت اسلام نے اس پر بھی گہری نظر کرکے اس کو بھی خاص قانون کا پابند بنایا ہے کہ

(۱) تندرست، توانا آدمی کو بجز مخصوص حالات کے سوال کرنے کا حق نہیں دیا،

قرآن کریم میں "فقراء" کی قابل تعریف صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ "وہ لوگوں سے لگ لپٹ کر سوال نہیں کرتے"۔

(۲) جس شخص کے پاس ایک دن کے گزارہ کا سامان موجود ہو اس کے لیے سوال حرام کر دیا۔

(۳) سوال کرنے کو حدیث میں ذلت قرار دیا ہے۔

(۴) جس شخص کے پاس بقدر نصاب مال موجود ہو اس کے لیے بغیر سوال کے بھی صدقہ لینا حرام کر دیا۔

(۵) غرباء و مساکین کو اس کی ترغیب دی کہ محنت مزدوری کی کمائی کو عزت سمجھیں صدقات سے گریز کریں۔

(۶) ارباب اموال کو اس کی ہدایت کی کہ اموال صدقات صرف اپنی جیب سے نکالنا کافی نہیں۔ بلکہ اس کے مستحقین یا حاجتمند لوگوں کو تلاش کر کے ان کو پہونچانا بھی ان کی ذمہ داری ہے

(۷) محکمہ احتساب کے ذریعہ گداگری کا انسداد کیا گیا۔

ان احکام کے ذریعہ اسلام نے تقسیم دولت کا جو خوشگوار نظام قائم فرمایا ہے اس کے نتیجہ میں ہماری تاریخ کے اندر ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ معاشرہ میں صدقات کو قبول کرنے والا ڈھونڈے سے نہیں ملتا تھا۔

یہ اسلامی نظام تقسیم دولت کے چند نمایاں خدوخال تھے، اس مختصر مقالہ میں اس نظام کی اتنی ہی جھلک دکھائی جا سکتی تھی، لیکن امید ہے کہ ان گزارشات سے یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ اس معاملے میں اسلامی نظام معیشت سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سے کس طرح ممتاز ہے اور اس کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں۔

ولله الحمد اوله وآخره وظاهره وباطنه

بقیہ :- "صحبتے با اہل دل"

تو جنت میں پہنچ رہا ہے اور درویش دوزخ میں پڑا ہوا ہے، کسی بزرگ سے تعبیر پوچھی تو کہا کہ وہ بادشاہ صاحب تخت و تاج تھا مگر درویشی کی تمنا کرتا تھا اور درویشوں کو بڑی حسرت کی نگاہ سے دیکھا کرتا اور یہ درویش تھے تو فقیر بے نوا مگر بادشاہ کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اس طرح اگر کوئی شخص مسجد میں ہو اور اسکا دل لگا ہوا ہو کہ جلدی نماز ہو اور میں اپنے کام کو جاؤں تو گویا وہ مسجد سے باہر نکل چکا اور اگر کوئی بازار میں ہو اور اسکا دل مسجد و نماز میں لگا ہوا ہے تو گویا وہ نماز ہی میں ہو یہی معنیٰ ہیں انتظار الصلوٰۃ بعد الصلوٰۃ کے، زہد خانقاہ میں بیٹھنے کا نام نہیں ہے، معلوم نہیں ہم کہاں ہیں، اس کا حال قیامت میں معلوم ہوگا، فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ وہاں ادھر کا پلہ بھاری ہوا تو ادھر، اگر ادھر کا پلہ بھاری ہوا تو ادھر۔

۱؎ یعنی بے فکری اور استغنا ۲؎ حضرت کی عمر مبارک اس تحریر کے وقت ۸۵ سال کی ہے اللہ تعالیٰ برکت عطا فرمائے لیکن قد مبارک میں ذرا بھی خمی نہیں۔

۳؎ یعنی خدا کے سامنے۔

سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی

مکتوبات، علمی و ادبی برکات

حسن تدبر — مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

مکتوب شاہ عبدالعزیزؒ — کسی عزیز کے نام

اما بعد المرسوم بين الاحباء
من التحية والدعاء فقد
طالعت رقيمتكم الانيقة التي
صدرتموها باسم خواجه
محمد امين ودسستموها في
غلاف ديوان الحزين
واطلعت ما فيها من انباء
المتنوعة وكان من
جملتها الاستفسار عن
الاستكشاف عما تقرر
من احتمالي الاقامة
والارتحال فاعلموا ان

بعد سلام و دعا کے واضح ہو کہ
میں نے آپ کے اس مکتوب گرامی کا مطالعہ
کیا جو خواجہ محمد امین کے نام تھا
اور جس کو دیوان حزین کے
غلاف میں آپ نے رکھا تھا،
میں نے اس کے تمام مندرجہ مضامین
پڑھے اس میں میری اقامت اور
سفر کے بارے میں بھی سوال تھا
آپ کو معلوم ہونا چاہئیے کہ فقیر
ابھی آج کل میں جانے کا قصد کر رہا
ہے۔ میری والدہ اور بھائی مجھے
یہاں تنہا چھوڑنے پر راضی نہیں

الفقير ايضاً غداً او
بعد غدٍ قاصد وذلك
لان الوالدة والاخوة
لا يدعونني ان اقيم
ههنا منفرداً
.... تعب السفر الذي
يجيئ في الاجتماع اولى
من لذة الاقامة
التي [illegible] انفراد فقبلت
منهم ذلك وقد صار الان
الى البت عنده بالفعل
ثم ان حدث شيء من الفتن
من المشرق او المغرب
نرتحل من هناك الى
الموضع الآخر المعين
وان سكنت رياحها الجنوبية
والشمالية اخترنا العود
الى هذا البلد المألوف
[illegible]

ہیں ۔۔۔ میں نے بھی سفر کی اس
مشقت کو جو سب کے ساتھ ہو اپنی
انفرادی اقامت کی راحت
پر ترجیح دے کر اُن کے فیصلے کو قبول
کر لیا ۔۔۔ اب بالفعل بڈھانہ کی
سکونت طے پائی ہے۔ پھر اگر مشرق
یا مغرب سے فتنے نمودار ہوئے تو
ہم وہاں سے ایک اور مقام پہ
چلے جائیں گے جو ذہن میں ہے
اگر جنوبی اور شمالی فتنے دب گئے تو پھر
ہم اسی بلد مالوف (دہلی) کی طرف
لوٹنا پسند کریں گے اللہ تعالیٰ اس
کو آباد رکھے۔

طلب الكتب المرقومة
فالقول الفصل فيها
انها شدت في الغرائر
لا يطاق اخراجها الان

[illegible]
کتابیں طلب کی ہیں اس کے بارے
میں قطعی بات یہ ہے کہ تمام کتابیں
باندھ کر تھیلوں وغیرہ میں
رکھ دی گئی ہیں اس وقت

وسا بلغها ان شاء الله تعالى بعد الاستقرار في موضع ...... واما رسالة الجمع بين الوحدتي الوجود والشهود فهو مكتوب سيدنا الوالد قدس سره ...... الى افندي اسمعيل الرومي ولقبه بالمكتوب المدني وكذلك مقدمة ازالة الخفا مسدودة في الغرائر واما ديوان الحزين فقد طالعت بعضه من ذروة النهار الى هذا الوقت وارسلته على يدي حامل الرقيمة والسلام۔

ان کا نکالنا بہت مشکل ہے کسی جگہ استقرار نصیب ہونے پر ان شاء اللہ تعالیٰ ان کتابوں کو جلد بھیج دوں گا۔ اور رسالہ وحدت الوجود والشہود جو در اصل والد صاحب قدس سرہٗ کا آفندی اسمٰعیل رومی کے نام ایک مکتوب ہے، جسے مکتوب مدنی کا نام دیا گیا ہے۔ نیز ازالۃ الخفا کا مقدمہ یہ دونوں بھی دیگر کتابوں کے ساتھ بند ہیں۔ آپ نے جو دیوان حزیں کا نسخہ بھیجا تھا اس کا بعض حصہ آج دیکھ لیا ہے۔ حامل رقعہ کے ہاتھ اس کو واپس کر رہا ہوں۔

والسلام

مکتوب شاہ عبدالعزیزؒ ــــ بعض افاضل کے نام

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته ۔ وبعد ــ فقد طال انتظار شرح الجغمنية الى الآن ولم يصل بعد ــ فكانه

بعد سلام مسنون واضح ہو کہ شرح چغمنی کا انتظار بہت طویل ہوگیا ابھی تک یہ کتاب نہیں پہونچی ــ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہل پہلت اس کتاب کو بھیجنے کا موقع نہیں

لم يتفق لاهل الفلهت
الرسالة ـ قد اشتغل
به الشيخ رفيع الدين سلمه
الله والنسخة منفردة
ليس يعتمد في الصحة
والسقم ومع ذالك فهي
سقيمة في الغالب فالواجب
ان يبلغ اقصى الجهد في الطلب
فان اتفق فيها ونعما والا
فالياس احدى الراحتين السلام

پائیے۔ یہ کتاب برادر عزیز شیخ
رفیع الدین سلمہٗ کے کام میں ہے
صرف ایک ہی نسخہ ہے جس پر
صحیح اور غلط کا دارومدار ہے۔
پھر وہ بھی اکثر غلط ہے آپ
اچھی طرح کوشش کرکے دوسرا
نسخہ تلاش کریں اگر مل جائے
تو بہتر ہے ورنہ ناامیدی بھی
ایک قسم کی راحت ہے۔

مکتوب شاہ عبدالعزیزؒ ــــــ بعض افاضل کے نام

اما بعد السلام المسنون
فقد وصلت صحيفتكم
الشريفة محتوية على
عافيتكم وعافية اهل
بيتكم ـ فشكرنا الله على
ذلك ـ وإن سألتم عنا
فنحن ايضاً بحمد الله بعافية
ورفاهية غيران ماجرى
فينا من تقديرات الله
تعالى (رحلة) الولد العزيز
احمد[له] واختلال الانتظام

بعد سلام مسنون ــــ آپ کا گرامی نامہ
ملا جو آپ کی اور آپ کے متعلقین
کی عافیت پر مشتمل تھا۔ اس پر
اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے ـ اور
ہماری حالت دریافت طلب ہو تو
ہم بحمد اللہ عافیت و رفاہیت
سے ہیں ــــ البتہ تقدیرات
الٰہیہ کا ظہور میاں احمد کے
انتقال اور انتظام منزلی
کے اختلال کی شکل میں ہوا۔
آگے

[له] اس مکتوب سے معلوم ہوا کہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے ایک صاحبزادے کا نام احمد تھا۔

المنزلی الخ

مکتوب شاہ عبد العزیز بنام شاہ نور اللہ (خسر شاہ عبد العزیز صاحبؒ)

...... فمما شاع و ذاع و	وہ بات جو بہت شائع، مشہور اور
ملاء السماع و تواتر بل	گوش زد خاص و عام ہو رہی ہے
وقع علیہ الاجماع،	بلکہ تواتر کی حد تک پہونچ گئی ہے
نہوض موکب الدرانی	یہ ہے کہ لشکر احمد شاہ درانی [ع] اٹھ کھڑا
الیٰ تسخیر ھذہ البلاد	ہوا ہے یہاں کے شہروں اور علاقوں
والارباع و ان مقدمۃ	کو مسخر کرنے کے لیے ـــــ اس کے
جیشہ عبرت النہر او	مقدمۃ الجیش نے نہر کو عبور کر لیا ہے
کادت و شوکتہ اللتی	یا عبور کیا چاہتا ہے، اور اس کی وہ
فارقتہ قد عادت و	پہلی شوکت جو اس سے جاتی رہی تھی
انہ بنفسہ وصل الی	اب پھر لوٹ آئی ہے۔ اور وہ بنفس
جلال آباد و حصل من	نفیس جلال آباد [۵]...... تک پہونچ
رؤساء الافاغنۃ لہ	گیا ہے۔ افغان رؤسا، اس کے

ع۵ جنگ پانی پت کے بعد احمد شاہ درانی تین مرتبہ اور ہندوستان میں اپنا لشکر لے کر آئے۔ جن میں ایک مرتبہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی حیات میں اور دو مرتبہ ان کے بعد۔ ان دو میں ایک حملہ ۱۷۶۷ء میں کیا۔ اس وقت یہ مشہور ہو گیا تھا کہ درانی کا مقصد اس حملے سے انگریزوں کو بنگال سے نکالنا ہے۔ چنانچہ انگریزوں نے بھی ایک دستہ الٰہ آباد بھیج دیا تھا کہ ادھر ہی میں مقابلہ ہو جائے۔ اس کے بعد ۱۷۶۹ء میں آخری بار سکھوں سے نبرد آزما ہوئے۔ اس مکتوب میں ان آخری دو حملوں میں سے کسی ایک کا ذکر ہے۔ اس مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ پانی پت کے بعد درمیان میں درانی کی شوکت میں کچھ خلل آ گیا تھا۔ بعد کو یہ خلل دور ہوا۔

---

۵ افغانستان کا مشہور شہر ۱۲

الانقیادُ هذا هو الخبر المحققُ المنقّحُ بحسبِ الظنِّ والذی سار فی الاطراف کالمثلِ السائر۔ والعلم عند العلیم الخبیر۔

تابع فرمان ہوگئے ہیں۔ یہ خبر بحسب الظّن اور شہرت کے لحاظ سے مُحقّق اور مُنقّح ہے۔ باقی اصل علم خدائے علیم و خبیر ہی کو ہے۔

واما کفّارُ مرهٹه فهم علیٰ ما کانوا علیه من السکون جامدون فی خیم الادبار و مُعسکر الخُسران۔

گروہ مرہٹہ اسی حال میں ہے جس حال پر تھا، یعنی سکون و جمود میں مبتلا ہے اور ادبار و خسران کے خیموں میں سکونت پذیر ہے۔

.....

مکتوب شاہ اہل اللہ بنام شاہ عبد العزیزؒ

یا من هو عزیزٌ عند القلوب و یا من فضلهٗ بالعلمِ علّامُ الغیوب۔ نَسْأَلُ اللّٰهَ لنا و لکم ان ینجینا و ایّاکم من من شرورِ الزمان خصُوصًا من غلبةِ اهل الطغیان فی البلدان وقد وَصَل الینا مکتوبکم المرغوبُ واطّلعنا علیٰ ما فی مطویّاته من تلاقی الفئتین و مصاف الفرقتین

اے وہ کہ جو سب کے دلوں کو عزیز ہے اور جس کو علّام الغیوب نے علم کے ساتھ فضیلت بخشی ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہم کو اور تم کو شرورِ زمانہ سے محفوظ رکھے خصوصاً اس فتنے سے جو اہل طغیان کے غلبے کی صورت میں شہروں میں رونما ہے۔ تمھارا مکتوب مرغوب پہونچا۔ اور اس کے مندرجات سے آگاہی ہوئی ــــ اس میں دو گروہوں اور

فِئَۃٌ تقاتل فی سبیل اللّٰہ	جماعتوں کی نبرد آزمائی کا بھی ذکر ہو۔
واُخریٰ کافِرۃٌ یرونھم	ایک جماعت فی سبیل اللّٰہ قتال کرنے
مثلیھم رای العین والمرجو	والوں کی ہے اور دوسری مخالفین
من فضل اللّٰہ سبحانہٗ اَن	اسلام کی جن کی تعداد دیکھنے میں
ینصُرَ المسلمین و یخذل	دو گنی نظر آتی ہے۔ اللہ تعالےٰ
الکافرین...... فکم من فئۃٍ	کے فضل سے امید ہے کہ وہ مسلمین
قلیلۃ غلبَتْ فِئَۃً کثیرۃً	کو کامیاب اور ان سے مقابلہ
باذن اللّٰہ ــــ والذی یسمع	کرنے والوں کو ناکامیاب کرے گا۔
من اَخبار جنود الشجاعِ الدولۃ	...... کتنی کچھ کم تعداد کی جماعتیں
من کفار فرنگ فالی اللّٰہ	ایسی تھیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے بڑی
المشتکی ــــ الایّامُ ایّامُ	تعداد والی جماعتوں پر غالب آئیں" ــــ
الفِتَنِ والحوادث ونحن	اور وہ خبر جو کفار فرنگ (انگریزوں) کے ہاتھوں
فقراء المسلمین مثلُ	شجاع الدولہ[ع] کے لشکر کی شکست سے

ع ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ کے بعد ہندوستان میں انگریزوں نے اپنی سلطنت کی گویا بنیاد رکھ دی تھی۔ کلکتہ پر تو انگریز پہلے ہی قبضہ کر چکے تھے اس کے بعد انھوں نے پٹنہ پر بھی اپنا قبضہ جما لیا۔ میر قاسم نے بھاگ کر اودھ کے نواب شجاع الدولہ کے پاس پناہ لی۔ پھر شجاع الدولہ، میر قاسم اور مغل بادشاہ شاہ عالم ان تینوں نے مل کر پٹنہ پر حملہ کیا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ پھر یہ تینوں دوسری مرتبہ ۲۳ اکتوبر ۱۷۶۴ء کو بکسر کے میدان میں جمع ہوئے۔ انگریز فوج لے کر مقابلہ کے لیے آیا۔ بڑی بھاری جنگ ہوئی جس میں شجاع الدولہ وغیرہ کو شکست ہوئی۔ شاہ عالم نے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ شجاع الدولہ دوبارہ کچھ دنوں بعد اپنی فوج جمع کر کے مقابلے کے لیے نکلے، پھر شکست ہوئی اور انگریزوں سے معافی مانگی ــــ اس مکتوب میں غالباً بکسر کی شکست کا ذکر ہے جس کا سال ہجری ۱۱۷۸ھ ہے۔ اور جو حضرت شاہ ولی اللہ رح کی وفات سے دو سال بعد ہوئی تھی۔ اور ممکن ہے کہ بکسر کے بعد والی جنگ کا ذکر ہو جس میں شجاع الدولہ کا لشکر نبرد آزما ہوا تھا۔ اور جو بکسر سے تھوڑے عرصے بعد ہوئی تھی۔

حشرات الارضِ من اَتیٰ
علیھا یدُسُھا بالاقدام۔
لانستطیع الانتقالَ والارتحالَ
من بلدٍ اِلیٰ بلدٍ واین المفر۔
لاملجأَ ولامنجأَ من اللہِ الاّ
الی اللہ — کان ماکان۔
لکن الرقعۃ اللتی فیھا اخبار
السکھان اوحشنا غایۃ
الوحشۃ — فان شرورھم
احذران یُخافَ منھا لقربھم
وھجومھم بغتۃً کما وقعَ
مراراً وعداوتھم شدیدۃٌ
یفعلون بھم مالا یفعلون
بغیرھم — خصوصاً من
کان معروفاً فی العلم
والمشیخۃ اعاذنا اللہُ
وجمیع المسلمین من
شرورھم وخبث صدورھم
والسلام۔

متعلق سنی جارہی ہے (اس سے
صدمہ ہے) بس اللہ ہی سے ہماری
فریاد ہے۔ یہ زمانہ حوادث کا
زمانہ ہے۔ اور ہم فقراء مسلمین بے
وقعتی میں حشرات الارض کی مانند
ہو رہے ہیں کہ جو آتا ہے ہم کو پامال
کر جاتا ہے۔ ہم نہ کہیں جا سکتے ہیں
نہ کسی جگہ منتقل ہو سکتے ہیں — اور
بھاگنے کی جگہ بھی کہاں ہے؟ —
کوئی لجاء اور نجات کا ٹھکانہ اللہ
سے بچ کر نہیں — بس اسی کی طرف
رجوع کرنے میں نجات ہے —
یہ واقعہ تو ہوا سو ہوا — تمہارے
اس خط نے جس میں سکھوں سے
متعلق لکھا تھا بہت زیادہ فکر
میں ڈال دیا۔ ان کے شرور سے
خوف ہونا ہی چاہیئے۔ اس لیے
کہ یہ قریب کے ہیں اور ان کا ہجوم
اچانک ہوتا ہے جیسا کہ کئی مرتبہ ہو چکا
ہو اور (اس وقت) ان کی دشمنی بھی
دوسروں کی بہ نسبت اہل اسلام سے
شدید قسم کی ہے — خصوصاً ان حضرات
سے جو علم و مشیخت میں معروف و *

---

* ممتاز ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اور
جمیع مسلمین کو ان کے شرور اور خبث صدور
سے محفوظ رکھے — والسلام

مکتوب شاہ اہل اللہؒ بنام شاہ عبدالعزیزؒ

(۱) یا من لدی اھل الصفا مافیک مقبولُ
ثم الذی یاتیک من فضلٍ فمامولُ

(۱) اے وہ کہ اہلِ صفا کے نزدیک تمہارے اندرون کی خوبیاں مقبول و پسندیدہ ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ تم پر فضل الٰہی سایہ فگن ہوگا۔

(۲) ان السعادۃَ کلھا فی کلّکم مشھودۃٌ
والخیر فی اصلابکم واللہِ مجبولُ

(۲) سعادت کلیۃً تم سب میں ظاہر اور روشن ہے۔ اور خیر تو خدا کی قسم تمہارے خاندان کی سرشت میں ہے۔

(۳) یاتی من الاخبار ما یدھش قلوبنا
فالحفظ من کان من الآفات مسئولُ

(۳) خبریں اس قسم کی آرہی ہیں جن سے قلوب خوف زدہ ہیں۔ آفات سے حفاظت کی درخواست اللہ تعالیٰ سے کی جارہی ہے۔

(۴) اللہ یحفظنا وایاکم من البلاء
فی الدین والدنیا فبعض الخلق مبتولُ

(۴) اللہ تعالیٰ ہم کو اور تم سب کو بلاؤں سے محفوظ رکھے، دین میں بھی اور دنیا میں بھی ۔۔ بعض مخلوق بہت ہی پریشان اور تباہ حال ہے۔

مکتوب شاہ عبدالعزیزؒ بنام مولانا رشید الدین خاں دہلویؒ

خان صاحب عالی مراتب جامع الفنون

خاں صاحب عالی مراتب جامع الفنون

ع ۵ یہ منظوم مکتوب غالباً شاہ عبدالعزیزؒ کے اس منظوم خط کے جواب میں ہو جس کا ایک شعر یہ ہے۔

ایامُ بردٍ انت والقلب منجزع   من قوم سکھ وان الخوف معقول

اور جو حیات ولی کے ص ۳۴۳ و ۳۴۴ پر درج ہے۔

والفضائل سلالۃ العلماء و
الافاضل مرضی السجایا والشمائل
سلمہ اللہ وابقاہ الیٰ معارج
الکمال الدارین رقاہ۔
امّا بعد اھداء السلام المسنون
والحاف الدعاء الذی ھو
بالاخلاص معجون وبکمال
المودّۃ مشحون فقد وصلت
رقیمتکم الکریمہ ودلّت علیٰ
عافیتکم من جمیع الوجوہ،
وکانت لداء الانتظار تمیمہ
وان سألتُم عن حالی
فلا استطیعُ شرحھا
خوفاً من ملالۃ الاصدقاء
وکآبۃ الاحبّاء امّا
مرضُ القدیم فقد
اشتدّ جدّاً لاسیّما
قصور البصارۃ وھیجان
العین فان ذٰلکَ منعَ من
اکثر اشغالی والی اللہ المشتکیٰ
وھو المُستعان........

والفضائل..... کو اللہ تعالےٰ سلامت
رکھے اور کمالات دارین کی بلندیوں
پر فائز کرے۔ بعد سلام مسنون اور ایسی
دُعا کے بعد جو اخلاص سے مرکب اور
کمالِ محبت سے بھری ہوئی ہے۔۔۔
واضح ہو کہ تمھارا مکتوب آیا اور
اس نے تمھاری ہر طرح کی عافیت سے
مطلع کیا۔ یہ مکتوب مرض انتظار کے لیے
تعویذ ثابت ہوا۔ اب اگر تم مجھ سے
میرا حال دریافت کرتے ہو تو بھائی
میں اپنی داستان کو مفصل بیان
کرنے سے قاصر ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ
کہیں طول تحریر دوستوں کی الجھن اور
تکلیف کا باعث نہ بن جائے۔ مختصر
یہ ہے کہ جو بیماری پہلے سے چلی
آرہی تھی اس نے اب شدّت اختیار
کرلی ہے۔ بالخصوص ضعف بصارت
اور آشوب چشم نے مجھے اکثر اشغال
سے روک دیا۔۔۔ بس اللہ ہی سے
فریاد کرتا ہوں اور وہی ایسی
ذات ہے جس سے مدد طلب
کی جاتی ہے۔

(باقی)

اسلام کا نظامِ عقائد و اعمال؟
اسلام کی بنیاد کن چیزوں پر ہے؟ — اور — ان کی حقیقت کیا ہے؟
اسلامی زندگی کن امور سے عبارت ہے؟ — اور — انکی صورت و حقیقت کیا ہے؟
ان مجمل سوالات کا مفصل جواب
آپ کو
مولانا محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان کی تازہ کتاب
دین و شریعت
میں ملے گا
جس میں ضروری تفصیل کے ساتھ توحید، آخرت اور رسالت — نماز، روزہ، حج، و زکوٰۃ، اخلاق و معاملات، دین کی خدمت و نصرت، دعوت و جہاد، سیاست و حکومت اور احسان و تصوف کے عنوانات پر ایسی محققانہ روشنی ڈالی گئی ہے کہ شکوک و شبہات کی ساری گرہیں کھل جاتی ہیں۔ غلط فہمیوں کا پردہ چاک ہو کر اصل حقیقت سامنے آجاتی ہے اور دل و دماغ بعقل و وجدان اطمینان و سکون سے معمور ہو جاتے ہیں۔
جن عقائد میں غور و خوض بہت سوں کے لئے الحاد و تشکیک کا موجب ہوتا ہے ان کو ایسے سادہ انداز میں لکھا گیا ہے کہ متوسط درجہ کے ذہن کا آدمی بھی پڑھ کر پوری طرح مطمئن ہو جاتا ہے۔
یہ کتاب ان مسائل میں سلف صالحین کے مسلک پر پورا اطمینان بخشتی ہے۔ بشرطیکہ سلامتئ فکر بالکل رخصت نہ ہو چکی ہو۔
مولانا نعمانی کی دوسری کتابوں کی طرح اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ذہنی اطمینان اور قلبی انشراح کے علاوہ یہ حلاوتِ ایمان اور ذوقِ عمل بھی پیدا کرتی ہے۔ جس کے بغیر دینی مباحث اور دین کی باتیں محض فلسفہ اور ذرا ذہنی تعیش ہیں جس کی اللہ کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔
اور جو موٹے موٹے عنوانات درج کئے گئے ہیں انکے علاوہ ذیلی عنوانات کی تعداد دو سو کے قریب ہے۔
۲۰۰ کے قریب صفحات — بہترین سفید کاغذ — عمدہ جلد اور خوشنما گرد پوش — قیمت تین روپے
کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

قیمت 3-75

Regd. No. L-353

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow

VOL. 36 NO. 2 MAY 1968

صرف ٹائیل پرنٹرس اینڈ پرنٹرس، قطب الدین روڈ، لکھنؤ ۳۔ میں چھپا۔

[ربیع الاول ۱۳۸۸ھ]

مرتبہ
عتیق الرحمٰن سنبھلی

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے
مزید محصول ڈاک کا اضافہ

فی کاپی .... ۷۰ پیسے

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۸/۵۰
پاکستان سے ۸/۵۰
ششماہی
ہندوستان سے ۴/-
پاکستان سے ۴/-

جلد ۳۶	بابت ماہ ربیع الاول ۱۳۸۸ھ مطابق جون ۱۹۶۸ء	شمارہ ۳

اگر اس دائرہ میں سرخ نشان ہو تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ جون تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں۔ نئے خریدار بھی اسی طریقہ سے چندہ ارسال فرمائیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۵ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں، اس کی اطلاع ۲۵ تاریخ تک آجانا چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اوّلین

از ــــــــــ محمد منظور نعمانی

قرآن مجید میں ایک بڑی حقیقت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ " عَسٰی اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ " (ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ تمھیں کوئی چیز یا کوئی بات ناگوار و ناپسند ہو اور انجام کے لحاظ سے وہ تمھارے حق میں سراسر خیر اور بھلائی ہو)۔

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے " عَسٰی اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا " یعنی بالکل ممکن ہے کہ کوئی چیز یا کوئی واقعہ تمھیں سخت ناگوار اور ناپسند ہو اور اللہ تعالیٰ اسی سے تمھارے لئے کوئی " خیر کثیر " پیدا فرما دے۔

اللہ تعالیٰ کے اس قانون رحمت کا ایک عجیب و غریب تجربہ اس عاجز کو نصیب ہوا، ناظرین الفرقان کا حق ہے کہ وہ بھی اس سے واقف ہو کر مسرت میں شریک ہوں۔

گزشتہ اکتوبر کے شروع میں اس ناچیز نے جنوب مشرقی افریقہ کے جزیرہ ماریشس اور ری یونین کا، اور پھر رابطۂ عالم اسلامی کے اجلاس کی شرکت کے لئے وہیں سے مکہ معظمہ کا سفر کیا تھا اس سفر کا تذکرہ خاصی تفصیل سے " الفرقان " میں کیا جا چکا ہے اور اسی سلسلہ میں یہ بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ ماریشس کے دوستوں نے مجھے دراصل اگست میں بلایا تھا لیکن اس وقت پاسپورٹ ملنے میں دیر ہو جانے کی وجہ سے مقررہ تاریخ پر نہ جا سکا۔

پھر پاسپورٹ مل جانے کے بعد میں نے ستمبر میں وہاں جانے کا پروگرام بنایا۔

رابطۂ عالم اسلامی کے اجلاس کا دعوت نامہ بھی آچکا تھا جو ۱۰ اکتوبر سے مکہ معظمہ میں شروع ہونے والا تھا۔ میں نے طے کیا اور یہی اس وقت کے میرے حالات کا تقاضا تھا کہ میں مارشیس صرف ایک ہفتہ قیام کر کے واپس آجاؤں گا اور رابطہ کے اجلاس کے لئے وسط اکتوبر میں دوبارہ سفر کروں گا، اسی حساب سے میں بمبئی پہنچا۔ میرے کاغذات چونکہ مکمل تھے اس لئے اطمینان تھا کہ پی۔ فارم ملنے میں مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی اور میں جلدی ہی اپنے پروگرام کے مطابق مارشیس جا سکوں گا۔ لیکن پی۔ فارم کے مرحلہ میں میرے نزدیک بالکل بلا وجہ کئی دن صرف ہو گئے۔ اسکے بعد ایر انڈیا کے دفتر کے ایک کلرک کی غلطی اور ناواقفی کی وجہ سے میرے ۴-۵ دن مزید برباد ہوئے اور اس طرح جو ہفتہ میں نے مارشیس کے قیام کا سوچا تھا وہ بمبئی ہی میں ختم ہو گیا۔ قدرتی طور پر مجھے یہ تاخیر اس وقت بے حد ناگوار ہوئی تھی اور مجھے یاد ہے کہ اسکی وجہ سے مجھے انتہائی کوفت اور میری طبیعت میں سخت جھنجھلاہٹ تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی کو میرے حق میں ایک بڑی رحمت اور بڑے لطف و کرم کا وسیلہ بنایا اور اس سے میرے لئے وہ "خیر عظیم" پیدا فرمایا جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اور یہ قرآنی حقیقت واقعہ بن کر میرے سامنے آئی عَسٰى اَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ۔ ہوا یہ کہ میرا بنایا ہوا پروگرام سب غلط ہو گیا اور میں بجائے ستمبر کے شروع اکتوبر میں مارشیس پہنچ سکا۔ اسکے بعد وقت میں اتنی گنجائش نہیں رہی کہ میں مارشیس سے یہاں واپس آکر رابطہ کے لئے ازسرنو دوسرا سفر کروں اس لئے مجھے وہیں سے براہ راست مکہ معظمہ کے لئے سفر کرنا پڑا۔ میرے پاس بمبئی سے مارشیس کا واپسی کا ٹکٹ تھا اور رابطہ کی طرف سے آیا ہوا بھی لکھنؤ سے جدہ کا واپسی ٹکٹ تھا۔ مارشیس سے براہ راست جدہ چلے جانے کی وجہ سے مارشیس سے بمبئی واپسی ٹکٹ کے حساب کی رقم ہوائی کمپنی کے ذمہ بچ گئی، پھر جدہ پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ یہ رقم اتنی ہے کہ اس سے بمبئی سے جدہ کا ایک اور واپسی ٹکٹ مل سکتا ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر اہلیہ کے ٹکٹ کا بھی کوئی انتظام کیا جا سکا تو میں ان کو ساتھ لے کر اس رقم سے انشاء اللہ اسی سال سفر حج

کرلوں گا اور چونکہ میں اپنا حج فرض پہلے ادا کرچکا ہوں اور یہ موقع اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم نے میرے وہم و گمان اور ارادہ وخیال کے بغیر بالکل "لایحتسب" طریقہ پر پیدا فرمایا ہے اس لئے اس کے اس لطف و کرم کے شکریہ میں یہ حج میں کسی ایسی ذات کی طرف سے کروں گا جس کی طرف سے حج کرنا اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہو۔

پھر اسی رب کریم کے لطف و کرم سے اہلیہ کے ٹکٹ کا بھی انتظام ہوگیا۔

اس کے بعد مرحلہ یہ تھا کہ ہم دونوں انٹرنیشنل پاسپورٹ ہی سے سفر کرسکتے تھے حج والے پاسپورٹ سے سفر کا ہمارے لئے کوئی امکان نہیں تھا اور صورت یہ تھی کہ میرے پاسپورٹ کی مدت ختم ہوچکی تھی اور اس میں توسیع کی ضرورت تھی اور اہلیہ کے لئے تو نیا پاسپوٹ حاصل کرنا تھا اور وقت میں گنجائش بہت ہی کم تھی۔ بعض سابقہ تجربوں کی بنا پر خطرہ تھا کہ اتنے تنگ وقت میں شاید پاسپورٹ حاصل ہی نہ ہوسکے لیکن یہاں بھی اللہ تعالیٰ کے خاص کرم سے بالکل خلاف توقع صرف ۳-۴ دن میں پاسپورٹ کا مرحلہ طے ہوگیا اور صاف معلوم ہوا کہ یہ صرف ارادۂ الٰہیہ کی کارفرمائی ہے۔

اس کے بعد ایک مشکل ترین مسئلہ یہ سامنے آیا کہ انٹرنیشنل پاسپورٹ سے سفر کرنے والوں کو صرف ۷۵ روپے لے جانے کی اجازت ہوتی ہے جو ہم جیسوں کے لئے جدّہ کے ہوائی اڈہ پر اترنے کے بعد مکہ معظمہ پہنچنے تک کے لئے بھی مشکل ہی سے کافی ہوسکتے ہیں اس مسئلہ نے اچھا خاصا تردد پیدا کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے دستگیری فرمائی اور میں نے اپنے دل سے کہا کہ اس سفر کا انتظام ربّ کریم نے میرے ارادہ بلکہ وہم و گمان کے بغیر محض اپنے لطف و کرم سے فرمایا ہے اس لئے اسی کے کرم پر بھروسہ کرکے چلنا چاہیئے۔ اور اپنا ہر مسئلہ اسی کے اوپر چھوڑ دینا چاہیئے۔ آخری بات یہ ہے کہ ضرورت پڑے گی تو جاننے والوں سے قرض لیں گے۔

اس فیصلہ کے بعد ہم لوگ بمبئی پہونچ گئے اور ۲۹ر فروری کی صبح کو سعودی طیارہ سے روانہ ہوگئے جو ہر ہفتہ جمعرات کو بمبئی سے کراچی، ظہران اور ریاض ہوتا ہوا جدّہ جاتا ہے اور ظہر کے اوّل وقت جدہ کے ہوائی اڈہ پر اتر گئے۔

خاص کر زمانۂ حج میں جدّہ اترنے والے مسافروں کو پاسپورٹ، ویزا، ڈاکٹری سارٹیفکٹ کی جانچ پڑتال اور سامان کی دیکھ بھال میں کئی کئی گھنٹے لگ جاتے ہیں اور یہ چیز اس وقت بڑی ذہنی کوفت کا باعث ہوتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے اس سے بھی محفوظ رکھا، میں نے اسی مقصد کے لئے رابطۂ عالم اسلامی کے جدّہ کے دفتر کو تار سے اطلاع دیدی تھی، وہاں سے ایک صاحب ہوائی اڈہ پر آگئے اور میں چند منٹ میں فارغ کر دیا گیا۔ اور وہی صاحب مجھے رابطہ کے دفتر لے گئے جس کی وساطت سے مجھے "بطاقۃ المجاملہ" نقل وحرکت کی آزادی کا پاس حاصل کرنا تھا، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ "بطاقہ" کے لیے میرے فوٹو کی دو کاپیوں کی ضرورت ہوگی جو پاسپورٹ کے فوٹو سے لی جاسکیں گی اسلیے کچھ دیر لگے گی، چنانچہ میں نے اپنا پاسپورٹ دفتر کے مدیر شیخ عنانی کے حوالہ کر دیا انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ آپ کے لیے فلاں ہوٹل میں کمرہ محفوظ ہے۔ اور ڈرائیور سے کہا کہ وہ مجھے وہاں پہنچا دے میں نے شکریہ ادا کرنے کے بعد اُن سے کہا کہ یہ سفر میں نے خالص حج کے لیے کیا ہے اس لیے میں اپنے قیام وغیرہ کا بار رابطہ پر ڈالنا پسند نہیں کروں گا ——— اس کے بعد میں جدہ میں اپنے خاص عنایت فرما اور مستقل میزبان جناب عبد القادر نور ولی صاحب کے مکان پر آگیا۔ اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم سے وہاں گھر سے زیادہ راحتوں کے سامان تھے۔ رات بھی وہیں گزاری اور یکم مارچ کی صبح جبکہ وہاں ذی الحجہ کی دوسری تاریخ تھی اور جمعہ کا دن تھا مکہ معظمہ پہنچ گیا، مکہ کرمہ میں قیام کے لیے ایک نہایت مخلص عزیز صالح دہلوی صاحب نے بھی پہلے سے کہہ رکھا تھا اور اپنے مکان کا ایک حصہ انھوں نے میرے لیے خالی بھی رکھا تھا لیکن مختلف پہلوؤں پر غور کر کے میں نے مدرسہ صولتیہ میں (جو ہمارے شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ نور اللہ مرقدہٗ کی قیام گاہ رہا ہے۔) ٹھہرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

مجھے اندازہ تھا کہ ایام حج میں ہندوستان و پاکستان کے سیکڑوں حجاج جن میں خواص کی بھی اچھی خاصی تعداد ہوتی ہے صولتیہ میں قیام کرتے ہیں اسلیے بس گذارہ کی جگہ پر قناعت کرنا ہوگا اور اسکے لیے دل پوری طرح بلکہ خوشی کے ساتھ آمادہ و مطمئن تھا لیکن جب جمعہ کی صبح صولتیہ پہنچکر کار سے اترا تو معلوم ہوا کہ مدرسہ کے خاص دفتر کے اُوپر ایک نیا

کمرہ اسی سال بنا ہے اور وہ میرے لیے محفوظ ہے۔ میں وہاں پہنچا تو رہائش ہی کے نہیں بلکہ آسائش کے بھی ضروری سامان موجود تھے، صراحی میں پینے کا پانی تک غالباً رات ہی کو بھر کر رکھ دیا گیا تھا۔ دو پلنگوں پر بستر لگے ہوئے تھے، الغرض وہ سب کچھ تھا جو راحت کے لیے ضروری تھا اور جس کا پہلے سے وہم و گمان بھی نہیں تھا۔

چونکہ اپنے بارے میں مجھے کوئی غلط فہمی نہیں تھی اس لئے میں نے یقین کے ساتھ سمجھا کہ جس رب کریم نے اس سفر کا انتظام اپنے خاص لطف و کرم سے بالکل لایحتسب طریقہ پر فرمایا ہے اسی نے ہمارے مولانا شیخ محمد سلیم صاحب اور اُن کے سعادتمند فرزند برادرم مولوی محمد شمیم سے یہ انتظامات کرائے۔ میں اللہ تعالیٰ ان حضرات کو ہماری طرف سے بہتر سے بہتر جزا دے اور دنیا و آخرت میں خاص الخاص انعامات سے نوازے۔

عرض کیا جاچکا ہو کہ یہ جمعہ کا دن تھا کمرہ میں سامان رکھنے کے بعد سیدھے مسجد حرام پہنچے۔ سب سے پہلے عمرہ کا طواف کیا، اسکے بعد سعی کی۔ عمرہ سے فارغ ہو کر جمعہ کی نماز حرم شریف میں ادا کر کے قیام گاہ پر آئے۔

میرے ایک مخلص دوست اور عنایت فرما قاری محمد سلیمان صاحب ہیں پہلی دفعہ ۱۹۶۳ء میں اور اس کے بعد ۱۹۶۵ء میں حج ہی کے زمانہ میں ان سے ملاقات ہوئی تھی اور مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ دونوں جگہ ان کا ساتھ رہا تھا اور ان کی عنایتوں نے دل کو بہت متاثر کیا تھا، وہ اب کچھ مدت سے مدرسہ صولتیہ کے بالکل قریب مکہ معظمہ ہی میں مقیم ہیں۔ میرے اس سفر کے انتظامات کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے انہی کو خاص وسیلہ بنایا، جب ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا قیام تو آپ نے صولتیہ میں کر لیا، یہی سب سے بہتر تھا، کھانا میرے یہاں سے آیا کرے گا اور اس سلسلہ میں کوئی معذرت قبول نہیں ہوگی۔ میں نے اسکو منجانب اللہ سمجھا اور خوشی کے ساتھ قبول کر لیا اور مکہ معظمہ کی پوری مدت قیام میں گویا اُن ہی کا مہمان رہا۔ اللہ تعالیٰ اپنی شان عالی کے مطابق ان عنایات کا بہتر سے بہتر صلہ ان کو عطا فرمائے۔

پھر جب مدینہ طیبہ جانے کا ارادہ کیا تو ایک مخلص ترین دوست اور دینی بھائی ڈاکٹر

اسماعیل مرچنٹ (جو کراچی کے رہنے والے ہیں لیکن اب کئی سال سے سعودیہ عربیہ میں سرکاری ڈاکٹر ہیں۔) اپنی کار سے مجھے مدینہ طیبہ لے گئے اور وہاں دو ہفتہ کے قیام کے بعد ایک دوسرے دوست بھائی محمد یوسف جو ہیں تو بمبئی کے لیکن ادھر کئی سال سے کویت میں مقیم ہیں اور وہیں سے اپنی ذاتی کار لیکر حج پر آئے تھے وہ مجھے اپنے ساتھ مدینہ طیبہ سے مکہ معظمہ لے آئے۔ بلاشبہ یہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوا۔ اللھم کل ذالک منک وحدک لاشریک لک فلک الحمد ولک الشکر۔

مدینہ طیبہ میں ایک نہایت ہی عزیز دوست مولوی صوفی محمد اقبال ہوشیارپوری ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا اُن پر خاص فضل ہے مخدومنا شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا دامت برکاتہم کے مجازین میں ہیں کئی سال ہوئے ہجرت کی نیت کر کے مدینہ طیبہ ہی کو اپنا مسکن بنالیا ہے۔ حج کے ایام میں وہ مکہ معظمہ میں ملے تو فرما گئے کہ میں مدینہ طیبہ پہنچ کر پہلے ان ہی کے پاس اتروں' میں نے ایسا ہی کیا اور ان کے تعلق کا یہ حق اور تقاضا تھا لیکن ارادہ تھا کہ ایک دو دن کے بعد اجازت لے کر کسی دوسری جگہ منتقل ہو جاؤں گا مگر وہ اُس پر راضی نہ ہوئے۔ ان کے مکان کے بالکل برابر میں ایک دوسرے دوست حاجی عبدالعزیز صاحب لائل پوری کا مکان تھا انھوں نے اُسمیں ہمارے قیام کا انتظام کر دیا اور مدینہ طیبہ کے پورے زمانہ قیام میں اپنا ہی مہمان بنائے رکھا۔ میں نے اس کو بھی یہی سمجھا کہ یہ اسی رب کریم کی طرف سے ہو جس کے لطف و کرم نے یہ سفر اس طرح کرایا ہے۔ الغرض اس طرح پورے سفر مبارک میں اللہ تعالیٰ کے الطاف بارش کی طرح برستے رہے اور مجھے بار بار یہ یاد آتا رہا کہ اللہ تعالیٰ نے ماریشس والے سفر میں جبری تاخیر کرا کے (جو اس وقت میرے لیے سخت ناگوار اور انتہائی تکلیف دہ تھی) اس سفر کا سامان فرمایا اور اُس میں قدم قدم پر اُن عنایات اور انعامات سے نوازا جن کا تصور بھی مجھے نہ تھا۔ بے شک حق ہے۔

"عَسىٰ اَن تَكرَهُوا شَيئاً وَّيَجعَلُ اللهُ فِيهِ خَيراً كَثِيراً"

ایک وضاحت:-

"معارف الحدیث جلد چہارم" میں زکوٰۃ کے بیان میں نصاب زکوٰۃ سے متعلق صحیحین کی

مشہور حدیث درج کی گئی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ ۔۔۔ دو سو درہم سے کم چاندی میں اور ۵ وسق (قریباً ۲۰ من) سے کم کھجوروں میں اور اسی طرح ۵ راس سے کم اونٹوں میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

پھر اس حدیث کی تشریح کے ضمن میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کے حوالے سے لکھا گیا ہے ۔ کہ ۵ وسق کھجور، دو سو درہم بھر چاندی اور ۵ راس اونٹوں کی مالیت اتنی ہوتی تھی کہ ایک مختصر گھرانے کا سال بھر کا خرچ اس سے چل سکتا تھا، اس لیے ایسے شخص کو جس کے پاس سال پورا کرنے کے بعد اتنا محفوظ ہو خوشحال اور صاحب مال قرار دے کر وجوبِ زکوٰۃ کا حکم کیا گیا۔

پھر اس پر ایک مختصر حاشیہ لکھا گیا تھا جس میں فی زمانا روپیہ کی قیمت اور مالیت میں بہت زیادہ کمی ہو جانے کی بنا پر زکوٰۃ کے کم سے کم نصاب پر غور کرنے کے لیے حضرات علمائے کرام سے عرض کیا گیا تھا۔

بعض حضرات نے اس حاشیہ سے میرا مطلب یہ سمجھا کہ اس زمانہ میں معاشی حالات میں جو تبدیلیاں ہو گئی ہیں ان کی وجہ سے نصاب زکوٰۃ کی منصوص مقادیر پر از سرِ نو غور کرنے کی علمائے کرام کو دعوت دے رہا ہوں اور ان میں کسی ترمیم و تبدیلی کی گنجائش سمجھتا ہوں ۔۔۔
یہ بات کبھی میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقرر کی ہوئی اس طرح کی حدود و مقادیر میں تبدیلی و ترمیم کا حق اُمت کے کسی ادارہ یا طبقہ کو ہرگز نہیں دیا جا سکتا۔

دراصل میں نے اس حاشیہ کے ذریعہ حضرات علمائے کرام کو اس صورتِ حال پر غور کرنے کی دعوت دینا چاہا تھا کہ ہمارے اس زمانہ میں لوگوں کے پاس دولت یا تو نوٹوں کی شکل میں ہوتی ہے یا بضائع اور تجارتی اموال کی شکل میں، اور اب چاندی، سونے اور سوائم (اونٹوں وغیرہ) کے منصوص نصابوں کی مالیت میں وہ یکسانی باقی نہیں رہی ہے جس کا ذکر حضرت شاہ ولی اللہؒ نے کیا ہے، بلکہ بہت بڑا فرق ہو گیا ہے، تو اس صورت میں یہ مسئلہ علمائے کرام کے غور و فکر کا مستحق ہے کہ کس نصاب کی مالیت کو معیار قرار دے کر زکوٰۃ کے وجوب یا عدم وجوب کا فیصلہ کیا جائے۔

ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ منصوص دائرہ سے باہر کی چیز ہے۔ بہرحال میرا مقصد اسی صورت حال

کی طرف توجہ دلا کر غور و فکر کی دعوت دینا تھا — میں یہ بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اس طرح کے مسائل میں انفرادی فتوؤں کے بجائے حتی الامکان اجتماعی اور شورائی فیصلے ہونے چاہئیں۔

میں نے اب غور سے دیکھا تو مجھے اعتراف ہے کہ میرے حاشیہ کے الفاظ میرا یہ مقصد ادا کرنے کے لیے ناکافی ہیں اور اگر کسی کو غلط فہمی ہوئی تو اس کی ذمہ داری میری تعبیر کے قصور اور ابہام پر بھی ہے۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

محمد منظور نعمانی

سوانح

حضرت مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ

جسے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی نگرانی میں مولانا سید محمد ثانی حسنی مدیر ماہنامہ رضوان لکھنؤ نے مرتب کیا

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی پوری تبلیغی زندگی کا مستند ریکارڈ۔ ہند و بیرون ہند کے ایک ایک سفر کی تفصیل ایمان افروز مکاتیب۔ اور تقریریں، بے شمار مکاتیب اور تقریروں کے اقتباسات۔ مولانا کے افکار و خیالات اور زندگی کی مکمل تصویر۔ تبلیغی تحریک پر سب سے پہلی مفصل اور بصیرت افروز تصنیف۔

کتاب کے مواد کا سب سے اہم ماخذ خود حضرت مولینا کے مکاتیب اور حضرت شیخ الحدیث کی تحریری یادداشتیں ہیں، شروع میں آباؤ اجداد اور مشاہیر خاندان، خاص کر حضرت مولانا محمد الیاسؒ کا مفصل تذکرہ۔

اسی ضمن میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے

قریباً ستر صفحات پر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ کا مفصل تذکرہ، اس طرح یہ حضرت مولانا محمد یوسفؒ کے ساتھ حضرت شیخ الحدیث کی بھی سوانح حیات ہے۔

قریباً آٹھ سو صفحات سائز ۱۸×۲۲ پوری جلد رنگین کی پائیدار، خوبصورت گرد پوش

قیمت دس روپے -/۱۰

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

کِتَابُ الدَّعَوَاتِ

مَعَارِفُ الحَدِيث

(مُسَلْسَل)

جامع اور ہمہ گیر دُعائیں:-

[اس عنوان کے تحت احادیث دو قسطوں میں پہلے پیش کی جا چکی ہیں یہ تیسری قسط ہے]

عَنْ شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعَلِّمُنَا اَنْ نَقُوْلَ "اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَسْأَلُكَ الثَّبَاتَ فِى الْاَمْرِ وَاَسْأَلُكَ عَزِيْمَةَ الرُّشْدِ وَاَسْأَلُكَ شُكْرَ نِعْمَتِكَ وَحُسْنَ عِبَادَتِكَ وَاَسْأَلُكَ لِسَانًا صَادِقًا وَّقَلْبًا سَلِيْمًا وَّاَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا تَعْلَمُ وَاَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَا تَعْلَمُ وَاَسْتَغْفِرُكَ مِمَّا تَعْلَمُ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ۔

——— رواہ الترمذی والنسائی

حضرت شدّاد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں تعلیم فرماتے تھے کہ ہم دعا میں اللہ تعالیٰ سے یوں عرض کیا کریں۔
"اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَسْأَلُكَ الثَّبَاتَ فِى الْاَمْرِ...... تا...... اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ"

(اے اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے استقامت اور ثابت قدمی دین کے معاملہ میں، اور طلب کرتا ہوں اعلیٰ صلاحیت اور سوجھ بوجھ میں پختگی، اور تیری نعمتوں کے شکر کی اور حسن عبادت کی توفیق، اور طالب ہوں تجھ سے لسان صادق اور

قلب سلیم کا، اور تیری پناہ چاہتا ہوں ہر اس شر سے جس کا تجھے علم ہے اور سائل ہوں ہر اس خیر اور بھلائی کا جو تیرے علم میں ہے۔ اور معافی اور مغفرت چاہتا ہوں اپنے ان سب گناہوں سے جو تجھے معلوم ہیں، تو ساری پوشیدہ باتوں کو بھی خوب جانتا ہے۔ (جامع ترمذی و سنن نسائی)

(تشریح) اس دعا کے ایک ایک جز پر غور کیجئے، یہ ان تمام مقاصد پر حاوی ہو جو ایک مومن کو عزیز ہونے چاہئیں۔ اسی حدیث کو ابن عساکر نے بھی روایت کیا ہے اس کے آخر میں یہ اضافہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شداد بن اوس رضی اللہ عنہ کو یہ دعا تلقین کرنے کے بعد فرمایا کہ

"اے شداد بن اوس جب تم دیکھو کہ لوگ سونے اور چاندی کو بطور خزانے کے جمع کرتے ہیں تو تم اس دعا کو اپنا خزانہ سمجھو!"

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَجُلًا قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ سَمِعْتُ دُعَاءَكَ اللَّیْلَةَ فَكَانَ الَّذِیْ وَصَلَ اِلَیَّ مِنْهُ اَنَّكَ تَقُوْلُ "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ ذَنْبِیْ وَوَسِّعْ لِیْ فِیْ دَارِیْ وَبَارِكْ لِیْ فِیْمَا رَزَقْتَنِیْ" قَالَ فَهَلْ تَرَاهُنَّ تَرَكْنَ شَیْئًا ـــــ رواہ الترمذی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک صاحب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ رات میں نے آپ کو دعا کرتے سنا۔ اس دعا میں سے یہ الفاظ مجھے پوری طرح پہنچے۔ آپ اللہ تعالیٰ سے عرض کر رہے تھے "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ ذَنْبِیْ..... تا..... وَبَارِكْ لِیْ فِیْمَا رَزَقْتَنِیْ" (اے اللہ میرے گناہ معاف فرما دے اور میرے لیے میرے گھر میں وسعت عطا فرما اور تو نے جو رزق مجھے عطا فرمایا ہے اس میں میرے لیے برکت دے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ـــ تم نے دیکھا ان مختصر لفظوں نے کچھ بھی چھوڑا۔

(جامع ترمذی)

(تشریح) اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس بندہ کے رزق میں برکت دی جائے، اس کو

رہنے بسنے کے لیے ایسا مکان عطا ہو جس کو وہ اپنے لیے کافی سمجھے اور اس میں وسعت محسوس کرے اور آخرت کے لیے اس کی لغزشوں گناہوں کی مغفرت اور معافی کا فیصلہ ہو جائے تو اس کو سب ہی کچھ مل گیا ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری جملہ (هل تراهن تركن شيئاً) کا مطلب یہی ہے کہ بندہ کو جو کچھ چاہیے وہ اس مختصر سی دعا میں سب آگیا ہے، چھوٹے چھوٹے ان تین کلموں نے کچھ بھی نہیں چھوڑا ہے۔

عَنْ طَارِقِ الْاَشْجَعِيِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَتَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ كَيْفَ اَقُوْلُ حِيْنَ اَسْأَلُ رَبِّيْ قَالَ قُلْ "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ وَارْحَمْنِيْ وَعَافِنِيْ وَارْزُقْنِيْ" (وَجَمَعَ اَصَابِعَهُ الْاَرْبَعَ اِلَّا الْاِبْهَامَ) فَاِنَّ هٰؤُلَاءِ يَجْمَعْنَ لَكَ دِيْنَكَ وَدُنْيَاكَ۔

(رواہ ابن ابی شیبہ)

حضرت طارق اشجعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص آیا اور اس نے پوچھا کہ مجھے بتا دیجئے کہ جب میں اپنے پروردگار سے مانگوں تو کس طرح عرض کروں اور کیا عرض کروں۔ آپ نے فرمایا یوں عرض کیا کرو "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ وَارْحَمْنِيْ وَعَافِنِيْ وَارْزُقْنِيْ" (اے اللہ میرے گناہ معاف فرما دے اور مجھے بخش دے، مجھ پر رحمت فرما، مجھے عافیت اور آرام چین نصیب فرما اور مجھے روزی عطا فرما) اس کے بعد آپ نے اپنے ہاتھ کی چاروں انگلیاں ملا کے ہاتھ کا اشارہ کیا اور فرمایا کہ یہ چار کلمے تیری دینی اور دنیوی ساری ضرورتوں پر حاوی ہیں۔ (مصنف ابن ابی شیبہ)

(تشریح) بلاشبہ جس کو دنیا میں بقدر ضرورت روزی اور چین و آرام اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہو جائے اور آخرت میں اس کے لیے مغفرت اور رحمت کا فیصلہ ہو جائے اُسے سب کچھ مل گیا ۔ یہ دعا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم فرمائی ہوئی نہایت جامع اور مختصر دعاؤں میں سے ہے۔

صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ جب کوئی شخص اسلام لاتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اس کو نماز کی تعلیم فرماتے اور اس دعا کی تلقین فرماتے۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ وَارْحَمْنِیْ وَاھْدِنِیْ وَعَافِنِیْ وَارْزُقْنِیْ ـ

عَنِ ابْنِ عُمَرَ (رَفُوْعًا) اَللّٰھُمَّ عَافِنِیْ فِیْ قُدْرَتِكَ وَاَدْخِلْنِیْ فِیْ رَحْمَتِكَ وَاقْضِ اَجَلِیْ فِیْ طَاعَتِكَ وَاخْتِمْ لِیْ بِخَیْرِ عَمَلِیْ وَاجْعَلْ ثَوَابَهُ الْجَنَّةَ ـــــــــ رواہ البیہقی فی السنن

حضرت عبداللہ بن عمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی ہو۔ "اَللّٰھُمَّ عَافِنِیْ ... تا ... وَاجْعَلْ ثَوَابَهُ الْجَنَّةَ (اے اللہ مجھے اپنی قدرت سے عافیت عطا فرما اور مجھے اپنی رحمت کے سایہ میں لے لے اور میری زندگی اپنی طاعت و عبادت میں پوری کرا دے (یعنی میں زندگی کے آخری لمحہ تک تیری طاعت عبادت کرتا رہوں) اور میرے بہترین عمل پر میرا خاتمہ فرما اور اس کے صلہ میں مجھے جنت عطا فرما)۔ (سنن کبریٰ بیہقی)

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ (مَرْفُوْعًا) اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ وَرَحْمَتِكَ فَاِنَّهُ لَا یَمْلِكُهُمَا اِلَّا اَنْتَ ـــــ رواہ الطبرانی فی الکبیر

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی ہے" اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ ..... تا ..... اِلَّا اَنْتَ" (اے اللہ میں تجھ سے تیرا فضل اور تیری رحمت مانگتا ہوں، بس تو ہی فضل و رحمت کا مالک ہو)۔ (معجم کبیر طبرانی)

(تشریح) اسی سلسلۂ معارف الحدیث میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو دنیوی اور مادّی نعمتیں نصیب ہوں ان کو قرآن و حدیث کی زبان میں فضل سے تعبیر کیا جاتا ہے اور روحانی و اُخروی نعمتوں کو رحمت سے۔ اس بنا پر اس دُعا کا مطلب یہ ہوا کہ اے اللہ دنیوی و اُخروی اور مادی و رُوحانی سب نعمتوں کا مالک تو ہی ہے، تیرے سوا کوئی نہیں، جو کچھ بھی دے سکے اس کے لیے میں تجھ ہی سے دونوں قسم کی نعمتوں کا طالب و سائل ہوں۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ (مرفوعًا) اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ عِيْشَةً نَقِيَّةً وَ مِيْتَةً سَوِيَّةً وَ مَرَدًّا غَيْرَ مُخْزِيٍ وَلَا فَاضِحٍ۔

——— رواہ البزار والحاکم والطبرانی فی الکبیر

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی ہے "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ ...... تا ...... ولا فاضح" (اے اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں پاک صاف زندگی اور ڈھنگ کی موت (جس میں کوئی بدنمائی نہ ہو) اور (اصلی وطن آخرت کی طرف) ایسی مراجعت جس میں رسوائی اور فضیحت نہ ہو۔) (مسند بزار، مستدرک حاکم، معجم کبیر طبرانی)

(**تشریح**) آدمی کے لیے تین ہی مرحلے ہیں، ایک اس دنیا کی زندگی کا مرحلہ، دوسرا موت کا مرحلہ اور تیسرا دار آخرت کا مرحلہ، اس مختصر دعا میں تینوں مرحلوں کے لیے بڑے سادہ انداز میں بہترین دعا موجود ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ (مَرْفُوعًا) اَللّٰهُمَّ انْفَعْنِیْ بِمَا عَلَّمْتَنِیْ وَعَلِّمْنِیْ مَا يَنْفَعُنِیْ وَزِدْنِیْ عِلْمًا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى كُلِّ حَالٍ وَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ حَالِ اَهْلِ النَّارِ ——— رواہ الترمذی وابن ماجہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی "اَللّٰهُمَّ انْفَعْنِیْ ...... تا ...... وَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ حَالِ اَهْلِ النَّارِ" (اے اللہ جو کچھ علم تو نے مجھے عطا فرمایا اس کو میرے لیے نفع مند بنا دے (یعنی مجھے اس پر عمل کرنے کی توفیق دے) اور مجھے وہ علم عطا فرما جو میرے لیے نافع ہو اور میرے علم میں اضافہ فرما، اللہ کے لیے حمد و ستائش ہے ہر حال میں اور میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں دوزخیوں کے حال سے) (جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

عَنِ ابْنِ عُمَرَ (مَرْفُوعًا) اَللّٰهُمَّ لَا تَكِلْنِیْ اِلٰى نَفْسِیْ طَرْفَةَ عَيْنٍ وَلَا تَنْزِعْ مِنِّیْ صَالِحَ مَا اَعْطَيْتَنِیْ ——— رواہ البزار

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا

روایت کی ہے "اَللّٰھُمَّ لَا تَکِلْنِیْ.... تا..... مَا اَعْطَیْتَنِیْ" (اے اللہ مجھے پل بھر کے لیے میرے نفس کے حوالہ نہ کر، اور جو کوئی اچھی چیز، (اچھا عمل یا اچھا حال) تو نے مجھے عطا فرمایا ہے اس کو مجھ سے واپس نہ لے) (مسند بزار)

(تشریح) بندوں کے پاس جو کچھ خیر ہے وہ صرف اللہ کی توفیق اور اس کی عطا سے ہے، اگر اللہ تعالیٰ ایک لمحہ کے لیے بھی نگاہِ کرم پھیر لے اور بندہ کو اس کے نفس کے حوالے کر دے تو وہ محروم ہو کے رہ جائے گا۔ اس لیے ہر عارف بندہ کے دل کی یہ صدا ہوتی ہے کہ اے اللہ ایک لمحہ کے لیے مجھے میرے نفس کے حوالہ نہ کر، ہر دم میری نگرانی اور مجھ پر نظر کرم فرما۔

عَنْ عَائِشَةَ (مَرْفُوْعًا) اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ اَوْسَعَ رِزْقِكَ عَلَیَّ عِنْدَ كِبَرِ سِنِّیْ وَ انْقِطَاعِ عُمْرِیْ"۔ ـــــــــ رواه الحاكم

اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دُعا روایت کی ہے "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ...... تا..... وَانْقِطَاعِ عُمْرِیْ" (اے اللہ میرے بڑھاپے کے دنوں میں اور میری عمر کے آخری حصہ میں میری روزی میں زیادہ سے زیادہ وسعت فرما) (مستدرک حاکم)

(تشریح) بڑھاپے میں اور عمر کے آخری حصہ میں رزق کی تنگی زیادہ تکلیف دہ ہو سکتی ہے۔ کیونکہ آدمی اس وقت دوڑ بھاگ اور جدوجہد کے قابل نہیں ہوتا، علاوہ ازیں وہ موت کے قریب کا زمانہ ہوتا ہے، اور ہر مومن کی آرزو یہ ہونی چاہئے کہ اس زمانہ میں آدمی اللہ کی یاد اور آخرت کی تیاری کے لیے دوسری تمام فکروں سے فارغ اور آزاد ہو، اس لیے یہ مسنون دُعا ہر مومن کے دل کی دھڑکن ہونی چاہیے۔ "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ اَوْسَعَ رِزْقِكَ عَلَیَّ عِنْدَ كِبَرِ سِنِّیْ وَ انْقِطَاعِ عُمْرِیْ"۔

عَنْ اَنَسٍ (مَرْفُوْعًا) اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ خَیْرَ عُمْرِیْ آخِرَهٗ وَ خَیْرَ عَمَلِیْ خَوَاتِیْمَهٗ وَخَیْرَ اَیَّامِیْ یَوْمَ اَلْقَاكَ فِیْهِ۔

ـــــــــ رواه الطبرانی

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دُعا روایت

کی ہے" اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ خَیْرَ عُمْرِیْ آخِرَہٗ ...... تا ..... یَوْمَ اَلْقَاکَ فِیْہِ" (اے اللہ میرے عمر کے آخری حصہ کو میری زندگی کا بہترین حصہ کر دے اور میرے آخری عمل میری زندگی کے بہترین عمل ہوں، اور میرا سب سے اچھا دن وہ ہو جو تیرے حضور میں میری حاضری کا دن ہو) (معجم کبیر طبرانی)

عَنْ عَائِشَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہَا (مَرْفُوْعًا) اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ الَّذِیْنَ اِذَا اَحْسَنُوْا اسْتَبْشَرُوْا وَاِذَا اَسَاؤُا اسْتَغْفَرُوْا۔

رواہ ابن ماجہ والبیہقی فی شعب الایمان

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرمایا کرتے تھے "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ ...... تا ..... اِسْتَغْفَرُوْا" (اے اللہ مجھے ان بندوں میں سے کر دے جن کا حال یہ ہو کہ جب کوئی اچھا اور نیکی کا کام کریں تو انھیں دلی خوشی ہو اور جب ان سے کوئی برائی ہو جائے، تو انھیں (رنج ہو) اور وہ اللہ سے استغفار کریں اور معافی چاہیں۔ (سنن ابن ماجہ، شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) کسی بندہ کی سعادت اور اللہ کی نگاہ میں مقبولیت کی یہ خاص پہچان ہے کہ جب کسی اچھے کام کی توفیق ملے تو دل کو خوشی ہو اور اندر ایک نورانیت محسوس ہو، اور جب کوئی لغزش ہو جائے تو اندر ظلمت محسوس ہو اور اس کی وجہ سے رنج اور دکھ ہو اور پھر ندامت و استغفار ہو۔ اس دعا میں اللہ تعالیٰ سے یہی چیز مانگی گئی ہے۔ کتنے مختصر الفاظ میں کتنی عظیم نعمت مانگ لی گئی ہے!۔

یک دو ساعت صحبتے با اہل دل

مجلس حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی مدظلہ العالی

(مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

(پانچویں مجلس)

(۲۳ شوال ۸۶ھ مطابق ۲۴ جنوری ۶۸ء خانقاہ شریف بھوپال، حاضرین مجلس بوقت ۱۰ بجے سے ۱۲ بجے تک)

فرمایا کہ "میں آپ کے آنے سے پہلے ابھی تلاوت میں سورہ زمر پڑھ رہا تھا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ تنزیل الکتاب من اللہ العزیز الحکیم ۵ انا انزلنا الیک الکتاب بالحق فاعبد اللہ مخلصا لہ الدین ۵ الا للہ الدین الخالص۔ بس انھیں الفاظ پر ٹھٹھک کر کھڑے ہو جاتے کو جی چاہتا ہے، ان مختصر الفاظ میں کیا کچھ فرما دیا گیا ہے۔ ایک ناواقف آدمی بیج دیکھتا ہے، اس میں اس کو کچھ نظر نہیں آتا، لیکن واقف آدمی اس کو دیکھ کر اس کے اندر پورا تناور درخت دیکھ لیتا ہے۔ اس کی بیسیوں شاخیں، اس کے ہزاروں، لاکھوں پتے ان کے سیکڑوں پھل، سب اس کو نظر آجاتے ہیں، کہ یہ سب اسی چھوٹے سے خول میں ہیں،

لہ اس کتاب کا اتارا جانا اللہ عزیز و حکیم کی طرف سے ہوا ہے (اے پیغمبر) ہم نے یہ کتاب تمہاری طرف سچائی کے ساتھ نازل کی ہے تو تم خدا کی عبادت کرو۔ اسی کے لیے عبادت خالص کر کے۔ خبردار خالص عبادت خدا ہی کا حق ہے۔" الفرقان"

مگر اس دین اور اس قرآن کی قدر تو انھیں لوگوں تھی، جنھوں نے اس کو بیابانوں کی خاک چھان کر اور حق کی تلاش میں سرگرداں رہ کر پایا تھا، ان میں سے بعض بعض ایسے تھے جو یہودیوں کی عبادت گاہوں، عیسائیوں کے کلیساؤں میں دین حق کی تلاش کے لیے گئے، اور وہاں کے عابدوں، اور راہبوں نے کہا کہ تم تو بایں ہمہ چلتے ہوئے راستہ، اور رواجی دین پر ہیں، دین حق تو آنے والا ہے پھر جب ان کو اپنا گوہر مقصود نہ ملا، اور ان کا اخیر وقت آگیا تو انھوں نے بڑی حسرت سے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا "خدایا تو گواہ رہ کہ ہم اس دین حق کو مانتے ہیں، جو آنے والا ہے، اور ہم دین ابراہیمی پر جان دے رہے ہیں۔"

اس کی ایک چھوٹی سی مثال یوں سمجھئے کہ مئی جون کا روزہ ہو، آپ کی زبان خشک ہو، اور ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوں، آفتاب غروب ہونے والا ہو، آپ کسی ضرورت سے کسی کام کے لیے موٹر پر بیٹھ کر جائیں اور وہ کسی میدان میں پہونچ کر جہاں دور دور پانی نہ ہو فیل ہو جائے، اب افطار کا وقت آجائے اور پانی کا کہیں نام و نشان نہ ہو، اس وقت اگر آپ کو کوئی ایک گلاس پانی پیش کرے، تو آپ کی نگاہ میں اس کی کیا قیمت ہوگی، اور آپ اس کو کیسی بڑی نعمت اور آب حیات سمجھیں گے، دوسری مثال یوں سمجھیے کہ کسی شخص نے کسی عامی آدمی سے کہا کہ جو کلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا، وہ بجنسہ استنبول کے کتب خانہ میں موجود ہے، وہ شخص اوسی وقت اس کی زیارت کے لیے رخت سفر باندھ لیتا ہے، ہزار دقتوں سے اس کو پاسپورٹ اور ویزا ملتا ہے، پھر سمندر کے سفر کی کلفتیں، اور مصارف، غرض وہ سراپا اشتیاق بنا ہوا قسطنطنیہ کے ساحل پر اترتا ہے، جس وقت اس کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اس سرزمین پر ہو جہاں وہ کلام موجود ہے جو خدا کے آخری رسول پر نازل ہوا تھا، وہ پھولے نہیں سماتا، وہ اپنی قسمت پر ناز کرتا ہے، اور اس پر ایک عالم بے خودی طاری ہو جاتا ہے، پھر وہ ہمہ تن شوق و انتظار بنا ہوا اس کتب خانہ کے دروازہ پر پہونچتا ہے، جہاں یہ گوہر نایاب موجود ہے، اب آپ ہی اندازہ کیجیے کہ وہ کن نگاہوں سے اس کو دیکھے گا، کن ہاتھوں سے اس کو مس کرے گا، اور اس کی یہ تمنا پوری ہوگی تو اس کا کیا حال ہوگا، اس لیے کہ اس نے اس کے لیے اتنا طویل سفر اختیار کیا، اور بڑی سے بڑی مشقتیں برداشت کیں، اب اس کی مراد پوری ہونے کا وقت

آیا، یہی کلام الٰہی ہے جس کو ہم پانچ روپے، دس روپے خرچ کر کے بازار سے لے آتے ہیں۔ آج قرآن مجید کے ان نسخوں سے مسجدوں کے طاق بھرے ہوئے ہیں اور کسی کو ان کی قدر و قیمت معلوم نہیں، ایک بزرگ فرماتے تھے کہ جب چھاپہ خانہ نکلا، اور قرآن مجید کی طباعت کا سلسلہ شروع ہوا، تو ایک بزرگ نے فرمایا، کہ میں نے قرآن کو اٹھتے ہوئے دیکھا ہے، سارا معاملہ اہمیت، اور قدر و قیمت کا ہے، میں ایک رئیس کو جانتا ہوں، ایک صاحب نے عرضی دی کہ میں حج کو جا رہا ہوں، کوئی خاص توجہ نہیں ہوئی، پانچ دس روپے دے دیے، کسی نے ذکر کیا کہ ایک صاحب ولایت جانے والے ہیں، ان کو بلایا، استقبال کیا، اور بغیر ان کی طلب و ضرورت کے دو ہزار روپے پیش کر دیے، اصل یہ ہے کہ جس چیز کو آدمی دماغ میں پرورش کرتا ہے، وہی تناور درخت بن کر اپنے وقت پر پھل دینے لگتا ہے، درخت کی آدمی پرورش کرے، اور جب وہ پھول پھل دینے لگے تو اس پر اعتراض کرے یا تعجب، یہ کوئی عقل کی بات نہیں، یہی قرآن شریف ہے جس کی ایک آیت سن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اونٹ سے گر گئے ایسے بیمار پڑے کہ کئی روز تک لوگ ان کی عیادت کو آتے رہے، یہی قرآن شریف ہے، جو ہم پڑھتے ہیں اور کچھ اثر نہیں ہوتا، ہماری اور قرآن کی مثال ایسی ہے، جیسے کسی شخص کے پاس کوئی آئینہ ہو، مدت سے وہ اس کے پاس رکھا ہوا ہے، لیکن وہ ہمیشہ اس کو الٹا کر کے دیکھتا ہے، اور اس کو کچھ نظر نہیں آتا، مشائخ مجاہدات کراتے ہیں، مراقبات بتاتے ہیں، مرغوبات چھڑاتے ہیں، انبیاء نے مراقبہ نہیں بلکہ مشاہدہ کرایا ہے، وہ صرف یہ کہتے ہیں، کہ آئینہ کو سیدھا کر کے دیکھو سب کچھ نظر آ جائے گا "یا ایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ ولتنظر نفس ما قدمت لغد"[1] بس یہی آئینہ کو سیدھا کر کے دیکھنے کی تعلیم ہے۔

میرے ایک استاد تھے جن سے میں عربی زبان کی ابتدائی کتابیں پڑھتا تھا۔ ایک دن مجھے ایک کتاب کی فرہنگ اور شرح مل گئی، جس میں پوری کتاب کو حل کر دیا تھا، میں خوش

---

[1] اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ہر نفس دیکھے اور سوچے کہ اس نے آنے والے دن کے لیے (روز قیامت کے لیے) کیا کیا ہے؟ الفرقان

ڈاکٹر اس کو اپنے استاد کے پاس لے گیا، انھوں نے اس کو اٹھا کر پھینک دیا، میں نے کہا کیا اس کتاب میں کچھ غلطی ہے؟ کہنے لگے کہ غلطی؟ یہ اول سے آخر تک غلط ہے، کہنے لگے سب سے بڑی غلط بات یہ ہے، کہ اس میں وہ لکھا ہے جو ہم بھی نہیں جانتے، ایسی کتاب کے ہوتے ہوئے ہم کو کون پوچھے گا، اور ہمارے پاس کون پڑھنے کو آئے گا۔ بس یہی قرآن مجید کا معاملہ ہے کہ ذرہ سب سے مستغنی کر دیتا ہے، لوگ کہتے ہیں کہ قرآن پاک کے لیے اتنے علوم درکار ہیں، ہم کہتے ہیں کہ جہالت درکار ہے، حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس راہ میں جہالت نکارت کام دیتی ہے، اس علم کا قاعدہ ہے، کہ پڑھا تو قاعدہ سے جاتا ہے، پھر اس قاعدہ کو بھول کر اپنی اس علمی روشنی سے جو اس علم سے حاصل ہوئی، کام لیا جاتا ہے، طب میں بھی یہی ہوتا ہے، اگر وہ روشنی یا ملکہ پیدا نہ ہو تو آدمی کچھ کام نہیں کر سکتا، اسلام جذبات کو مارنے اور آزادی کو سلب کرنے کی تعلیم نہیں دیتا، صرف ان کا وقت و محل بتاتا ہے ہر چیز اپنے وقت پر سجتی اور زیب دیتی ہے۔

ریاست ٹکروائی میں ایک مرتبہ نواب صاحب نے ایک صاحب کا تعارف کروایا کہ یہ ڈاکٹر چندریا صاحب ہیں۔ یہ کچھ سوال کرنا چاہتے ہیں، میں نے کہا کہ میں طالب علم ہوں، کوئی عالم نہیں ہوں، اگر جواب نہ دے سکوں تو یہ نہ کہیے گا کہ میں نے ایک مسلمان عالم سے کچھ باتیں پوچھیں، وہ جواب نہ دے سکے، انھوں نے کہا کہ عرض کرنا یہ ہے کہ اللہ کی عبادت کے وقت دنیا کے تعلقات کو الگ کر کے اللہ سے قرب حاصل کرتے ہیں، عیسائی گرجوں میں، ہندو مندروں میں اور مسلمان مسجدوں میں ان سب تعلقات سے الگ ہو کر اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور اس کا قرب تلاش کرتے ہیں، میں نے سنا ہے کہ آپ کے یہاں اعتکاف کا بھی طریقہ ہے، جس میں تمام تعلقات دنیاوی سے کچھ دیر کے لیے علیحدگی ہو جاتی ہے، یہ کیسا طریقہ ہے کہ جنت میں شراب بھی ہے، حوریں بھی ہیں، اور اللہ کا قرب بھی، یہ تو دنیا میں بھی نہ ہوتا تھا، اور شراب تو ایسی بری چیز ہے کہ اس کا تو اس موقع پر قرآن شریف میں ذکر بھی نہ ہوتا تو اچھا تھا،

میں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب، میں آپ کے سوال سے بہت خوش ہوا، میں غور

اور تحقیق کرنے والوں سے بہت خوش ہوتا ہوں، جمود مجھے پسند نہیں، مگر میں آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں، آپ چونکہ ڈاکٹر بھی ہیں، اس لیے اور سہولت ہے، میں نے کہا کہ ہمارے حکماء بڑے بڑے قدحے پلاتے ہیں، لیکن ان میں وہ اثر نہیں ہوتا، جو آپ کی چھوٹی سی گولی میں اثر ہوتا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ آپ ہی بیان کریں گے، کہ اس گولی میں دوا کا جوہر آگیا ہے، اور یقیناً کسی چیز کا جوہر نکالا جاتا ہے، اور فاضل اجزاء کم کر دیئے جاتے ہیں، طاقت بڑھتی جاتی ہے، دوسری بات یہ ہے کہ انسان سب میں اشرف المخلوقات مانا جاتا ہے، اور سب اشیاء اسی کے لیے پیدا کی گئی ہیں، انسان کامل کسے کہیں گے؟ اسی کو نا! جس میں کمالات انسانی مکمل طور پر موجود ہوں، لولا، لنگڑا، اندھا، اپاہج نہ ہو، اب یہ عرض ہے کہ موت کے ذریعہ انسان کے ارضی اجزاء تو الگ ہو جاتے ہیں، اور اس کا جوہر رہ جاتا ہے، اس سے اس کی قوت بہت بڑھ جاتی ہے، اور اس کے سب کمالات اور طاقتیں ترقی کر جاتی ہیں، اب یہ تمام طاقتیں اور کمالات جنت میں موجود ہوں، اور محل صرف نہ ہو، تو یہ رحمت ہے یا عذاب؟ کسی کو تخت حکومت و خزانہ، اور گھر کے لوگ دیے گئے ہوں، اور کہہ دیا جائے کہ خبردار نظر اٹھا کر نہ دیکھنا، تو یہ اس کے حق میں رحمت ہے، یا اچھی خاصی سزا؟ یہی جنت کی ان نعمتوں کی حقیقت و حکمت ہے، آپ جو بار بار شراب کو دہرا رہے ہیں، تو آپ کی کون سی دوا شراب سے خالی ہے، محل بدل گیا، تو وہ اب اچھی چیز بن گئی، اور اس سے صحت ہونے لگی، تو اس پر وہ خاموش ہو گئے۔

فرمایا مجھے بحث و مناظرہ کا یہی طریقہ پسند ہے، کہ بغیر دل آزاری، اور صنفی نفسانیت کو ابھارنے والی باتوں سے پرہیز کرتے ہوئے اپنی بات سمجھانے، اور دل نشین کرنے کی کوشش کی جائے، مناظرہ کا وہ طرز پسند نہیں جس کو "دندان شکن" کہا جاتا ہے، مج

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

فرمایا! مقصدِ تخلیق کو بھلا کر ایک ایسی تعلیم میں منہمک ہونا جو موت کے بعد کی زندگی میں کام آنے والی نہیں، لوگ بڑی عقلمندی اور ترقی سمجھتے ہیں۔ اس تعلیم میں کوئی حرج نہیں، ضرورت کے لحاظ سے اس کو اختیار کیا جا سکتا ہے، مگر اس کو کمال اور ترقی سمجھنا بے جا ہے، پاخانہ جانا ضروری کام ہے، مگر وہاں بیٹھ کر کوئی یہ نہیں کہتا کہ نعمت خانہ میں بیٹھا ہوں، کل ایک بچے نے دل خوش کر دیا، اس سے پوچھا میاں کیا کر رہے ہو؟ اس نے کہا کہ "عمر ضائع کر رہا ہوں"۔ یہ احساس اور اعتراف بڑی چیز ہے، قاعدہ یہ ہے کہ جب چند آدمی کسی بات کو کہنے لگتے ہیں تو لوگ اس کو یقین کر لیتے ہیں، ایک کہے، دو کہے، جب متعدد آدمی ایک بات کو کہتے ہیں تو اچھے اچھے آدمیوں کو یقین آجاتا ہے، حالانکہ کسی کے کہنے سننے سے حقیقت نہیں بدلتی، ایک بزرگ نے بکری کا بچہ خریدا، دو تین ٹھگوں نے دیکھ لیا اور کہا کہ یہ بچہ ٹھگنا چاہیے، ان میں سے ایک نے اس راستہ پر جس سے یہ بزرگ گزرنے والے تھے ایک درخت کے نیچے مصلیٰ بچھا کر تسبیح پڑھنی شروع کر دی، ثقہ صورت، لانبا کرتہ، نیچی داڑھی، جب وہ بزرگ پاس سے گزرے تو یہ حضرت لپک کر پہونچے، بڑے ادب سے سلام کیا، دست بوسی کی اور کہنے لگے کہ حضور! اس کے لب پلید ہیں، اس کے روئیں بھی ناپاک ہیں، آپ نے ضرور چوکیداری کے لیے اس کو خریدا ہوگا، اس کے لیے تو بے شک جائز ہے، انھوں نے جھڑک دیا کہ آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ یہ بکری کا بچہ ہے، آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ فوراً ہاتھ جوڑ کر معذرت کی اور کہا کہ یہ میری نگاہوں کا قصور ہے، بھلا آپ جیسے بزرگ کتا کہیں خریدیں گے؟ آگے بڑھے تو ایک اور صاحب اسی طرح مقدس صورت بنائے ہوئے ملے، آگے بڑھے اور قدموں میں گر گئے، کہنے لگے کہ اچھے لوگوں کی زیارت بھی کفارہ ذنوب ہے۔ حضور نے کھیت کی حفاظت کے لیے اس کو لیا ہوگا، انھوں نے پھر ڈانٹا اور کہا کہ "آپ کو سجھائی نہیں دیتا کہ یہ بکری کا بچہ ہے یا کتا ہے۔" کہنے لگے "حضرت نے صحیح فرمایا۔ میں جھوٹا، میری نگاہیں جھوٹی۔" آگے بڑھے تو تیسرے صاحب ملے اور کہا کہ "حضرت یہ بڑی اچھی نسل کا معلوم ہوتا ہے تازی کتا ہے" اس پر وہ بھی شبہ میں پڑ گئے اور کہنے لگے ایک غلطی کر سکتا ہے، دو غلطی کر سکتے ہیں، اتنے آدمی

تو غلطی نہیں کر سکتے، مجھ ہی کو دھوکا ہوا ہوگا، انھوں نے بکری کے بچہ کو چھوڑ دیا اور چلے گئے ٹھگو نے اس کو ٹھگ لیا۔

فرمایا، اگلے مذاہب میں دواؤں کے اجزاء بتا دیتے تھے اور نسخہ لکھ کر دیدیتے تھے، جاؤ تلاش کرو، اجزاء فراہم کرو، اور دوا بناؤ، آخر میں جو حکیم تشریف لائے (صلی اللہ علیہ وسلم) انھوں نے بنی بنائی دوا، اور تیار معجون دیدیا، جس میں اجزاء کو جمع کرنے، چھاننے پیسنے، جوش دینے کی دردسری نہیں، اور فرمادیا کہ صبح آفتاب نکلنے سے پہلے کھالینا، پھر سورج ڈھلے کھانا، پھر عصر کو استعمال کرنا، پھر غروب آفتاب پر، پھر شفق ڈوبنے کے بعد[۱]، اگر قوت ہو تو پچھلے کو اٹھ کر کھالینا ورنہ[۲] آفتاب نکلنے سے پہلے پہلے، اس سے زیادہ آسان نسخہ کیا ہو سکتا ہے۔ اور فرمادیا:

"لا یذوقون فیھا الموت" اس دوا کی تاثیر یہ ہے کہ (دائمی اور حقیقی) موت اور فنائے کلی کا خطرہ نہیں، حیات جاوید ضرور حاصل ہوگی۔

---

[۱] فرض نمازوں کے اوقات خمسہ ۱۲ [۲] تہجد کی نماز ۱۲

سراج الہند حضرت شاہ عبد العزیز محدّث دہلویؒ

مکتوبات، علمی و ادبی تبرّکات

مرتبہ ـ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

من رشحات اقلام قدوۃ الادباء الشیخ عبد العزیزؒ

... ولمّا اتمّ تحریر الجواب و
حان تختم الکتاب دار
فی خلدی ان اخبرکم
ببعض النعم اللّتی انعم
اللّٰہ علیّ وثبّت اساسہا
واختار براسہا الذی ـ
فمنہا انّ سیّدی والدی
رضی اللّٰہ عنہ لمّا توفّی
والتحق بالملاء الاعلیٰ
ترکنی صغیرا السنّ الّا انّی
لہ اعادِ رمع صغرِ سنّی

اب جبکہ جواب لکھا جا چکا اور مضمون
خط ختم ہو رہا ہے ـ میرے دل میں یہ
بات آئی کہ میں آپ کو اللہ تعالیٰ کی
بہت سی نعمتوں میں سے ان چند نعمتوں
سے مطلع کروں جو اس نے میرے
اوپر خاص طور پر کی ہیں ـ منجملہ ان
نعمتوں کے ایک یہ ہے کہ حضرت والد
ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے جب وفات پائی
اور ملاء اعلیٰ سے ملحق ہوئے انھوں نے
مجھے صغیر السن چھوڑا تھا، مگر میں نے
باوجود اپنی کم عمری کے ان کے علوم

علماً من علومه وشاناً من
شئونه الّا وقد اخذتُ منه
بجُملةٍ كافيةٍ وتشبثتُ من
اذيالهٖ بقطعةٍ وافيةٍ وذٰلكَ
من فضلِ اللهِ علينا وعلى
النّاسِ وكان من اسباب ذٰلكَ انّي
ما زلتُ مُنذ امِيطت عن التمائمِ
ونيطت بي العمائمُ مشغوفاً
بمصاحبته مولعاً بقربه
ومجالسته .... وبها يظهر
محاسن المناسباتِ الروحيةِ
والاستعداديةِ وتبرزُ
حسناتها ـ وترك اِخوتي
كلّهم لم يمصّوا ثدي علومه
الخاصة ولا اخذوا منه
مما يُعدّ هم لِاخذ علومه
حتّٰى انّ اخي رفيع الدين
سلمه الله كان مشغولاً بالفوائد
الضيائية وتعليقات الكافية
اذ هجمت هذه الواقعة
التي اطارت الالبابَ واسطالتُ
على القلوب والاكباد
فوفّقني الله تعالٰى لضبطهم

میں سے کوئی علم نہ چھوڑا جس کو حاصل
نہ کیا ہو۔ اتنی عمر میں میں نے ان سے
کافی استفادہ کیا۔ یہ محض اللہ کا فضل
تھا میرے اوپر اور تمام انسانوں پر۔
کم عمری میں استفادہ کرنے کے اسباب
میں سے ایک سبب ظاہر یہ بھی تھا کہ
میں نے جب سے ہوش سنبھالا برابر
حضرت والد ماجدؒ کی صحبت اقدس
میں رہنے اور ان کی مجلس اقدس میں
بیٹھنے کا بیحد شوق رکھتا تھا۔ صحبت
ومجالست سے مناسبات روحانی کے
محاسن اور استعداد علمی کے کمالات
جلوہ گر ہوا کرتے ہیں۔ والد ماجدؒ نے
میرے بھائیوں کو اس حال میں اور
اس عمر میں چھوڑا تھا کہ انھوں نے
حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے علوم خاصہ کو
بالکل بھی نہیں چھوا تھا۔ اور نہ ضروری
علوم میں سے اتنا پڑھا تھا کہ ان کے
علوم خاصہ کو حاصل کرنے کا ذریعہ بن
جاتے۔ حتیٰ کہ رفیع الدین سلمہٗ فوائد ضیائیہ
(شرح جامی) اور تعلیقات کافیہ پڑھ
رہے تھے کہ والد ماجدؒ کی وفات کا
جانکاہ اور ہوش ربا واقعہ پیش آگیا۔

ودعيتهم إلى هذا الشان و
حثثهم على تحصيل العلم و
اخذه بكل لسان - فاثر
ذلك فيهم واشتغلوا بقرأة الكتب
وسماعها على هذا الفقير فجاءوا
الحمد لله كما تشتهيه القلوب
وتلذه الاعين اما رفيع الدين
فقد حفظ القرآن كُلَّهُ وفرغ
بحمد الله من تحصيل العلوم
كلها لاسيما الادبية والفلسفة
والاصليين من العلوم الدينية
بل اَخَذَ من العلوم الغريبة
كالهيئة والنجوم والحساب
والهندسة وما يجري مجراها
من الرمل والجفر والتاريخ
وعلم الفرائض والشعر ورسائل
التصوف بحظ وافر وبقى له
العبورُ على الصحاح الستة و
غيرها من كتب الحديث
وعسى ان يوفقه الله تعالى
لذلك ايضاً وهو بحمد الله
مشغول بتفسير البيضاوی و
مشغوف بالتدريس......

اللہ تعالیٰ نے مجھے توفیق دی کہ میں نے
سب بھائیوں کو تحصیل علم اور ہر
رائج الوقت زبان سیکھنے کی ترغیب
دی۔ چنانچہ ان پر میری ترغیب کا
اثر ہوا اور وہ اس فقیر کے پاس کتابوں
کے پڑھنے اور سننے میں مشغول رہے
تاآنکہ الحمد للہ حسب دلخواہ اپنی استعداد
پیدا کی جس سے آنکھیں ٹھنڈی ہوتی
ہیں۔ بہرحال رفیع الدین نے قرآن
مجید حفظ کرلیا ہے اور وہ بحمد اللہ تمام
علوم کی تحصیل سے فارغ ہوچکے ہیں
خاص طور پر علوم ادبیہ اور فلسفہ اور
علوم دینیہ کی دونوں اصلوں (قرآن و
حدیث) میں ان کو تخصص حاصل ہے۔
بلکہ انھوں نے علوم غریبہ بھی حاصل
کیے ہیں جیسے ہیئت، نجوم، حساب،
ہندسہ، رمل، جفر، تاریخ، علم الفرائض
علم شعر، نیز رسائل تصوف بھی پڑھے
ہیں اور ان کو ان علوم میں پورا پورا
حصہ ملا ہے۔ ابھی ان کا صحاح ستہ
وغیرہا پر عبور یعنی دورۂ حدیث باقی ہے۔
امید ہے کہ اللہ تعالیٰ عنقریب توفیق
عطا فرمائے گا۔

ولہ تعلیقاتٌ و تدقیقاتٌ
تقرّ بہا العین و تسرّ بہا الصدرُ
فالحمد للہ علی ذلک۔
واما عبد القادر فھو ایضاً
فرغ بحمد اللہ من حفظ القرآنِ
کلّہ و اسمع فی التراویح مرّاتٍ
وھو الآن مشغولٌ بالقطبی
وحواشی السید علیہ ۔
واما عبد الغنی فقد حفظ
نصف القرآن وھو مشغولٌ
بہ ......

بحمد اللہ فی الحال وہ تفسیر بیضاوی
پڑھ رہے ہیں اور درس و تدریس سے
بھی شغف رکھتے ہیں ..... ان کے
قلم سے تعلیقات اور تدقیقات بھی ہیں
جن کو دیکھ کر آنکھوں کو ٹھنڈک نصیب
ہوتی ہے اور دل کو سرور حاصل ہوتا
ہے۔
عبد القادر بھی بحمد اللہ حفظ قرآن
سے فارغ ہو چکے ہیں اور کئی مرتبہ
تراویح سنا چکے ہیں۔ اس وقت وہ
قطبی اور اس کے حواشی سید پڑھ رہے
ہیں ۔ عبد الغنی نصف قرآن مجید
حفظ کر چکے ہیں۔ ابھی اسی میں مشغول
ہیں......

من عبارات الشیخ الاجل فی تعریف الدھلی

الدھلی وما الدھلی...ھی
خیر البلاد ومنفعۃ العباد
یؤمّہا اھل الالباب من کلّ
مکانٍ سحیق..... لیشھدوا
منافع لھم ویاخذوا الادب
فیھا ویخوضوا فی کلّ من العلم
غور عمیق ۔ اھلہا خیر

دہلی کیا ہے؟ دہلی ایک بہترین شہر
ہے لوگوں کی منفعت کا مرکز ہے،
عقلمند لوگ دور دور سے یہاں آتے
ہیں تاکہ اپنے منافع کو پہونچیں اور
یہاں علم و ادب سیکھیں اور یہاں
رہ کر ہر علم کے اندر غور و خوض کریں
یہاں کے باشندے بہترین آدمی ہیں

اهلٍ ولسانها اسهل من كلِّ
سهلٍ ترى العربيَّ فيها لا يتضجر
من لسانه والاصفهانيَّ يظنّها
خيراً من اصفهانه والتورانيَّ
قد القىٰ فيها بجرانه والافاغنته
من اقلّ عبيدها والكشامرة
من طارفها وتليدها تجدُ
فيها اشياء لم تعرف لها
اسماً وتنظر بها رجالا لم
تدرك منهم رسماً لعمرك انها
زبدة جميع الاقاليم ومسكن
ارباب الدولِ والنعيم المالُ
فيها يميل عنه العيونُ بلْ
لا يدركه الظنونُ - والذهبُ
قد ذهب عن القياسُ الفضّةُ
قد فضضت عقول الناسِ
والحريرُ تجاوز من الاحرار
الى العبيد فالناظرُ ليشبه
كلَّ يوم فيها بالعيد فـ
والقرآن المجيد لو اصغيتَ
الى محامدها لتعجّبتَ وقلت
ذلك امرٌ بعيد متى ما
خرجت الى سوقها وتسلّلت

ان کی زبان بڑی سہل اور آسان ہے
عرب کے باشندے کو دیکھوگے کہ اپنی
زبان کی وجہ سے یہاں پریشان نہیں
ہوتا۔ اصفہانی اس شہر کو اپنے اصفہان
سے بھی اچھا سمجھتا ہے اور تورانی
نے تو اس کو اپنا وطن بنا لیا ہے۔
افاغنۂ دہلی کے زیب آراستہ کرنے کے
لحاظ سے خدام ہیں۔ اور کشمیری (اپنے
تعلق کی بنا پر) یہاں کا مال جدید و
قدیم ہیں۔ تم یہاں پر کچھ ایسی چیزیں
دیکھوگے جن کے تم کو نام بھی معلوم
نہیں اور ایسے اشخاص بھی یہاں
پاؤگے جن کے رسم و رواج تک سے
تم واقف نہیں۔ بقسم کہتا ہوں کہ
یہ شہر تمام اقالیم میں (بعض لحاظ سے)
ایک عمدہ اور منتخب شہر ہے۔ یہ
ارباب دول و نعیم کا مسکن ہے۔ یہاں
مال اس کثرت سے ہے کہ نظریں اس
سے اعراض کرتی ہیں اور اس کی
مقدار سمجھ میں نہیں آسکتی۔ یہاں
سونا قیاس سے باہر ہے اور چاندی
کی فراوانی نے لوگوں کی عقلوں کو
حیران کر رکھا ہے۔ یہاں ریشم احرار

الیٰ مجامعہا لما ارتبت انک
لفی خلق جدید۔ فینادی
لک ھاتف من فلک فکشفنا
عنک غطاءک فبصرک
الیوم حدید۔

سے متجاوز ہو کر غلاموں تک پہونچ گیا ہے۔ ناظر کو روزانہ یہاں عید کا شبہ ہوتا ہے۔
قسم ہو قرآن مجید کی اگر تم اس شہر کی تعریفوں کی طرف کان لگاؤگے تو تعجب کروگے اور کہوگے کہ یہ امر بعید ہے، اور جب تم اس کے بازاروں اور مجموں کی طرف جاؤگے تو تم کو بالکل شک نہ ہوگا کہ تم خلق جدید کے اندر ہو اس وقت فلک سے ہاتف غیبی تم کو ندا دے گا ـــــ اور یہ آیت پڑھے گا۔
"ہم نے آج کے دن تیری آنکھوں سے پردہ ہٹا دیا، اب تیری نگاہ تیز ہے"۔

ایک اہم مکتوب اور اس کا جواب

خواجہ حسن مودودی لکھنوی نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کو ایک مکتوب فارسی زبان میں تحریر فرمایا جس کا ترجمہ بطور خلاصہ یہ ہے۔

حقائق آگاہ معارف پناہ جامع علوم یقینی وحاوی فنون رسمی مولانا مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب ـــــ فقیر عاصی پر معاصی حسن مودودی عفا اللہ عنہ کی طرف سے بعد سلام ملاحظہ فرمائیں ـــــ

کل، حافظ الملک نواب محمد خاں بہادر ابن حافظ الملک حافظ رحمت خاں بہادر شہید مغفور میرے پاس تشریف لائے تھے۔ اثنائے گفتگو میں انھوں نے فرمایا کہ آپ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کو لکھیں کہ انھوں نے اپنی کتاب مستطاب، تحفۂ اثنا عشریہ میں حضرات شیعہ کے اس اعتراض کا کوئی جواب

نہیں دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اکثر غزوات میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے علاوہ تمام خلفاء راشدین کو دوسرے امراء کا تابع کرکے روانہ فرمایا ہے حضرت علیؓ کو کسی کا تابع کرکے کسی لشکر میں نہیں بھیجا اس سے تینوں خلفائے راشدین کے مقابلے میں حضرت علیؓ کی ترجیح ثابت ہوتی ہے۔

اگر شاہ صاحب ایسا جواب تحریر فرمادیں جو تسکین بخش اور دافع خطرات و شبہات ہو تو بڑی مہربانی ہوگی"۔ اسی وجہ سے میں خدمت عالی میں لکھ رہا ہوں۔ اگر آپ اس کا جواب عنایت فرمائیں گے تو باعث اجر ہوگا۔ اگرچہ میرے پاس بھی اس سوال کا جواب دلائل قویہ کے ساتھ موجود ہے، لیکن چونکہ نواب صاحب آپ ہی سے دریافت کرنا چاہتے ہیں میرے جواب سے ان کو تسکین نہ ہوگی اسی بناء پر میں نے ان کو خود اس کا جواب نہیں دیا۔

مولانا رفیع الدین صاحب، مولوی عبدالقادر صاحب سے سلام مسنون فرمادیں۔ حاجی شرف الدین خاں آپ تینوں حضرات کو سلام مسنون پہونچاتے ہیں۔

جواب از جانب حضرت شاہ عبدالعزیزؒ

...... خدمت سلالۃ الاسلاف الکرام ونتیجۃ الآباء العظام، سباق مضمار البلاغۃ واللسن المسمیٰ بالاسم الحسن المتخلق بالخلق الحسن مودودیۃ الطریقۃ والنسب، بصری الاسم والادب سلمہ اللہ تعالیٰ۔

از ہیں فقیر بیہیچ وناچیز مسمّیٰ بعبدالعزیز عفا اللہ عنہ تحیۃ الاسلام مقرون باشتیاق مالاکلام قبول فرمایند بعدہٗ آنکہ صحیفۂ شریفہ ونمیقۂ انیقہ

..... موصوف باوصاف حمیدہ مسمیٰ باسم حسن متخلق بخلق حسن۔ طریقت اور نسب میں مودودی، حسن بصریؒ کے ہم نام یعنی خواجہ حسن لکھنوی، فقیر بے ہیچ وناچیز عبدالعزیز عفاء اللہ عنہ کی طرف سے ایسا سلام مسنون قبول فرمائیں جو اشتیاق بیحد سے مقرون ہے۔ اس کے بعد واضح ہو کہ آپ کا مکتوب گرامی موصول ہو کر مسرت کا

در وقتے وصول عزت شمول آورد و بہجت آمود فرمود اگرچہ بسبب امراض گوناگوں و عوارض بوقلموں حواس خمسہ ظاہری در انتشار و مدرکات باطنی در مجاہدۂ اسقام و آلام گرفتار۔۔ معہذا امتثالاً للامر الشریف ۔ بتحریر جواب سوال نواب حافظ الملک می پردازد۔

در تحفۂ اثنا عشریہ ۔ گفتگوئے شیعہ و سُنّی است مبحث تفضیل در آں اندراج ندارد و ایں سوال متوجہ بر مسئلۂ تفضیل است لاجرم در تحفۂ مذکور نشدہ ۔

ازیں سوال دو جواب گفتہ اند اول جواب اہل سیر و روایت است و دوم جواب اہل نصر و درایت۔

حاصل جواب اول آنکہ از تتبع سیر آنسرور معلوم است کہ آنسرور ہیچ کس را از بنی ہاشم بلکہ بنی اُمیہ نیز در اکثر اوقات ۔ تابع دیگرے نفرمودہ اند دریں امر، حضرت حمزہؓ و ابو عبیدہ بن الحارث بن عبد المطلبؓ و حضرت عباسؓ و حضرت جعفرؓ و حضرت عقیلؓ و فضل بن عباسؓ و ابو سفیان

باعث ہوا۔ اگرچہ امراض گوناگوں اور عوارض بوقلموں کی وجہ سے حواس خمسہ ظاہری انتشار پذیر ہیں اور مدرکات باطنی اسقام و آلام کی مشقت میں گرفتار ہیں۔ پھر بھی نواب حافظ الملک (محبت خاں) کے سوال کا جواب دیتا ہوں۔

(دراصل) تحفۂ اثنا عشریہ میں بحث شیعہ و سُنّی ہے۔ تفضیل کا مبحث اس کے اندر نہیں ہے اور یہ سوال مسئلۂ تفضیل سے تعلق رکھتا ہے اسی وجہ سے تحفہ میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔

اس سوال کے دو جواب دیئے گئے ہیں۔ پہلا جواب اہل سیر و روایت کا ہے اور دوسرا اہل نصر و درایت کا۔

پہلے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ کتب سیرت آنسرور صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی ہاشم بلکہ بنی اُمیہ میں سے بھی کسی شخص کو اکثر اوقات میں کسی دوسرے خاندان کا تابع نہیں بنایا اس معاملے میں حضرت حمزہؓ حضرت

بن الحارث رضؓ و حضرت عثمان بن عفان رضؓ
اموی و خالد بن سعید بن العاص اموی رضؓ
شریک اند۔ اگر این امتیاز رجحانے
ہست نیز ہمہ راست۔ و جہش آنست
کہ این ہر دو قبیلہ از قدیم، ریاست
قریش داشتند و بسبب قربت قرابت
اینہا با جناب رسولؐ، شرف دیگر اینہا
را افزود و لنعم ما قیل۔
کنند خویش نیاز تو ناز می زیبد
بحسن یک کس اگر یک قبیلہ ناز کند
پس اگر اینہا را تابع دیگرے می
فرمودند خیلے شاق و گران بر طبائع
و امزجہ اینہا می آمد و نزدیک تکلیف
مالا یطاق می رسید و شارع حکیم است
بتیسیر در ہر تکلیف مراعات می فرماید۔
و این وجہ را کسانے کہ در حنا نداں
ریاست پیدا شدہ اند و اخوان دینی عام
خود را بتجربہ و امتحان نمودہ کرای العین
می فہمند۔ ع
حاجت تنبیہ نیست عارف آگاہ را
و حاصل جواب ثانی مسبوق بتمہید مقدمہ
است و آں مقدمہ این است کہ سنت
اللہ جاری است کہ بطبع باقصیٰ و رجال

ابو عبیدہ بن الحارث بن عبد المطلب رضؓ
حضرت عباسؓ، حضرت جعفر رضؓ، حضرت
عقیل رضؓ، حضرت فضل بن عباس رضؓ،
حضرت ابو سفیان بن الحارث رضؓ، حضرت
عثمان بن عفان اموی رضؓ اور حضرت
خالد بن سعید بن العاص اموی رضؓ بھی
شریک ہیں۔ اگر اس امتیاز کی بنا
پر کسی کو ترجیح ہے تو ان سب کے
لیے ہے۔ ان دونوں قبیلوں کو کسی
کا تابع نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں
قبیلے قدیم سے قریش کی سرداری کے
وارث و حامل تھے، پھر آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کی قرابت قریبہ کی وجہ سے
ایک اور شرف بھی ان دونوں قبیلوں
کو حاصل ہوگیا۔ کسی شاعر نے کیا خوب
کہا ہے۔ کنند خویش نیاز تو ناز الخ
(یعنی اے محبوب تیرے خویش و اقارب
تیرے ناز کی بنا پر ناز کرتے ہیں۔ اگر کسی
ایک فرد کے کمال کی وجہ سے پورا قبیلہ
ناز کرے تو یہ بات ایک حد تک زیبا ہے)
اگر ان کو کسی دوسرے قبیلے کے کسی فرد
کے تابع بنایا جاتا تو اس کا امکان تھا
کہ مزاجاً اور طبعاً ان کو بہت شاق و

کمال بے طے مراتب تحتانی آں نمی شود
اگر ابتداءً ہر شخصے را مرتبۂ علیا از
کمال، القا کنند بے آنکہ طے مراتب
سافلہ کردہ باشد حوصلہ اش تنگی می کند
و عہدۂ ایں مرتبہ کما ینبغی بر نمی تواند آمد
غیر از انبیاء ہمہ کس دریں امر یکساں اند
اولیاء تا وقتے کہ مشق از ادب و اتباع
پیرانِ خود نکردہ ند بمرتبۂ ارشاد
نرسیدہ و علماء تا وقتے کہ سالہا
لت خورِ استاداں نگشتہ و گردِ مدرسہ
نخوردہ اند بمرتبۂ تدریس و تعلیم نرسیدہ
اند۔ و ہمچنیں در فرقۂ اُمراء و دیگر
اہلِ حرف و صنائع مجرّب و ممتحن
است و قاعدۂ حکمیہ نیز ہمیں را
اقتضاء می کند بر دو وجہ اوّل آنکہ
بلوغ نفوس با قصیٰ کمال خود تدریجی
است۔

دوم آنکہ ریاست متضایف
مرؤسیۃ است تا وقتیکہ شخصے مدتے
دراز مرؤس و تابع نشدہ باشد در وقت
ریاست بحق الیقین نمی تواند کہ حسن
معاملہ را با مرؤسین بفہمد و بداند کہ
مرؤس و رعیت را بکدام کدام سلوک

گزرے اور بات تکلیف مالایطاق
کی حد تک پہونچ جائے۔ شارع کے
سارے اصول و قوانین مبنی بر حکمت ہیں۔
اور ہر تکلیف میں تیسیر کی رعایت ملحوظ رکھی
گئی ہے۔ یہاں بھی یہی لحاظ رکھا گیا۔ اس
بات کو وہ لوگ جو خاندان ریاست میں
پیدا ہوئے ہیں اور اپنے سگے بھائیوں اور
چچازاد بھائیوں کا تجربہ و امتحان کیے
ہوئے ہیں بدیہی طور پر سمجھ سکتے ہیں "عارف آگاہ
کو تنبیہ کی ضرورت نہیں ہوتی"

دوسرے جواب کا حاصل ایک مقدمہ
کی تمہید پر موقوف ہے وہ مقدمہ یہ ہو
کہ سنت اللہ اس طرح جاری ہے کہ
منتہائے کمال پر پہونچنا تحتانی مراتب کو
طے کیے بغیر کما حقہٗ میسر نہیں ہوتا۔
اگر ہر شخص کو ابتدا ہی میں کمال کا مرتبہ
عالی دے دیا جائے بغیر اس کے کہ وہ نیچے
کے درجات و مراتب طے کرے تو ایسی
صورت میں اس کا حوصلہ تنگ ہو جائے
گا اور اس مرتبے کی ذمہ داری سے
کما حقہٗ عہدہ برآ نہ ہو سکے گا۔ حضرات
انبیاء علیہم السلام کے علاوہ تمام انسان
اس امر میں مساوی ہیں، اولیاء کو دیکھیے

التمالت و جلب قلوب، تواں کرد و از کدام
کدام سلوک متنفر می شوند و رم می کنند پس
ریاست او علیٰ جنبہا تمکن نمی پذیرد و چوں
ایں مقدمہ ممہد شد، می گویم کہ آنحضرت صلی
اللہ علیہ وسلم را چناں کہ از احادیث
بسیار مستفاد می شود خلافت ایں چہار
بزرگ علیٰ ترتیبہا از غیب معلوم شدہ بود
و چوں خلیفۂ رابع را قابلیت و چہار
سال مرد سیت و تبعیت و فرمان سہ
کس مختلف الامزجہ برداشتن مقدر
بود، حاجت مشق کنانیدن اینکار بحضور
خود نبود و خلیفۂ ثالث را کہ تا دوازدہ
سال مشق ایں کار، مقرر بود و زیر فرمان
دو کس ماندن، ایشاں ہم محتاج مشق
ایں کار نشدند بخلاف شیخین کہ اینہا را
بلا فصل بعد از وفات آنجناب صلی اللہ
علیہ وسلم ریاست مقدر بود اینہارا
مشق ایں کار بحضور خود کنانیدن ضرور
افتاد زیرا کہ خلیفۂ اول، بمجرد وفات
آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بر منصب
ریاست نشستند و خلیفۂ دوم بفاصلہ
دو سال و سہ ماہ در حضور خلیفۂ اول
من حیث المشورہ والوزارۃ شریک

جب تک انھوں نے ادب کی مشق اور اپنے
مرشدوں کی اتباع نہیں کی مرتبۂ ارشاد
کو نہیں پہونچے، اسی طرح علماء نے تا وقتیکہ
سالہا سال اپنے اُستادوں کی مار یں
نہیں کھائیں اور مدتوں مدرسے کی خاک
نہیں پھانکی، تدریس و تعلیم کی مسند پر فائز
ہوئے، یہی بات فرقۂ امراء اور دیگر اہلِ
حرفہ و اہل صنعت میں آزمائی جا چکی ہے۔
اور حکمت کا قاعدہ بھی اسی کا اقتضا کرتا
ہے دو سبب سے (۱) حد کمال تک نفوس
کا پہونچنا تدریجی ہے (۲) ریاست و سرداری
تابعداری سے وابستہ ہے۔ جب تک کہ
کوئی شخص طویل عرصے کسی کا تابع نہ رہا ہوگا
ریاست و سرداری کے منصب پر پہونچنے
کے بعد رعیت کے حقوق اچھی طرح ادا نہ کر
سکے گا اور نہ یہ سمجھ سکے گا کہ رعیت کے
دلوں کو کس کس طرز عمل اور تدبیر سے اپنی
طرف کھینچا جا سکتا ہے۔ اور کن کن باتوں
سے رعیت اپنے سردار سے متنفر ہو جایا
کرتی ہے۔ جب وہ اس گُر کو نہ سمجھ سکے
گا تو اس کی ریاست بھی قوت نہیں پا
سکتی۔ جب یہ مقدمہ بطور تمہید لکھا جا
چکا تو اب میں کہتا ہوں کہ آں حضرت

خلافت بودہ اند۔ بلکہ از تتبع تواریخ معلوم
می شود کہ خلیفہ اوّل را نیز بحضور آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کمتر اتفاقِ تبعیت واقع
شدہ و خلیفہ دوم را بیشتر تعینات واز
تابعین دیگراں فرمودہ اند بنا بر آنکہ
مزاجِ خلیفہ اول سہل الانقیاد بود و
ایشاں را مشقِ تبعیت چنداں ضرور
نبود بخلاف خلیفہ دوم کہ در مزاج ایشاں
از قدیم استبداد و حکم رانی مجبول بود
والطبیب یعالج الشئی بالضد۔ بنا
بریں امورات ایشاں را بحق الیقین
کیفیت تبعیت و زیر فرمان کسے بودن
چشانیدن ضرور افتاد۔ خانی شرف اللہ
خانصاحب از اصحاب ثلثہ کہ رابع
غیر منفک نیز ہمراہ دارند بحکم ما یکون
من نجوی ثلثۃ الآیۃ متصف اند۔

صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسا کہ احادیث سے
معلوم ہوتا ہے، چاروں خلفاء کی خلافت
ترتیب کے ساتھ غیب سے معلوم ہو گئی
تھی۔ خلیفۂ رابع (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)
کے لیے چونکہ چوبیس (۲۴) سال تک تین مختلف
المزاج خلفاء کے تابع رہنا مقدر تھا
اس لیے اُن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے اپنی حیاتِ ظاہری میں کسی کا تابع بننے
کی مشق کرانی ضروری نہیں سمجھی۔ خلیفۂ ثالث
(حضرت عثمان غنی رض) جن کو بارہ سال تک
شیخین رض کے تابع رہنا مقدر تھا۔ وہ
بھی چنداں اس مشق کے محتاج آں حضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نہیں ہوئے
بخلاف شیخین رض کے کہ اُن کے لیے چونکہ بلا فصل
بعد از وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
خلافت و ریاست مقدر تھی۔ اس لیے اُن
کو اس کام کی مشق اپنے سامنے کرانی ضروری
سمجھی کیونکہ خلیفۂ اول (حضرت ابو بکر صدیق رض) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات
کے فوراً بعد منصب خلافت و ریاست پر فائز ہوئے اور خلیفۂ دوم (حضرت فاروق
اعظم رض) دو سال تین ماہ کے فاصلے سے اس منصب پر قائم ہوئے اور خلیفۂ اوّل
کی خلافت کے زمانے میں وہ مشیر و وزیر تھے اور شریک خلافت کی حیثیت رکھتے
تھے۔ خلیفۂ اوّل کو بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں کسی کی تبعیت
کا موقع کم ملا۔ البتہ خلیفۂ دوم منجانب رسول اکرم صلعم اکثر و بیشتر دوسروں کے تابع

کیے گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خلیفۂ اوّل کا مزاج قدرتی طور پر نرم اور انقیاد پذیر تھا۔ اس لیے اُن کو تابعداری کی زیادہ مشق کی ضرورت نہ تھی۔ بخلاف خلیفۂ دوئم کے کہ ان کے مزاج میں پہلے سے شدّت اور حکمرانی کا مادہ تھا اور طبیب علاج بالضد کیا کرتا ہے۔ اس بنا پر خلیفۂ دوئم کو کیفیت تبعیت سے واقف کرانا اور دوسروں کے زیر فرمان رہنے کا مزہ چکھا دینا ضروری ہوا۔ حاجی شرف الدین خانصاحب کو ہم تینوں بھائیوں کا سلام پہونچے۔

الفرقان
ملکیت اور دیگر تفصیلات
فارم نمبر ۴
دیکھیے رول (۸)

۱۔ مقام اشاعت .... کچہری روڈ لکھنؤ
۲۔ وقفۂ اشاعت .... ماہانہ
۳۔ پرنٹر کا نام .... محمد منظور نعمانی
۴۔ پبلشر کا نام .... ״
۵۔ ایڈیٹر کا نام .... محمد منظور نعمانی
۶۔ مالک کا نام .... ״
۷۔ شہریت .... ہندوستانی
۸۔ پتہ .... کچہری روڈ لکھنؤ

میں محمد منظور نعمانی اعلان کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین میں صحیح ہیں۔
—— محمد منظور نعمانی (پبلشر)

اسلام میں عقل کا کردار

(از ڈاکٹر سید محمد یوسف صدر شعبہ عربی کراچی یونیورسٹی)

[گزشتہ فروری میں راولپنڈی میں جو بین الاقوامی اسلامی کانفرنس ہوئی تھی اس میں پیش کیا ہوا حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ کا مقالہ (تقسیم دولت کا اسلامی نظام) الفرقان کے گزشتہ دو شماروں میں شائع کیا جا چکا ہے۔

اسی کانفرنس میں کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے صدر ڈاکٹر سید محمد یوسف صاحب نے عربی زبان میں ایک بڑی اہم تقریر فرمائی تھی جس میں "عقل سلیم" اور "عقل مسلم" اور "وحی" اور "اجتہاد" کے موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے اور اُن سب کے حدود کار متعین کرتے ہوئے اُن مدعیانِ علم و دانش کے طرز عمل پر بھی بڑی فاضلانہ اور عادلانہ تنقید کی تھی جو اسلام کے اصل ماخذ قرآن و حدیث اور اُنکی زبان عربی سے بے بہرہ ہونیکے باوجود محض اپنی عقل خام کے زور سے یا چند اُردو یا انگریزی پڑھ کے پنے کو اجتہاد کا حقدار سمجھتے ہیں اور اسلام کا ایک نیا اڈیشن چالو کر دینا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر سید محمد یوسف نے اپنی تقریر میں جو خیالات ظاہر کیے تھے ان کو خود ہی اُردو میں ایک مقالہ کی شکل میں قلمبند کر دیا ہے، اس کی غیر معمولی افادیت کے پیش نظر ہم اس کو "المعارف۔ لاہور" سے لے کر ہدیۂ ناظرین کر رہے ہیں۔

اس کے بالکل ابتدائی تمہیدی حصے میں خاصکر "معجزات" سے متعلق بعض جملے اس طرح کے ہیں جن سے ناظرین کو توحش ہو سکتا ہے لیکن مقالہ سے ان کے خیالات معلوم ہو جانے کے بعد اطمینان ہو جاتا ہے کہ توحش کا باعث صرف تعبیر کا ایک خاص انداز ہے۔

یہ بات بھی قابل لحاظ ہو کہ اس کا مخاطب خواص کا وہ طبقہ تھا جو اس کانفرنس میں مقرر کے سامنے تھا۔ بہر حال مقالہ نہایت قابل قدر اور بڑی افادیت کا حامل ہے۔ ادارہ]

اسلام کا اولیں تخاطب عقل سے ہے۔ بات اپنی جگہ بالکل صحیح ہو۔ اگر آپ ایک انسان کو کسی بھی فکر کی طرف دعوت دیں، تو اس کی کون سی قوتوں اور صلاحیتوں کو مخاطب کریں گے؟ خدا نے انسان کو حواس خمسہ اور عقل ـــــــ سادہ فطری عقل ـــــــ کی ایک قدر مشترک سے نوازا ہے۔ حواس خمسہ فکر و نظر کا مواد مہیا کرتے ہیں، فکر و نظر کی دعوت عقل تک پہونچاتے ہیں اور عقل اس مواد سے کام لینے اور دعوت کو قبول یا رد کرنے کی ذمہ دار ہے۔ دعوت کا فکری طریقہ تو یہی ہے، لیکن اگر اس کے مقابلہ میں کوئی غیر فطری طریقہ نہ ہو تو پھر اسلام کی کوئی امتیازی شان باقی نہیں رہتی، عقل سے اسلام کا تخاطب جو اتنا واضح اور نمایاں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام عقل کو جگاتا ہے، بیدار کرتا ہے، گرد و پیش کے حقائق سے دوچار کرکے چونکاتا اور جھنجھوڑتا ہے۔ اس کے مقابلے میں کسی دوسرے سے اپنی بات منوانے کا ایک طریقہ وہ بھی ہے جسے "تنویم" کہا جاتا ہے، یعنی یہ کہ مخاطب کی عقل کو سلایا جائے، اس کی عقل کی مقاومت کو ختم کر دیا جائے تا آنکہ وہ اپنی عقل اور ارادہ سے کام لے کر دعوت قبول کرنے کے بجائے داعی کے ارادہ کا محض بے عقل تابع بن جائے۔ اسلام سے پہلے جو دین آئے ان کی طرف دعوت میں اس طریقہ سے احتراز نہیں کیا گیا۔ چنانچہ قرآن شاہد ہے کہ طفل گہوارہ کو بولتے دیکھ کر، مردہ کو زندہ کرتے دیکھ کر، چڑیوں کے منتشر اجزا کو یکجا ہوتے اور ان میں جان پڑتے دیکھ کر عقل مدہوش ہو جاتی ہے یہاں تک کہ جس دعوت کو سوچ سمجھ کر بحالت ہوش قبول کرنے کو تیار نہ تھی اسی دعوت کا بحالت مدہوشی اتباع کرنے لگتی ہو۔ مفتی عبدہٗ اس کو بجا طور پر "ادھاش" کا طریقہ کہتے ہیں[۵]۔ یہ طریقہ کچھ ایسا فرسودہ نہیں، آج بھی طرح طرح سے کارفرما نظر آتا ہے "تنویم مقناطیسی" "HYPNOTISM" اس کی

---

[۵] تفصیل کے لیے دیکھئے میری کتاب "ہمیا ہائیکا" (انجمن ترقی اردو کراچی)؛ باب "عقل نقل اور کشف"

بھیانک شکل ہے جو صوفیہ اپنے کاروبار کی بنیاد کرامات پر رکھتے ہیں وہ اسی طریقہ سے کام لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے متبعین کو بے چون وچرا اطاعت پر تو آمادہ کر لیتے ہیں لیکن ان کے قوائے عقلی کو بیدار نہیں کرتے، چنانچہ ان کے حلقوں میں توحید اور شرک وبدعت گڈمڈ ہوکر بلا تمیز عقل بیک وقت قابل قبول بن جاتے ہیں۔ سماع، رقص اور بخور (خوشبو کا دھواں) منوّمات ہیں جو عقل کو سلانے میں مدد دیتی ہیں۔ صوفیہ کا وجد اور حال مجازی معنی میں نہیں بلکہ حقیقت میں شراب کے نشہ، مدہوشی اور قوائے عقلی کے تعطل کا مرادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیہ کا جذب اور حال عمل کا موجب نہیں بنتا۔ عمل کا باعث یقین ہوتا ہے اور یقین علم کے اعلیٰ مدارج میں سے ہے۔ علم عقل و ہوش کی برقراری سے نہ کہ جذب اور حال سے حاصل ہوتا ہے۔ یقین عقل وتمیز کی یکسوئی اور ارتکاز واستقرار کا نام ہے۔ سیاست اور حکمرانی کے میدان میں دیکھئے ایک آمر (ڈکٹیٹر) سب سے پہلے عوام کو اپنی شخصیت سے مرعوب کرتا ہے، اپنی اتفاقی کامیابیوں کو کرامات کا رنگ دیتا ہے پھر عوام سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنی عقل بالائے طاق رکھ کر اس کی اطاعت میں لگ جائیں۔ مثلاً ایک آمر فوج کی مدد سے عوام کو ساتھ لیے بغیر ملوکیت کا خاتمہ کرتا ہے عالمی طاقتوں کی باہمی رقابت سے فائدہ اٹھاکر استعمار کے خلاف کامیابی حاصل کرتا ہے، اس کے بعد عوام سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اشتراکیت کو قبول کرلیں۔ جس کے معنی مفہوم، نظام اور فلسفہ سے وہ قطعاً ناآشنا ہیں۔ اشتراکیت کو منوانے کا یہ طریقہ وہی اوھاشش کا طریقہ ہے۔

بسا اوقات یہ مدہوشی افراد اور مجموعۂ افراد یعنی اقوام کی خود پیدا کردہ بھی ہوتی ہے۔ مثلاً ہم ایک قوم کو ہوائی جہاز بناتے، ذرّہ کا دل چیرتے اور چاند پر کمند پھینکتے دیکھتے ہیں اور ایسے مدہوش ہوتے ہیں کہ اس کا رقص، سرود، عریانیٔ تن، طریقِ ازدواج، ہم آغوشیٔ زن سب ہی کچھ اختیار کرلیتے ہیں۔ ہوش کے لمحات میں آپ جس سے بھی پوچھیں وہ سائنس کی ترقی اور معاشرت کے ان اطوار میں رشتہ قائم کرنے سے عاجز ہوگا۔ اسی پر مزید قیاس کیجئے۔ زمانۂ حال کی تاریخ شاہد ہے کہ سائنس کی ترقی اور مادی خوش حالی

سرمایہ دارانہ نظام اور سودی بنک کاری کے ساتھ لازم و ملزوم نہیں۔ ایک نیا شیوعی نظام (کمیونزم) حریف بن کر اٹھا اور اس نے ایسی مادی طاقت پیدا کی کہ سرمایہ دار پر انوں کی نیند حرام ہوگئی۔ لیکن ہماری مدہوشی اور مرعوبیت کا یہ عالم ہے کہ "یک نشد دو شد" اب ہم اس بحث و تکرار میں الجھے ہوئے ہیں کہ ہماری ترقی کی راہ سرمایہ داری ہے یا شیوعیت۔ اگر عقل سے رجوع کیا جائے تو وہ کہے گی کہ جب ایک سرمایہ داری نظام لازمی نہیں ٹھہرا تو شیوعیت ہی پر کیا موقوف ہے اس کا بدل کوئی اور تیسرا بلکہ چوتھا پانچواں نظام بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن ہمارے یہاں عقل کا کام یہ رہ گیا ہے کہ ہم مدہوشی کے عالم میں جس کامیاب نو دولت نظام کی طرف جھک پڑیں اس کی پیرایہ پوشی کے لیے اسلام میں جگہ نکال لیں بلکہ بڑھ کر یہ کہ موجودہ دنیا کے ہر طاقت ور نظام میں سے کچھ اجزا لے کر ایک ملغوبہ تیار کریں اور اس طرح سارے ہی رقیبوں سے سرٹیفکٹ حاصل کرلیں:

رقیب سرٹیفکٹ دیں تو عشق ہو تسلیم
یہی ہے عشق تو اب ترک عاشقی اولیٰ (اکبر)

اسلام نے دعوت میں کہیں ادھاش کے طریقہ سے کام نہیں لیا۔ معجزات جو محمد صلعم کی طرف منسوب ہیں ان کے بارے میں جو بھی اختلاف ہو، اس پر تو سب کا اتفاق ہوگا کہ اسلام نے دعوت کی بنیاد معجزات پر نہیں رکھی۔ اگر ایسا ہوتا تو جس طرح قرآن کے صفحات موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کے معجزات سے بھرے پڑے ہیں۔ اسی طرح محمد صلعم کے معجزات بھی مذکور ہوتے۔ عملی طور سے بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ایسی کوئی مثال نہیں کہ کوئی دعوت سے انکار کرتا ہو تو محمد صلعم نے معجزہ دکھا کر اس کی عقل کو عاجز کیا ہو۔ یہ ضرور ہے کہ جو اصحاب ایمان کی دولت سے مالا مال تھے جیسے ابوبکرؓ وہ بلا تامل دل سے مانتے اور زبان سے کہتے تھے کہ محمد صلعم جو کچھ بھی فرمائیں وہ حق ہے خواہ عقل کے لیے معجز ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن جو لوگ دعوت پر ایمان نہیں لائے تھے انھوں نے دعوت قبول کرنے کے لیے جب کبھی معجز نمائی کی قید لگائی اور معجزہ صراحۃً طلب کیا تو ان کو ایک ہی جواب ملا اور وہ یہ کہ محمد صلعم کا معجزہ تو قرآن ہے۔ قرآن کوئی منتر، زمزمہ نہیں جس کا خطاب عقل

سے ڈھو بلکہ سیدھی سادی، صاف سمجھ میں آنے والی عربی زبان میں ہے (بلسان عربی مبین) اور اسی لیے ہے کہ تم اسے عقل سے سمجھو (لعلکم تعقلون) چونکہ دعوت اسلام کی مخاطب عقل ہے اسی لیے قرآن میں عقل سلیم اور غیر سلیم کے فرق کو اتنا کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ اور ایسی عاجزی اور ترشی اور طنز کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ کسی اور مذہبی کتاب میں شاید ہی اس کی مثال پائی جاتی ہو۔ جب عقل کی بات کی جائے اور مخاطب عقل سلیم نہ رکھتا ہو تو ظاہر ہے کہ عقل کی بات کرنے والا خود ہی عاجز ہو جائے گا۔ دوسری شکل یہ ہو کہ وہ عقل کی بات چھوڑ کر معجزہ سے کام لے، ادھاش کا عمل کرے۔ اس سے اسلام کو صریح انکار ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کھلے الفاظ میں عقل غیر سلیم کے آگے اپنی عاجزی کا اعتراف کرتا ہے ختم اللہ علی قلوبھم الخ عقل غیر سلیم وہ ہے جو وحی کی برتری تسلیم کیے بغیر یا وحی سے رجوع کیے بغیر کوتاہ بیں نفس حیوانی کے تقاضوں سے مغلوب ہو جسے "ھویٰ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کچھ لوگ وحی پر اس لیے کان نہیں دھرتے کہ وہ "تقلید آبا" میں جکڑے ہوتے ہیں۔ قرآن تقلید آبا کی مذمت کرکے انھیں غیرت دلاتا ہے۔ مگر یاد رہے کہ غیر عاقل یعنی غیر مسلم آبا کی تقلید مذموم ہے۔ عاقل یعنی مسلم آبا سے ہدایت نہ حاصل کرنا عقل کی نہیں، بلکہ اندھی عقل کی بات ہے، جیسا کہ ہر ناخلف کا شیوہ ہوتا ہے۔ اگر عالم باعمل آبا کی تقلید سے روگردانی اور بیزاری کو عقل کا معیار قرار دیا جائے تو پھر تو اسلامی معاشرہ میں "بیٹلز" اور "ہپیز" ہی پیدا ہوتے رہیں گے۔ کچھ ایسے ہیں جو وحی کی برتری کو مانتے ہیں اور وحی ان کے پاس موجود بھی ہے لیکن اس سے استفادہ نہیں کرتے۔ ایسے لوگ کمثل الحمار یحمل اسفارا، چہارپایہ برو کتابے چند، کے مصداق ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو صریح عناد رکھتے ہیں، ایسے لوگوں سے کوئی امید رکھنا عبث ہے۔

عقل سلیم رکھنے والا جو "ھویٰ" سے مغلوب نہ ہو اور عناد سے پاک ہو وہ اسلام کی دعوت سے قبول کرتا ہے اس لیے کہ اس کا تخاطب عقل سے ہے۔ دعوت کے مرحلہ میں اسلام تفکیر فی الخلق پر اکساتا ہے۔ گرد و پیش کے طبیعی عجائبات اور تغیرات پر غور و فکر کرنا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اس غور و فکر سے عقل مطبوع میں جو سوالات ابھرتے ہیں اسلام

انھیں پر زور دے کر ان کے جوابات کی تلاش و جستجو کا مطالبہ کرتا ہے۔ ایک مرتبہ یہ تلاش و جستجو بیدار ہو جائے اور قوت پکڑ لے تو عقلِ انسانی از خود توحید کی دہلیز تک پہونچ جاتی ہے۔ اسلام ہاتھ پکڑ کر اللہ واحد کا وہ جلوہ دکھاتا ہے جو تشبیہ و تجسیم سے منزہ ہے۔ اسی طرح بنیادی طور پر نیک و بد کی تمیز عقل مطبوع کا خاصہ ہے چنانچہ نیکی کے حق میں اور بدی کے خلاف اسلام بجز اس کے اور کوئی دلیل نہیں لاتا کہ تمہاری عقل مطبوع، تمہاری فطرت اس کو نیک و بد بتاتی ہے۔ "معروف" و "منکر" کے معنی یہی ہیں تمہارے دل کی قبول کی ہوئی اور رد کی ہوئی چیز۔ نیک و بد کی بنیادی تمیز، جو عقل مطبوع کا خاصہ ہے، انسان کو ایک مکمل نظام اخلاق اور ضابطۂ حیات کی تلاش پر مجبور کرتی ہے لیکن اس تلاش میں عقل انسانی زمان و مکان کی قیود میں جکڑ بند ہونے کی وجہ سے مکمل نظام اخلاق و ضابطۂ حیات سے دو چار ہاتھ لبِ بام رہ جاتی ہے نتیجہ یہ کہ جب وحی الٰہی اُس کی دستگیری کرتی ہے تو وہ احسان مندی کے جذبہ کے ساتھ اس کے پیچھے ہو لیتی ہے اور اس کو اپنا مخالف یا غیر سمجھنے کے بجائے سچا معاون اور واقف کار رہبر جانتی ہے۔ جیسے ہی عقل وحی پر اعتماد کرتی ہے نبوت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ دعوت کے مرحلہ میں اسلام کا تخاطب تمامتر عقل مطبوع سے ہے۔ اللہ کے وجود اور وحدانیت کو پہچاننا اور اپنی کوتاہیوں کے پیشِ نظر وحی کی ضرورت کو محسوس کرنا خالصتہً عقلِ سلیم کا کام ہے۔ یہاں تک کہ اگر اسلام کی دعوت نہ بھی پہونچے تو اجمالی توحید اور نظامِ اخلاق کی تلاش کی حد تک عقل کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔

ایمان لانا عقل کا ذمہ دارانہ فعل ہے۔ اس کی نوعیت خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ ایمان لانے کے بعد عقل وحی کی برتری اور اس کی رہنمائی تسلیم کرتی ہے اب عقل اپنی مرضی اور اختیار سے اپنی تکمیل ذات اور فلاح دارین کی خاطر اپنے آپ کو کمالِ علم و قدرت رکھنے والی ہستی کے سپرد کر دیتی ہے اور اس کے اوامر و نواہی کی منتظر رہتی ہے، اسی کا نام اسلام ہے۔ اتنا تو ظاہر ہے کہ یہ عقل کی طرف سے ایک ضبط و نظم کا التزام ہے اور ضبط و نظم تکمیل ذات کے لیے ہوتا ہے، صلاحیتوں کو بے راہ روی سے

محفوظ کر کے انھیں ترقی دینے اور بروئے کار لانے کے لیے ہوتا ہے، عقل کی کوششیں بھی ضبط و تعلم ہی سے بار آور ہوتی ہیں۔ اگر کوئی ایمان اور اسلام کو عقل کی آزادی پر قدغن اور اس کے لیے زنجیر پا سمجھتا ہے تو اس کو اختیار ہے کہ اسی مرحلہ پر دین کا جوا اپنے سر سے اتار پھینکے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کرکٹ کا کھیل یا کوئی اور کھیل: کھیل کے قواعد و ضوابط کا پابند ہو کر ہی انسان اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکتا ہے اور اپنی مساعی کو بارآور بنا سکتا ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھے کہ قواعد و ضوابط کا التزام کر کے وہ اپنی آزادی مفت کھو رہا ہے تو اس کو چاہیے کہ کھیل میں شریک ہی نہ ہو اور بے قاعدہ اندھا دھند گیند اچھال کر اپنا دل خوش کرے اور بعد کو وقت گزرنے کے بعد اپنی صلاحیتوں کے ضائع جانے پر افسوس کرتا رہے۔ البتہ اس کی کسی کو اجازت نہیں ہوگی کہ قواعد و ضوابط کا التزام کر کے کھیل میں شامل ہو اور پھر اپنی عقل کے زعم میں ان قواعد و ضوابط سے سرتابی کرے یہاں تک کہ ان قواعد و ضوابط میں مین میخ نکالے۔ ہمارا سب کا آئے دن کا تجربہ ہے کہ بعض پست ہمت اور خود غرض کھلاڑی اس قسم کی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ اردو کی مثل "ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا" انھیں لوگوں پر صادق آتی ہے۔

سب سے اہم اس فرق کو ملحوظ رکھنا ہے کہ دعوت کے مرحلہ میں اسلام کا خطاب "عقل سلیم" سے ہے اور قبول دعوت کے بعد خطاب "عقل مسلم" سے ہے۔ دونوں میں بنیادی فرق ہے جسے بسا اوقات نظر انداز کر دیا جاتا ہے، اسی باعث بہت سے مغالطے اور الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ عقل سلیم کسی کی تابع نہیں ہوتی اپنی بھلائی، برائی خود سوچتی ہے۔ اسکے برخلاف عقل مسلم سے دین کا انداز خطاب استعلا کے طریقہ پر ہوتا ہے، یوں کہنا چاہیے کہ عقل مسلم سے وحی اسی طرح مخاطب ہوتی ہے جس طرح استاد شاگرد سے۔ استاد شاگرد کے باہمی تعلقات کی اساس شاگرد کی جانب سے اس اعتراف پر اور استاد کی جانب سے اس شعور پر ہوتی ہے کہ شاگرد کی بھلائی اور تکمیل ذات کے طریقوں کو خود شاگرد کی بہ نسبت استاد بہتر سمجھتا ہے۔ شاگرد کی عقل کا کام یہ ہے کہ وہ استاد کے اوامر و نواہی پر غور کرے، استاد کی بتائی ہوئی راہوں پر چلے اور بالآخر ذکاوت، اخلاص اور کثرت ممارست سے وہ حس اور ملکہ پیدا

کرے کہ استاد کی عدم موجودگی اور سکوت کی حالت میں بھی استاد کی مرضی معلوم کر سکے اور اس کے بموجب عمل پیرا ہو۔ یہ کوئی ایسی مبہم، غیر یقینی یا نادر بات نہیں ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کا تجربہ ہو گا کہ صراحتاً ہدایت نہ ہونے کے باوجود ہم جان لیتے ہیں کہ ہمارے استاد ہمارے لیے کیا پسند کرتے ہیں۔ بہت سے خادم اور ماتحت بھی یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے مخدوم کسی ایک نئی بات سے جو پہلے تجربہ میں نہ آئی ہو خوش ہوں گے یا ناخوش۔ حد یہ ہے کہ غیر مخلص، مطلب پرست چاپلوس اور خوشامدی بھی اس حس اور ملکہ سے خوب کام نکالتے ہیں۔ شرط صرف ایک ہے کہ اور وہ یہ کہ ہم اپنی عقل کو اپنے سے بلند ہستی کی وحی، توجیہ اور اشارے سمجھنے میں لگائیں نہ یہ کہ اپنی وقتی پسند، خوشی اور آسانی کے مطابق خود اپنی راہ نکالیں۔ بہ حیثیت استاد میرا تجربہ ہے اور دیگر اساتذہ میری تصدیق کریں گے کہ کبھی کبھی ایک طالب علم اپنی عقل سے یہ فیصلہ کرکے آتا ہے کہ اس کی بھلائی اسی سال امتحان دینے میں ہے، میں بحیثیت استاد اس سے یہ کہتا ہوں کہ تم اس سال امتحان نہ دو، تمہاری بھلائی اس میں ہے کہ ایک سال اور محنت کرکے اور اپنی خامیاں پوری کرکے آئندہ سال امتحان دینا۔ یہ طالب علم رسمی طور پر میرا شاگرد ہے، عقل بھی رکھتا ہے۔ میں خود اس کی تیزی اور ذہن کی کا معترف اور قدرداں ہوں لیکن وہ اپنی عقل کو میرے امر و نہی کے سمجھنے کے لیے وقف کرنے کے بجائے خود رائی کی تدابیر نکالنے میں صرف کرتا ہے۔ یہ مثال ہے عقل غیر مسلم کی۔ میں اپنے بعض رفقائے کار کو دیکھتا ہوں کہ وہ ایسی عقل غیر مسلم کی بغاوت سے ڈر کر اپنے امر و نہی میں ترمیم کر دیتے ہیں۔ یہ وہی چیز ہے جس سے آئے دن ڈرایا جاتا ہے کہ اگر مذہب میں ترمیم نہ ہوئی تو موجودہ نسل اور موجودہ نہیں تو آئندہ نسل تو ضرور دین و مذہب چھوڑ بیٹھے گی۔ اس کے برخلاف ایک دوسرا طالب علم ہے جو اپنی عقل سے کوئی فیصلہ کیے بغیر مجھ سے ہدایت لینے آتا ہے کہ ایسی صورت میں مجھے کیا کرنا چاہیے میں اسے جو ہدایت کرتا ہوں اسے کمال طاعت کے ساتھ گرہ میں باندھ لیتا ہے، اپنی عقل کو میری ہدایت پر غور و خوض میں لگا دیتا ہے یہاں تک کہ اس کی علت اور مصلحت کو خوب سمجھ لیتا ہے اور نہ صرف اس معینہ صورت میں اس پر عمل کرتا ہے بلکہ دیگر مماثل حالات میں بھی میرا مرضی اور منشا کو پورا کرتا ہے اور خواہ دوسرے طالب علم اتفاقی طور پر زود تر کامیابی حاصل

کرتے نظر آئیں اسے یقین رہتا ہے کہ اس کی فلاح میری ہدایت پر چلنے میں ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "أیحسب الانسان ان یترک سُدی" ـــــ انسان کے شتر بے مہار کی طرح ہونے کے معنی یہی ہیں کہ وحی کو اولیت دیے بغیر تمام تر اپنی عقل پر بھروسہ کرے عقل ہی کو معیار قرار دے۔ ایسے انسان کو حقیقت میں وحی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا لیکن معاشرہ کے دباؤ اور اخلاقی جرأت کی کمی کے باعث وحی سے ناطہ توڑ بھی نہیں سکتا اس لیے عقل ہی کی ڈیوڑھی سے کام لے کر عقل کے فتویٰ کو مذہب پر نافذ کرنا چاہتا ہے۔ اس عقلِ بے مہار یا عقلِ بے عقال، کے مقابلہ میں "عقلِ مسلم" کا دائرہ عمل اور طریق کار دونوں بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ عقلِ مسلم کا دائرہ عمل صرف فقہ ہوتا ہے یعنی نصوص کا علم و فہم اور ان سے استنباط احکام مماثل حالات میں قیاس اور جہاں نص موجود نہ ہو وہاں دین کے اقتضا کی بابت تحری اور اجتہاد۔ یاد رہے کہ دین کے اقتضا کی بابت تحری اور اجتہاد محض عقلی کاوش سے بالکل مختلف ہے۔ اس کو یوں سمجھیے کہ ایک مسلم جسے سمت قبلہ معلوم نہیں وہ کیا کرے گا؟ اگر وہ ایسی صورت میں اپنے آپ کو آزاد سمجھتا ہے کہ جس سمت اس کا دل چاہے یا جس سمت کھڑا ہونا اس کو خوشگوار اور آرام دہ معلوم ہو اس سمت نماز پڑھ لے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ عقل نے رسی تڑا لی اور وہ پھر بے مہار ہو گئی۔ یہ تحرّر ہے۔ اور اگر وہ سمتِ قبلہ معلوم نہ ہونے کی صورت میں بھی اپنے آپ کو سمت قبلہ کا پابند سمجھتا ہے تو وہ اپنی مرضی اور آرام سے قطع نظر عقل کی کاوش اور کوشش اس میں صرف کرے گا کہ سمت قبلہ کس طرف ہو سکتی ہے۔ اس طرح عقل بدستور مسلم رہے گی اور اس کا نام "تحرّر" نہیں "تحرّی" اور اجتہاد ہوگا۔

یہاں جزئیات میں نہیں پڑنا، صرف عام ذہنیت اور رجحانات سے بحث ہے۔ یہی رجحان جس کو ابھی "تحرّی" کا نام دیا گیا۔ اس کا ایک شاخسانہ یہ ہے کہ دین کے اداروں کی ہیئت ـــــ مثلاً زکوٰۃ اور تطلیع ید کی ہیئت ـــــ کبھی دیوارِ زنداں معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس ہیئت کی مخاطب صرف "عقلِ مسلم" ہے، اس کی مخاطب عقلِ محض ہو ہی نہیں سکتی۔ جب یہ ہیئت دیوارِ زنداں معلوم ہونے لگے تو سمجھ لینا چاہیے کہ "عقلِ مسلم" معلقہ بن کر رہ گئی ہے اور عقلِ محض پس پردہ کارفرما ہے۔ یہ عقلِ محض ہی تو ہے جو یہ بتاتی ہے کہ موجودہ دنیا

میں غیر اسلامی افکار کے فیشن شوز (Fashion Shows) میں شمولیت کے لیے ہیئت بدلنا ضروری ہے اور ہیئت میں رکھا کیا ہے ؟ تمام اسلامی اداروں اور اسلامی احکام کے ساتھ وہی عمل کرو جو ایک ماہر کیمیا اپنی تجربہ گاہ میں کیا کرتا ہے۔ ان اداروں یا احکام سے ان کی روح اور ان کی اقدار کو جدا کرو اور پھر انھیں وہ شکل و ہیئت دیدو جو زمانہ حال میں مقبول ہو۔ مسلمان کے مسلمان رہو گے اور "ماڈرن" بھی بن جاؤ گے، اپنے بھی خوش رہیں گے اور غیر دل کی محفل میں بھی باریابی کا شرف حاصل ہوگا۔ یاد آیا کہ قدیم فلسفیوں کا ایک گروہ تھا جو اپنے وجود میں بھی شک کرتا تھا۔ مسلم فلاسفہ ان سے تنگ تھے۔ خود اپنے وجود کی دلیل دوسروں سے مانگتے تھے اور جو بھی دلیل دی جائے اس کا انکار کر دیتے تھے۔ بالآخر ایک منچلے چلبلے نے یہ تجویز کی کہ انھیں خوب پیٹا جائے یہاں تک کہ یہ چلا اٹھیں: "میں ہوں اس لیے کہ میں چوٹ کی تکلیف محسوس کرتا ہوں۔" یہ علاج کہیں زیادہ کارگر تھا اس علاج بالنفس سے کہ "میں ہوں اس لیے کہ میں فکر کرتا ہوں۔" ان روح نکالنے والوں سے بھی کوئی پوچھے کہ اگر آپ کی روح آپ کی جسمانی ہیئت سے جدا کر دی جائے تو آپ کہاں رہیں گے ؟ خیر! یہ تو مناظرانہ جواب تھا، ٹھنڈے دل سے کہنے کی بات یہ ہے کہ اسلام کی اقدار تو وہی کی وہی ہیں جو عقلِ محض، عقلِ سلیم دعوت قبول کرنے سے قبل سے الجتی اور ابھرتی ہیں، انسان کی فطرت میں خدا کی طرف سے ودیعت کی گئی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو اسلام اور عقلِ محض یا فطرتِ انسانی میں بھی ویسا ہی تصادم نظر آئے جس کی مثالیں بعض دوسرے مذاہب میں ملتی ہیں۔ مگر اسلام تو دینِ فطرت ہے " فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا " اسلامی اقدار کا فطرت انسانی کے عین مطابق ہونا تو خود اسلام کے دعوی کے بموجب ضروری ہے۔ پھر اسلام کی ضرورت کیا ہے ؟ عقلِ محض ہی کیوں کافی نہ ہو ؟ یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام عقلِ انسانی کی جو مدد کرتا ہے وہ صرف اتنی ہے کہ ان اقدار کے لیے جو فطرتِ انسانی میں ودیعت کی گئی ہیں، عمل کی ایک مخصوص شکل و ہیئت پیش کرتا ہے۔ اقدار تو عقلِ محض کے لیے اجنبی نہیں، یہ دوسری بات ہے کہ کسی کی گرفت ان پر نسبتاً مضبوط ہو اور کسی کی ڈھیلی۔ البتہ عقلِ محض ہمیشہ سے اسی میں سرگرداں اور ناکام رہی ہے کہ ان اقدار کو انسان کی

عبادات، معاملات اور پوری کی پوری ظاہری اور باطنی زندگی میں کیا منظم اور جامع شکل وہیئت دی جائے۔ مثال کے طور پر چوری عقل انسانی کے نزدیک قابل سزا ہے۔ جو چوری کرتا ہو وہ بھی اپنے آپ کو چور کہلانا پسند نہیں کرے گا۔ یہاں تک کہنا چاہیے کہ اسلام عقل سلیم کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے۔ جہاں عقل کے پر جلنے لگتے ہیں اور اسلام آگے بڑھتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ مکمل ضابطۂ حیات میں اس جرم کی وضع، اس کا درجہ اور اس درجہ کے مطابق اسکی سزا اور سزا کی نوعیت اور سادہ اور عام فہم حد معین کرتا ہے۔ ایک اور مثال لیجیے، غنی کا زائد از حاجت دولت سے فقیر کی حاجت روائی کرنا ایک فطری انسانی جذبہ ہے۔ عقل کے نزدیک مستحسن ہے، لیکن چونکہ عقل مکمل ضابطہ حیات میں اس کی شکل معین کرنے سے عاجز ہے، اسی لیے یہ جذبہ بسا اوقات عملی طور سے غیر فعال اور بے کار ہو جاتا ہے اور بہت نیچے دب کر جب پورے زور سے ابھرتا ہے تو کمیونزم جیسی شکلیں اختیار کر لیتا ہے، جسے کہنا چاہیے کہ اس انسانی جذبہ کی غلط تفسیر ہے۔ اسلام اس فطری جذبہ کو، اس انسانی قدر کو، اس عقل سلیم کے تقاضے کو ایک سادہ مگر نہایت ہی واضح اور عام فہم شکل وہیئت دیتا ہے، جس کی تعیین میں یہ امر ملحوظ ہے کہ وہ ہمارے نظام حیات سے پوری طرح ہم آہنگ ہو۔ اب سوچیے کہ اعمال اور ضابطۂ حیات کی ہیئت اور شکل بدل دینے سے اسلام اور وحی کا حصہ تو ختم ہو گیا، باقی جو رہ گیا وہ عقل محض اور سادہ فطرت کا حصہ ہے، جو دین تو دین دنیا کی فلاح کے لیے بھی ناکافی ہو۔

ایک اور طریقے سے دو ذہنیتوں کا فرق دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک ذہنیت صحابہ کی تھی جو ہر موقع پر کہا کرتے تھے، افسوس رسول اللہ سے یہ نہ پوچھ لیا وہ نہ پوچھ لیا، یعنی وہ اعمال کی ہیئات و اشکال کی تعیین میں وحی کی مدد کے مزید طالب تھے، دوسری ذہنیت اس بیسویں صدی میں ہماری ہے کہ جو ہیئات و اشکال خدا کی طرف سے ہمیں دی گئی ہیں ان سے دل تنگ ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ ہیئات و اشکال بھی معین نہ ہوتیں اور اسلام کنفیوشس کی تعلیمات کی طرح صرف مبہم اقدار کا مجموعہ ہی رہتا تو کیسا اچھا ہوتا، پھر ہم کیسے آزاد ہوتے۔ چونکہ ان ہیئات و اشکال کا تعین ثابت ہے اور تیرہ صدیوں نے ان پر اعتراف کی مہر ثبت کر دی ہے اس لیے اب ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہیئات و اشکال قرون اولیٰ کے لیے تھیں، ہمارے لیے نہیں۔ یہ

وہی "تحرک" ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ سارا غلغلہ یہ ہے کہ ہمیں بیسویں صدی میں رہنا ہے اور اس زمانے کے رجحانات کا ساتھ دینا ہے۔ اچھا تو اس زمانے کے رجحانات کیا ہیں؟ سائنس کی ترقی، صنعت، تجارت۔ رہی جمہوریت تو اس کا بھاؤ تو آج کل گرا ہوا ہے، اس کی بھی قدر ہی قدر باقی رہ گئی ہے، شکل و ہیئت تو ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے مختلف ممالک میں بیسویں بار بدلی اور اب بھی آئے دن بدلتی رہتی ہے، سوشلزم سے اکھا آنکھ لڑی ہے۔ "آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟" ——— اچھا تو کوئی بتائے کہ سائنس کی ترقی کے لیے اسلامی نظام حیات کی کونسی اشکال و ہیئات میں تبدیلی ضروری ہے؟ سائنس علم ہے، علم کاوش چاہتا ہے، خدا ہمیں بھی توفیق دے، نظام چاہے امریکہ کا ہو، چاہے روس کا، چاہے ماؤزے تنگ کا ہو، چاہے چیانگ کائی شیک کا، اور ہاں چاہے میکاڈو کے جاپان کا، جس نے جتنی محنت کی اس نے اتنی علم میں ترقی کی، اگر آج ہم سائنس میں پیچھے ہیں تو اس کے ذمہ دار تمام تر ہمارے سائنس داں ہیں نہ کہ مولوی مُلّا۔ تقریباً پندرھویں صدی تک سائنسی علوم کی مشعل ہمارے ہاتھ میں تھی اور اس وقت تک ہم نے اسلامی نظام حیات میں علوم کی ترقی کی خاطر کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ہمارے سائنس داں صرف ایک رخصت کے طالب ہو سکتے ہیں اور وہ یہ کہ انھیں اسلامی علوم سے، قرآن حدیث سے معاف کر دیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے انیسویں صدی کے لائق صد تعظیم و تکریم علماء[1] یہ رخصت دینے کو تیار نہ تھے لیکن انگریز نے نہ صرف سائنس دانوں کو بلکہ ہر "تعلیم یافتہ" مسلمان کو اسلامی علوم سے رخصت دلا ہی دی۔ سر سید کو صرف ایک فکر تھی اور وہ یہ کہ مسلمانوں کو حکومت اور سیاست میں وہ مقام مل جائے جو ایک مستقل قوم کے شایان شان ہو اور ان کے ساتھ

---

[1] یہ وہ علماء ہیں جنھوں نے انگریزی پڑھی، عبرانی پڑھی، توراۃ پڑھی، انجیل پڑھی اور علمی سطح پر عیسائی پادریوں کو شکست فاش دی۔ انھوں نے عملی سیاست میں گراں قدر حصہ لیا۔ دینی تعلیم اور اسلامی علوم کے حق میں جدید انگریزی تعلیم کے جن نتائج و عواقب کی انھوں نے پہلے روز پیشین گوئی کی تھی وہ سو فی صدی صحیح ثابت ہوئی۔

وہ سلوک نہ ہو جو ایک ناکارہ اور معاندانہ اقلیت کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس مقصد کی خاطر انھوں نے بھی اسلامی علوم سے رخصت دینا گوارا کر لیا۔ ان کا خیال تھا کہ اسلامی علوم کی تلافی اسلامی تربیت سے ہو جائے گی۔ انھوں نے خلوص اور نیک نیتی سے جو چاہا تھا وہ تو اللہ نے پورا کر دیا اور علیگڑھ کی بدولت مسلمانوں کو حکومت میں مناصب ملے اور سیاست نیا پاکستان ملا لیکن ان کا یہ خیال غلط ثابت ہوا اور یہ سراسر غلط تھا ہی کہ علم کی تلافی کسی درجہ میں بھی تربیت سے ہو سکتی ہے۔ تربیت علم سے فائدہ اٹھانا سکھاتی ہے۔ علم کی جگہ تو نہیں لے سکتی، چنانچہ اسلامی علوم سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ محروم رہا۔ شبلی کو اس کا اندازہ تھا اور اکبر کی دوررس نگاہ تو وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی جو آج پیش آرہا ہے :-

شکر ہے راہ ترقی میں اگر بڑھتے ہو — یہ تو بتلاؤ کہ قرآں بھی پڑھتے ہو؟
دین کو سیکھ کے دنیا کے کرشمے دیکھو — مذہبی درس "الف بے" ہو علیگڑھ تے ہو

یہ بات تو کھری ہے، ہرگز نہیں ہے کھوٹی — عربی میں نظم ملت بی۔ اے میں صرف روٹی
لیکن جناب لیڈر یہ شعر سن کے بولے — بند ہوائیں گے یہ حضرت اس قوم کو لنگوٹی
اس بات کو خدا ہی بس خوب جانتا ہے — کس کی نظر ہے عقبیٰ کس کی نظر ہو موٹی

الغرض ایک صدی سے زیادہ عرصہ ہو گیا کہ ہمارے سائنس داں علوم اسلامیہ سے بے بہرہ ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس میں قوم کا نقصان ہے یا فائدہ، لیکن اتنا تو ہے کہ اگر ہمارے سائنسداں کمال پیدا نہ کر سکیں تو ان کے لیے دین، مذہب یا مولوی ملا کے سر الزام دھرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ جب تک ہمارے سائنس داں علوم اسلامیہ سے بے بہرہ ہونے کے ساتھ ساتھ بے تعلق بھی تھے اسوقت تک کم از کم ان کی دیانتداری کا بھرم تھا، لیکن گزشتہ بیس سال سے یعنی قیام پاکستان کے بعد سے ہمارے سائنس دانوں کو بھی یہ شوق ہوا ہے کہ وقتاً فوقتاً اپنے معمل اور تجربہ گاہوں کے حدود سے نکل کر اسلام کی آبیاری اور سرپرستی کریں۔ دراصل پاکستان میں اسلام کی حیثیت ایک یتیم مگر مالدار بچے کی ہے جس کا متولی اور سرپرست بننے کا ہر ایک ہی خواہش مند ہے لیکن اس دوڑ میں سائنس داں کے شریک ہونے سے سائنس کے

وقار کو بٹہ لگتا ہے۔ ہم غیر سائنس دان سائنس کو احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں اس لیے کہ اس میں اٹکل پچو باتوں کی اور خیال آرائی اور لاف زنی کی گنجائش نہیں، اسی لیے ہم کبھی سائنس کی حدود میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کرتے اور اگر بے غیرتی لاد کر کبھی جرأت کر بھی بیٹھیں تو سائنس کے پاسبانوں سے امید نہیں کہ وہ ذرا بھی مروّت اور رواداری سے کام لیں گے۔ اس کے مقابلے میں جب سائنسداں اسلام کے حدود میں سرگشت کو نکل آتے ہیں تو انھیں دیکھ کر سب سے پہلے سائنس کے ساتھ ان کی وفاداری میں شک ہونے لگتا ہے۔ جو سائنس دان بغیر علم کے کسی بھی مسئلہ پر بولے اس کے متعلق یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس نے سائنس کا پہلا سبق بھی نہیں سیکھا۔ کہتے ہیں اور بار بار اسی کو دہراتے ہیں کہ اسلام مطالعۂ کائنات اور تسخیر کائنات پر زور دیتا ہے۔ ٹھیک ہے۔ توجیہ دعوت کے مرحلہ میں اسلام انسان کے اس فطری رجحان کا واسطہ دیتا ہو اور اس سے ہدایت کا راستہ نکالتا ہو۔ قبول دعوت کے بعد بھی اسلام انسان کے اس فطری رجحان کو آزاد چھوڑتا ہو اور چونکہ مادہ کوئی گھناؤنی چیز نہیں، دنیا کی آسائشیں اللہ کی نعمت ہیں اور انسے جائز حدود میں تمتع بندہ کی طرف سے اللہ کے شکر کا موجب ہوتا ہو اور شکر اللہ کی طرف سے زیادتی کا ارمغان لاتا ہے، اسلیے اجازت ہو بلکہ پسندیدہ اور مستحب ہو کہ تسخیر کائنات کرتا چلا جائے اور جہاں تک تسخیر کائنات سے پیدا ہونے والی فوجی مسلح طاقت کا تعلق ہے تو وہ تو فرض ہو کہ اس میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے۔ لیکن مطالعہ کائنات اور تسخیر کائنات تو انسان کی فطرت میں ہے۔ اگر کوئی دین مذہب اس پر قدغن لگائے بھی تو انسان اس دین مذہب کے خلاف بغاوت کر دیتا ہے، پھر اس کے لیے عقلِ انسانی بالکل کافی ہے۔ وحی سائنس نہیں بلکہ مکارم اخلاق کی تتمیم اور تکمیل کے لیے آئی ہے۔ چنانچہ وحی مطالعۂ کائنات کی طرف شوق دلانے والے اور معنی خیز مفید مطلب اشارے کر کے آگے بڑھ جاتی ہے اور قبول دعوت کے بعد وحی تمامتر اہتمام کتاب اللہ کی تعلیم کا کرتی ہے جو کہ زندگی کی غذا بھی ہے اصلی ہے۔ قرآن کے مجموعی نظام میں کتاب فطرت کی حیثیت وہی ہے جو قصیدہ میں تشبیب کی ہوا کرتی ہے۔ کتاب اللہ کا درجہ مدیح یا قصیدہ کے مقصد اصلی کا ہے۔ قبولِ دعوت گویا گریز ہے۔ چنانچہ جیسے ہی حسنِ فطرت کے ذکر سے سامع کی توجہ حاصل ہوتی ہے اس کے سامنے اللہ کا ذکر اور اس کا کلام رکھ دیا جاتا ہے اور یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ اللہ کے کلام کو پڑھے، اسے سمجھے، اس میں غور و فکر کرے، استنباط احکام کرے اور دنیا میں شریعت نافذ کرے۔ ہمارے

سائنس دان جو تُکی سنائی ادھوری بات لے اڑتے ہیں۔ اس سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتاب اللہ یہ تاکید کرنے کے لیے ہی نازل کی گئی تھی کہ کبھی کتاب اللہ نہ پڑھنا، سیرت کو سنوارنے کی فکر نہ کرنا، بس مطالعۂ کائنات اور تسخیرِ فطرت میں لگے رہنا۔ اللہ کی اطاعت صرف اس میں ہے کہ چاند پر پہونچ جانا، چاند پر قرآن لے کر جانے سے حاصل؟ کیا سائنس دانوں کی ساری جدو جہد اس لیے ہے کہ وہاں علمائے دین آباد کیے جائیں جو اس زمین پر باردوش ہیں؟ کوئی میری باتوں کو ہذیان نہ سمجھے۔ سب کو یاد ہونا چاہیے کہ ہمارے متعدد سائنس دان متعدد بار منبرِ عام سے یہ کہہ چکے ہیں کہ اگر پاکستان کی فلاح مطلوب ہے تو نہ صرف اسلامی علوم بلکہ تمام آرٹس کے شعبوں میں تالے ڈال دینا چاہیے۔ یہ نقص کی دعوت بھی ہے اور بہانہ تراشی بھی۔ اس دعوت کیا تھ جب کوئی اپنے مقصد کے لیے اسلام کو بیچ میں لائے تو اسے مصلحت پرستی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

اسی ذیل میں یہ کوشش بھی کی جاتی ہے کہ قرآن میں جو "الحکمۃ" کا لفظ استعمال ہوا ہے اُسے سائنس کے مرادف قرار دیا جائے۔ قرآن کو علوم طبیعیہ کی تعلیم سے کوئی سروکار نہیں۔ قرآن تو کتاب کے ساتھ اخلاق کی عملی تربیت کا اہتمام کرتا ہے۔ "الحکمۃ" سے یہی مراد ہو سکتی ہے اور سب تو نہیں، بعض سائنس داں (اور غیر سائنس داں ماہرِ تعلیم بھی) اس پر اتر آتے ہیں کہ سائنس میں ترقی نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنا رکھا ہے۔ انگریزی کی جگہ لینے کے لیے جو بہت سی ملکی زبانیں تیار ہیں اور ہو رہی ہیں ان میں سے صرف اُردو کو لیجیے۔ ہمارے بعض مصلحت پرست اور سیاست آشنا ماہرِ تعلیم جو خود کبھی اُردو کو ہلکی پھلکی جذباتی تقریروں کے علاوہ، علمی اغراض کے لیے استعمال نہیں کرتے وہ تو یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ اگر اردو کے اسلامی لٹریچر کو ایک پلڑے میں رکھا جائے اور عربی، فارسی، ترکی تینوں زبانوں کے مجموعی اسلامی لٹریچر کو دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو اردو کا پلڑا بھاری رہے گا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جو کبھی اسلامیات کا ادنیٰ طالب علم بھی نہ رہا ہو اور جو عربی سے نابلد ہو وہ اس حد تک جرأت کرے اور جاہل عوام کا تو ذکر کیا، پڑھے لکھے سنجیدہ لوگ اسکی اجازت دیں اور خاموشی سے سنیں (ہو سکتا ہے کہ واہ واہ بھی ہوئی

ہو، تو سمجھ لینا چاہیے کہ ملک میں علمی قدریں بالکل ہی پامال ہو چکی ہیں[1] ۔۔۔ ایں چہ شور یست کہ در دور قمر می بینم

بہت زیادہ حسن ظن اور حسن تعلیل سے کام لیا جائے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ عربی قرآن ایک ہے اور ایک ہی رہے گا، اس کے مقابلہ میں اردو تراجم کے انبار کو رکھا جائے تو یقیناً اردو کا پلڑا بھاری رہے گا، اس سے قطع نظر یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہماری چودہ سو سالہ تاریخ میں ساڑھے بارہ سو سال تک عرب، ایران و ماوراء النہر اور ترکی کی علمی زبان عربی ہی رہا، مقامی زبانوں کو عربی سے انتساب پر فخر رہا۔ خود ہندوستان میں انگریزوں کی آمد تک اردو کسی مدرسہ میں پڑھی پڑھائی نہیں گئی، علم کی اور ساری متداول کتب کی زبان عربی اور صرف عربی تھی۔ پھر یہ تو بدیہی بات ہے کہ اگر اسلامیات کی پیشوا زنا آزاد کرا سے "اسلامی نظریۂ حیات" کا سایہ[2] نہ پہنایا جائے تو قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر کی تعلیم عربی کے بغیر کسی اور زبان میں ہو ہی نہیں سکتی۔ جب اسلامیات کے بازار میں اردو کے سودیشی کھدر کا چلن ہوا اور کم نظروں کو آنکھیں لڑانے کا موقع ملا اس وقت اہل نظر نایاب اور معدوم نہ تھے۔ ملاحظہ کیجیے:

"یہ آفت جو اس چند زمان میں تمام دیار ہندوستان خصوصاً شاہجہان آباد حرسہا اللہ عن الشر والفساد میں شامل ہوئے وبائی کے عام ہو گئی ہے کہ ہر عامی اپنے تئیں عالم اور ہر جاہل اپنے کو فاضل سمجھتا ہے اور فقط اسی پر کہ چند رسالہ مسائل دینی لغت ترجمہ قرآن مجید کہ وہ بھی زبان اردو میں کسی نے استاد سے اور کسی نے اپنے ذہن طبیعت سے پڑھ لیا ہے اپنے تئیں فقیہ و مفسر سمجھ کر مسائل و وعظ گوئی میں جرأت کر بیٹھتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔"

(آثار الصنادید، حالات مولوی شاہ عبد العزیز)

اس سودیشی کھدر کا چلن محض افلاس علم کے سبب ہوا، بعد کو مغربی اثرات کے تحت غیر اسلامی قومیت نے جنم لیا تو ادعائے عقل نے افلاس علم کو سہارا دیا، اس وقت سے

---

[1] چند روز ہوئے ایک مشاعرہ میں محسن بھوپالی کا ایک شعر سنا تھا جو رہ رہ کر یاد آتا ہے:

محسن دردِ کم نظراں سانحہ نہیں ۔۔۔ یہ سانحہ کہ اہل نظر دیکھتے رہے

[2] بپہن بے سایہ مری جان تار کہ پیشواز ۔۔۔ زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز

کہ نظر آنکھیں دکھانے لگے۔ اسی غیر اسلامی قومیت کے شاخسانہ کے طور پر گزشتہ ایک صدی کے دوران ایران اور ترکی میں زبان کے بارے میں جو تحریکیں چلیں وہ اب تاریخ کا جزو بن چکی ہیں اور ان کے اسباب و محرکات اور عواقب و نتائج کا بآسانی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ پاکستان میں جو اس وقت یہ کہا جا رہا ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے اردو کا پلڑا بھاری ہے اور اس کو عربی پر فوقیت حاصل ہے، اس کا ان تحریکات سے مقابلہ کر کے دیکھ لیجئے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایران اور ترکی میں عربی سے نفرت کی وجہ وطن اور نسل تھی اور ہمارے یہاں عربی سے پیچھا چھڑانے کی وجہ اسلام بتائی جاتی ہے۔ پاکستان کا خمیر ایسا ہے کہ ہر اجنبی فکر یہاں داخل ہونے سے پہلے اسلام کا بھیس بدلنے پر مجبور ہے۔ یہ عقل کی روباہی اور عیاری ہے۔

عربی زبان کا چودہ سو سالہ ذخیرہ جو تمام عالم اسلام کی مختلف قوموں کی بہترین کوششوں کا مرہون ہے۔ اس کے مقابلہ میں صرف ایک سو سال میں اردو میں جو کچھ ہوا ہے اس میں قابل قدر انہی علماء کا کارنامہ ہے جن کی ثقافت عربی تھی۔ آخر آخر میں عربی سے جہل، استغنا اور عناد کی جو کچھ پیداوار ہے وہ باعث شرم و باعث ننگ ہے۔ انگریز بھی کلاسیکی زبانوں کی اہمیت سے بخوبی واقف تھا، عربی فارسی کے ساتھ اس نے ہمیشہ وہ احترام ملحوظ رکھا جو کلاسیکی زبانوں کا حق ہے، اس کی قدر اس وقت معلوم ہوتی ہے جب ہم یہ دیکھیں کہ آزادی کے بعد سے ہم نے ان زبانوں کی کیا گت بنائی ہے۔ مختصر یہ کہ اقبال کی قدر دانی اور وفاداری کا دم بھرنے کے باوجود اگر اردو کے طالب علم سے "اسرار خودی" پڑھنے کو کہا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قلعہ معلیٰ کی سویدا میں شگاف پڑ گیا۔ غالب کی عظمت پر کس کو ناز نہیں؟ جشن کی دھوم دھام قریب ہے۔ گستاخی معاف، کوئی پوچھے کہ اردو کے "موحدین"[1] میں کتنے ایسے ہیں جنھوں نے "نقشہائے رنگ رنگ" کی ایک جھلک بھی دیکھی ہے۔ جو ہیں وہ اسی عہد غلامی کے خطاکار ہیں جس کی طرف ابھی اشارہ ہوا۔ الغرض ایک طرف تو اردو کی جڑیں کاٹ کر اسے اس کی توانائی

---

[1] "موحدین" وہ جو اردو کے ساتھ عربی فارسی کو شرک سمجھتے ہیں۔ انگریزی دشمنی پر ان کی سیاست کی بنیاد ہے اور انگریزی کے ساتھ دفاع مشترکہ (Joint Defence) کا معاہدہ بھی ہے۔

کے کلاسیکی سرچشموں سے جدا کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف اس سے ایک علمی زبان کی خدمت لینے کا منصوبہ بنایا جاتا ہے۔ یہ تضاد صرف ایک کوتاہ اندیش اور تنگ خیال قومیت کی سیاسی خود غرضیوں سے میل کھاتا ہے۔ اگر ہمارے سائنس دان کوئی مخلصانہ علمی نقطۂ نظر رکھتے ہیں تو انھیں یہ ماننا پڑے گا کہ اُردو کو علمی زبان اور اعلیٰ مدارج میں ذریعہ تعلیم بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اُردو نہیں بلکہ عربی فارسی کی باقاعدہ تعلیم کو عام کیا جائے[1] عقل کے کردار سے بحث کرتے وقت یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ تنہا عقل اندھی عصبیتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہاں تک کہ اہل علم کو غیر علمی موقف میں کھڑا کر دیتی ہے۔ عقل کو تعصبات سے (اور موجودہ دور کی قومیت سب سے بڑا تعصب ہے) بچانے کا صرف ایک ذریعہ ہے اور وہ ہو دین یا رومی کی اصطلاح میں "عقلِ عقل"۔

(باقی)

---

[1] پاکستان میں جو لسانی رقابتیں بالائے سطح یا زیرِ سطح پائی جاتی ہیں ان کا واحد علاج یہ ہے کہ کلاسیکی زبانوں (عربی فارسی) کو اقتدارِ اعلیٰ بخشا جائے جو دین، ثقافت، تاریخ ہر لحاظ سے ان کا حق ہے۔

سید محمد عبد العزیز شرقی (ملتانی)

حرم کعبہ میں

شرقی صاحب بہت قدیم اور مخلص ترین دوستوں میں ہیں، غالباً ہر سال اللہ تعالیٰ ان کے لیے حج وزیارت کی کوئی سبیل پیدا فرما دیتا ہے، جب کبھی حاضری ہوئی اُن سے ضرور ملاقات ہوئی۔ اس سال بھی موجود تھے، ذیل کے اشعار اسی سال کی حاضری کے موقع پر کہے اور الفرقان کے لیے مجھے عنایت فرمائے ——— نعمانی

تیرے گھر کی خیر یارب تیرے دیوانوں کی خیر ذوق و شوقِ بندگی میں مست پروانوں کی خیر

شوقِ اپنا والہانہ ایک پر گرتا ہے ایک جلوۂ شمعِ حرم کی اُس کے پروانوں کی خیر

توڑ کر سارے علائق مال و زر اولاد کے تیرے در پر آ پڑے ہیں ایسے مہمانوں کی خیر

لغزشوں سے بچ رہے ہیں مست ہیں ہشیار ہیں بندگی کی حد پہ قائم ایسے فرزانوں کی خیر

گونجتی ہے کان میں اب تک براہیمی دعا یا الٰہی غیر ذی زرع بیابانوں کی خیر

میٹھے میٹھے درد دل کی خیر ہو یارب مرے چشمہائے ترکے ان لبریز پیمانوں کی خیر

پرورشِ اعدائے دیں ہو تیرے گھر کی تاک میں یا الٰہی تیرے گھر اُس کے نگہبانوں کی خیر

دشمنانِ دینِ حق کی نیتوں میں ہے فساد خیر بطحا کی اور اُن کے نگہبانوں کی خیر

قومیت باقی رہی اور قبلۂ اوّل گیا
خیر ہو اسلام کی سارے مسلمانوں کی خیر

وقت کے ایک اہم مطالبہ کا جواب

ہمارے اس زمانہ کا ایک اہم مطالبہ یہ تھا کہ اس بیسویں صدی کے نفسیات اور فکری رجحانات کو سامنے رکھ کر دینی تعلیمات کو براہ راست قرآن و حدیث سے اخذ کر کے ایسے سادہ، دلنشین اور آج کی علمی دنیا کے لیے قابل قبول انداز میں پیش کیا جائے کہ ذہن و دماغ بھی اُسے قبول کریں اور دل بھی متاثر ہوں۔

مولانا نعمانی نے اب سے قریباً بیس سال پہلے اللہ کی توفیق سے اور اسی کے بھروسہ پر اس کام کو اپنا خاص موضوع بنایا اور خاموشی سے اپنے کو اس میں مصروف کر دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تنہا ان سے وہ کام لے لیا جو دراصل کسی ادارہ کے کرنے کا تھا۔ انھوں نے اس کے لیے کبھی قوم سے کوئی اپیل نہیں کی، کسی فرد سے بھی کبھی کوئی اعانت اس سلسلہ میں طلب نہیں کی، خاموشی کے ساتھ خود ہی کتابیں لکھتے رہے اور ان کے چھپوانے کا اہتمام کرتے رہے۔

الحمدللہ معارف الحدیث کی چوتھی جلد چھپ جانے کے بعد یہ سلسلہ ایک حد تک مکمل ہو گیا ہے۔ اس کی دو جلدیں باقی ہیں ان کا کام جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ جلد ہی تکمیل کو پہونچائے۔

خدا کے فضل سے اس سلسلہ کی کئی کتابوں کے ترجمے بھی ہندوستان اور بیرون ہند کی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں اور اُمید ہے کہ انشاء اللہ یہ پورا سلسلہ دوسری زبانوں میں منتقل ہو جائیگا۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کتابوں کی خصوصیت اور قدر و قیمت کو عام طور سے سمجھا جائے اور زیادہ پیمانے پر ان سے وہ فائدہ اُٹھایا جائے جس کی اُمید میں اللہ کے ایک بندہ نے اسی کی توفیق سے یہ کام کیا ہے۔

یہ اردو زبان میں مندرجہ ذیل چند کتابیں ہیں

۳	۲	۱
قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟	دین و شریعت	اسلام کیا ہے؟

۷	۶	۵	۴
چہارم	سوم	جلد دوم	معارف الحدیث جلد اول

کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

سیرت وسوانح

زاد المعاد (اُردو)

(از حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ پر جو کتابیں گزشتہ صدیوں میں لکھی گئی ہیں اُن میں علم وتحقیق کے لحاظ سے زاد المعاد کا خاص مقام ہے۔ یہ چار جلدوں میں ہے، اس کا اُردو ترجمہ بھی چار ہی جلدوں میں ہے۔

قیمت (مکمل سیٹ) مجلد -/۴۸

اصح السیر : — مولانا عبدالرؤف صاحب

دانا پوری مرحوم کی تالیف کردہ نہایت محققانہ اور مستند سیرتِ نبویؐ —— قیمت -/۱۰

خطباتِ مدراس — حیاتِ نبویؐ کے

مختلف پہلوؤں پر علامہ سید سلیمان ندوی کے خطبات جو مرحوم کے علم وتحقیق کا نچوڑ ہیں۔ قیمت : -/۳

رحمتِ عالم (از مولانا سید سلیمان ندویؒ)

یہ کتاب خاص طور سے مدارس اور اسکول کے طلبا کے لئے لکھی گئی ہے —— قیمت — ۱/۷۵

سیرتِ محمدیہ (از سرسید احمد خاں مرحوم)

صوبۂ یوپی کے ایک انگریز گورنر سر ولیم میور نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک کتاب "لائف آف محمدؐ" لکھی تھی جو زہر افشانیوں اور افترا پردازیوں سے لبریز تھی سرسید مرحوم نے لندن میں بیٹھ کر اس کے جواب میں "سیرتِ محمدیہ" لکھی۔ تاریخی اور معرکۃ الآرا کتاب ہے۔

قیمت (مجلد) -/۱۲

ابوبکر صدیقؓ اور فاروقِ اعظمؓ

تاریخ انسانی کا معجزہ، ۱۲ سالوں میں دنیا کا رخ بدلنے والے عہد کی تفصیلی داستان (طٰہٰ حسین مصری کے قلم سے) جس کا اُردو ترجمہ شاہ حسن عطا ایم اے نے کیا ہے۔

قیمت ۴/۷۵

صدیقِ اکبرؓ (از مولانا سعید احمد اکبرآبادی)

مولانا شبلی مرحوم کے (الفاروق) کے بعد اُردو زبان میں سیرتِ صدیقِ اکبرؓ کا جو خلا محسوس ہوتا تھا اُس کو اِس کتاب نے کما حقہٗ پُر کر دیا ہے۔ قیمت -/۸

الفاروقؓ — علامہ شبلی مرحوم کا

مشہور اور عظیم شاہکار۔ قیمت -/۴

سوانح ابوذر غفاریؓ (از مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ)

صحابۂ کرامؓ میں حضرت ابوذر غفاریؓ کی ایک نرالی شان تھی۔ اُن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ :- ابوذرؓ سے زیادہ سچے انسان پر آسمان نے سایہ نہیں ڈالا۔ مولانا نے انکی یہ سیرت بڑے فاضلانہ اور مجذوبانہ انداز میں لکھی ہے۔ قیمت ۴/۲۵

تاریخ ردّہ

(از ڈاکٹر خورشید احمد صدر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی)

عہد صدیقی کی بغاوتوں اور عسکری سرگرمیوں کی مفصّل تاریخ۔ قیمت :— -/۴

عبداللہ بن مسعود اور انکی فقہ۔ قیمت -/۷

ملّتِ اسلامیہ کی تمدّنی و سیاسی تاریخ ملاحظہ فرمائیے

تاریخ طبری مکمّل اُردو (۹ حصّوں میں)

۸ حصّے طبع ہو کر آچکے ہیں۔ قیمت مکمّل ۸ حصّے -/۱۹

تاریخ ابن خلدون مکمّل (اُردو)

(۷ حصّوں میں مکمل)۔ قیمت مکمّل سٹ -/۹۳

تاریخ اسلام (۳ حصّوں میں)

(مصنّفہ مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی) قیمت مکمل -/۴۵

خلافت بنو امیہ (۲ حصّوں میں)

امام ابن الاثیر جزری کی تاریخ کامل سے اُردو ترجمہ

قیمت حصّۂ اوّل -/۱۲ دوم -/۱۲

فتوح البلدان بلاذری (اُردو)

احمد بن یحییٰ البلاذری کی (فتوح البلدان) اسلامی تاریخ کی مستند کتابوں میں سے ہے اور مؤرخین کا خاص ماخذ ہے۔ اُردو ترجمہ از سید ابو الخیر مودودی

قیمت -/۱۸

تاریخ تمدّن اسلام (۲ حصّوں میں)

جرجی زیدان کی شہرۂ آفاق کتاب کا ترجمہ قیمت -/۲۰

آئینۂ حقیقت نما (از اکبر شاہ خاں نجیب آبادی)

انگریزوں نے سیاسی اغراض کیلئے مسلمان بادشاہوں کے ظلم وستم کے جو افسانے گڑھے تھے، اس کتاب میں ان کی حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ قیمت مجلد -/۱۲

تاریخ فاطمیین مصر (از ڈاکٹر زاہد علی آکسفورڈ)

یہ کتاب خود فاطمی مصنّفین کی قلمی کتابوں سے اخذ کر کے لکھی گئی ہے قیمت حصّۂ اوّل ۹/۹۰ دوم ۹/۹۰

اسلامی ہند کی تاریخ

مغلیہ دَورِ حکومت (چار حصّوں میں)

خافی خاں نظام الملک کی "منتخب اللباب" کا اُردو ترجمہ۔ قیمت مکمّل سٹ -/۳۸

اقبال نامۂ جہانگیری

جہانگیر کے دَورِ حکومت کی مکمل تصویر ———

مصنّفہ معتمد خاں بخشی۔ ترجمہ: — محمد زکریا مائل۔

قیمت مجلّد — ۴/۵۰

مآثر عالمگیری ———

حیاتِ عالمگیری کی پوری تصویر۔ جس کی عکاسی اورنگ زیب کے ساتھ وقائع نگار کی حیثیت سے زندگی بھر رہنے والے "ساقی خاں" نے کی ہے۔

ترجمہ:۔ از مولوی فدا علی طالب۔ قیمت ۹/۵۰

شاہجہان کے ایّامِ اسیری

اور

عہدِ اورنگ زیب

مصنّفہ: — ڈاکٹر برنیئر (فرانسیسی)

ترجمہ:۔ از خلیفہ محمد حسین — قیمت -/۱۲

سفر نامہ ابن بطوطہ

ابن بطوطہ نے دنیا کی سیاحت ۲۵ سال تک کی، اس سفر کے حالات اور عجیب و غریب تجربے ملاحظہ فرمائیے۔ ترجمہ:۔ از رئیس احمد جعفری

قیمت: — -/۱۸

قابلِ مطالعہ منتخب متفرق کتابیں

طبقات الاولیاء

(امام شعرانی کی "الطبقات الکبریٰ" کا ترجمہ)

حضرت صدیق اکبرؓ سے لیکر کتاب کے زمانہ تصنیف (۹۵۰ھ) تک کے اولیاءِ امت کا جامع مفصل و مستند تذکرہ۔ قیمت ۱۵/-

تبلیغِ دین (از حضرت امام غزالیؒ)

حضرت امام غزالیؒ کی مشہور و معروف تصنیف "اربعین" (جو درحقیقت ان کی شہرۂ آفاق کتاب "احیاء العلوم" کا خلاصہ ہے) کا اُردو ترجمہ۔ از مولانا عاشق الٰہی میرٹھی

رعایتی قیمت (مجلّد) ۲/۵۰

تذکرۃ الرشید

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کی مفصل سوانح حیات۔ (از مولانا عاشق الٰہی میرٹھی)۔ قیمت ۸/-

مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور اُن کے جانباز رفقاء کی آپ بیتی

(از ظفر حسن ایبک)

مجاہدانہ جذبہ اور منصوبہ کے ساتھ ہندوستان سے کابل ہجرت۔ وہاں کا سات سالہ قیام۔ پھر وہاں سے روس کا سفر، اور وہاں کیمونسٹ نظام کا غائر مطالعہ اور تجربہ، روسی سربراہوں سے مذاکرات۔ پھر وہاں سے استنبول اور ترکی زعماء سے اونچی سطح پر مذاکرات اور مشورے۔

ہندوستان و پاکستان کے ہر پڑھے لکھے مسلمان کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔ اس کے ہر ہر صفحہ میں عبرت کا سبق ہے، اور ملت کے نوجوانوں کو پیغام۔ (کتاب کے ۲ حصے ہیں)

قیمت ہر دو حصہ ۹/۵۰

کتب خانہ "الفرقان" کی مطبوعات

- اسلام کیا ہے؟ (۲/۵۰) • دین و شریعت (۳/۷۵) • قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟ (۵/-)
- معارف الحدیث، جلد اوّل (غیر مجلد ۵/-، مجلد ۶/۲۵) دوم (غیر مجلد ۵/۷۵، مجلّد ۷/-) جلد سوم (غیر مجلد ۷/-، مجلد ۸/۲۵) چہارم (غیر مجلد ۵/۲۵، مجلد ۶/۵۰)
- نماز کی حقیقت (۱/۲۰)
- کلمۂ طیبہ کی حقیقت (۵۰/) • برکات رمضان (۱/۰) • آپ حج کیسے کریں؟ (۲/-)
- آسان حج (۶۰/-) • سب سے پہلا سفرنامۂ حجاز (۲/-) • انیس نسواں (۱/-) • فیصلہ کن مناظرہ (۱/۷۵)
- تذکرہ مجدد الف ثانیؒ ۵/- • مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ ۴/۵۰ • ملفوظات مولانا محمد الیاسؒ (۲/-)
- حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور اُنکی دینی دعوت ۳/- • شاہ اسمٰعیل شہیدؒ پر الزامات کا جواب (۱/-)

موجودہ قیمت 3/75

Regd. No. L-353

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow

VOL. 36 NO. 3 JUNE 1968

ربیع الثانی ۱۳۸۸ھ

JULY 1968

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

موجودہ قیمت 5-00

ماہنامہ
الفرقان
لکھنؤ

فی کاپی ..... ۷۰ پیسے

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۵۰/۷
پاکستان سے ۵۰/۷
ششماہی
ہندوستان سے ۴/۰
پاکستان سے ۴/۰

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک سے
مزید محصول ڈاک کا
اضافہ

جلد ۳۶	بابت ماہ ربیع الثانی ۱۳۸۸ھ مطابق جولائی ۱۹۶۸ء	شمارہ ۴

اگر اس دائرہ میں ( ) سرخ نشان ہو تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی اطلاع ۸ ر جولائی تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں۔ نئے خریدار بھی اسی طریقہ سے چندہ ارسال فرمائیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۵ ر تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اس کی اطلاع ۵ ر تاریخ تک آجانی چاہیے۔ اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

ازعتیق الرحمٰن سنبھلی

۶۷ء کے الیکشن سے ملک کے سیاسی نظام میں جو انتشار اور عدم استحکام پیدا ہوا ہے اُس نے جہاں مجموعی طور پر سارے ملک کو نقصان پہونچایا ہے وہاں مسلمانوں کے خصوصی مسائل بھی سنگین تر ہو گئے ہیں۔ مسلم دشمن طاقتوں کو زیادہ آزادی سے سرگرم ہونے کا موقع ملا ہے، ان کی طاقت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ وہ علاقے جہاں مسلم دشمن حلقے دکھائی نہیں دیتے تھے ایسے کئی علاقوں میں بھی یہ وبا منظرِ عام پر آگئی ہے اور فساد ایک دور ہونے لگے ہیں۔ اس قسم کے لیڈروں کے حوصلے اتنے بڑھ گئے ہیں کہ جامعہ ملیہ جیسے اداروں کو پبلک جلسوں میں "احکام" دیے جاتے ہیں اور یہ ادارہ جسے اپنے تاریخی پس منظر کی بنا پر سب سے زیادہ جری ہونا چاہیئے تھا ان "احکام" سے متاثر ہونے لگتا ہے۔

حالات کا یہ انداز ذرا بھی نیا نہیں ہے بلکہ برسہا برس کے رُخ کا یہ بس ایک ارتقائی مرحلہ ہے، اور حالات کا دیرینہ رُخ مسلمانوں کو پہلے ہی اس نتیجہ پر پہونچا چکا ہے کہ وہ اتحاد کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے جو اُن کے دین کی بھی نہایت اہم تعلیم ہے۔ اس خیال کی پختگی نے مسلمانوں میں ایک پرجوش حرکت بھی پیدا کی اور اس حرکت نے اتحادِ ملت کا ایک ڈھانچہ آناً فاناً بنا کے کھڑا بھی کر دیا۔ مگر اتحاد بذاتِ خود کوئی چارہ ساز طاقت نہیں ہے۔ تنہا متحد ہو جانے یا متحد ہو کر کوئی بھی راہِ عمل اختیار کر لینے سے کسی قوم کے مسائل حل نہیں ہوتے۔ ضروری ہے کہ راہِ عمل بھی صحیح اختیار کی جائے اور تدبیر وہ اپنائی جائے جس کے متعلق تجربہ اور عقل و دانش کا

فیصلہ ہو کر مسائل کا قفل اس سے کھل سکتا ہے۔ اتحاد کا کام صرف تدبیر و عمل کو طاقت پہونچانا ہے تدبیر کا جو اثر اُس کی فطرت اور خارجی حالات کے ماتحت ہونا چاہیے اس میں کوئی تبدیلی اتحاد سے نہیں ہو سکتی۔ تدبیر اگر کارگر ہونے والی ہوگی تو اتحاد اس کی کارگری میں اضافہ کرے گا۔ اور مضر ہونے والی ہوگی تو اسی تناسب سے اس کے مضر اثرات میں بھی اضافہ ہو جائے گا ـــــ ہاں اگر خدا نہ چاہے تو دوسری بات ہے۔

اس کے علاوہ اتحاد کی بقا خود بڑی حکمت اور بڑی دیکھ ریکھ چاہتی ہے۔ یہ اس قدر نازک شیشہ ہے کہ ایک نوخیز ملت جو اختلاف و افتراق سے آشنا بھی نہ ہوئی ہو، سیسہ پلائی دیوار کے انداز پر اُس کی تعمیر ہوئی ہو، اس کا اتحاد ٹوٹتے بھی کچھ دیر نہیں لگتی، جیسا کہ خود مسلمانوں کے دور اوّل میں ہوا ہے۔ چہ جائیکہ ایک بُری طرح منتشر اور متفرق قوم جو اپنے اختلافات کو ختم کیے بغیر صرف ایک مشترک مصیبت کے تحت اتحاد کا فیصلہ کرے۔ ایسے اتحاد کی بقا، قدرتی طور پر بیحد احتیاط، بیحد باہمی لحاظ اور رد رعایت کو چاہتی ہے۔

بے شک یہ بات غیر فطری ہے کہ کوئی مکتب خیال اس اتحاد کو اپنی راہ پر کھینچنے کی کوشش نہ کرے ہر خیال اپنا اتباع چاہتا ہے اور ہر مکتب خیال کی قدرتی اُمنگ ہوتی ہے کہ وہ رہنمائی کا مقام حاصل کرے اور اس کے خیال کے مطابق قوم کو اس کی رہنمائی سے فائدہ پہونچے لیکن اس میں صبر و احتیاط بہر حال لازم ہے۔ ایک وقت گزرنا چاہیے کہ ایک مکتب خیال اس اتحاد کے اندر اپنا حلقہ اثر نہ صرف بہت وسیع کرلے بلکہ اسے اتنی مضبوطی اور پختگی کی منزل تک بھی پہونچا لے کہ یہ (وسعت اثر) محض ایک وقتی اور جذباتی حمایت نہیں بلکہ فکر و نظر کی ایک ٹھوس اور گہری وابستگی ثابت ہو سکے۔ صبر و احتیاط کے ساتھ یہ منزل طے کرلی جائے تو پھر کوئی مضائقہ نہیں کہ یہ مکتب فکر پورے اتحاد کی عملی قیادت پر فائز ہونے کی کوشش کرے۔ اس منزل پر دوسرے مکتب فکر یا تو اس سے مصالحت قبول کرلیں گے اور یا اگر تفرقہ ہوگا تو اس سے مقصد اتحاد کو کوئی خاص نقصان نہیں پہونچے گا۔ بالفاظ دیگر یا تو اتحاد کا ڈھانچہ ٹوٹنے ہی نہ پائے گا اور اگر ٹوٹے گا تو ایک زیادہ وسیع مگر کمزور اور کم نتیجہ خیز اتحاد کی جگہ نسبتاً ایک کم وسیع مگر مضبوط اتحاد اصل مقاصد کو زیادہ بہتر طریقے پر پیدا کرے گا۔

ان دونوں امکانات کی مثالیں انڈین نیشنل کانگریس میں موجود ہیں کہ آزادی تک اس میں ایک خاص مکتب فکر حاوی ہوتا چلا گیا مگر کوئی ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوئی اور آزادی کے بعد ٹوٹ پھوٹ ہوئی تو وہ کوئی خاص اثر نہیں ڈال سکی۔ لیکن اس صبر احتیاط کو چھوڑ کر اگر کسی اتحاد کی اکائیاں عجلت اور بے صبری کی راہ اپناتی ہیں تو اس اتحاد کا حشر وہ ہوتا ہے جو ۱۹۶۷ء میں قائم ہونے والی مخلوط حکومتوں کا ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں ہو چکا ہے کہ نہ یہ اتحاد باقی رہا اور نہ اس کی اکائیوں میں سے کوئی اکائی اس حال میں ہے کہ ۱۹۶۷ء والی عوامی حمایت کا بھی اسے اپنے لیے بھروسہ ہو۔

مسلمانانِ ہند کا وہ اتحاد جو بڑے جوش، جذبے اور نیک آرزوؤں کے ساتھ وجود میں آیا تھا افسوس ہو کہ اس سنگین تر وقت میں اس کے صرف منہدم آثار دکھائی دے رہے ہیں اور جتنے دن اسے کام کرنے کا موقع ملا اس کا مسائل کے میدان میں کوئی اچھا نتیجہ بھی ہمارے سامنے نہیں ہو بلکہ مسائل کچھ پیچیدہ ہی ہوئے۔ ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اس صورت حال کے اسباب تلاش کرنے کی کوشش کی جائے تو شاید اسی نتیجہ پر پہونچنا ہوگا کہ ایک طرف ہم نے بس اتحاد کو اصل چارہ ساز طاقت سمجھ لیا اور تدبیر و عمل کی خوبی و خامی کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ ہم نے کچھ ایسا سمجھا کہ ہمارے معاملات میں کمی بس اتحاد کی تھی۔ یہ کمی پوری ہوگئی تو اب ہم جس راہ پر بھی چل پڑیں، حالات ہمارے حق میں ہونے لگیں گے۔ حالانکہ تنہا اتحاد کبھی کوئی چارہ ساز طاقت نہیں رہی فکر و تدبیر کی صحت اسکے ساتھ شرط ہو۔ اس شرط کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری متحدہ قوت عمل نے کچھ کام بنائے نہیں بلکہ اور بھی پیچیدہ کر دیئے ــــ دوسری طرف جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس اتحاد کا ایک مکتب فکر تمام تر عوامی حمایت اپنے ساتھ کھینچ لینے کے باوجود یہ شکل نہیں پیدا کر سکا کہ ایک وسیع مگر ڈھیلے ڈھالے اتحاد کا چراغ اگر دھیما ہو گیا تو اس کی جگہ نسبتاً ایک چھوٹے مگر مضبوط اتحاد نے لے لی ہو اور اس سے وہ تمام مقاصد زیادہ تیزی کے ساتھ پورے کیے جاسکتے ہوں جو ابتدائی اتحاد سے اصل مقصود تھے۔ تو اس کی وجہ بھی طاقت سازی کے اسی قدرتی اصول کو نظر انداز کرنے میں پوشیدہ ہو کہ یہ معاملہ وقتی اور جذباتی حمایت حاصل کرنے کا نہیں بلکہ فکر و نظر کی ٹھوس وابستگی پیدا کرنے کا ہے۔

ہمیں اتحاد کی آج کل سے زیادہ ضرورت ہو اسکے لیے کوششوں میں کمی نہیں ہونی چاہیے مگر اس میں کامیابی اور نتیجہ خیزی کا راستہ وہی ہو جو قدرت نے مقرر کر رکھا ہو۔ ہم اس سے انحراف کر کے کبھی منزل نہیں پا سکتے۔

کِتَابُ الدَّعَوات:

معارف الحدیث

(مُسلسل)

جامع اور ہمہ گیر دُعائیں:

[اس عنوان کے تحت احادیثِ نبوی ۳ قسطوں میں پہلے پیش کی جا چکی ہیں۔ چوتھی قسط اس شمارہ میں درج کی جارہی ہے ــــ اس قسط کی زیادہ تر حدیثیں کنز العمال سے لی گئی ہیں۔]

عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ (مرفوعاً) "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَنَا وَارْحَمْنَا وَارْضَ عَنَّا وَتَقَبَّلْ مِنَّا وَاَدْخِلْنَا الْجَنَّةَ وَنَجِّنَا مِنَ النَّارِ وَاَصْلِحْ لَنَا شَأْنَنَا كُلَّهٗ" ــــ قِيْلَ زِدْنَا قَالَ اَوَلَيْسَ قَدْ جَمَعْنَا الْخَيْرَ كُلَّهٗ

ــــــــ رواہ احمد وابن ماجہ والطبرانی فی الکبیر

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی ہے: "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَنَا..... تا..... شَأْنَنَا كُلَّهٗ" (اے اللہ ہم کو بخش دے ہم پر رحمت فرما اور دوزخ سے ہمیں بچالے، اور ہمارے حالات اور جملہ معاملات درست فرما دے) آپ سے عرض کیا گیا حضور ہمارے لیے اور زیادہ دُعا فرمائیے! آپ نے فرمایا کیا (اس دُعا میں جو میں نے ابھی کی) ساری خیر کو ہم نے جمع نہیں کر دیا۔

(مسند احمد، سنن ابن ماجہ، معجم کبیر طبرانی)

(تشریح) اس دُعا میں اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور بخشش مانگی گئی ہے، رحمت مانگی گئی ہے۔

اللہ کی رضا اور قبولیت مانگی گئی ہے۔ جنت کا داخلہ اور دوزخ سے نجات مانگی گئی ہے اور سب سے آخر میں استدعا کی گئی ہے کہ ہمارے جملہ معاملات اور سارے حالات درست فرمائے۔ (وَاَصْلِحْ لَنَا شَانَنَا كُلَّهٗ) ظاہر ہے کہ اس کے بعد کوئی بھی انسانی حاجت اور ضرورت باقی نہیں رہتی، اس سے زیادہ جو کچھ مانگا جائے گا وہ اسی اجمال کی تفصیل ہوگی، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اَوَلَيْسَ قَدْ جَمَعْنَا الْخَيْرَ كُلَّهٗ" (یعنی اس دعا میں ہم نے وہ سب مانگ لیا ہے جو انسان کو دنیا اور آخرت میں مطلوب ہو سکتا ہے)

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُنْزِلَ عَلَيْهِ الْوَحْيُ يَوْمًا..... فَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ وَرَفَعَ يَدَيْهِ وَقَالَ "اَللّٰهُمَّ زِدْنَا وَلَا تَنْقُصْنَا وَاَكْرِمْنَا وَلَا تُهِنَّا وَاَعْطِنَا وَلَا تَحْرِمْنَا وَاٰثِرْنَا وَلَا تُؤْثِرْ عَلَيْنَا وَاَرْضِنَا وَارْضَ عَنَّا"

(رواہ احمد والترمذی)

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوئی (اور اس وقت آپ کی وہ کیفیت ہوگئی جو نزولِ وحی کے وقت ہوجایا کرتی تھی۔ جب وہ کیفیت ختم ہوئی) تو آپ قبلہ رو ہو گئے اور ہاتھ اٹھا کے یہ دعا فرمائی "اَللّٰهُمَّ زِدْنَا..... تا..... وَارْضَ عَنَّا" (اے اللہ ہماری تعداد میں زیادتی اور اضافہ فرما، کمی نہ فرما اور ہمیں عزت و کرامت عطا فرما، ہماری اہانت و ذلت نہ فرما، ہمیں اپنی ہر طرح کی نعمتیں عطا فرما، ہمیں محروم نہ فرما، ہمیں اپنا لے ہمارے مقابلہ میں دوسروں کو ترجیح نہ دے۔ ہم سے راضی ہو جا اور ہمیں خوش کر دے۔ (مسند احمد، جامع ترمذی)

تشریح) اس حدیث میں آگے یہ بھی ہے کہ اس وقت آپ پر سورۂ مومنون کی ابتدائی دس آیتیں نازل ہوئی تھیں ان کا آپ کے قلبِ مبارک پر غیر معمولی اثر تھا، اسی تاثر کے ماتحت آپ نے خاص اہتمام سے اپنی جماعت اور امت کے لیے یہ دعا فرمائی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب کوئی دعا زیادہ اہتمام سے کرنی ہو تو بہتر ہے کہ قبلہ رو ہو کر اور ہاتھ اٹھا کر کی جائے۔

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ (مرفوعاً) اللّٰهُمَّ اَصْلِحْ ذَاتَ بَيْنِنَا وَاَلِّفْ بَيْنَ قُلُوْبِنَا وَاهْدِنَا سُبُلَ السَّلَامِ وَنَجِّنَا مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَجَنِّبْنَا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ اللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِىْ اَسْمَاعِنَا وَاَبْصَارِنَا وَقُلُوْبِنَا وَاَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ وَاجْعَلْنَا شَاكِرِيْنَ لِنِعْمَتِكَ مُثْنِيْنَ بِهَا قَابِلِيْهَا وَاَتِمَّهَا عَلَيْنَا ـــــــ رواہ الطبرانی فی الکبیر والحاکم فی المستدرک

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی ہے "اللّٰهُمَّ اَصْلِحْ ذَاتَ بَيْنِنَا ...... تا ...... وَاَتِمَّهَا عَلَيْنَا" (اے اللہ ہمارے آپس کے تعلقات درست فرما دے اور ہمارے دلوں کو جوڑ دے۔ اور ہمیں سلامتی کے راستوں پر چلا اور ہر طرح کی گمراہیوں سے نکال کر ہمیں نور کی طرف لا اور ظاہری و باطنی قسم کی ساری بے حیائیوں سے ہمیں بچا۔ اے اللہ ہماری سماعت و بصارت اور ہمارے قلوب میں اور اسی طرح ہمارے بیوی بچوں میں برکت عطا فرما اور ہماری توبہ قبول فرما کر ہم پر عنایت فرما تو بڑا عنایت فرما بڑا مہربان ہے اور ہمیں اپنی نعمتوں کا شکر گزار اور ثنا خواں اور قدر کے ساتھ قبول کرنے والا بنا اور ہمیں اپنی وہ نعمتیں بھرپور عطا فرما۔

(معجم کبیر طبرانی، مستدرک حاکم)

(تشریح) اس جامع ترین دعا میں سب سے پہلے آپس کے تعلقات کی درستی اور دلوں کے جوڑ کی استدعا کی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر دلوں میں پھوٹ اور سینوں میں بغض و عداوت ہو تو دین بھی برباد ہوتا ہے اور دنیا بھی، اللہ تعالیٰ کی دینی و دنیوی اور مادی و روحانی ساری نعمتوں سے صحیح طور پر فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ معاشرہ بغض و عداوت کے عذاب سے محفوظ ہو ــــ علاوہ ازیں اہل ایمان کے دلوں کا باہمی جوڑ اور ان کے تعلقات کی خوشگواری بجائے خود اہم مطلوبات میں سے ہے۔

آنکھوں، کانوں اور بیوی بچوں وغیرہ میں برکت کا مطلب یہ ہے کہ یہ نعمتیں برابر

نصیب رہیں اور ان سے وہ فوائد و برکات حاصل ہوتے رہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان میں رکھے ہیں۔

نعمتوں کی قدر اور ان پر شکر و حمد کی توفیق بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ملتی ہے اور ان سے محرومی بہت بڑی محرومی ہے۔ اس لیے اس کو بھی اللہ سے مانگنا چاہیے اور ایک محتاج بندہ کی حیثیت سے ہر نعمت کے اتمام کی بھی اس سے استدعا کرنی چاہیے۔

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ (مرفوعاً) اَللّٰهُمَّ وَفِّقْنِیْ لِمَا تُحِبُّ وَ تَرْضٰی مِنَ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ وَالْفِعْلِ وَالنِّیَّةِ وَالْهَدْیِ اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ـــــ رواہ الدیلمی

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی ہے "اَللّٰهُمَّ وَفِّقْنِیْ ..... تا ..... اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ" (اے اللہ جو قول و فعل اور جو نیت و عمل اور جو طرز زندگی تجھے پسند ہو اور تو اس سے راضی ہو اسی کی مجھے توفیق دے، یقیناً تو سب کچھ کرنے پر قادر ہے۔

(مسند فردوس دیلمی)

عَنْ مَعَاذٍ (مرفوعاً) اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ لِفَاجِرٍ عِنْدِیْ نِعْمَةً اُكَافِیْهِ بِهَا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ـــــ رواہ الدیلمی

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا بھی روایت کی ہے "اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ لِفَاجِرٍ عِنْدِیْ نِعْمَةً اُكَافِیْهِ بِهَا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ" (اے اللہ کسی نافرمان اور بدکار آدمی کا مجھ پر احسان نہ ہو جس کی مجھے مکافات کرنی پڑے دنیا یا آخرت میں۔

(مسند فردوس دیلمی)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا بڑا اہتمام فرماتے تھے کہ اگر کسی نے آپ کے ساتھ ذرا سا بھی اچھا سلوک کیا ہو تو اس کی مکافات فرمائیں اور مناسب سے مناسب شکل میں اس کا بدلہ دیں، ہر شریف آدمی کا یہی جذبہ اور رویہ ہونا چاہیے، اس دعا میں رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی ہے کہ مجھے کسی ایسے آدمی کا ممنونِ احسان نہ بنا جو تیرا نافرمان اور غلط کار ہو۔ اور مجھے دنیا میں یا آخرت میں اس کے احسان کا بدلہ چکانا پڑے۔

عَنْ عُمَرَ (مرفوعًا) اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِیْ دِيْنِیْ وَدُنْيَایَ وَاَهْلِیْ وَمَالِیْ اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَتِیْ وَاٰمِنْ رَوْعَتِیْ وَاحْفَظْنِیْ مِنْ بَيْنِ يَدَیَّ وَمِنْ خَلْفِیْ وَعَنْ يَمِيْنِیْ وَعَنْ شِمَالِیْ وَمِنْ فَوْقِیْ وَاَعُوْذُ بِعَظَمَتِكَ اَنْ اُغْتَالَ مِنْ تَحْتِیْ۔

——— رواہ ابوداؤد وابن ماجہ والنسائی

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دُعا روایت کی ہے "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْعَفْوَ ..... تا ..... اَنْ اُغْتَالَ مِنْ تَحْتِیْ" (اے اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں گناہوں کی معافی اور اپنے دین و دنیا، مال و منال اور اہل و عیال کی عافیت۔ اے اللہ میری شرم و عار والی باتوں کی پردہ داری فرما اور میرے خوف اور اندیشوں کو بے خوفی سے بدل دے اور میری حفاظت فرما، میرے آگے اور میرے پیچھے سے اور میرے دائیں اور میرے بائیں اور میرے اوپر سے۔ میں تیری عظمت و جلالت سے اس بات سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ اچانک کسی آفت میں مبتلا ہو جاؤں نیچے کی جانب سے۔

(سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ، سنن نسائی)

عَنْ اَنَسٍ (مرفوعًا) اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ اِيْمَانًا دَائِمًا وَهَدْيًا قَيِّمًا وَعِلْمًا نَافِعًا ——— رواہ ابونعیم فی الحلیۃ

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی ہے "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ ..... تا ..... عِلْمًا نَافِعًا" (اے اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں وہ ایمان و یقین جو ہمیشہ رہے اور سوال کرتا ہوں تجھ سے سیدھی صالح سیرت کا، اور استدعا کرتا ہوں تجھ سے ایسے علم کا جو نفع مند ہو)

(حلیہ ابونعیم)

عَنْ عَائِشَةَ (مرفوعا) رَبِّ اَعْطِ نَفْسِيْ تَقْوَاهَا وَ زَكِّهَا اَنْتَ خَيْرُ مَنْ زَكَّاهَا اَنْتَ وَلِيُّهَا وَمَوْلَاهَا ــــــــ رواہ احمد

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی ہے "رَبِّ اَعْطِ نَفْسِيْ ..... تا ..... اَنْتَ وَلِيُّهَا وَمَوْلَاهَا" (اے میرے رب میرے نفس کو تقوے سے آراستہ فرما اور (اس کی گندگیاں دور فرماکر) اس کو پاکیزہ بنادے۔ تو ہی سب سے اچھا پاکیزہ بنانے والا ہے، تو ہی اس کا والی اور مالک و مولا ہے) (مسند احمد)

عَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ (مرفوعًا) قُلْ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْأَلُكَ نَفْسًا مُطْمَئِنَّةً تُؤْمِنُ بِلِقَائِكَ وَتَرْضٰى بِقَضَائِكَ وَتَقْنَعُ بِعَطَائِكَ۔

ــــــــ رواہ الضیاء فی المختارۃ والطبرانی فی الکبیر

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی ہے "اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْأَلُكَ ..... تا ..... تَقْنَعُ بِعَطَائِكَ" (اے اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں "نفس مطمئنہ" یعنی ایسا نفس جس کو تیری طرف سے اطمینان اور جمعیت کی دولت نصیب ہو اور مرنے کے بعد تیرے حضور میں حاضری کا اس کو کامل یقین ہو اور تیرے فیصلوں پر وہ راضی و مطمئن ہو اور تیری طرف سے جو کچھ ملے وہ اس پر قانع ہو۔ (مختارہ للضیاء المقدسی، معجم کبیر طبرانی)

(تشریح) "نفس مطمئنہ" وہی ہے جس میں یہ صفات پائی جائیں اور یہ وہ نعمت ہے جو خاص ہی خاص بندوں کو عطا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے نصیب فرمائے۔

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ (مَرْفُوعًا) اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ اَخْشَاكَ كَاَنِّيْ اَرَاكَ اَبَدًا حَتّٰى اَلْقَاكَ وَاَسْعِدْنِيْ بِتَقْوَاكَ وَلَا تُشْقِنِيْ بِمَعْصِيَتِكَ ــــــــ رواہ الطبرانی فی الاوسط

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی ہے "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ ..... تا ..... وَلَا تُشْقِنِيْ بِمَعْصِيَتِكَ" (اے اللہ میرا

حال ایسا کر دے کہ تیرے حضور میں حاضر ہونے تک (یعنی مرتے دم تک) تیرے قہر و جلال سے میں ہر وقت اس طرح ترساں و لرزاں رہوں کہ گویا ہر دم تجھے دیکھ رہا ہوں، اور اپنے خوف و تقوے کی دولت نصیب فرما کر مجھے خوش بخت کر دے، اور ایسا نہ ہو کہ تیری نافرمانی کر کے میں بدبختی میں مبتلا ہو جاؤں) (معجم اوسط طبرانی)

(تشریح) غور کیا جائے مندرجۂ بالا دعاؤں میں خاصکر اس دعا میں کتنے مختصر الفاظ میں کتنی عظیم نعمتوں کی استدعا کی گئی ہے۔ یہ دعائیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص میراث میں سے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ان کی قدر و قیمت کو سمجھیں۔

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ (مرفوعاً) اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِي عَيْنَيْنِ هَطَّالَتَيْنِ تَسْقِيَانِ الْقَلْبَ بِذُرُوفِ الدَّمْعِ مِنْ خَشْيَتِكَ قَبْلَ اَنْ تَكُوْنَ الدَّمُ دَمْعًا وَالْاَضْرَاسُ جَمْرًا ـــــــــ رواہ ابن عساکر

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی ہے "اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِي..... تا..... وَالْاَضْرَاسُ جَمْرًا" (اے اللہ مجھے وہ آنکھیں نصیب فرما جو تیرے عذاب اور غضب کے خوف سے آنسوؤں کی بارش برسا کر دل کو سیراب کر دیں، اس گھڑی کے آنے سے پہلے جب بہت سی آنکھیں خون کے آنسو روئیں گی اور بہت سے مجرمین کی ڈاڑھیں انگارہ بن جائیں گی۔)

(ابن عساکر)

(تشریح) جن کو اللہ نے حقائق کی معرفت دی ہے اُن کے نزدیک وہی آنکھ زندہ اور بینا ہے جو اللہ کے خوف سے روئے اور آنسوؤں کی بارش برسائے ان کے دل اسی بارش سے سیراب ہوتے ہیں، اس لیے وہ اللہ سے رونے والی آنکھیں مانگتے ہیں۔

عَنِ الْهَيْثَمِ الطَّائِيِّ (مرفوعاً) اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ الْاَشْيَاءِ اِلَيَّ كُلِّهَا وَاجْعَلْ خَشْيَتَكَ اَخْوَفَ الْاَشْيَاءِ عِنْدِيْ وَاقْطَعْ عَنِّيْ حَاجَاتِ الدُّنْيَا بِالشَّوْقِ اِلٰى لِقَائِكَ وَاِذَا اَقْرَرْتَ اَعْيُنَ اَهْلِ الدُّنْيَا مِنْ دُنْيَاهُمْ فَاَقْرِرْ عَيْنِيْ مِنْ عِبَادَتِكَ۔

______ رواہ ابو نعیم فی الحلیۃ

ہیثم بن مالک طائی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دُعا روایت کی ہے "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ ..... تا ..... مِنْ عِبَادَتِكَ" (اے اللہ ایسا کر دے کہ کائنات کی ساری چیزوں سے زیادہ مجھے تیری محبت ہو۔ اور ساری چیزوں سے زیادہ مجھے تیرا خوف ہو، اور اپنی ملاقات کے شوق کو مجھ پر اتنا طاری کر دے کہ دُنیا کی ساری حاجتوں کا احساس اس کی وجہ سے فنا ہو جائے اور جہاں تو بہت سے اہلِ دُنیا کو ان کی مرغوبات دے کر ان کی آنکھیں ٹھنڈی کرتا ہے تو میری آنکھیں طاعت و عبادت سے ٹھنڈی کر (یعنی مجھے عبادت کا وہ ذوق و شوق بخش دے کہ اس میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہو اور پھر مجھے عبادت کی بھرپور توفیق دے۔) (حلیہ ابی نعیم)

عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ كَانَ مِنْ دُعَاءِ دَاوُدَ يَقُوْلُ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ يُّحِبُّكَ وَالْعَمَلَ الَّذِیْ يُبَلِّغُنِیْ حُبَّكَ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ اِلَیَّ مِنْ نَّفْسِیْ وَاَھْلِیْ وَمِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ قَالَ وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا ذَكَرَ دَاوُدَ يُحَدِّثُ عَنْہُ قَالَ كَانَ اَعْبَدَ الْبَشَرِ ______ رواہ الترمذی

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے پیغمبر داؤد (علیہ السلام) جو دعائیں کرتے تھے ان میں ایک خاص یہ بھی تھی ــ "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ حُبَّكَ ..... تا ..... وَمِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ" (اے میرے اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں تیری محبت (یعنی مجھے اپنی محبت عطا فرما) اور اپنے ان بندوں کی محبت بھی مجھے عطا فرما جو تجھ سے محبت کرتے ہیں اور ان اعمال کی بھی محبت مجھے عطا فرما جو تیری محبت کے مقام تک پہونچاتے ہوں۔ اے اللہ ایسا کر دے کہ اپنی جان اور اہل و عیال کی محبت اور ٹھنڈے پانی کی

چاہت سے بھی زیادہ مجھے تیری محبت اور چاہت ہو۔) ابوالدرداء رضی اللہ عنہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حضرت داؤد کا ذکر فرماتے تو ان کے متعلق یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ وہ بہت ہی زیادہ عبادت گذار بندے تھے۔

(تشریح) حضرت داؤد علیہ السلام کی یہ دعا جو ان کے جذبۂ محبت اور عشق الٰہی کی آئینہ دار تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت ہی پسند تھی۔ اسی لیے آپ نے خاص طور سے صحابۂ کرام کو بتلائی۔

وصفِ نبوت اگرچہ تمام انبیاء علیہم السلام کا مشترک شرف ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بعض انبیاء علیہم السلام کے کچھ خصائص بھی ہوتے ہیں جن میں وہ دوسروں سے ممتاز ہوتے ہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کثرت عبادت حضرت داؤد علیہ السلام کی امتیازی خصوصیت تھی۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ يَزِيْدَ الْخَطْمِيِّ الْاَنْصَارِيِّ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ فِيْ دُعَائِهٖ اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِيْ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ يَّنْفَعُنِيْ حُبُّهٗ عِنْدَكَ اَللّٰهُمَّ مَا رَزَقْتَنِيْ مِمَّا اُحِبُّ فَاجْعَلْهُ قُوَّةً لِّيْ فِيْمَا تُحِبُّ وَمَا زَوَيْتَ عَنِّيْ مِمَّا اُحِبُّ فَاجْعَلْهُ فَرَاغًا لِّيْ فِيْمَا تُحِبُّ ۔۔۔۔۔۔ (رواہ الترمذی)

حضرت عبداللہ بن یزید خطمی انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دعا یہ بھی کیا کرتے تھے۔ "اللّٰهُمَّ ارْزُقْنِيْ ....تا.... فِيْمَا تُحِبُّ"۔ (اے اللہ مجھے اپنی محبت عطا فرما اور اپنے ان بندوں کی محبت عطا فرما جن کی محبت میرے لیے تیرے نزدیک نفع مند ہو۔ اے اللہ میری چاہت اور رغبت کی جو چیزیں تو نے مجھے عطا فرمائی ہیں اُن سے مجھے ان کاموں میں تقویت پہونچا جو تجھے محبوب ہیں۔ اور میری رغبت و چاہت کی جو چیزیں تو نے مجھے عطا نہیں فرمائیں (اور میرے اوقات کو ان سے فارغ رکھا، تو مجھے توفیق دے کہ میں اس فراغ کو ان کاموں میں استعمال کروں جو تجھے محبوب ہیں۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) آدمی کو اس کی مرغوبات دے دی جائیں تو اس کا بھی امکان ہے کہ وہ اُن میں

مست اور منہمک ہوکر خدا سے غافل ہوجائے یا وہ ان کو اس طرح استعمال کرے کہ معاذ اللہ خدا سے اور دور ہوجائے، اسی طرح مرغوبات نہ ملنے کی صورت میں بھی امکان ہے کہ وہ دوسری قسم کی خرافات میں اپنا وقت برباد کرے ـــ اس لیے بندہ کو برابر یہ دُعا کرتا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اگر اس کی مرغوبات عطا فرمائے تو اس کو اس کی بھی توفیق دے کہ وہ مرغوبات کو تقرب الی اللہ کا وسیلہ بنائے اور اگر مرغوبات نہ ملیں اور اس کی وجہ سے فرصت و فراغ حاصل ہو تو اس کو توفیق ملے کہ فارغ اور خالی وقت کو اللہ تعالیٰ کی مرضیات ہی میں لگائے ـــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر دعا اور اس کا ہر جز بلاشبہ معرفت کا خزانہ ہے۔

عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ قَالَ لِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ " قُلِ اللّٰهُمَّ أَلْهِمْنِيْ رُشْدِيْ وَأَعِذْنِيْ مِنْ شَرِّ نَفْسِيْ.

ــــــــــ رواہ الترمذی

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ دُعا تلقین فرمائی " اَللّٰهُمَّ أَلْهِمْنِيْ رُشْدِيْ وَأَعِذْنِيْ مِنْ شَرِّ نَفْسِيْ (اے میرے اللہ میرے دل میں وہ ڈال جس میں میرے لیے بھلائی اور بہتری ہو اور میرے نفس کے شر سے مجھے بچا اور اپنی پناہ میں رکھ)

(جامع ترمذی)

عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ أَنَّ أَكْثَرَ دُعَاءِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا كَانَ عِنْدَهَا يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ.

ــــــــــ رواہ الترمذی

اُم المومنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ان کے پاس ہوتے تو اکثر یہ دُعا کیا کرتے " يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ " (اے دلوں کو پلٹنے والے میرے دل کو اپنے دین پر ثابت و قائم رکھ)

(جامع ترمذی)

(تشریح) اس روایت میں آگے حضرت اُمّ سلمہ کا یہ بیان بھی ہے کہ میں نے ایک دن حضور سے عرض کیا کہ کیا بات ہے کہ آپ اکثر بیشتر یہ دُعا کرتے ہیں؟ حضرت ام سلمہ کا مطلب اس سوال سے یہی ہوگا کہ آپ تو لغزشوں سے محفوظ ہیں پھر آپ یہ دُعا کیوں کرتے ہیں؟ — آپ نے ارشاد فرمایا کہ ہر آدمی کا دل اللہ کے ہاتھ میں ہے، اسی کے اختیار میں ہے جس کا دل چاہے سیدھا رکھے اور جس کا چاہے ٹیڑھا کر دے۔ آپ کے اس جواب کا مطلب یہ ہوا کہ میرا معاملہ بھی اللہ کی مشیت پر موقوف ہے اس لیے مجھے بھی اس سے دُعا مانگنے کی ضرورت ہے — بلاشبہ جس بندہ کو اپنے نفس کی اور ساتھ ہی اپنے رب کی معرفت نصیب ہوگی اس کا یہی حال ہوگا اور وہ کبھی اپنے کو مامون و محفوظ نہیں سمجھے گا — بندوں کے حق میں یہی بلندی اور کمال ہے — "قربیا نرا بیش بود حیرانی"۔

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ (مرفوعاً) اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ ضَعِيْفٌ فَقَوِّ فِيْ رِضَاكَ ضُعْفِيْ وَخُذْ اِلَى الْخَيْرِ بِنَاصِيَتِيْ وَاجْعَلِ الْاِسْلَامَ مُنْتَهٰى رِضَائِيْ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ ضَعِيْفٌ فَقَوِّنِيْ وَاِنِّيْ ذَلِيْلٌ فَاَعِزَّنِيْ وَاِنِّيْ فَقِيْرٌ فَارْزُقْنِيْ —————— رواہ الطبرانی فی الکبیر

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی ہے "اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ ضَعِيْفٌ.... تا.... وَاِنِّيْ فَقِيْرٌ فَارْزُقْنِيْ" (اے میرے اللہ میں تیرا ایک کمزور بندہ ہوں تو اپنی رضا طلبی کی راہ میں میری کمزوری کو قوت سے بدل دے (تاکہ میں پوری تندہی اور تیز رفتاری سے تیری رضا کے لیے کام کر سکوں) اور میری پیشانی پکڑ کے میرا رُخ خیر کی طرف کر دے اور اسلام کو میرا منتہائے رضا بنا دے (یعنی میری انتہائی خوشی یہ ہو کہ میں پورا پورا مسلم ہو جاؤں) — اے میرے اللہ میں ضعیف و ناتوان ہوں، تو میری ناتوانی کو توانائی سے بدل دے اور میں ذلت و پستی کے حال میں ہوں تو مجھے عزت بخش دے، اور میں فقیر و نادار ہوں تو مجھے میری ضروریات عطا فرما دے۔

عَنْ اِبْنِ مَسْعُوْدٍ (مرفوعاً) اِلَيْكَ رَبِّ فَحَبِّبْنِيْ وَفِيْ نَفْسِيْ لَكَ

فَذَلِّلْنِیْ وَفِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ فَعَظِّمْنِیْ وَمِنْ سَیِّئِ الْاَخْلَاقِ فَجَنِّبْنِیْ۔

—————— رواہ ابن لال فی مکارم الاخلاق

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی ہے "اِلَیْكَ رَبِّ فَحَبِّبْنِیْ ..... تا ..... فَجَنِّبْنِیْ" (اے میرے پروردگار مجھے اپنا پیارا بنالے اور مجھے ایسا کردے کہ میں اپنے کو تیرے حضور میں ذلیل سمجھوں اور دوسرے بندوں کی نگاہ میں مجھے باعظمت بنادے، اور برے اخلاق سے مجھے بالکل بچادے اور دور رکھ۔ (مکارم الاخلاق لابن لال)

(تشریح) کسی بندہ سے اللہ تعالیٰ کا محبت فرمانا عظیم ترین دولت ہے جسکی ہر مومن کو دلی آرزو ہونی چاہیے۔ اس دعا میں سب سے پہلے یہی نعمت مانگی گئی ہے۔ اسی طرح یہ بھی بندہ پر اللہ تعالیٰ کا بڑا انعام ہے کہ وہ خود کو تو ذلیل وحقیر سمجھے لیکن اللہ کے بندے اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور اس کا احترام واکرام کریں — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا پہلے گزر چکی ہے۔ "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ فِیْ عَیْنِیْ صَغِیْرًا وَّفِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ کَبِیْرًا"[1]

عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قُلْ اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الْخَلَّاقُ الْعَظِیْمُ اَللّٰھُمَّ اِنَّكَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ اَللّٰھُمَّ اِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ، اَللّٰھُمَّ اِنَّكَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ۔ اَللّٰھُمَّ اِنَّكَ الْجَوَادُ الْکَرِیْمُ فَاغْفِرْلِیْ وَارْحَمْنِیْ وَعَافِنِیْ وَارْزُقْنِیْ وَاسْتُرْنِیْ وَاجْبُرْنِیْ وَارْفَعْنِیْ وَاهْدِنِیْ وَلَا تُضِلَّنِیْ وَاَدْخِلْنِیْ الْجَنَّةَ بِرَحْمَتِكَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ — تَعَلَّمْھُنَّ وَعَلِّمْھُنَّ عَقِبَكَ مِنْ بَعْدِكَ

—————— رواہ الدیلمی

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ دعا تلقین فرمائی "اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الْخَلَّاقُ الْعَظِیْمُ ..... تا ..... بِرَحْمَتِكَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ (اے میرے اللہ تو خالق کل اور خلاق عظیم ہے، تو سمیع وعلیم (سب کچھ سننے والا اور جاننے والا) ہے۔ تو غفور ورحیم (بخشنے والا

[1] اے اللہ مجھے اپنی نظر میں چھوٹا اور حقیر بنادے اور دوسرے لوگوں کی نگاہ میں بڑا کردے۔

اور نہایت مہربان) ہے۔ تو مالک عرش عظیم ہے، تو نہایت فیاض اور کریم ہے۔ اپنی ان عالی صفات کے صدقہ میں تو مجھے بخشدے، مجھ پر رحمت فرما، مجھے عافیت عطا فرما، مجھے رزق نصیب فرما، میری پردہ داری فرما، میری شکستگی کو جوڑ دے، مجھے عزت و رفعت عطا فرما، مجھے اپنی راہ پر چلا، مجھے گمراہی سے بچا، اور اے ارحم الراحمین (مرنے کے بعد آخرت میں) اپنی رحمت سے مجھے جنت میں داخلہ نصیب فرما)۔۔۔ (حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا تلقین فرمائی اور مجھ سے ارشاد فرمایا) اس کو سیکھ لو اور اپنے بعد والوں کو سکھاؤ۔

(مسند فردوس دیلمی)

(تشریح) کسقدر جامع دُعا ہے! اس کو نہ سیکھنا اور اس سے فائدہ نہ اٹھانا بلاشبہ بڑے خسارہ کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ان انمول جواہرات کی قدر نصیب فرمائے اور ان سے فائدہ اُٹھانے کی توفیق دے۔

یک دو ساعت صحبتے با اہل دل

مجالس حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی مدظلہ العالی

مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

چھٹی مجلس

۲۴ شوال ۱۳۸۶ھ مطابق ۲۵ جنوری ۱۹۶۷ء خانقاہ شریف بھوپال

حاضرین مجلس بدستور

مولانا جمیل احمد صاحب حیدرآبادی نے ایک ایسے بزرگ کے متعلق دریافت کیا جو توحید وجودی کے بڑے داعی اور مبلغ تھے، فرمایا، کہ اس زمانہ میں (حیدرآباد میں) وحدۃ الوجود کا بڑا زور تھا، یہ حضرات صاف فرماتے تھے کہ وجود بس ایک ہی ہے، باقی سب ظہورات و تعینات ہیں، آپ کچہری میں منشی ہیں، گھر میں والد، اسی طرح محل کے اعتبار سے آپ کے نام بدلتے رہتے ہیں، باقی وجود ایک ہی ہے۔ دوسرا وجود ماننا شرک ہے۔ اس طرح کے عقیدے اور غلو کے ساتھ، پھر اللہ تعالیٰ کا خوف وہیبت، اور محرمات اور معاصی سے نفرت، و دہشت نکل جاتی ہے کہ جب وجود ایک ہی ہے اور سب کچھ وہی ہے تو کیا گناہ اور کس کا گناہ؛ البتہ دل آزاری ان حضرات کے مذہب میں کفر ہے، کسی کا دل نہ توڑو، اور جو چاہو کرو۔ بالارادہ شراب نہ پیو، مگر شراب کی محفل میں ہو اور کوئی پلائے تو پی لو،

دہیں حیدرآباد میں ایک بندگ تھے ۔ اگر کوئی ان سے مرید ہوتا تو اس کے چار ابرو کا صفایا کرتے تھے ۔ اس کو مردہ بناتے ، نہلاتے دھلاتے ۔ تین لوٹے حضرت بھی ڈال دیتے ۔ جب تک یہ عمل رہتا " مُوتوا قبل اَن تموتوا " کا ورد رہتا ۔ پھر اس مرید کو سب کچھ اجازت تھی ، وہ کہتا حضور میں گانجا اور بھنگ پیتا ہوں ، فرماتے کہتا ہے وہ اپنا معمول بتاتا ، فرماتے اِسے کی اجازت ہے ، پھر اگر اس کو کوئی ٹوکتا تو کہتا کہ پیر و مرشد نے اس کی اجازت دی ہے ، اسی طرح بغیر جبر اور دل آزاری کے رشوت ملتی ہو اور کوئی اپنی خوشی سے دے تو لے لو ، انکار نہ کرو ۔

ایک دن بھوپال میں ایک جنازہ کے انتظار میں بیٹھا تھا ، ایک احرام پوش وارثی صاحب بھی تشریف لائے ، گفتگو شروع ہوئی تو فرمانے لگے کہ جس کو دیکھو منبر پر بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ قرآن میں یہ ہے ۔ حدیث میں یہ ہے ۔ کوئی درویشی کی بات بات نہیں کرتا ، میاں درویشی کی باتیں کرو ۔ ایک صاحب حیدرآباد میں حقہ پیتے رہتے اور دوسروں کو نماز کے لیے اٹھاتے ، ایک صاحب نے کہا کہ آپ خود نہیں تشریف لے جاتے ، فرمایا کہ پیالہ پی لو ، پھر اس کے بعد کہنا ۔ ایک دوسرے صاحب نے اپنے مرید کو مرشد کی قبر پر سجدہ کا حکم دیا ۔ انھوں نے انکار کیا کہ کفر و شرک ہے ، کہنے لگے ۔ جب تک کفر و شرک کے دریا میں نہ ڈوبو گے اسلام تک نہیں پہونچو گے ، یہ طریقت و حقیقت ہے ۔ میں نے تلاش کر کر کے حیدرآباد میں ان حضرات کی کتابیں خرید کرلیں ۔ جواہر السلوک ، عقائد صوفیہ ، معلوم ہوا کہ قرآن شریف عقائد صوفیہ میں نہیں معاذ اللہ قرآن شریف میں تو ہے وَمَن یَبتَغِ غَیرَ الاِسلَامِ دِیناً فَلَن یُقبَلَ مِنہُ[۱] ، یہ اسلام سے الگ عقائد کیا ہیں ۔

فرمایا : صوفیہ سے جس قدر ضرر پہونچا ہے دوسروں سے نہیں پہونچا ، بہت سے حضرات ایسے ہیں کہ جہاں علم کا ذکر آیا کہنے لگتے ہیں کہ یہ تو ملا ہیں ، تصوف سے ان کو حصہ نہیں ملا ، یہ تو حضرت مجددؒ کا کارنامہ ہے کہ طریقت کو بالکل شریعت کے تابع بنا دیا ، فرماتے ہیں کہ

---

[۱] اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی دین اپنائے وہ قبول نہیں کیا جائے گا ۔ —— الفرقان

دوپہر کا قیلولہ سنت کی نیت سے رات بھر کی عبادت سے بہتر ہے۔ اصل یہ ہے کہ

ومن یعش عن ذکر الرحمٰن نقیض لہ شیطاناً فھو لہ قرین[ف۱]

فرمایا کہ میں نے آگرہ کی جامع مسجد میں ایک مولوی صاحب کو اس آیت پر وعظ کہتے سُنا،

قل ان کان آباءکم وابناءکم	(اے پیغمبر ان لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تمہارے
واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم	باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور
واموالٌ اقترفتموھا وتجارۃ	کنبے قبیلے والے اور تمہارا مال و دولت
تخشون کسادھا ومساکن	جو تم نے کمایا ہے اور تمہارے کاروبار
ترضونھا احب الیکم من اللہ	جن کی کسادبازاری کا تم کو خطرہ ہو، اگر
ورسولہ وجھاد فی سبیلہ فتربصوا	یہ چیزیں تم کو زیادہ عزیز و محبوب ہیں
حتیٰ یاتی اللہ بامرہ واللہ لا	اللہ اور اس کے رسول سے اور اس کی
یہدی القوم الفاسقین۔	راہ میں جہاد کرنے سے تو ٹھہرو یہاں تک
	کہ اللہ اپنا فیصلہ [illegible]
	اور اللہ نافرمانوں کو ہدایت [illegible]
	نہیں دیتا۔)

میں نے اس آیت پر بہت غور کیا، بھوپال پہنچ کر متعدد علماء سے پوچھا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ان محبوباتِ طبعی کو آدمی ترک کر دے، اور ان سے دستبردار ہو جائے۔ کہنے لگے کہ شریعت بہت سی ایسی چیزوں کا حکم دیتی ہے جن میں طبیعت کے خلاف عقل کے فیصلہ پر عمل کرنا ہوتا ہے، لیکن مجھے اطمینان نہیں ہوا، میرے ذہن میں اس کی ایک توجیہ اور تشریح آئی اسکو آپ ایک قصہ سے سمجھیں گے۔

ف۱ اور جو اللہ کی یاد اور اس کی نصیحت سے غافل ہو کر زندگی گزارے اس پر شیطان مسلط کر دیا جاتا ہو، پھر وہی اس کا رفیق و ہمدم ہو جاتا ہے ۱۲ — الفرقان

ایک بڑی بی ایک مکان میں رہتی تھیں، ایک صاحب ان کے پاس آئے، اور کہنے لگے کہ "اماں! میں یہ مکان خریدنا چاہتا ہوں کتنے میں فروخت کرو گی؟" انھوں نے کہا بیٹا! نام نہ لو، میں اس کو کسی دام بھی فروخت نہ کروں گی، یہ میرے بزرگوں کا مکان ہے، اس میں نہ معلوم کتنی پشتیں مریں، گڑیں، میں بھی اسی میں مروں گی، انھوں نے بہت آمادہ کرنا چاہا مگر وہ سننے پر بھی تیار نہ ہوئیں۔ کچھ وقت دے کر وہ پھر آئے اور پھر وہی خریداری کی بات کی۔ .... انھوں نے پھر کانوں پر ہاتھ رکھا اور سخت ناراض ہوئیں کہ میں کہہ چکی کہ میں کسی قیمت پر بھی اس کو دینے پر تیار نہیں، انھوں نے کہا کہ میں منھ مانگے دام دوں گا کچھ کہئے تو، مگر انھوں نے ایک نہ سنی۔ تیسری مرتبہ وہ خریدار پھر آئے۔ اس مرتبہ وہ بہت برافروختہ ہوئیں، بہت سخت سست کہا، لوگوں نے کہا بڑی بی خیریت ہے۔ یہ کون آدمی تھا؟ کہنے لگیں، پاگل ہے۔ دماغ چل گیا ہے، میرا مکان خریدنے کو کہتا ہے، میں نے کہا مجھے بیچنا نہیں، میرے پرکھوں کا مکان ہے، مگر کسی طرح نہیں مانتا، تین مرتبہ آچکا ہے، لوگوں نے کہا، "بڑی بی! پھر تھانہ میں رپٹ لکھوا دو کہ تنگ کرتا ہے۔" کہنے لگیں کہ نہیں! میں تھانہ وانہ نہیں جاتی، میں تو یہیں بیٹھی ہوں، ایک مرتبہ وہ صاحب پھر آئے، دیکھ کر ناراض ہونے لگیں۔ بات سننے کے لیے تیار نہ ہوئیں۔ ان صاحب نے موقع پاکر کہا کہ اماں! آپ نے فلاں باغ بنگلہ اور کنواں وغیرہ دیکھا ہے؟" ذرا رنگ بدلا، کہنے لگیں "کیوں" انھوں نے کہا کہ سرکار کو اس مکان کی ضرورت ہے یہاں سڑک نکلے گی یا کوئی سرکاری عمارت بنے گی اس کے بدلے میں وہ باغ بنگلہ، اور کنواں ملے گا۔" یہ کہہ کر وہ جانے لگے، کہنے لگیں "بیٹا بیٹھو، کبھی غریبوں کے یہاں کی چائے تو پیتے جاؤ" انھوں نے کہا میں بازو والے سے بات کرتا ہوں، انھیں کا مکان لے لیا جائے، کہنے لگیں "نہیں بیٹا! کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں، تم اسی مکان کا سودا کرا دو۔"

بس یہی قصہ ہماری مرغوباتِ طبعی اور تعلقات دنیاوی کا ہے، جب ان سے قیمتی اور بہتر چیز ہمارے سامنے لائی جائے گی تو ہم سب سے دست بردار ہونے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ اس سڑنے گلنے والے جسم، اس فانی اور مختصر زندگی کے مقابلہ میں حیاتِ ابدی اور نعماءِ اُخروی کا یہی معاملہ ہے۔ یہ جان اس جسم سے نکالی نہیں جاتی، اس سے بہتر جان ڈالی جاتی

ہے۔ موت و فنا کا تخیل ہی غلط ہے، وہ تو حیات ہے۔ بعض لوگوں کو جب کسی کا آنا اور بیٹھنا ناگوار ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ "ملک الموت کی طرح آکر بیٹھ جاتے ہیں" نعوذ باللہ، ملک الموت تو فرشتۂ رحمت ہے، ملک الموت تو بڑے اشتیاق کی چیز ہے، اس کو عذاب کا فرشتہ اور فنا کا پیغامبر بنا دیا۔

یورپ کی قوموں نے ہمارا تخیل بدل دیا، ہمارے تخیلات پر قبضہ کرلیا۔ اس قبضہ کی وجہ سے ہر چیز ان کی ہوگئی، ان کا فلسفہ ہے کہ "کنجیاں ان کے ازار بند میں بندھی رہنے دو، مال پر قبضہ کرلو، اس کی مثال ایسی ہے کہ باپ تنخواہ لے کر گھر آتا ہے، بیٹا ضد کرتا کہ سب مجھے دے دو، وہ ساری تنخواہ اس کے سامنے ڈال دیتا ہے۔ پھر کہتا ہے بیٹا فلاں چیز گھر کے لیے لے آؤ، فلاں چیز خرید لو، سب اس کے ہاتھ سے روپیہ خرچ کرواتا ہے، اور سارے کام نکال لیتا ہے' اور بچہ خوش ہے کہ میں روپے کا مالک ہوں۔

گرم پانی کی کوئی تعریف نہیں، وہ تو آگ اور گرمی کا کرشمہ ہو۔ جب گرمی کا اثر جاتا رہے گا پانی اپنی فطرت پر آجائے گا، قرآن نے فیصلہ کر دیا ہے۔ ما اصابك من حسنة فمن اللہ[1] وما اصابك من سيئة فمن نفسك۔ گویا گرمی ہماری طرف سے ہے اور ٹھنڈک جو تمہاری فطرت ہے تمہاری طرف سے ۔

یہاں ایک حکیم صاحب تھے، ان کا بچہ طبیہ کالج علی گڑھ میں پڑھتا تھا، کہیں ساتھیوں کے ساتھ کسی دریا پر گیا۔ سب بچے کو د رہے تھے، اس نے بھی چھلانگ لگائی اور غائب ہوگیا۔ حکیم صاحب کو جب اطلاع کا تار ملا تو دماغی توازن بگڑ گیا۔ علی گڑھ گئے اور وہاں سے آئے تو جنون کی کیفیت تھی۔ صرف میرے ہاتھ سے دوا پیتے تھے۔ بار بار مجھے بلایا جاتا تھا، ایک دن گیا تو اُن کے سمدھی بیٹھے ہوئے تھے جن کی بچی کے ساتھ اس لڑکے کی نسبت تھی' انھوں نے کہا "معاف فرمائیے گا میں نے آپ کو زحمت دی۔ خودکشی کیسی چیز ہے؟" میں نے کہا بہت عمدہ چیز ہے۔ انبیاء نے بھی خودکشی کی ہی تعلیم دی ہے" وہ میرا منھ دیکھنے لگے

---

[1] تمھیں جو بھلائی اور نعمت پہونچتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عنایت ہو اور جو برائی آتی ہو وہ تمھاری اپنی کمائی ہو۔ "الفرقان"

میں نے کہا پانچ وقت اپنے گلے پر چھری پھیرنے اور اپنی خودی کو فنا کرنے کا حکم ہے۔
مولانا رحؒ فرماتے ہیں:- ؎

چونکہ با تکبیر ہا مقترون شوید
ہمچو بسمل از جہاں بیروں شوید

کہنے والے نے یہ بھی کہا ہے ؎

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اکثر ہرن تو وہ ہوتے ہیں کہ ایک گولی چلائی اور سب بھاگے، لیکن ایسے ہرن بھی ہیں جو شکاری کے انتظار میں رہتے ہیں ؎

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ بر کف
بہ امید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

یہ صحیح خودکشی ہے جس کی عارفین تعلیم دیتے ہیں۔ البتہ جہلاء نے جس کو خودکشی کہا ہو وہ "خداکشی" ہے، خودکشی نہیں، اس لیے کہ یہ حاکم کے حکم کی خلاف ورزی ہے۔ اس پر حکیم صاحب نے خودکشی کا ارادہ تو ترک کر دیا اور نماز ایسی شروع کر دی کہ بیماری میں بھی نہ چھوڑی۔

فرمایا: بعض احباب مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے درس قرآن میں جاتے تھے، یہاں بھی آتے تھے، میں نے ایک صاحب سے ایک دن پوچھا کہ کہاں سے آرہے ہیں؟ کہا کہ "وعظ سے" میں نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ وعظ کی مثال کیا ہے؟ وعظ کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کسی نے ایک بچہ کو پانچ روپئے دے دیے، اس نے خرچ کر ڈالے، پھر دے دیے، پھر خرچ کر دیے۔ اس کی عادت بگڑ گئی، لیکن ملکہ پیدا کر دینا، وہ علم سکھا دینا جس سے قرآن وحدیث آدمی خود پڑھنے لگے، ہر وقت اس سے فائدہ اٹھا سکے، ایسا ہے کہ جیسے کسی کو بوریہ بنانا، چٹائی بنانا سکھا دیا۔ ایسا ہنر آگیا کہ اس سے اپنا پیٹ پال سکتا ہے۔

فرمایا کہ میں اس کا بہت لحاظ رکھتا ہوں کہ کسی برتن یا صراحی وغیرہ پر نام نہ کھدایا جائے، کہ یہ نام یا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموں میں سے ہوتے ہیں یا صحابۂ کرام کے، پھر ان برتنوں کو ادھر اُدھر ڈال دیا جاتا ہے اور بے ادبی ہوتی ہے، بعض لوگ لوٹے پر لکھوا لیتے ہیں پھر وہ بیت الخلاء میں جاتا ہے، ایک صاحب نے اگالدان پر اپنا نام نقش کروا رکھا تھا — دوسرے یہ کہ میں تعویذ یا قرآن مجید کی آیت یا اسماء حسنیٰ کو موم جامہ رکھ کر بازو پر باندھنے یا وقت پر اپنے پاس رکھنے کو بہت ناپسند کرتا ہوں، اس کی مثال تو ایسی ہے کہ کوئی اپنے پیر کی گردن میں رسّی باندھ کر لیے پھرے۔ کوئی پوچھے کہ ان کو کیوں باندھ رکھا ہے تو کہے کہ جس وقت ضرورت ہو ان سے دعا کرا لوں — اللہ کا نام اور آیات اس سے زیادہ ادب کی مستحق ہیں۔ لکھوا کر گھر میں رکھ لے ان کی برکت پہونچتی رہے گی، ایسے متعدد واقعات ہیں کہ ادب اور عقیدہ کے ساتھ ان چیزوں کو مناسب جگہ رکھنے سے گھر میں بڑی برکت اور روزی میں فراخی ہوئی۔

فرمایا کہ قانون کی پابندی سب کو کرنی چاہیے، اس میں انتشار اور رعایت فساد کا موجب ہے۔ ایک مرتبہ میں کسی صاحب کو لینے یا کسی کو رخصت کرنے کے لیے اسٹیشن جانے لگا، اسٹیشن ماسٹر صاحب خانقاہ سے تعلق رکھتے تھے، کہنے لگے کہ پیر صاحب! آپ پلیٹ فارم ٹکٹ نہ لیجئے گا، میں نے کہا کیوں؟ آپ کو چاہیئے تھا کہ آپ مجھ سے دگنی تگنی قیمت دلاتے اس لیے کہ آپ ریلوے کے ملازم ہیں اور خیر خواہی و فرض شناسی کا تقاضا ہے کہ آدمی جس کا ملازم ہو اس کو فائدہ پہونچانے کی کوشش کرے۔ اسی طرح ایک مرتبہ میں نے دارالعلوم تاج المساجد کے کتب خانے سے ایک کتاب مطالعہ کے لیے لینی چاہی، مولوی عمران خاں صاحب نے اس کے قانون و شرائط بتائے میں نے بڑی خوشی سے ان کو قبول کیا، کہ اگر ہمیں ان قوانین کی پابندی نہ کریں گے تو کون کرے گا۔

سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ

مکتوبات، علمی و ادبی تبرکات

(۴)

مرتبہ ـــــ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

ایک استفتاء کا جواب ایک سید صاحب نے حضرت شاہ صاحبؒ کو ایک مکتوب استفتاء کی شکل میں لکھا تھا اس کا جواب مع ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ جواب کا کچھ حصہ آخر سے حذف کر دیا گیا ہے جس سے اصل مطلب و مفہوم پر کوئی اثر نہیں پڑتا ــــ استفتاء کرنے والے یہ سید صاحب کون ہیں؟ بیاض سے ان کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ جواب استفتاء کے آغاز میں ان کو حضرت شاہ صاحبؒ نے ان الفاظ سے مخاطب فرمایا ہے۔ "سید صاحب عالی مراتب جامع الفضائل والمناقب الشدید فی دین اللہ کالسیف القاضب الخ"

بعد السلام والتحیۃ المسنونہ رقیمۂ کریمہ شرفِ ورود یافت حمدِ الٰہی بجا آوردہ شد کہ دریں زمانہ ہم حمیتِ دینی درمیانِ اکابر موجود است

بعد سلام مسنون واضح ہو کہ آپ کا مکتوبِ گرامی صادر ہوا۔ اس کو پڑھ کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا گیا کہ اس زمانے میں بھی بڑے

و شدت فی امر اللہ غیر مفقود، زاد اللہ
امثالکم فی العالم ـــ
..... مہربان من! چند مقدمہ را اول
خاطر نشین باید ساخت اول آنکہ
تکفیر کلمہ گو امریست محظور، در صحیح
وارد است کہ من قال لاخیہ یا کافر
فقد باء بہ احدہما ـــ حتی المقدور
اقدام براں نباید کرد ـــ لہذا فقہاء
باجمعہم چنیں قرار دادہ اند کہ ہر گاہ
(کلام) را یک وجہ محتمل صحت باشد
و چند وجہ دیگر محتمل کفر، آں کلام
را بر ہماں محمل صحیح عمل باید نمود
و لب، بتکفیر قائل نباید کشود
دوئم آنکہ تکفیر، موافق قاعدہ متعلق
بانکار ضروریات دین است بسبب
سوء ادب یا استخفاف مجرد از انکار،
یا فعل شنیع و ارتکاب کبیرہ و اختراع
بدعت و تحلیل حرام مختلف فیہ
و تحریم حلال مختلف فیہ کفر لازم
نمی آید ـــ زیرا کہ تعریف ایمان
ہمیں مقرر است کہ ہو تصدیق
جمیع ما علم مجیئ النبی صلی اللہ علیہ وسلم
بہ ضرورۃ ـــ و شئے را از ضروریات

لوگوں میں حمیت دینی اور اللہ کے احکام
کے بارے میں مضبوطی موجود ہو ـــ
اللہ تعالیٰ آپ جیسے حضرات کی تعداد
دنیا میں اور زیادہ کرے ....
مہربان من! جواب سے پہلے
چند مقدمات کو ذہن نشین کر لینا ضروری
ہے ـــ
(۱) کسی کلمہ گو کی تکفیر ایک ممنوع
امر ہے صحیح حدیث میں وارد ہے کہ
جس کسی نے اپنے بھائی (کسی کلمہ گو)
سے مخاطب ہو کر اوکافر کہا تو یہ کلمہ
ان دونوں میں سے کسی ایک کی طرف
رجوع کرے گا (یعنی اگر مخاطب
در اصل کافر نہیں ہے تو کہنے والے
کی طرف یہ کلمہ پلٹے گا) ـــ
حتی الامکان تکفیر میں پیش قدمی
نہ کرنی چاہیئے ـــ اسی لئے تمام فقہاء
اس بات پر متفق ہیں کہ جب کسی کے
کلام کے اندر ایک صورت ایسی نکلتی
ہے جس سے مطلب صحیح کا احتمال ہو اور
چند صورتیں ایسی ہیں جو احتمال کفر
رکھتی ہیں تو کلام کو اسی محمل صحیح پر
رکھا جائے اور قائل کی تکفیر نہ ہو۔

نوٹ:- اگلے دو صفحات کی ترتیب غلط ہو گئی ہے۔ براہ کرم ہندسہ دیکھ کر ملاحظہ فرمائیے۔ مرتب

قولِ اوّل کہ بسبِّ صحابہؓ کافر گردد اگر مرادِ او از صحابہ جمیع صحابہ اند حتیٰ خلفاء راشدین و ازواجِ مطہراتؓ، پس ایں قولِ او خطاء صریح است زیرا کہ نزدِ حنفیہ بسبِّ شیخین و قذفِ عائشہ صدیقہؓ کفر لازم می آید و اگر مرادِ او آنست کہ بسبّ ہر صحابی کفر نیست پس ایں خود خطاء نیست زیرا کہ فقہاءِ حنفیہ نیز سبّ ہر صحابی را کفر نمی دانند بلکہ بدعت و فسق می انگارند و بحدِّ کبیرہ می رسانند۔

و قولِ ثانیؒ او کہ ہر چند شخص گناہ کند رحمت زیادہ گردد، خطاءِ فہمی است منشاءِ غلطِ او آنست کہ بعضے لطیفہ گویان و شاعران در مقامِ دفعِ ناامیدی خود بایں لطیفہ تمسک کردہ اند چنانچہ صاحبِ قصیدۂ بردہ میگوید

یا نفس لا تقنطی من زلۃ عظمت ان الکبائر فی الغفران کاللمم

انکار ہوگا تو کفر یقینی طور پر لازم ہوگا مثلاً فرضیت صلوٰۃ و زکوٰۃ کا انکار اور شراب کا حلال قرار دینا اور (اسی طرح) بنیذ کا حرام کر دینا، یا شیخینؓ کی تحقیر کرنا وغیر ذلک ـــــ

(۳) تکفیر نہ کرنے اور تعدیل کرنے یعنی عدالت کا حکم لگانے (بالفاظ دگر عادل قرار دینے) کے درمیان بہت سے درجے اور کڑیاں ہیں اس لئے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جس کسی پر ہم نے حکم تکفیر نہیں لگایا تو اس کے قول کو ہم نے پسند کرلیا یا اس کی بات کو جائز کہہ دیا، بلکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص ایک قول سے کافر تو نہیں ہوتا البتہ بدعتی و فاسق ہو جاتا ہے ـــــ

اکثر ظاہر بین یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ جب علماء نے کسی کی تکفیر میں سکوت کیا تو اس سے اس شخص کے عقیدے کی تائید و تصویب لازم آگئی۔ ایسا نہیں ہے۔ اس

دین شمردن موقوف بر تواتر و ثبوت
آں بالقطع است۔ پس ہر چہ
ازیں قبیل باشد مثل انکار
فرضیت صلوٰۃ و زکوٰۃ و تحلیل لحم
وتحریم النبیذ و تحقیر الشیخین وغیر
ذالک، البتہ کفر است۔
سوم آنکہ در زعم تکفیر
و تعدیل یعنی حکم بعدالت کردن،
وسائط بیاید داشت این بباید
فہمید کہ ہر کہ را حکم تکفیر نکردیم او را
پسندیدہ نمودیم۔ یا قول او را جائز
داشتیم، بلکہ اکثر اوقات شخص
کافر نمیشود و مبتدع و فاسق می
گردد ___ اکثر عوام ہمیں میدانند
کہ ہرگاہ از تکفیر کسے علماء سکوت
کنند، تصویب عقیدہ او لازم
آید، چنیں نیست۔ ایں قاعدہ
بوجہ احسن ملحوظ باید داشت۔
چوں ایں ہر سہ قاعدہ ممہد شد
حالا آنچہ از روئے دلائل قویہ
در حق ایں شخص کہ اقوال ....
او مرقوم قلم صواب رقم است،
ظاہر می شود، التماس می نماید

لب کشائی نہ کی جائے۔
(۲) قاعدے کے مطابق تکفیر،
ضروریات دین کے انکار سے تعلق
رکھتی ہے لہٰذا محض سوء ادب
یا انکار سے خالی، استخفاف کے
باعث یا کسی فعل بد اور ارتکاب
کبیرہ یا استخراج بدعت اور مختلف
فیہ حرام کے حلال کرنے یا مختلف
فیہ حلال کے حرام کرنے کے سبب
کفر لازم نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ
"ایمان" کی تعریف یہ کی گئی ہے
کہ ___ جن احکام و ہدایات
کے متعلق بالیقین اور بالبداہت
یہ معلوم ہے کہ ان کو رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم لے کے آئے
ان سب کے ماننے اور ان کی تصدیق
کرنے کا نام ایمان ہے (اور انہی
چیزوں کو اصطلاح میں "ضروریات
دین" کہا جاتا ہے) اور کسی امر
کا ضروریات دین سے شمار کرنا
موقوف ہے تواتر اور ثبوت قطعی
پر ___ جب اس قسم کے متواتر
اور قطعی الثبوت امور دینیہ سے

لعل رحمۃ ربی حین یقسمہا
تاتی علی حسب العصیان فی القسم

و مدعائے آنہا آنست کہ از
بزرگی گناہ خود بناید اندیشید
و ناامید نباید شد۔ زیرا کہ
رحمت الٰہی نیز بقدر عصیاں
مقسوم است گناہ کبیرہ (را)
بازالہ برحمت کثیرہ تواند کرد ایں
شخص از غلط فہمی چنیں انگاشت
کہ عصیاں سبب رحمت است
و ایں نفہمیدہ کہ اگر بالفرض
عصیاں سبب رحمت ہم باشد
خاص یکنوع رحمت را سبب
خواہد بود کہ آن رحمت غفاریت
دیگر انواع رحمت بسیار
ازیں رحمت، بزرگتر و عالی
تر اند بہرہ از عاصی موقوف
خواہند شد مثل درجات
عالیات بہشت، و دخول
بلاحساب و سرخروئی
در عرصات ...... الحاصل
کہ از رحمت متقیاں و معصوماں

بات کو اچھی طرح ملحوظ رکھنا چاہیئے۔
جب یہ تینوں باتیں بطور مقدمہ
و تمہید بیان ہو گئیں تو اب اس
شخص کے بارے میں جسکے اقوال
آپ نے تحریر فرمائے ہیں جو بات
ظاہر ہوتی ہے وہ دلائل کے ساتھ
لکھی جاتی ہے۔

قائل کا قول اوّل یہ ہے کہ
"سب صحابہؓ سے کوئی شخص کافر
نہیں ہوتا"۔۔۔۔ غور طلب یہ امر
ہے کہ اسکی مراد کیا ہے؟ اگر صحابہ
سے جمیع صحابہ مراد ہیں حتی کہ خلفاء
راشدین اور ازواج مطہرات
بھی ۔۔۔ اس صورت میں اس
کا یہ قول خطاء صریح ہے، اسلئے
کہ نزد حنفیہ سب شیخینؓ اور حضرت
عائشہ پر "تہمت" دھرنے سے
کفر لازم آتا ہے اور اگر اسکی مراد
یہ ہے کہ سبّ ہر صحابی کفر نہیں ہو
تو یہ قول خطاء صریح نہیں ہے اسلئے
کہ فقہاء حنفیہ بھی سبّ ہر صحابی کو
کفر نہیں جانتے بلکہ بدعت و فسق
سمجھتے ہیں اور گناہ کبیرہ کی حد تک

ومحفوظاں بہرہ یافت لیکن
ایں ہمہ غلط فہمی است نوبت
بکفر نمی رساند۔ تا آنکہ صریحاً
قائل، ایں کلام نگوید "طاعت
وتقوی اصلاً موجب رحمت
نیست وعصیاں حقیقتہً سبب
رحمت است" وظاہر است
کہ متکلم بکلمۂ اسلام بتصریح
بایں ہر دو مضمون نخواہد
کرد۔ وقول ثالث او کہ
حضرت ام المومنین حضرت
بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا طپانچہ
.... زد افترائے
محض است حاکم شرع
راحی باید کہ اول او را
از سند ایں افترا بپرسد
وظاہر است کہ از بیانِ
سندش عاجز خواہد شد
وہرگاہ عاجز شود او را
تعزیر بزدن بسی و نہ تازیانہ
بکمالِ شدت دا یجاع
نماید وآیندہ از وتوبۂ
نصوح گیرد کہ ایں قسم

پہونچاتے ہیں۔ قائل کا دوسرا
قول یہ ہے کہ "جو شخص جتنا گناہ کریگا
اس پر رحمت زیادہ ہوگی" یہ قول
غلط فہمی کی بنا پر ہے اور اسکی غلطی
کی بنیاد اُن لطیفہ گو اور نازک خیال
شعراء کا کلام ہے جنھوں نے بطور
لطیفہ گوئی و نکتہ سنجی اپنی مایوسی کو
دفع کرنے کے لئے اس بات کو ظاہر
کیا ہے۔ چنانچہ صاحب قصیدۂ بردہ
(علامہ بوصیری رح) کے بھی اسی مضمون
کے دو شعر ہیں — (جن کا ترجمہ یہ ہے)

(۱) اے نفس اپنے گناہوں کے باعث
اگرچہ بہت بڑے ہیں مایوس ہو
کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ومغفرت
کے سامنے بڑے بڑے گناہ بھی چھوٹے
ہیں۔

(۲) جب اللہ تعالیٰ کی رحمت اس
کی بارگاہ سے تقسیم ہوگی تو ممکن ہے
کہ رحمت، بقدرِ گناہ ہر ایک کے حصے
میں آئے —

مدعا یہ ہے کہ گناہ کی بُرائی سے
اپنے کو فکر مند نہ کیا جائے اور ناامید
نہ ہوا جائے اس لئے کہ رحمت الٰہی

افترا ایر بزرگان نکرده باشد حاصل آنکہ مفاد این قول نسبت ظلم شنیع بجانب صدیقہ رض است و نسبت ظلم بغیر معصوم موجب کفر نیست آرے نسبتے (بہ) بزرگان کہ عدالت و تقوی آنہا بثبوت پیوستہ، موجب فسق و ضلالت است ـــــ و از باب قذف نیست کہ باجماع کفر است۔

و قول رابع کہ سید اگرچہ ساب صحابہ باشد تعظیم او بر مردمان واجب است غلط محض است زیرا کہ سید چون مرتکب این قسم امر شنیع گردد تعظیم او واجب نمی ماند و اصل آنست کہ در انکار بر منکر و امر بالمعروف و اقامۂ حدود و گرفتن قصاص و ادائے شہادت و ادائے امانت و عدل در حکومت، تخصیص ہیچ

بقدر عصیاں، مقسوم ہو۔ گناہ کبیرہ کا ازالہ رحمت کثیرہ کے ذریعے کیا جاسکتا ہے۔

اس شخص نے اپنی غلط فہمی سے یہ تو سمجھ لیا کہ گناہ، سبب رحمت ہے مگر یہ نہ سمجھا کہ اگر بالفرض گناہ سبب رحمت بھی ہو تب بھی ایک نوع رحمت کا سبب ہے اور وہ "رحمت غفاری" ہے۔ (یعنی گناہ کی مغفرت والی رحمت) دوسری انواع رحمت بھی تو ہیں جو اس رحمت سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں وہ رحمتیں تو عاصی و گنہگار کو حاصل نہ ہو سکیں گی ـــ مثلاً بہشت کے درجات عالیات، بلا حساب کتاب جنت میں داخلہ اور میدان محشر میں سرخروئی حاصل ہونا وغیرہ۔

حاصل کلام یہ ہو کہ وہ رحمتیں جو اہل تقوی، معصومین، اور محفوظین کے واسطے مخصوص ہیں عاصی کا ان میں کوئی حصہ نہیں اور وہ بیچارہ ان کا حقدار نہ ہوگا

فرقہ وہیچ قبیلہ نیست سید وجولاہہ
دریں امر برابر اند ہرگاہ
سید بسبب سبّ صحابہ کافر
شد سید نماند لانہ لیس
من اہلک انہ عملٌ غیر صالح۔
آرے اگر سیدے اتلاف
حق خاص ایں کس کند
عزیمت آنست کہ ازو در گذرد
و ترک انتقام نماید۔ بقولہ
علیہ السّلام۔ اقبلوا عن محسنہم
و تجاوزوا عن مسیئہم امّا
اتلاف حقوقِ دینی پس دراں
تجاوز مقبول نیست۔ والحاصل
ایں قولِ او نیز خطا و بدعت
است امّا نوبت بکفر نمی رساند
زیرا کہ ایجاب تعظیم بمعنی
محبت و ترکِ ایذا در حق
اہلِ بیت عموماً وارد شدہ
و تخصیص ایں عام در ذہنِ
ایں قائل نگنجیدہ یا حقوق
دینی با حقوقِ انسانی باہم
اشتباہ پیدا کردہ ایں حکم
از زبانِ او بر آوردہ

مگر اس قسم کی تمام باتیں غلط فہمی
کی بنا پر کہی جاتی ہیں ان سے کفر تک
نوبت نہیں پہونچتی۔ جب تک صراحۃً
یوں نہ کہدیا جائے کہ طاعت و تقویٰ
بالکل موجب رحمت نہیں بس عصیان
و گناہ ہی حقیقۃً سبب رحمت ہو۔
ظاہر ہے کہ کلمۂ اسلام کا بولنے والا
کوئی آدمی اس طرح کی بات صراحت
کے ساتھ نہیں کہے گا۔

قائل کا تیسرا قول کہ ام المومنین
حضرت بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ
عنہا نے نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کی شان میں کوئی گستاخانہ
حرکت کی۔

یہ افترائے محض ہے حاکم شرع
کو چاہیئے کہ اول اس سے اس افترا
کی سند طلب کرے۔ ظاہر ہے کہ وہ
کوئی سند نہ پیش کر سکے گا، جب وہ
سند پیش کرنے سے عاجز ہو تو اس
کو انتالیس ۳۹ کوڑے کمال شدت
کے ساتھ لگوائے اور آئندہ کے
کے لئے اس سے توبۂ نصوح کرائے
کہ وہ اس قسم کے بہتان بزرگانِ

انکار صریح ضروریات دین دین پر نہ لگائے گا۔ حاصل کلام
از یں کلمہ فہمیدہ نمی شود۔ یہ ہے کہ اس قول کا منشا حضرت
صدیقہ پر ایک ظلم شنیع کا الزام
لگانا ہے اور غیر معصوم کو ظلم کے ساتھ منسوب کرنا موجب کفر نہیں ہے البتہ
ان بزرگوں کے حق میں ظلم کی نسبت کرنا جن کی عدالت اور جن کا تقوی ثابت
ہو چکا ہے۔ موجب فسق و ضلالت ضرور ہے۔ یہ قول باب قذف سے بھی
نہیں ہے۔ (آیات سورۂ نور کے نزول کے بعد حضرت صدیقہؓ پر) قذف
باجماع، کفر ہے۔

قائل کا چوتھا قول کہ "سید اگرچہ صحابہؓ کو برا بھلا کہنے والا ہو
بہر حال اس کی تعظیم لوگوں پر واجب ہے" یہ غلط بات ہے اس لئے کہ جب
یہ سید اس قسم کی قبیح حرکات کا مرتکب ہو گا اس کی تعظیم واجب نہیں۔ اور
اصل یہ ہے کہ نہی عن المنکر، امر بالمعروف اقامت حدود، قصاص،
ادائے شہادت، ادائے امانت اور حکومت میں عدل و انصاف کے معاملے
میں کسی طبقہ اور کسی قبیلہ کی تخصیص نہیں ہے ایک سید اور ایک نور باف ان
امور میں برابر و مساوی ہیں۔ جب کہ سید۔ سبِ صحابہ کے باعث کفر کا
مرتکب ہو تو پھر سید کب رہا؟ وہ تو "غیر صالح عمل" کی وجہ سے "اہل"
سے نکل گیا، اور لیس من اہلک کا مصداق ہو گیا۔ ہاں اگر کوئی سید اس
شخص کا کوئی خاص دنیاوی حق ضائع کر دے تو عزیمت اور بلند کرداری
کی بات یہ ہو کہ اس سے درگزر کرے اور انتقام نہ لے۔ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے بھی درگذر کے لئے فرمایا ہے۔ لیکن اگر حقوق دینی تلف کئے
جائیں وہاں درگذر اور چشم پوشی معقول و جائز نہیں ہے خلاصہ یہ ہے
کہ قائل کا یہ قول بھی خطا و بدعت ہے اس بات کے کہنے سے کفر تک نوبت
نہیں پہونچتی اس لئے کہ اہل بیت کے حق میں تعظیم بمعنی محبت کا واجب ہونا

اور ان کو ایذاء نہ دینے کا حکم عموماً وارد ہوا ہے قائل کے دماغ میں
اس عام کی تخصیص نہیں آئی کہ اس نے صحابۂ کرام کو برا بھلا کہنے
والے والے سید کے لئے بھی تعظیم واجب قرار دیدی۔ یا حقوق دینی
اور حقوق انسانی میں باہم اس کو اشتباہ ہو گیا۔ اور اس نے
دونوں قسم کے حقوق میں فرق نہ کر کے یہ بات کہدی ـــــ بہر حال
ضروریات دین میں سے کسی بات کا انکار اس قول سے مفہوم نہیں ہوتا۔

اسلام میں عقل کا کردار

(از ڈاکٹر سید محمد یوسف صدر شعبۂ عربی کراچی یونیورسٹی)

—— گزشتہ سے پیوستہ ——

صنعت، حرفت اور تجارت کوئی نئی چیز نہیں، ہمیشہ سے رہی ہے اور برابر ترقی کرتی آئی ہے۔ ترقی کے بالکل ابتدائی درجہ میں جوں ہی انسان نے تمدن و حضارت کی راہ لی "تمویل" کا مسئلہ پیش آیا۔ یعنی یہ کہ ایک فرد کے بس کی یہ بات نہیں رہی کہ صنعت، حرفت اور تجارت کو اعلیٰ سے اعلیٰ پیمانے پر فروغ دینے کے لیے جتنے سرمایہ کی ضرورت پڑے وہ اس کی تن تنہا کفیل ہو جائے۔ لامحالہ اسے دوسروں سے مال کے حصص جمع کرنے پڑتے ہیں۔ انسان کی خود غرضی کا یہ حال ہے کہ اگر وہ دوسرے انسان کو اس کی ذاتی حاجت روائی کے لیے کچھ قرض دیتا ہے تو اس میں بھی "ربوا" بڑھت کا طالب ہوتا ہے۔ تنہا عقل سے آج بھی پوچھ کر دیکھ لیجیے، وہ اس میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتی پھر اگر "مقرض" (قرض دینے والے) کو یہ معلوم ہو جائے کہ "مقترض" (قرض لینے والا) اس کا مال صنعت، حرفت یا تجارت میں لگائے گا تو بالطبع یہی چاہے گا کہ جتنا نفع ہو اس میں سے زیادہ سے زیادہ حصہ خود اس کو ملے اور مقترض کا دم کم سے کم پر راضی ہو جائے۔ لیکن "خلق الانسان ھلوعا" انسان بڑا تھڑدلا بھی واقع ہوا ہے، وہ صنعت، حرفت، تجارت کا نفع دیکھ کر منہ پھاڑتا ہے، لیکن نقصان میں شریک نہیں ہونا چاہتا۔ مقرض کو جو نقصان کا ڈر ہوتا ہے اور جس کی وجہ سے وہ سرمایہ لگانے سے ڈرتا اور جھجکتا ہے اسے وہ مقترض کا دم بھانپ لیتا ہے جسے اپنی کامیابی پر

کسی حد تک بھی دتوق ہو۔ چنانچہ وہ مقرض سے کہتا ہے کہ تم منافع میں کم سے کم حصہ پر راضی رہو تاکہ فع ہو جاؤ تو میں تمہیں نقصان کے ڈر سے نجات دیے دیتا ہوں۔ مقرض اپنی پست ہمتی کے باعث اس پر راضی ہو جاتا ہے اور اس طرح اس کا خود اپنا منصوبہ اُلٹ جاتا ہے۔ بالآخر مقترض کاروبار ہو کچھ کماتا ہے اس میں سے بہت تھوڑا حصہ بطور سود کے مقرض کو دے دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مقترض کاروبار مقرض کو جو بندھا ٹکا "سود" دیتا ہے وہ اس منافع کا بہت تھوڑا حصہ ہوتا ہے جو وہ مقرض کے مال اور اپنی محنت اور حسن تدبیر سے کماتا ہے لطف یہ کہ مقترض کاروبار تو خوش ہوتا ہی ہے، مقرض بھی یہ سمجھتا ہے کہ نقصان میں شریک نہ ہو کر اس نے مقترض کاروبار کو بے وقوف بنایا اور خود بے وقوف بن کر خوش ہوتا ہے۔

اس کے باوجود بھی مقرض کو اطمینان نہیں ہوتا۔ وہ یہ ڈرتا ہے کہ مقترض کاروبار لاکھ یقین دلائے اگر نقصان ہوا اور وہ دیوالیہ ہو گیا تو میرا مال ڈوب جائے گا پھر کیا ضمانت ہے کہ مجھے اپنا راس المال پورا پورا مع سود کے مل سکے گا۔ اور کہاں سے ملے گا، اور اس کے لیے مجھے کتنے جھنجھٹ میں پڑنا ہو گا اور کتنی پریشانی اور کوفت اٹھانی ہو گی؟ اُدھر مقترض کاروبار کی ضرورت اتنی بڑھی ہوئی ہوتی ہے کہ وہ زیادہ انتظار نہیں کر سکتا اور چھوٹے چھوٹے سینکڑوں مقرضین سے فرداً فرداً معاملہ کرنا اس کے لیے دشوار ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کوئی ایک بڑا سرمایہ دار ایسا مل جائے جو "سود" نسبتہً زیادہ لے تو لے اس کی تمام ضرورتیں وقت پر پوری کر دے۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر ذیرک بنک کار درمیان میں کود پڑتا ہے اور اپنی دکان سجاتا ہے۔ ایک طرف وہ مقرضین کو اپنے وعدوں کی ہر مطلوبہ ضمانت پیش کرتا ہے، حکومت سے تصدیق اور یقین دہانی کراتا ہے یہاں تک کہ قرض دینے والے کو کوئی کھٹکا باقی نہیں رہتا۔ دوسری طرف وہ مقترض کاروبار سے ایسی ضمانت لے لیتا ہے کہ اسے خود قرض دینے میں اپنے راس المال یا سود کے بارے میں کسی نقصان کا اندیشہ نہیں رہتا۔ پھر وہ ادھر ادھر چھوٹے چھوٹے مقرضین سے چھوٹی چھوٹی رقمیں قرض لیتا ہے اور بڑے بڑے مقترضین کو بڑی بڑی رقمیں کھٹا کھٹ قرض دیتا ہے۔ مقترضین سے زیادہ شرح سود لیتا ہے اور مقرضین کو بہت کم شرح سود دیتا ہے۔ سود لینے اور

سود دینے کی شرح کا فرق خود اینٹھ لیتا ہے۔ اس کے باوجود دونوں ہی اس کے شکر گزار اور احسان مند رہتے ہیں۔ بالآخر وہ تمویل کا مرجع بن کر صنعت، حرفت اور تجارت کی شہ رگ دبائے رکھتا ہے۔

ہو سکتا ہے کوئی اقتصادیات کا ماہر زیر لب مسکرائے اور کہے کہ آپ نے بھی سادگی کی حد کردی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میرا اقتصادیات کا مطالعہ بہت سرسری ہے۔ لیکن شاید یہ صحیح ہو کہ شریعت میں اس مسئلہ کے جن پہلوؤں کی رعایت کی گئی ہے وہ یہی ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ اگر ایک انسان دوسرے انسان کو اس کی حاجت روائی کے لیے قرض دے تو اس پر "ربوا" یعنی "بڑھوت" کا طالب نہ ہو۔ جیسا کہ اوپر اشارہ گزرا تھا، تنہا عقل اس کو حماقت بتلائے گی۔ اس انسانی کردار کی عظمت کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے عقل کو دین سے مدد لینا ہوگی۔ جہاں تک تمویل کا تعلق ہے اسلام ایک نہایت سادہ، عام فہم اور قابل عمل اصول بتاتا ہے اور وہ یہ کہ مقرض اور مقترض دونوں نفع نقصان میں اور منافع میں برابر کے شریک ہوں۔ عقل اس کی مصلحت کو بآسانی سمجھ سکتی ہے اور وہ یہ کہ فریقین میں سے کوئی ایک دوسرے کا استغلال نہ کر سکے۔ تمویل کا یہ طریقہ سترھویں صدی تک جب مسلمان صنعت، حرفت اور عالمی تجارت میں ہزیمت خوردہ ہونے کے باوجود خاصے ممتاز تھے۔ تمدن و حضارت کی تمام ضروریات کے لیے کافی تھا۔ آج بھی مضاربت کا یہ طریقہ بالکل متروک نہیں ہوا ہے۔ اگر بنک کار مقرضین کی ہمت پست نہ کرے اور مقترضین کی بے جا حوصلہ افزائی نہ کرے تو یہ طریقہ بڑی سے بڑی صنعت اور تجارت کی صحت مند ترقی کا کفیل ہو سکتا ہے۔ بنک کار کی طرح کے "وسطاء" (Middle men) کا کردار بسا اوقات یہی ہوتا ہے کہ وہ بلا استحقاق اصلی فریقین سے اینٹھ لیتے ہیں اور مجموعی طور پر معاشرہ کے لیے مضر ثابت ہوتے ہیں۔

اس مثال سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ عقل کے نام پر تقلیدِ غیر ہمارا شیوہ بن چکا ہے۔ مغرب کی صنعت اور تجارت، سود اور بنک کاری کے نظام کے ساتھ ہمارے سامنے آئی اور ہم نے مدہوشی کے عالم میں جس کا اوپر ذکر گزرا، سود اور بنک کاری کے نظام کے لیے اسلام میں جگہ نکالنی شروع کردی۔ آج تقریباً پچاس برس سے ہم اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں حالانکہ اگر ہم مدہوشی کی کیفیت سے نجات پالیں اور عقل و ہوش کی راہ پر چلیں تو صحیح

طریق کار یہ ہے کہ دیانت داری سے پہلے تو یہ معلوم کریں کہ ابتدائے اسلام سے عصر حاضر کے آغاز تک مسلمان کس اصول پر کاربند رہے اور اس کی بدولت ان کے اپنے زمانے میں کہاں تک سرخروئی یا رسوائی ہوئی، پھر یہ دکھائیں کہ اس اصول پر چل کر عصر حاضر میں ترقی خواہ وہ کسی قسم کی ہو، کیوں محال یا دشوار ہے، تب پھر اسلام میں تاویل، ترمیم یا اضافہ کی سوچیں۔ اس کے بجائے ہم کرتے یہ ہیں کہ اسلام میں تاویل، ترمیم اور اضافہ کی پہلے سوچتے ہیں، پھر دوسرے نقطہ سے بالکل آسان گذر جاتے ہیں اور بلا دلیل یہ فرض کر لیتے ہیں کہ عصر حاضر میں ترقی صرف انھیں اصولوں کو اپنانے سے ہو سکتی ہے جن پر ہم ترقی یافتہ قوموں کو کاربند دیکھتے ہیں، مسلمان چونکہ عصر حاضر میں ترقی یافتہ نہیں اس لیے اسلام عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ اس کے بعد آخر میں دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں: یا یہ کہ عصر حاضر سے قبل سلف کے اصول بھی وہی تھے جو آج ترقی یافتہ قوموں کے ہیں یا یہ کہ سلف جن اصولوں پر کاربند تھے وہ ان کے زمانے کے لیے تھے، ہمارے لیے نہیں، ہمارے لیے اسلام کی رُوح کافی ہے نہ کہ وہ ہیئات واشکال جو سلف کے زمانہ میں رائج تھیں۔ اسلام کو عصر حاضر کے مطابق ڈھالنے والوں کی تحریروں میں یا تو ہمیں یہ ملتا ہے کہ سود کی فلاں فلاں قسم سرے سے ممنوع ہی نہیں، فقہا اور علماء تیرہ سو برس تک غلطی پر رہے یا پھر یہ کہ عصر حاضر کی ترقیوں میں برابر کا حصہ لینا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ صرف اسلام کی رُوح پر اکتفا کرتے ہوئے ترقی یافتہ قوموں کے سارے نظام بلا تکلف اپنا لیے جائیں۔ لیکن یہ کوئی نہیں بتاتا کہ اسلام نے تمول کا جو طریقہ معین کیا ہے اور جس پر مسلمان عصر حاضر کے آغاز تک کاربند رہے اور جو آج بھی کلیتہً متروک نہیں ہوا ہے بلکہ بڑی حد تک معمول بہ ہے وہ کیوں ترقی کے تقاضوں کو پورا کرنے سے عاجز ہے۔ ترقی کی خواہش خواہ وہ مادی ترقی ہی کیوں نہ ہو کوئی بری چیز نہیں۔ کہنا صرف اتنا ہے کہ مادی ترقی کی خواہش روس کو بھی تھی۔ نیرنگیٔ احوال دیکھیے کہ شیوعی انقلاب اس ملک میں آیا جو صنعتی لحاظ سے بالکل ہی پس ماندہ تھا جب کہ قائدین انقلاب کی توقعات اور پیشین گوئیاں یہ تھیں کہ شیوعی انقلاب کا گہوارہ وہ ممالک ہوں گے جو صنعت میں آگے بڑھے ہوئے ہوں گے۔ بہرحال

مادی ترقی تو شیوعی نظام کا جزو نہیں بلکہ کل کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن اگر شیوعیت مادی ترقی کی خاطر اپنے آپ کو اس وقت کی ترقی یافتہ قوموں کے نظام سرمایہ داری کے مطابق ڈھال لیتی تو کہاں شیوعیت باقی رہتی اور کہاں شیوعیت کی رُوح؟ روس نے مادی ترقی حاصل کرلی لیکن شیوعیت کے حدود کے اندر رہ کر۔ اسی باعث تو آج ہمارے یہاں کچھ لوگ اس خیال کے ہیں کہ شیوعیت کے ساتھ خدا[1] کو جمع کردو (شیوعیت + خدا) اسی طرح جیسے کہ ہم نے انگریزی نظام تعلیم کے ساتھ اسلامی نظریۂ حیات کو جمع کردیا ہے۔ دنیاوی مقاصد میں اسلام مددگار ثابت ہوگا اور اگر کوئی رندگستاخ آخرت کا ذکر چھیڑدے تو اس کے لیے بھی اسلام کی روح (اسلامی شریعت نہیں اسلامی "نظریۂ حیات") کافی ہے۔ اب تک یہ طرز فکر معدوم ہے کہ زندگی کے مسائل سے کیا ڈرنا اور کیا ڈرانا۔ زندگی ایک ہے، زندگی کے مسائل ہر دین و مذہب اور نظام زندگی کے متبعین کے لیے یکساں ہوتے ہیں۔ ہر دین مذہب اور نظام زندگی کی امتیازی شان بلکہ اس کے وجود کا جواز ہی اس میں ہوتا ہے کہ وہ ان مسائل کا نیا حل پیش کرے جیسے کہ روس نے مادی ترقی اور خوش حالی کا ایک نیا حل پیش کیا۔ اگر سائل اپنے ساتھ بندھے ٹکے حلول لے کر ابھریں تو پھر تو سبھی انسان "ملۃ واحدۃ" میں ضم ہوجائیں۔ دین تو دین پھر عقل کی بھی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بالکل اسی انداز پر ہمیں اقتصادیات کے دوسرے ابواب میں سوچنا ہوگا۔ موجودہ نقد کے نظام کو لیجیے جو تمامتر حکومتوں کے تصرف میں ہے، فطری عوامل بالکل معطل کردیے گئے ہیں۔ اسلام کا موقف مختصراً یہ ہے کہ نقد کی مقررہ قیمت (Face Value) وہی ہونا چاہیے جو اس کی ذاتی قیمت (Intrinsic Value) ہو۔ نقد بھی ایک جنس ہے اور فطری عوامل کے تحت اجناس کی قیمت میں جو اتار چڑھاؤ رہتا ہے۔ اس سے نقد کی قیمت کا متاثر ہونا بھی فطری ہے[2]۔ حمل ونقل کی سہولت کے لیے کاغذ کا نوٹ ایک نشانی (Token) ہے۔ یقین دہانی ہے۔ ایک "وعدہ" ہے کہ معین مقدار میں

---

[1] جو خدا سے بے نیاز ہیں ان کا ذکر ہی بے محل ہے۔ ختم اللہ علیٰ قلوبھم ...الخ۔ [2] چونکہ سونے چاندی کے گھریلو استعمال سے نقد کی قیمت متاثر ہوتی ہو اور اقتصاد پر برا اثر پڑتا ہو اسی لیے اس پر پابندیاں ہیں۔

زرِ نقد محفوظ ہے۔ اب اگر یہ وعدہ جھوٹا ہو تو؟ آخر جھوٹے سکے اور جعلی سکے پر پکڑ دھکڑ کیوں ہے؟

میں کھٹکتا ہوں تو چھلنی کو بُرا لگتا ہے کیوں؟
ہیں سبھی تہذیب کے اوزار تو چھلنی میں چھاج

یہ جو موجودہ دنیا میں "ہتھیلی پر سرسوں جمانے" کا عمل جاری ہے اور اقتصاد کے جسم پر بادی گوشت چڑھنے لگتا ہے اور موٹاپے کے باعث حرکتِ قلب بند ہونے کا خدشہ ہوتا ہے اس میں بہت بڑا دخل اسی نقد کے نظام کے فساد کا ہے۔ نقد کے نظام میں "تلاعُب" اور من مانی جو موجودہ دور میں حکومتوں کا حق سمجھا جاتا ہے۔ اسی سے یہ عبرت حاصل ہوتی ہے کہ عقل کو خود اپنی صحت برقرار رکھنے کے لیے وحی کے بتائے ہوئے اخلاقی سانچوں میں ڈھلنا چاہیے۔

یہ جو عقل والے اسلام سے کہتے ہیں: "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز" اسے بڑی تقویت ایک لفظ "تشکیلِ نو" (Re-Construction) سے ہوتی ہے جو اقبالؔ کے لیکچرز کا عنوان ہونے کے طفیل چل پڑا ہے۔ عام طور سے یہ مغالطہ ہوتا ہے یا جانتے بوجھتے ہوئے اقبالؔ کے ساتھ عقیدت کا سہارا لے کر یہ مغالطہ دیا جاتا ہے کہ تشکیلِ نو یا تعمیرِ نو اس عمل کا نام ہے جو "ہدم و بنا ر" پر مشتمل ہوتا ہے، یعنی یہ کہ پہلی عمارت کو ہدم کر دو، ڈھادو اور اس کی جگہ ایک نئی عمارت بنا کر کھڑی کر دو۔ اگر یہی ہے تو پھر تو "ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت" اسلام اگر نام کو رہا بھی تو ہمیشہ پھاوڑے کدال کی زد میں رہے گا۔ اقبالؔ کے مجموعی فکر میں اس "ہدم و بنا ر" کی کوئی گنجائش نہیں[1]۔ یہ اقبالؔ پر سراسر بہتان ہوگا۔

---

[1] اس میں شک نہیں کہ اقبال کے چھٹے لیکچر (The Principles of Movement) میں ہدم کی بہت سی مثالیں ہیں۔ لیکن اس سے صاف ظاہر ہے کہ فکر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے اور اقبال وقتی جذبات کی رَو میں بہہ گئے ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے میرا مقالہ ——— A Study of Iqbal's Views on "Ijma" Iqbal Review, Karachi, October 1962.

حتیٰ کہ اقبال کے فنِ شاعری کی بابت بھی کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ انھوں نے اردو شاعری کی قدیم عمارت ڈھاکر اس کی جگہ ترقی پسند ڈیزائن کی نئی عمارت کھڑی کی۔[1] قبل اس کے کہ کوئی یہ کہے کہ اچھا تو پھر ایک مرتبہ اسلام کی جو عمارت بن گئی وہ مرورِ زمانہ سے بوسیدہ ہو کر اپنے آپ گر جائیگی اور اس کے مکین ویرانہ چھوڑ کر بھاگ جائیں گے ـــــ قبل اس کے کہ کوئی یہ کہے میں کہوں گا کہ آپ جتنی بھی تجدید کریں، پتھر تو جماد ہے، اس کی تشکیل، تعمیر، تجدید ہمیشہ بانی کے تخیل، مرضی، پسند اور عمل کے مطابق ہو گی۔ اس کے برخلاف اسلام میں "نمود اور ازدھار" ہے۔ وہ ایک نبات کی مانند بڑھتا ہے، اور بڑھتا ہی چلا جاتا ہے، پھلتا اور پھولتا ہے۔ یہ سب زورِ طبیعت کی بدولت اور اپنے مزاج اور فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔ جیسے زمانہ گزرتا جاتا ہے اس کی جڑیں ماضی میں اور زیادہ راسخ ہوتی جاتی ہیں، تنا اور زیادہ موٹا اور مضبوط ہوتا جاتا ہے، اس میں نئی نئی شاخیں پھوٹتی ہیں، نئے نئے پھول کھلتے ہیں اور پھل لگتے ہیں، لیکن نمود اور ازدھار کے اس عمل میں اس کی اندرونی طاقتیں کارفرما ہوتی ہیں، اس کا ارتقاء اس کے اپنے "نشاطِ روح (Elam Vital) کا تابع ہوتا ہے۔ الغرض کسی باغبان کے تخیل یا مرضی اور پسند کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ باغبان کی عقل صرف اتنا کر سکتی ہے اسے کھاد، پانی دے اور طفیلی پودوں سے بچائے رکھے تاکہ وہ سوکھنے نہ پائے اور اس کی بڑھت نہ رک جائے۔ کہنا یہ ہے کہ اگر اسلام کے باغبان اور چمن آرا اسلامی علوم کی آبیاری کریں اور انھیں تر و تازہ رکھیں تو اسلام کا تناور درخت طبعی تغیرات ـــــ گرمی، سردی، آندھی، جھکڑ ـــــ کی مقاومت کرتا ہوا اپنی فطرت کے مطابق خود بخود بڑھتا رہے گا۔ اپنے پتوں کی خود تجدید کرے گا اور ہر موسم میں نئے پھل دیتا رہے گا۔ کجا اسلامی علوم ـــــ قرآن، حدیث، تفسیر، فقہ ـــــ اور کجا "اردو کا اسلامی لٹریچر" اور "اسلامی نظریۂ حیات" جن کی حیثیت "برگِ حشیش" سے زیادہ نہیں۔ میرے پیش نظر اعلیٰ تعلیمی ادارے ہیں، ان پڑھ اور ادھ پڑھے عوام نہیں کہ انھیں جو میسر آجائے وہی بہت ہے۔

[1] دیکھیے میرا مقالہ "اقبال کے کلام میں روایت اور جدت"۔ اقبال ریویو، کراچی، جنوری ۱۹۶۱ء

"ہم و بنار" کی خاطر باب اجتہاد پر یورش ہے۔ باب اجتہاد کھلا ہے اور ہمیشہ سے کھلا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے قانون، طب، ہندسہ اور ایجادات ذریہ (Atomic Research) کا دروازہ کھلا ہے۔ صرف اتنا ہے کہ جب تک لوگ دیانتدار تھے وہ شرم و حیا کے ساتھ اپنے قصور علم کا اعتراف کرتے تھے اور بے جھجک نہیں داخل ہوتے تھے۔ کاش جو جد و جہد باب اجتہاد کے دروازے توڑنے میں کی جاتی ہے وہ اجتہاد کی تیاری میں صرف ہوتی۔ آخر یہ تو ضروری نہیں کہ جو دروازہ کھلا ہو اس میں ہر کس و ناکس گھستا چلا جائے۔ باب اجتہاد میں داخل ہونے کے آداب و شرائط کچھ اور ہیں اور حمام میں داخل ہونے کی ہیئت اور طریقے کچھ اور ہیں۔ اجتہاد کے آداب و شرائط تفصیل سے درج ہیں اور نہایت معقول ہیں۔ اجمالاً دو بڑے بڑے عنوانوں کے تحت آتے ہیں: ایک علم یعنی علم دین، دوسرے تقویٰ یعنی حسن نیت کے ساتھ اللہ کی مرضی کی تلاش۔ آنہ ججوں سے بھی تو ان کے عہدہ کا حلف اٹھوایا جاتا ہے، پھر یہ تقویٰ کی شرط کیوں گراں گزرتی ہے؟ علم کے سلسلہ میں ایک بات ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اسلامی نظام تعلیم کی ایک نہایت قابل قدر روایت یہ تھی (اب یہ روائتیں کہاں؟ صرف حدیث کی حد تک خال خال ان کا لحاظ باقی رہ گیا ہے) کہ مصنف سے اس کی کتاب کی روایت کا سلسلہ چلتا تھا، اس طرح نہ صرف مصنف کے الفاظ بلکہ ان الفاظ سے اس نے جو معانی مراد لیے ہیں وہ اور ان کی تفسیر سلسلہ وار منقول ہوتی تھی اور کسی کو یہ حق نہیں ہوتا تھا کہ ڈکشنری کی ناقص مدد اور عقل کے زور سے الفاظ کو وہ معنی پہنائے جو مصنف کے ذہن میں نہ تھے۔ ادب میں بھی یہ ہے کہ جاہلی شعر کی جو قدیم شرحیں ہیں وہ قابل احترام ہیں اور ہمارے اپنے اجتہاد کی گنجائش بہت کم ہے۔ پھر کیا قرآن و حدیث کے سلسلہ میں یہ واجب نہیں کہ صحابہ اور تابعین نے جو مطلب لیا اور جو سمجھا اس کا ہم احترام کریں؟ یہ بھی کیا بات ہے کہ ایک مدرسی لغت لے کر بیٹھے، قرآن و حدیث کے الفاظ کے متعدد معانی میں سے ایک معنی چنا، اور اجتہاد کر ڈالا کہ ہمارے مفید مطلب اور عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق، فلاں آیت اور فلاں حدیث کا مفہوم یوں بنتا ہے!!! ادب میں اس قسم کے اجتہاد کی ایک دلچسپ مثال ابن سلام الجمحی کی طبقات فحول الشعراء کا وہ ایڈیشن ہے جو محمود محمد شاکر

میں شائع کیا ہے۔ انھوں نے جا بجا قدیم شعر سمجھنے میں قدیم شارحین سے ہٹ کر خود اپنا اجتہاد کیا ہے۔ بس یوں سمجھیے کہ دین میں اجتہاد کرنے والے اسلام کی روح کو جدید قالب میں ڈھالتے ہیں اور وہاں قدیم شعر کے قالب میں جدید روح پھونک دی گئی ہے۔[1] ہمارے یہاں بھی کلام غالب کی ایسی شرحیں کم نہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنے بڑے ماہر اقتصادیات تھے! لغت کی رُو سے سب چولیں برابر بیٹھتی ہیں۔

اگر کسی کو یہ دیکھنا ہے کہ کیسے کیسے لوگ ننگ دھڑنگ تفسیر و اجتہاد کے دروازہ میں گھس آتے ہیں تو دکتورہ بنت الشاطی کا وہ طویل مقالہ پڑھے جو انھوں نے مستشرقین کی بین الاقوامی کانگرس کے اجلاس میں شرکت کے بعد دہلی سے واپسی پر "الاہرام" مورخہ ۲۷ مارچ ۱۹۶۴ء میں شائع کیا تھا۔ لکھتی ہیں کہ جو عربی سے نابلد ہے وہ قرآن کا ترجمہ اور تفسیر کر ڈالتا ہے۔ آخر میں کہتی ہیں کہ گو ہمیں (مصریوں کو) یہ حق نہیں کہ دوسرے ممالک میں شائع ہونے والی کتابوں پر پابندی لگائیں لیکن اتنا تو ہو کہ چند علمائے قرآن کی عزت و ناموس کی حمایت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں اور اللہ کی کتاب کو "عبث المترجمین وخطأ الشراح وعدوان الملتبسین" سے بچائیں۔

یہ حضرت عمرؓ کے سارے فقہی کارناموں کو چھوڑ کر صرف چند "اولیات عمرؓ" کیوں ہماری توجہ کا مرکز بنی ہیں؟ اسی لیے نا کہ "ہدم و بنا" کے پہلے جزو (ہدم) کی سند کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈھ کر نکالنی ہے؟ میں صرف دو مثالوں پر اکتفا کروں گا جو فی الواقع کسی حد تک جواب کی محتاج ہیں۔ پہلے "مولفۃ القلوب" کے مسئلہ کو لیجیے۔ اگر آج ہندوستان میں کوئی ہندو اسلام لاتا ہے یا قبول اسلام کا ارادہ کرتا ہے تو کتنی ہی مشکلات ہوں گی جو ایک کمزور ارادہ والے انسان کو باز رکھیں گی۔ اس کی جان، مال، نوکری سب خطرہ میں پڑ جائے گی۔ اس کے برخلاف اگر کوئی پاکستان میں اسلام لائے تو وہ تو ہو سکتا ہے مال و دولت ملازمت کی لالچ میں اسلام لائے۔ ایسی حالت میں ہندوستان کے مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ وہ اس ہندو کی جو مائل بہ اسلام ہے تالیف قلب کریں، پاکستان میں اس کی چنداں ضرورت نہیں پھر اگر وہ تو مسلم ہندوستانی مسلمانوں

---

[1] دیکھیے میرا نقد اس کتاب پر ــــ مجلۃ الکتاب (القاہرہ) اپریل ۱۹۵۲ء

سے وظیفہ لینا اپنا حق سمجھنے لگے اور پاکستان آجائے تو یہاں کے مسلمانوں کی دیکھا دیکھی پڑھا لکھا کر اس وظیفہ کا جھوٹا کلیم (claim) بھی داخل کر دے۔ اگر ایسا ہو تو عقل کیا کہتی ہے جو عقل کہتی ہے وہ قرآن و سنت کے عین مطابق ہے۔ حضرت عمرؓ نے صرف اتنا کیا تھا، ورنہ مولفۃ القلوب کی مد آج بھی باقی ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے عراق کی زمینوں کو مقاتلین میں تقسیم نہیں ہونے دیا۔ اچھا تو یہ تقسیم کس آیت اور کس سنت کی رو سے فرض تھی؟ اس سب کا مدلل، عالمانہ، اور سنجیدہ جواب اس مقالہ میں موجود ہے جو حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی کے قلم سے معارف (اعظم گڑھ) اگست ۱۹۵۷ء و مابعد میں شائع ہوا۔ فتح عراق سے پہلے یہ صورت حال پیش ہی کب آئی تھی کہ اتنا رقبہ زمین ہاتھ آئے جو رضا کار فوجیوں کی خود کاشت کی ضرورت سے زیادہ ہو؟ پھر "جنود مرتزقہ" (Standing army) کا اس سے پہلے کسی کو خیال بھی آیا تھا؟ یہ خیال تو اس وقت آیا، اور اسی وقت آنا بھی چاہیے تھا، جب ایران کے مفتوحہ علاقوں میں چھاؤنیاں قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ حضرت عمرؓ نے جو کچھ کیا وہ اسلامی شریعت کا "نمو" ہے، نمو میں کچھ تغیر تو ہوتا ہے لیکن "ہدم" نہیں۔ اپنی جوانی کا مقابلہ اپنے بچپن سے کر کے دیکھیے۔ نمو کے عضوی (organic) تغیرات نظر آئیں گے۔ اسی طرح اجتہاد بھی قرآن و سنت کا عضوی نمو و ارتقا ہے۔ اسی کو فقہاء محدثین یوں کہتے ہیں کہ اجتہاد کی سند قرآن و حدیث سے ضروری ہے۔

خلاصہ یہ کہ ہماری عقلیں "مسلم" ہیں۔ جو عقل اسلام لا چکی ہو اسے "تحرّد" زیب نہیں دیتا۔ "عقل مسلم" کا دائرہ عمل فقہ دین ہے۔ اجتہاد اس کا سب سے اعلا درجہ ہے۔ اجتہاد کا شوق مبارک لیکن اجتہاد ثمرہ ہے علوم اسلامیہ کی ترقی کا۔ بغیر شجر کے ثمر کی توقع؟ قرآن و سنت سے رضائے الٰہی دریافت کرنا کم از کم اتنا علم چاہتا ہے جتنا ذرہ کا دل چیرنے کے لیے ایک سائنس داں کو درکار ہوتا ہے۔ اگر اجتہاد کی ضرورت ہے، اور بے شک ہے، تو اسلامی علوم کے ساتھ وہی اعتنا کیجیے جو سائنس کے ساتھ کیا جاتا ہے، اور خدارا اسلام کو بہ حیثیت ایک علم کے سیاست سے بالکل منعزل (isolated) رکھیے۔ اتنا حق تو ہر علم کا تسلیم کیا جاتا ہے، پھر اسلام تو ایک مقدس علم ہے۔ تمام

جہاد اور ہجرت

سے متعلق سورہ نساء کی چند آیات

ہر اتوار کو مغرب سے عشاء تک، کچہری روڈ (لکھنؤ) کی اس مسجد میں جو "مرکز والی مسجد" کہلاتی ہے قرآن مجید کا درس ہوتا ہے۔ گزشتہ اتوار (۲۳ جون) کو سورۂ نساء کی مندرجۂ ذیل آیات (۹۴ تا ۱۰۰) زیر درس تھیں۔ ایک عزیز نے اس درس کے مضامین کو قلمبند کیا ہے اور میری نظر سے گزرنے کے بعد اس کو ہدیۂ ناظرین الفرقان کیا جا رہا ہے ——— محمد منظور نعمانی

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوا وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَىٰ إِلَيْكُمُ السَّلَمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُونَ عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيرَةٌ ۚ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوا ۚ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿٩٤﴾ لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ ۚ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً ۚ وَكُلًّا وَعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقَاعِدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿٩٥﴾ دَرَجَاتٍ مِنْهُ وَمَغْفِرَةً وَرَحْمَةً ۚ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿٩٦﴾ إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ ۖ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا ۚ فَأُولٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ﴿٩٧﴾ إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ﴿٩٨﴾ فَأُولٰئِكَ عَسَى اللّٰهُ أَنْ

يَعْفُوَ عَنْهُمْ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝ وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۚ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (النساء ۹۴ - ۱۰۰)

(ترجمہ) اے ایمان والو جب تم خدا کی راہ میں (یعنی جہاد کے لیے) نکلا کرو تو (عملی اقدام اور حملہ سے پہلے) اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو۔ اور جو تمھیں سلام کرے (اور اپنا مسلمان ہونا ظاہر کرے) تو اس کو دنیوی زندگی کے سامان کی خاطر یہ نہ کہو کہ تو مومن و مسلم نہیں ہے، اللہ کے پاس غنیمت کے بڑے سامان ہیں (لہذا تم اسی کے فضل پر نگاہ رکھو) پہلے تم بھی ایسے ہی حال میں تھے، اللہ نے تم پر فضل و احسان فرمایا تو تم (ایسے موقعوں پر) تحقیق ضرور کر لیا کرو، تم جو کچھ کرتے ہو اور کروگے اس سے اللہ تعالیٰ اچھی طرح باخبر ہے (۹۴)

مسلمانوں میں اپنے جان و مال سے جہاد کرنے والے اور بغیر کسی عذر اور مجبوری کے بیٹھ رہنے والے (یعنی جہاد نہ کرنے والے) درجہ اور مرتبہ میں برابر نہیں ہیں، جو اہلِ ایمان اپنے جان و مال سے راہ خدا میں جہاد کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو جہاد نہ کرنے والوں پر ایک بڑے درجہ کی فضیلت بخشی ہے، یوں دونوں ہی طبقوں کے لیے (بشرطیکہ وہ ایمان میں مخلص ہوں) اللہ تعالیٰ کی طرف سے حسنِ انجام کا وعدہ ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے "مجاہدین" کو "قاعدین" پر ایک عظیم اجر کی فضیلت دی ہے (۹۵) — (ان کے لیے) اس کی طرف سے (بڑے بلند) درجات ہیں اور (خاص درجہ کی) بخشش و رحمت ہے اور اللہ غفور و رحیم ہے۔ (۹۶)

جن لوگوں کی روح فرشتے اس حال میں قبض کریں گے کہ انھوں نے اپنے نفسوں پر ظلم ڈھائے ہیں (اور اللہ کے احکام و مطالبات کی

ادائیگی میں سخت کوتاہیاں کی ہیں) وہ ان سے پوچھیں گے کہ تم کس حال میں تھے؟ وہ کہیں گے کہ ہم اپنے وطن اور ماحول میں بالکل عاجز اور بے بس تھے (اس لیے مسلمانوں والی زندگی نہیں گزار سکتے تھے) فرشتے کہیں گے کہ کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم کسی طرف ہجرت کر جاتے! ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ (۹۷) البتہ وہ عاجز و لاچار مرد اور عورتیں اور بچے جو ان حالات سے نکلنے کی کوئی تدبیر نہیں کر سکتے اور کوئی راستہ نہیں پا سکتے ہیں (وہ معذور ہیں) (۹۸)

توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرمائے گا اور اللہ معاف فرمانے والا اور بخشنے والا ہے (۹۹)

اور جو کوئی راہ خدا میں ترک وطن کر کے نکلے (اس کے لیے اللہ کا فیصلہ ہے کہ) وہ اللہ کی زمین میں رہنے بسنے کے لیے وسیع میدان اور پوری گنجائش اور کشادگی پائے گا۔ اور جو کوئی چل نکلے اپنے گھر سے اللہ و رسول کے لیے ہجرت کر کے پھر آ جائے اس کو (راستہ ہی میں) موت تو (صرف قدم اٹھا دینے سے) اس کا اجر و ثواب ثابت ہو گیا اللہ تعالیٰ کے ہاں اور اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔ (۱۰۰)

تفسیر و تشریح :-

یہ آیتیں جس سیاق اور پس منظر میں سورۂ نساء میں وارد ہوئی ہیں پہلے اس کو سمجھ لینا چاہیے۔

یہ بات آپ سب حضرات کو معلوم ہے کہ مسلمان اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں ۱۳ برس تک دشمنان دین یعنی مکہ کے کفار و مشرکین کے ظلم و ستم سہتے رہے اور آپ نے اپنے اصحاب و رفقاء کو مدافعت کے لیے بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں دی، بلکہ مدینہ طیبہ ہجرت فرمانے کے بعد بھی شروع شروع میں کچھ دنوں یہی رویہ رہا کہ جب کبھی بعض جوشیلے مسلمانوں نے دفاع و مقابلہ کے لیے طاقت کے استعمال کرنے کی اجازت چاہی تو آپ نے ان کو اجازت نہیں دی

اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ مسلمانوں کو یہی ہدایت اور تلقین فرماتے رہے۔ کہ

"کُفُّوْا اَیْدِیَکُمْ وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ" (سورۃ النساء آیت ۷۷)

یعنی صبر و برداشت سے کام لو، ہاتھ نہ اٹھاؤ، اور بس نماز و زکوٰۃ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط کرتے رہو اور اپنے نفس و روح کی تربیت کرتے رہو۔

اب سے دو تین ہفتے پہلے جب یہ آیت (کُفُّوْا اَیْدِیَکُمْ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ) اسی سورۂ نساء میں زیر درس آئی تھی تو میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ نماز اور زکوٰۃ اگر صحیح طور پر ادا کی جائیں تو روح اور نفس پر ان کا کیا اثر پڑتا ہے۔ یہ بات مسلّمات اور مجربات میں سے ہے کہ نفس کے تزکیہ اور روح کی تربیت اور اخلاص وللّٰہیت پیدا ہونے کا سب سے بڑا ذریعہ یہی دو عمل ہیں۔ بشرطیکہ صرف ان کی صورت نہ ہو بلکہ حقیقت ہو، اسی لیے تمام آسمانی شریعتوں میں نماز اور زکوٰۃ کا حکم رہا ہے۔

بہر حال میں کہنا چاہتا تھا کہ ہجرت کے بعد بھی کچھ دنوں تک مسلمانوں کو یہی تاکید کی جاتی رہی کہ اپنی حفاظت اور مدافعت کے لیے بھی طاقت کا استعمال نہ کرو۔

کچھ عرصہ کے بعد وہ وقت آگیا کہ ظالموں کے مقابلہ کے لیے اور شرارت اور گمراہی کی قوتوں کو راستہ سے ہٹانے کے لیے طاقت کا استعمال کرنے کی اجازت مسلمانوں کو دیدی گئی اور جہاد و قتال کا حکم آگیا، اس وقت بعض ایسے مسلمانوں نے جن میں کچھ کمزوری تھی اس خیال اور آرزو کا اظہار کیا کہ ابھی کچھ دنوں اور یہ حکم نہ آیا ہوتا تو شاید بہتر اور قرین مصلحت ہوتا، تو قرآن پاک میں ان کو سخت سرزنش کی گئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا کہ آپ ان کی بالکل پرواہ نہ کیجئے اور اپنے اللہ پر بھروسہ کیجئے۔ (فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ)

اس کے بعد آپ کو مخاطب فرما کر ارشاد فرمایا گیا۔

فَقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ	(اے پیغمبر! کوئی تمہارا ساتھ دے
لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَ	یا نہ دے) تم بذات خود راہ خدا میں
حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَسَى اللّٰہُ	جہاد کرنے کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔)

اَنْ یَّکُفَّ بَاْسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ؕ وَاللّٰہُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّ اَشَدُّ تَنْکِیْلًا ۝

(النساء - ۸۴)

تم پر صرف اپنی ذات کی ذمہ داری ہے اور ایمان والوں کو جہاد فی سبیل اللہ کی دعوت و ترغیب دو۔ توقع ہے کہ اللہ اپنی خاص مدد سے (تمہارے اور تمہارے ساتھ دینے والے اہل ایمان کے ذریعہ) کافروں کے دباؤ اور ان کے جنگی اقدامات کو روک دے اور اللہ بڑے زور والا اور دشمنان حق کو سخت عبرتناک سزا دینے والا ہے۔

آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس وقت کے مؤمنین صادقین کے دلوں میں اس آیت نے جہاد کا کیسا بے پناہ جوش بھر دیا ہوگا۔

اس آیت کے بعد آٹھ دس آیتوں میں بعض ان مسائل کے بارے میں ہدایات دی گئی ہیں جو جہاد کے سلسلے میں پیدا ہو سکتے تھے یا ان کا جہاد سے قریب یا دور کا تعلق تھا۔ ان ہی میں سے ایک مسئلہ یہ تھا کہ جہاد کے اقدامات میں اس کا بھی امکان تھا کہ دشمنوں کی کسی بستی پر حملہ کیا جائے اور وہاں کے کچھ لوگ یا ایک ہی آدمی دعوت اسلامی کو قبول کر چکا ہو اور خدانخواستہ وہ بھی حملہ کی زد میں آجائے یا وہ مسلمانوں کے طریقہ پر سلام کرکے یا کلمہ توحید پڑھ کر اپنا مسلمان ہونا ظاہر کرے۔ اور اس وقت جہاد کے جوش میں اس پر اعتبار نہ کیا جائے۔ اور دشمن قرار دے کر اس کو بھی نشانہ بنا دیا جائے۔

آج جو آیتیں میں نے تلاوت کی ہیں، ان میں سے پہلی آیت (یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَتَبَیَّنُوْا) کا تعلق اسی مسئلے سے ہے کہ اہل مجاہدین کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ جب تم راہ خدا میں جہاد کے لیے نکلو اور دشمنوں کی کسی بستی یا علاقہ پر حملہ کا منصوبہ بناؤ تو امکانی حد تک اس کی پوری تحقیق کر لو کہ وہاں ایسا کوئی آدمی تو نہیں ہے جس نے دعوت اسلامی کو قبول کر لیا ہو اور اگر کوئی شخص سلام کے ذریعہ یا کلمہ پڑھ کے یا کسی اور طریقہ پر اپنا اسلام اور اللہ و رسول کے ساتھ اپنی

وفاداری ظاہر کرے تو تمہیں حق نہیں ہے کہ تم اس کو منافق اور تقیہ باز قرار دے کر اس کے ساتھ دشمنوں والا معاملہ کرو ــــــ اس ہدایت کے ساتھ فرمایا گیا ہے "تَبْتَغُونَ عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا" یعنی ایسی حالت میں اس کو دشمن قرار دے کر اس پر حملہ کر دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ تم دراصل اس کے مال و اسباب کے طالب ہو اور اس کو "غنیمت" قرار دے کر ہتھیا لینا چاہتے ہو۔ اس کے آگے فرمایا گیا ہے "فَعِنْدَ اللهِ مَغَانِمُ كَثِيرَةٌ" یعنی اللہ کے پاس غنیمت کے بڑے ذخیرے ہیں، تم اُن کے طالب بنو، اس کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے "كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوا"۔ مطلب یہ ہے کہ تم یاد کرو کبھی تم بھی ایسے ہی تھے، یعنی کافروں کے بیچ میں اور کافروں کی بستیوں میں رہا کرتے تھے۔ اس وقت اگر تم کو بھی کافروں اور دشمنوں میں سے سمجھ کر تمہارے ساتھ یہی معاملہ کیا جاتا تو تم پر کیا گزرتی اور تم اس کو کیا سمجھتے۔ اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان فرمایا تمہیں اس حالت سے نکال لیا، اس لیے اب تمہارا طریقہ کار یہ ہونا چاہیے کہ ایسے موقعوں پر پوری تحقیق سے کام لیا کرو، اللہ تعالیٰ ظاہر و باطن سب جانتا ہے۔ تم جو کچھ کرو گے اور جس نیت سے کرو گے وہ اس سے مخفی نہیں۔ وہ اسی کے مطابق تم کو جزا یا سزا دے گا۔ (إِنَّ اللهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا)

اس آیت میں "تَبْتَغُونَ عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا" کا یہ جملہ بڑی معنویت رکھتا ہے اس میں صحابہ کرام کو بڑے ہی بلیغ اور موثر پیرایہ میں تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ ایسے موقع پر اسلام اور اللہ و رسول سے وفاداری کا اظہار کرنے والے شخص کی بات پر اعتبار نہ کرنے اور سہل انگاری اور بے احتیاطی سے اس کو دشمن قرار دے کر نشانہ بنا دینے کا منشا یہی ہوگا کہ تمہاری نگاہ اللہ کی رضا پر نہیں بلکہ اس بے چارے کے مال و اسباب پر ہے اور یہ بات جتنی دنی، جتنی گھٹیا اور شانِ ایمان سے جتنی دور ہے ظاہر ہے ــــــ میرا خیال ہے کہ اس آیت نے صحابہ کرام کی روحوں پر یہ لرزہ طاری کر دیا ہوگا۔

احادیث و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض جنگی اقدامات میں اس طرح کے واقعات پیش آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن پر اپنی انتہائی ناراضی بلکہ غضب اور جلال کا اظہار فرمایا اور بعض موقعوں پر تو اس سلسلہ میں غلطی کرنے والوں کے

لیے دعائے مغفرت کرنے سے بھی انکار فرما دیا۔

صحیح بخاری اور جامع ترمذی وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ بیان مروی ہے کہ قبیلۂ بنو سُلیم کا ایک آدمی صحابہ کرام کے ایک عسکری دستہ کی زد پر آگیا (جبکہ یہ پورا قبیلہ دشمن تھا، اس آدمی نے اپنا اسلام ظاہر کرنے کے لیے مسلمانوں کے طریقہ پر سلام کیا، انھوں نے سمجھا کہ یہ ہمیں دھوکہ دینے کے لیے اور جان بچانے کے لیے ایسا کر رہا ہے) چنانچہ اس کو بھی نشانہ بنا کے ختم کر دیا اور اس کے سامان اور اس کی بکریوں کو مالِ غنیمت قرار دے کر اس پر قبضہ کر لیا اور لے آئے ـــــــ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ سورۂ نساء کی یہ آیت "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَىٰ إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا الخ" اسی واقعہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی تھی۔

اور صحیح مسلم میں ایک واقعہ مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دستہ کسی دشمن قوم کے مقابلہ کے لیے بھیجا، جس میں حضرت اسامہ بھی تھے۔ جب جنگ برپا ہو گئی تو دشمن کی طرف سے لڑنے والوں میں ایک آدمی تھا جو بلا کا لڑنے والا تھا وہ جس مسلمان کی طرف رُخ کرتا اس کو ختم کر دیتا، اِس طرح اس کے ہاتھ سے یکے بعد دیگرے کئی مسلمان شہید ہو گئے، حضرت اسامہ بن زید نے اس کو تاکا اور تلوار لے کے ساتھ اُس پر جھپٹے، جیسے ہی وہ حضرت اسامہ کی زد میں آیا اُس نے کہا لا الٰہ الا اللہ لیکن اسامہ نے ہاتھ نہیں روکا اور یہ سمجھ کر کہ یہ جان بچانے کے لیے منافقانہ طور پر کلمہ پڑھ رہا ہے، وار کر دیا اور وہ ختم ہو گیا ـــــــ واپسی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی بھی اطلاع دی گئی ـــــــ آپ نے عتاب کے انداز میں حضرت اسامہ سے پوچھا کہ جب وہ کلمہ پڑھ چکا تھا تو تم نے اس کو کیوں قتل کیا؟ انھوں نے عرض کیا کہ حضرت اس نے ہمارے فلاں فلاں ساتھیوں کو شہید کر دیا اور جب اس نے میری تلوار اپنے سر پر دیکھی تو اس وقت اُس نے کلمہ پڑھا ـــــــ آپ نے فرمایا "كَيْفَ تَصْنَعُ بِلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ إِذَا جَاءَتْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ" کہ قیامت کے دن جب اس کا کلمہ لا الٰہ الا اللہ فریادی بن کر آئے گا تو تم کیا کرو گے اور کیا جواب دو گے؟ حضرت اسامہ نے عرض

کیا۔ "یا رسولَ اللہ اِستَغفِرلِی" (حضرت میرے لیے دعا کر دیجئے کہ اللہ تعالیٰ میرا گناہ معاف فرما دے اور بخش دے) اس کے جواب میں آپ نے یہی فرمایا کہ "کیف تصنع بلا الٰہ الا اللہ اِذا جاءت یوم القیٰمۃ" (تم یہ بتاؤ کہ قیامت کے دن اُس کے لا الٰہ الا اللہ کا تم کیا جواب دوگے؟) راوی کا بیان ہے کہ آپ بار بار یہی فرماتے تھے کہ "کَیفَ تَصنَعُ بِلَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ اِذَا جَاءَت یَومَ القِیٰمَۃ"۔

اور امام ابن جریر طبری نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر سے ایک اور واقعہ عہد نبوی کا نقل کیا ہے، وہ تو بہت ہی لرزا دینے والا ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاحب مُحَلِّم بن جُثامہ کی سرکردگی میں کسی دشمن قبیلہ یا علاقہ کی طرف ایک دستہ بھیجا، ایک شخص عامر بن اضبط (جو غالباً کسی دشمن قبیلہ سے تعلق رکھتا ہوگا) وہ سامنے آگیا اور اُس نے اسلامی طریقہ پر سلام کیا (اور اس طرح اپنا مسلمان ہونا ظاہر کیا) اور مُحَلِّم اور عامر ابن اضبط کے درمیان کبھی پہلے یعنی اسلامی دور سے پہلے زمانہ جاہلیت میں عداوت اور رنجش رہی تھی، مُحَلِّم نے (غالباً اس پرانی رنجش کی وجہ سے بھی) اُس کے اظہارِ اسلام کی پروا نہیں کی اور اُس کو اپنے تیر کا نشانہ بنا دیا اور وہ خاک و خون میں تڑپ کر ختم ہوگیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپ کو بیحد دُکھ ہوا، آپ نے مُحَلِّم کو طلب فرما کر سخت عتاب فرمایا، انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میرے لیے مغفرت اور معافی کی دُعا فرما دیجئے ــــــ آپ نے انتہائی جلال کے انداز میں فرمایا۔

لَا غَفَرَ اللہُ لَکَ اللہ تجھے معاف نہ کرے۔

وہ روتے ہوئے کھڑے ہوگئے اور تھوڑی ہی دیر کے بعد دمیں ان کا انتقال ہوگیا ــــــ آگے حضرت ابن عمر کی اسی روایت میں ہے کہ ــــ ان کو قاعدہ کے مطابق دفن کر دیا گیا، لیکن زمین نے ان کی لاش کو باہر پھینک دیا ــــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ حضرت ایسا واقعہ ہوا ہے، کیا کیا جائے؟ ــــــ آپ نے فرمایا کہ یہ بات نہیں کہ یہ مُحَلِّم دنیا میں سب سے برا آدمی اور سب سے بڑا گنہگار تھا اس لیے زمین نے اس کو قبول نہیں کیا، زمین تو اس سے بہت زیادہ بروں، بڑے سے بڑے ظالموں

اور کافروں اور مشرکوں تک کو قبول کرلیتی ہے محلّم کے ساتھ ہی یہ واقعہ صرف اس لیے ہوا ہے کہ
تم لوگ اس سے سبق لو۔ اس کے بعد محلّم کی لاش کو دو پہاڑیوں کے درمیان رکھ کر اس پر پتھر
رکھ دیے گئے۔

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا امام ابن جریر طبری نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر سے
اس واقعہ کی روایت کی ہے۔

ان احادیث و روایات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں کلمہ کا اور
اللہ کے نام کا اور اظہارِ اسلام کا کتنا احترام ہے اور جو شخص محض بدگمانی یا کسی بُرے جذبہ کی وجہ
سے بلا دلیل ایسے شخص کو مسلمان نہ مانے اور اس کے ساتھ کافروں والا معاملہ کرے وہ اللہ
کی نظر میں کتنا بڑا مجرم ہے۔

یہ بات بھی بالکل کھلی ہوئی ہے کہ خصوصاً جنگ کے موقع پر اس اصول پر عمل کرنا یعنی
دشمنوں میں سے بھی جو اپنا مسلمان ہونا ظاہر کردے اس کو مسلمان مان لینا اور اپنا بھائی بنا لینا
کتنا خطرناک ہو سکتا ہے اور اس سے کتنے بڑے بڑے نقصانات پہنچ سکتے ہیں۔ اور دشمن کے
جاسوسوں کے لیے ہماری صفوں میں آجانا کتنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود سورۂ نساء کی
اس آیت اور اس کی تفسیر و تشریح کرنے والی ان احادیث و روایات کا مطالبہ مسلمانوں سے یہی ہے
کہ ان خطرات کے باوجود وہ اسی پالیسی کو اپنائیں۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اسلام کا بنیادی
نصب العین جہاد و قتال میں بھی بس یہ ہے کہ آدمیوں کو اللہ کا [illegible] اور اپنا بھائی بنایا جائے اور یہ مقصد
ہر دوسری مصلحت پر مقدم رہے۔

اس آیت ۹۴ میں جہاد کے موقع پر جس سخت احتیاط کا حکم دیا گیا ہے اور پھر اس بارہ
میں غلطی کرنے والوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو انتہائی سخت رویہ اختیار
فرمایا اس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ خاص قسم کی طبیعت اور خاص مزاج کے کچھ لوگ جہاد نہ کرنے
اور اپنے گھروں اور گوشوں میں بیٹھے رہنے ہی میں خیریت سمجھیں" اور اسی کو احتیاط و تقویٰ اور
خدا ترسی کا ایک تقاضا سمجھ کر "تقاعد اور گوشہ نشینی" کا رویہ اختیار کرلیں، فارسی کا مشہور مصرعہ ہے۔

"کنجے گرفت و ترس خدا را بہانہ ساخت"

اس لیے اس آیت کے بعد متصلاً جہاد اور مجاہدین کی خاص افضلیت بیان فرمائی گئی اور بتایا گیا کہ جو اہل ایمان اپنے جان و مال سے راہ خدا میں جہاد کریں ان کا درجہ اللہ کی نگاہ میں ان لوگوں کے مقابلہ میں بہت بلند ہے جو بغیر کسی عذر اور مجبوری کے جہاد میں حصہ نہ لیں اور گھر میں بیٹھ کر طاعات و عبادات کرتے رہیں۔

بخاری شریف میں یہ حدیث روایت کی گئی ہے کہ کسی شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا "یارسول اللہ! ایُّ النَّاسِ افضل؟" (حضرت! آدمیوں میں درجہ کے لحاظ سے کون لوگ سب سے افضل ہیں؟) آپ نے ارشاد فرمایا "مُؤمِنٌ یُجَاھِدُ فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ بِنَفْسِہٖ وَمَالِہٖ" (وہ ایمان والے بندے سب سے افضل ہیں جو اپنے جان و مال کے ساتھ راہ خدا میں جہاد کریں) پھر آپ سے دریافت کیا گیا "ثُمَّ مَنْ؟" (ان کے بعد کن لوگوں کا درجہ ہے؟) آپ نے فرمایا "مُؤمِنٌ فِی شِعْبٍ مِنَ الشِّعَابِ یَتَّقِی اللّٰہَ وَیَدَعُ النَّاسَ مِنْ شَرِّہٖ" (وہ ایمان والے جو معاشرہ کی برائیوں، گندگیوں اور گناہوں سے محفوظ رہنے کے لیے سب سے الگ تھلگ کسی گھاٹی میں قیام کریں، وہاں تقوے والی زندگی گزاریں اور کسی بندے کو ان سے کوئی تکلیف و ایذا نہ پہونچے۔) یہ حدیث گویا اسی آیت ۹۵ کی تفسیر ہے۔

اس آیت میں ایک بات یہ بھی فرمائی گئی ہے "وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنٰی" یعنی جو اہل ایمان جہاد میں حصہ لیں اور جو جہاد میں حصہ نہ لیں اور گھر ہی پر اللہ و رسول کے حکم کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔ اگرچہ اُن کے درجات میں بہت بڑا فرق ہے لیکن جنت اور جنت کی نعمتوں سے محروم ان میں سے کوئی بھی نہیں رہے گا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دونوں ہی طبقوں کے لیے جنت کا وعدہ ہے ــــــ اس بارے میں بھی صحیح بخاری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صریح حدیث مروی ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ ــــــ "جو کوئی اللہ و رسول پر ایمان لائے یعنی دعوتِ اسلام کو قبول کرے اور نماز روزہ وغیرہ احکام کی پابندی کرے تو خواہ وہ جہاد میں حصہ لے یا نہ لے اللہ تعالیٰ ایمان اور عمل صالح کے صلہ میں اس کو جنت ضرور نصیب فرمائے گا" ــــــ آگے اسی حدیث میں ہے کہ بعض

صحابہ نے اس پر عرض کیا کہ حضرت! جب معاملہ اتنا آسان اور ارزاں ہے تو ہم اس کا عام اعلان کیوں نہ کر دیں؟ — آپ نے ارشاد فرمایا کہ جنت ایک ہی درجہ اور ایک ہی قسم کی نہیں ہے اس کے سینکڑوں درجے ہیں۔ اور جو اہل ایمان جہاد میں بھی حصہ لیں گے وہی اس کے اعلیٰ درجات حاصل کر سکیں گے یعنی اعلیٰ درجہ کی جنت جو مجاہدین فی سبیل اللہ کے لیے تیار کی گئی ہے وہ جہاد کرنے والوں ہی کو مل سکے گی۔

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ عام حالات میں جہاد نماز وغیرہ کی طرح فرض عین نہیں ہے کہ اس کا ترک گناہ اور فسق ہو بلکہ وہ فرض کفایہ ہے اور سورۂ نساء کی اس آیت میں اسی کا یہ حکم بیان کیا گیا ہے لیکن کبھی ہنگامی اور غیر معمولی حالات ایسے بھی ہو سکتے ہیں کہ جہاد ہر اس مسلمان پر جو جہاد کے قابل ہو نماز کی طرح فرض ہو جاتا ہے جس کو نفیر عام کہتے ہیں اس صورت میں جہاد کے لیے نہ نکلنا سخت ترین گناہ ہے اور ایسے لوگوں کے لیے "کُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى" کی بشارت ہرگز نہیں ہے۔

اس آیت میں "غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ" کا جو لفظ آیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگر کوئی بندہ بیماری یا کسی دوسری قسم کی معذوری اور مجبوری کی وجہ سے جہاد میں حصہ نہ لے سکے، مگر اس کی نیت اور آرزو ہو تو وہ جنت میں مجاہدین والے درجے بھی پائے گا۔ بخاری شریف میں حضرت انس کی حدیث ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لشکر اسلام کے ساتھ غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لا رہے تھے تو راستہ میں آپ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ مدینہ میں تمہارے کچھ ایسے بھائی ہیں جو اس جہادی مہم میں کسی مجبوری کی وجہ سے ہمارے ساتھ نہیں جا سکے تھے، لیکن اللہ کی نگاہ میں وہ ہمارے ساتھ ہی رہے۔ ہم جس وادی یا گھاٹی سے گزرے یا جس منزل پر ہم اترے وہ ہمارے ساتھ رہے۔ اور اللہ تعالیٰ ان کو بھی اجر و ثواب دے گا تو اس مہم میں ساتھ جانے والے تم لوگوں کو عطا فرمائے گا۔ یہ غالباً آپ نے اس لیے فرمایا کہ ساتھ والے مجاہدین میں احساس برتری نہ پیدا ہو اور معذوری کی وجہ سے مدینہ میں رہ جانے والوں کو وہ اپنے مقابلہ میں کمتر نہ سمجھیں۔ واللہ اعلم۔

درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا ہی کریمانہ قانون ہے کہ کوئی بندہ کسی بڑے سے بڑے

عمل کی آرزو رکھے اور مجبوری اور بے بسی کی وجہ سے اسے نہ کر سکے تو اللہ تعالیٰ صرف اس کی نیت اور صادق آرزو کی وجہ سے اس کو وہی اجر عطا فرماتا ہے جو عمل کرنے والوں کو ملتا ہے۔ یہ ایسا کیمیا کا نسخہ ہے کہ ہم اور آپ جہاد اور حج جیسے اعلیٰ سے اعلیٰ اعمال کا ثواب ان کی نیت اور سچی آرزو رکھ کر حاصل کر سکتے ہیں۔ انشاء اللہ آخرت میں ہم اور آپ دیکھیں گے کہ اللہ کے لاکھوں بندے جنھوں نے حج نہیں کیا اور جہاد فی سبیل اللہ اور شہادت کا جنھیں موقع نہیں ملا مگر وہ حج اور جہاد و شہادت کی صادق آرزو اور سچی نیت رکھتے تھے وہ جنت میں حجاج اور مجاہدین و شہدار کے ساتھ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قانونِ کرم سے فائدہ نہ اٹھانا بڑی محرومی ہے۔ ہاں صادق نیت شرط ہے۔

جہاد اور مجاہدین کی فضیلت سے متعلق ان آیتوں کے بعد پورا ایک رکوع ہجرت کے بارہ میں ہے۔ جو "اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ" سے شروع ہو کر وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ پر ختم ہوا ہے۔

——— (باقی)

موجودہ قیمت 3/75

Regd. No. L-353

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow

VOL. 36 NO. 4 JULY 1968

[جمادی الاول ۱۳۸۸ھ]

AUGUST 1968

مرتب

عتیق الرحمن سنبھلی

ماہنامہ
الفرقان
لکھنؤ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۵۰/۷
پاکستان سے ۵۰/۷
ششماہی
ہندوستان سے ...... -/۴
پاکستان سے ...... -/۴

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک سے
مزید محصول ڈاک کا
اضافہ

فی کاپی ۷۰ پیسے

جلد ۳۶	بابتہ ماہ جمادی الاول ۱۳۸۸ھ مطابق اگست ۱۹۶۸ء	شمارہ ۵

اگر اس دائرہ میں ◌ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں۔ یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ اگست تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار: اپنا چندہ ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دیدیں۔ نئے خریدار بھی اسی طریقہ سے چندہ ارسال فرمائیں۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں ان کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

محمد منظور نعمانی

ظلم کی بہت سی قسمیں اور بہت سی شکلیں ہیں، لیکن سب سے بڑا ظلم اس دُنیا میں غالباً وہ ہے جو اولیاء کرام حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ، محبوب سبحانی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء دہلویؒ اور حضرت خواجہ علاء الدین صابر کلیری جیسے بزرگانِ دین کی رُوحوں پر ان کے عرسوں کے نام سے ہوتا ہے۔

پچھلے مہینہ ربیع الاول کے وسط میں یہ عاجز شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا دامت فیوضہم و برکاتہم کی خدمت میں حاضری و زیارت اور ان ہی کے یہاں کی ایک مبارک تقریب میں شرکت کی نیت سے لکھنؤ سے سہارن پور کے لیے ۱۱رجون کی شام کو دہرہ دون ایکسپریس سے روانہ ہوا ــــــ راستہ میں بعض مسافروں کی باتوں سے معلوم ہوگیا تھا کہ آج پیران کلیر شریف کے عرس کا آخری دن ہے۔ یہ لوگ خود وہیں جارہے تھے، ۱۲رجون کی صبح کو جب ٹرین رڑکی پہونچی جو پیرانِ کلیر کا اسٹیشن ہے، تو جس طرح ہمارے ملک میں بڑے میلوں کے موقعوں پر ریلوے پلیٹ فارموں پر بھیڑ ہوتی ہے، اسی طرح کی بے پناہ بھیڑ تھی۔ لوگ ٹرین میں اس طرح گھسے کہ مجھے اپنی سیٹ چھوڑکر اوپر کی برتھ پر پناہ لینی پڑی ــــــ لیکن اس سے بڑی آزمائش ان لوگوں کی وہ باتیں تھیں جو سہارن پور پہونچنے تک قریباً ایک گھنٹہ مسلسل سُننی پڑیں، موضوع صرف ایک تھا، یعنی "عرس شریف" کو زینت اور رونق بخشنے والی بمبئی اور جے پور اور خدا جانے کہاں کہاں کی طوائفوں اور ان کی جسمانی اور صوتی خصوصیات اور ان پر نوٹوں کی بارش کا تذکرہ، خدا ہی

جانتا ہے کہ یہ پورا گھنٹہ کیسی اذیت میں گزرا اور روح پر کیا گزر گئی ــــ

اس وقت اندازہ ہوا کہ جب مجھ جیسے گنہگار انسان کو ان باتوں کے صرف سننے سے اتنی روحانی اذیت ہو رہی ہے تو اللہ کے اُس مقبول بندہ کی روح پر کیا گزرتی ہوگی جس کے نام پر اور خاص جس کے مزار پر بدترین فسق و فجور کے یہ تماشے ہر سال ہوتے ہیں ــــ حضرت خواجہ علاء الدین صابر کلیری قدس اللہ سرہٗ اگر اللہ کے متقی بندے، سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے پیرو اور اولیاء اُمت میں سے تھے (اور ہمارے نزدیک بلاشبہ ایسے ہی تھے) تو یقیناً ان کی مظلوم روح خاص کر عرس کے ان دنوں میں اس ظلم وستم کے خلاف دربارِ خداوندی میں بڑی پر درد فریاد کرتی ہوگی ــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض حدیثوں میں تبلایا گیا ہے کہ ایسی مظلومانہ فریادوں پر اللہ کا غضب و جلال حرکت میں آجاتا ہے اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا ــــ

کیا عجب کہ دُنیا کے مسلمان خاص کر ہم ہندوستانی مسلمان جن آلام و مصائب میں گرفتار اور نصرتِ خداوندی سے محروم ہیں، اس کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہو ــــ سُنا ہے کہ جب نادر شاہ کا لشکر عذاب بن کر دلی پر نازل ہوا اور اس کے ہاتھوں ظلم وستم کے پہاڑ ٹوٹے تو اس دور کے عارفِ کامل حضرت مرزا مظہر جان جاں رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا ــــ "شامتِ اعمالِ ما صورتِ نادر گرفت"

ایک حدیثِ قدسی میں بھی اُمت پر آنے والے آلام و مصائب ہی کے بارے میں فرمایا گیا ہے "اِنَّمَا هِيَ اَعْمَالُكُمْ اُحْصِيْهَا لَكُمْ"

دوسرا رُخ :-

اوپر میں نے عرض کیا ہے کہ سہارن پور کے لیے میرا یہ سفر شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا مدظلہ کی زیارت اور انہی کے یہاں کی ایک مبارک تقریب میں شرکت کی نیت سے ہوا تھا، یہ تقریب نکاح، شادی، ولیمہ یا عقیقہ کے قسم کی کوئی تقریب نہیں تھی ــــ اس تقریب

کی حقیقت اور خاص نوعیت بتلانے کے لیے مجھے یہ ظاہر کرنا ضروری ہے کہ حضرتِ ممدوح کو اللہ تعالیٰ نے جن عظیم نعمتوں سے نوازا ہے، ان میں سے ایک بڑی نعمت اس عاجز کے نزدیک یہ ہے کہ محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے آپ کی احادیث پاک کے ساتھ ممدوح کو خاص شغف بلکہ عشق ہے، ان کے اس شغف و عشق کی مقبولیت ہی کا غالباً یہ نتیجہ ہے کہ ان کی ذات کے لیے "شیخ الحدیث" کا لقب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مخلوق میں ان کے نام سے زیادہ مشہور ہو گیا ہے اور یہ عاجز تو ان کی اسی خصوصیت کی وجہ سے ان کو شیخ الحدیث کہتا اور لکھتا ہے۔

ممدوح نے بالکل نوعمری میں جب ایک طالب علم کی حیثیت سے مشکوٰۃ شریف شروع کی تھی تو اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تھی کہ اب ساری عمر حدیث پاک سے تعلق نہ چھوٹے اور وہی میرا خاص مشغلہ رہے، چنانچہ رسمی طالب علمی کا سلسلہ جب تک جاری رہا۔ طالب علمانہ انداز میں علم حدیث اور کتب حدیث کے ساتھ اشتغال اور انہماک نصیب رہا، اس کے بعد سے اب تک مطالعہ، تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کی شکلوں میں حدیث پاک میں مشغولیت اور اس کی خدمت ہی ذکر و عبادت کے بعد زندگی کا وظیفہ اور روح کی غذا بنی ہوئی ہے۔

حدیث نبوی کی تصنیفی خدمت کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے جو خاص کام لیے وہ "شمائل ترمذی" کی شرح "خصائل نبوی" اور مؤطا امام مالک کی مبسوط شرح "اوجز المسالک" اور "الکوکب الدری علی جامع الترمذی" کی شکل میں اہل علم کے سامنے اب سے بہت پہلے آچکے ہیں، اس مقبول و مبارک سلسلہ کی آخری کڑی "لامع الدراری علی جامع البخاری" کی تالیف ہے جو اللہ تعالیٰ کی عنایت و توفیق سے اب اختتام کو پہونچی ہے، حضرت شیخ الحدیث کے ہاں جس تقریب میں شرکت کے لیے میں نے یہ سفر کیا تھا، اس کا تعلق اسی کتاب کی تکمیل سے تھا ـــــ اس کے بارے میں ناظرین کو یہاں اتنا بتانا ضروری ہے کہ حضرت شیخ الحدیث کے والد ماجد حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے (جو بعد میں حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کے مجاز، خادم خاص اور معتمد رفیق ہوئے) اب سے ٹھیک ۷۵ سال پہلے ۱۳۱۲ھ ہجری میں قطب الارشاد حضرت گنگوہی قدس سرہ کے درس بخاری میں شرکت کی تھی اور حضرت کے خاص درسی افادات کو عربی میں قلمبند کر کے محفوظ کر لیا تھا، حضرت شیخ الحدیث نے

اس کو اصل و بنیاد بنا کر بخاری شریف کی گویا ایک مستقل شرح اب سے قریباً ۱۲ سال پہلے لکھنی شروع فرمائی تھی "لامع الدراری علیٰ جامع البخاری" اسی کا نام ہے، اس کی پہلی دو ضخیم جلدیں (اول و ثانی) چھپ کر حدیث کے اساتذہ و طلبہ کے ہاتھوں میں اب سے کئی برس پہلے پہونچ چکی تھیں تیسری جلد جس پر کتاب ختم ہونی تھی زیر تصنیف تھی اور حضرت ممدوح کو بعض خاص بشرات کی بنا پر اس کی تکمیل و اتمام کا غیر معمولی اہتمام تھا۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت و توفیق سے گزشتہ مہینے ربیع الاول کے پہلے یا دوسرے جمعہ کو حضرت نے اس کے خاتمہ کی آخری سطریں لکھ کر حدیث کی تصنیفی خدمت کے سلسلہ کے بظاہر اپنے آخری کام کی تکمیل فرمائی اور اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت کا اتمام ہوا فللّٰہ الحمد والمنۃ ــــــ حضرت شیخ کو قدرتی طور پر اس کے اختتام اور اس نعمت عظمیٰ کے اتمام سے بڑی روحانی مسرت اور شادمانی ہوئی۔

صحیح بخاری کی شرحوں میں سب سے زیادہ معروف و مقبول شرح آٹھویں اور نویں صدی ہجری کے حافظ حدیث ابن حجر عسقلانی کی "فتح الباری" ہے جو انھوں نے پچیس ۲۵ سال کی مدت میں تیرہ ۱۳ جلدوں میں لکھی تھی ــــ رجب ۸۴۲ھ میں جب وہ اس کی تصنیف سے فارغ ہوئے تو انھوں نے اس کی خوشی میں بہت بڑے پیمانہ پر دعوتِ ولیمہ کی، اس دعوت کی نوعیت اور وسعت کا کچھ اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اُن کے بعض شاگردوں کے بیان کے مطابق اُس زمانہ میں اس پر پانچسو اشرفیاں صرف ہوئی تھیں جن کی مالیت اور قوتِ خرید آج کے ایک لاکھ روپے سے کم نہ ہوگی ــــ پھر ہماری اسی صدی کے اور ہمارے ہی ملک کے ایک محدث اور حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے خاص استاد و مرشد حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری مہاجر مدنی نے جب سنن ابو داؤد کی شرح "بذل المجہود" مدینہ طیبہ میں ۱۳۴۵ھ میں مکمل فرمائی تو اس کی خوشی میں مدینہ منورہ کے تمام علماء و صلحا اور اکابر و اعیان کی دعوت کی اور یہ گویا "بذل المجہود" کا ولیمہ تھا ــــ حضرت شیخ الحدیث مدظلہ نے بھی اپنے ان اسلاف کرام کے اتباع میں "لامع الدراری علیٰ جامع البخاری" کی تکمیل کی خوشی میں ایک دعوت کا اہتمام فرمایا، جیسا کہ اوپر عرض کیا، یہی وہ تقریب تھی جس کی شرکت کے لیے اس عاجز نے سہارنپور کا یہ سفر کیا تھا۔

یوں تو حضرت ممدوح کے دسترخوان پر روزانہ ہی اچھی خاصی وسیع دعوت کا سماں رہتا ہے اور کم دن ایسے ہوتے ہوں گے کہ مہمانوں کی تعداد چالیس پچاس سے کم ہو اور رمضان مبارک میں تو یہ تعداد کئی کئی سو تک پہونچ جاتی ہے۔ لیکن "لامع الدراری" کی اس دعوتِ ولیمہ میں جیسا کہ حضرت کے بعض خاص خدام سے معلوم ہوا مدعو تو بہت زیادہ لوگوں کو نہیں کیا گیا تھا مگر ہوا یہ کہ دو دو سو اور تین تین سو میل تک سے بھی جن خدام و محبین کو کسی طرح پتہ لگ گیا وہ اگر پہونچ سکتے تھے تو اس یقین و اعتماد کی بنا پر کہ حضرت کو ہمارے پہونچ جانے سے خوشی ہوگی، آپ سے آپ پہونچ گئے اور بہت سے تو ایک دو دن پہلے سے وارد ہو گئے خود یہ عاجز ۳ دن پہلے ۱۲ ارجون ہی کی صبح کو پہونچ گیا تھا۔ ___ اپنے بندوں کے باطن کا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے لیکن بظاہر یہ سارا مجمع جو ۱۴ ارجون بروز جمعہ اس مبارک و مسعود تقریب میں شرکت کے لیے سہارنپور میں جمع ہوا تھا علماء و صلحاء، ذاکرین و عابدین اور اہلِ دین کا مجمع تھا۔

حضرت کے خدام سے معافی مانگتے ہوئے عرض ہے کہ یہ بھی دراصل ایک بزرگ کا "عرس" ہی تھا ___ عرس عربی زبان کا لفظ ہے اس کے معنی شادی ہی کے ہیں، عُرُوس دُلہن کے معنی میں اردو میں بھی مستعمل ہے، اولیاء اللہ کے یوم وفات کا نام یَومُ العُرس کبھی اسی مناسبت سے رکھا گیا تھا کہ ان کا یوم وفات دراصل وصالِ محبوب کا دن اور ان کی مشتاق و بیتاب روح کے لیے سب سے زیادہ خوشی و شادمانی کا دن ہوتا ہے۔

یہ تو دراصل تمہید تھی جو ناگزیر طور پر طویل ہو گئی۔ ورنہ عرض یہ کرنا تھا کہ سہارنپور کے اس سفر میں ایک عرس والا مجمع اور اس کے کچھ مناظر اور مظاہر تو رڑکی کے اسٹیشن پر سر کی آنکھوں سے دیکھے اور کچھ کانوں سے سُن کر دل کی اور تصور کی آنکھوں سے مشاہدہ میں آئے۔ اور ایک دوسرے "عرس" والا مجمع اور منظر سہارنپور پہونچ کر ۱۴ ارجون یوم جمعہ کو شیخ الحدیث کے ہاں دیکھا بلکہ اس میں شرکت کی سعادت بھی حاصل کی ___ اکثر ناظرین کو معلوم ہوگا کہ پیران کلیر شریف سہارنپور ہی ضلع میں ہے۔ اور شہر سہارنپور سے قریب ہی ہے۔ اور حضرت شیخ الحدیث مدظلہ ہمارے اس دور میں سلسلہ چشتیہ صابریہ امدادیہ ہی کے شیخ اور نمائندے ہیں اور اسی سلسلہ کی امانت کے امین و وارث ہیں ___

اس سلسلہ کے مؤسس حضرت خواجہ علاء الدین صابر کلیری قدس سرہٗ جب ہماری اس دنیا میں رونق افروز تھے تو یقیناً ان کی خانقاہ طالبینِ حق، اتقیاء و صلحاء اور ذاکرین و عابدین کا مرکز و مرجع تھی، اور خالص توحید اور تزکیۂ نفس اور تقویٰ اور اتباعِ شریعت وہاں کا درس اور پیغام تھا۔ لیکن آج ان کے مزار و مرقد پر انہی کی عقیدت و محبت کے نام پر وہ سب کچھ ہو رہا ہے جو شیطان چاہتا ہے اور جس پر یقیناً خدا کی، اس کے نبیوں اور فرشتوں کی اور اولیاء اللہ کی پاک روحوں کی لعنت ہے ——— للّٰہ سوچنے والے سوچیں کہ کیا گزرتی ہوگی حضرت خواجہ صابر کلیری قدس سرہٗ کی رُوحِ پاک پر ——

کتابُ الدَّعوات

معارف الحدیث

(مُسلسل)

دعوات استعاذہ :-

ذخیرۂ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو دعائیں ماثور و منقول ہیں جو آپ نے مختلف اوقات میں اللہ تعالیٰ کے حضور میں خود کیں یا اُمت کو ان کی تعلیم و تلقین فرمائی، اُن میں زیادہ تر وہ ہیں جن میں اللہ تعالیٰ سے کسی دُنیوی یا اُخروی، روحانی یا جسمانی، انفرادی یا اجتماعی نعمت اور بھلائی کا سوال کیا گیا ہے اور مثبت طور پر کسی حاجت اور ضرورت کے لیے استدعا کی گئی ہے —— ڈیڑھ سو سے کچھ اوپر جو دعائیں اس سلسلہ میں اب تک درج ہو چکی ہیں وہ سب اسی قبیل کی تھیں —— ان کے علاوہ بہت سی ایسی دُعائیں بھی آپ سے مروی ہیں جن میں کسی خیر و نعمت اور کسی مثبت حاجت و ضرورت کے سوال کے بجائے دُنیا یا آخرت کے کسی شر سے اور کسی بلا اور آفت سے پناہ مانگی گئی ہے اور حفاظت و بچاؤ کی استدعا کی گئی ہے —— پھر جس طرح پہلی قسم کی دُعاؤں کو مجموعی طور پر سامنے رکھ کر یہ کہنا برحق ہے کہ دُنیا اور آخرت کی کوئی خیر اور بھلائی اور کوئی حاجت و ضرورت ایسی نہیں ہے جس کی دُعا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے نہ کی ہو اور اُمت کو تلقین نہ فرمائی ہو۔ اسی طرح دوسری قسم کی دعاؤں کو پیش نظر رکھ کر یہ کہنا بھی بالکل صحیح ہے کہ دنیا اور آخرت کا کوئی شر، کوئی فساد، کوئی فتنہ اور کوئی بلا اور آفت اس عالمِ وجود میں ایسی نہیں ہے

جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی پناہ نہ مانگی ہو اور اُمت کو اسکی تلقین نہ فرمائی ہو ـــــ غور کرنے اور سمجھنے والوں کے لیے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نہایت روشن معجزہ ہے کہ آپ کی دعائیں انسانوں کی دنیوی واخروی، روحانی اور جسمانی، انفرادی اور اجتماعی، ظاہری اور باطنی، مثبت اور منفی ساری ہی حاجتوں اور ضرورتوں پر حاوی ہیں، اور کوئی خفی سے خفی اور دقیق سے دقیق حاجت نہیں بتائی جا سکتی جس کو آپ نے بہتر سے بہتر پیرایہ میں اللہ تعالیٰ سے نہ مانگا ہو اور اُمت کو اس کے مانگنے کا طریقہ نہ سکھایا ہو ـــــ ـــــ قرآن مجید میں بھی ان دونوں ہی قسم کی یعنی مثبت اور منفی دعائیں موجود ہیں، اور بالکل آخر کی دو مستقل سورتیں "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ" اور "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ" اوّل سے آخر تک منفی قسم کی دعا یعنی استعاذہ ہی پر مشتمل ہیں اور اسی لیے ان کو "معوذتین" کہا جاتا ہے، اور ان ہی پر قرآن مجید ختم ہوا ہے۔

قرآن پاک کے اس طریقہ ہی کی پیروی میں یہ مناسب سمجھا گیا کہ جو احادیث ایسی دعاؤں پر مشتمل ہیں جن میں شر اور فتن اور بلایا سے اور برے اعمال و اخلاق اور ہر قسم کی ناپسندیدہ باتوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی گئی ہے۔ ان کو آخر میں درج کیا جائے اور ان ہی کو اس سلسلہ کا خاتمہ بنایا جائے ـــــ اب ذیل میں وہی حدیثیں پڑھیے!

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ جَهْدِ الْبَلَاءِ وَدَرْكِ الشَّقَاءِ وَسُوْءِ الْقَضَاءِ وَشَمَاتَةِ الْاَعْدَاءِ۔

ـــــ رواه البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ـــــ اللہ کی پناہ مانگو، بلاؤں کی سختی سے اور بدبختی کے لاحق ہونے سے اور بری تقدیر سے اور دشمنوں کی شماتت سے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث میں بظاہر تو چار چیزوں سے پناہ مانگنے کی تلقین فرمائی گئی ہے لیکن فی الحقیقت دنیا اور آخرت کی کوئی برائی اور کوئی تکلیف اور کوئی مصیبت اور کوئی پریشانی

ایسی نہیں سوچی جا سکتی جو ان چار عنوانوں کے احاطہ سے باہر ہو ان میں سب سے پہلی چیز ہے "جَهْدُ الْبَلَاءِ" (کسی بلا کی مشقت اور سختی) یعنی ہر اس حالت کا نام ہے جو انسان کے لیے باعث تکلیف اور موجب پریشانی ہو اور جس میں اس کی آزمائش ہو، یہ دنیوی بھی ہو سکتی ہے اور دینی بھی، روحانی بھی ہو سکتی ہے اور جسمانی بھی، انفرادی بھی ہو سکتی ہے اور اجتماعی بھی ——— الغرض یہ ایک ہی لفظ تمام مصائب و تکالیف اور آفات و بلیات کو حاوی ہے ——— اس کے بعد دوسری چیز جس سے پناہ مانگنے کی اس حدیث میں تلقین فرمائی گئی ہے وہ ہے "دَرْكُ الشَّقَاءِ" (بدبختی کا لاحق ہونا) اور تیسری چیز ہے "سُوْءُ الْقَضَاءِ" (بری تقدیر) ان دونوں کی جامعیت بھی بالکل ظاہر ہے جس بندہ کو ہر نوع کی بدبختی سے اور بری تقدیر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ اور حفاظت حاصل ہو گئی بلاشبہ اسے سب کچھ مل گیا ——— آخری چیز جس سے پناہ مانگنے کی اس حدیث میں تلقین فرمائی گئی ہے وہ ہے "شَمَاتَةُ الْاَعْدَاءِ" یعنی کسی مصیبت اور ناکامی پر دشمنوں کا ہنسنا. بلاشبہ دشمنوں کی شماتت اور طعنہ زنی بعض اوقات بڑی روحانی تکلیف و اذیت کا باعث ہوتی ہے. اس لیے اس سے خصوصیت کے ساتھ پناہ مانگنے کے لیے فرمایا اگرچہ اس سے پہلے تین جامع عنوانات اس کو بھی حاوی تھے.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تعمیل میں ان چار دں چیزوں سے پناہ مانگنے کے لیے صحیح اور مناسب الفاظ یہ ہوں گے.

"اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ جَهْدِ الْبَلَاءِ وَدَرْكِ الشَّقَاءِ وَسُوْءِ الْقَضَاءِ وَشَمَاتَةِ الْاَعْدَاءِ"	اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں بلا کی سختی سے اور بدبختی لاحق ہونے سے اور بری تقدیر سے اور دشمنوں کے ہنسنے اور انکی طعنہ زنی سے.

عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْهَمِّ وَالْحُزْنِ وَالْعَجْزِ وَالْكَسَلِ وَالْجُبْنِ وَالْبُخْلِ وَضَلَعِ الدَّيْنِ وَغَلَبَةِ الرِّجَالِ.

——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح دعا کیا کرتے تھے "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ ..... تا ..... غَلَبَةِ الرِّجَالِ" (اے میرے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں، فکر سے اور غم سے اور کم ہمتی اور کاہلی اور بزدلی سے اور بخیلی کنجوسی اور قرضہ کے بار سے اور لوگوں کے دباؤ سے) (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) اس دعا میں جن آٹھ چیزوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی گئی ہے۔ انہیں سے چار (فکر و غم، قرضہ کا بار اور مخالفین کا غلبہ) ایسی چیزیں ہیں جو حساس و صاحب شعور آدمی کے لیے زندگی کے لطف سے محرومی اور سخت روحانی اذیت کا باعث ہوتی ہیں اور اس کی قوت کار اور صلاحیتوں کو معطل کر کے رکھ دیتی ہیں جس کے نتیجہ میں وہ دنیا اور آخرت کی بہت سی کامیابیوں اور سعادتوں سے محروم رہ جاتا ہے اور باقی چار (کم ہمتی، کاہلی، کنجوسی اور بزدلی) ایسی کمزوریاں ہیں جن کی وجہ سے آدمی وہ جرأتمندانہ اقدامات اور محنت و قربانی والے وہ اعمال نہیں کر سکتا جن کے بغیر نہ دنیا میں کامرانی حاصل کی جا سکتی ہے اور نہ آخرت میں فوز و فلاح اور نہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا مقام حاصل ہو سکتا ہے ——— اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سب چیزوں سے اللہ کی پناہ چاہتے تھے اور اپنے عمل سے اُمت کو بھی اس کی تلقین فرماتے تھے۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْكَسَلِ وَالْهَرَمِ وَالْمَغْرَمِ وَالْمَاْثَمِ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ عَذَابِ النَّارِ وَفِتْنَةِ النَّارِ وَفِتْنَةِ الْقَبْرِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْغِنٰى وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْفَقْرِ وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ اَللّٰهُمَّ اغْسِلْ خَطَايَایَ بِمَاءِ الثَّلْجِ وَالْبَرَدِ وَنَقِّ قَلْبِیْ كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الْاَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ وَبَاعِدْ بَيْنِیْ وَبَيْنَ خَطَايَایَ كَمَا بَاعَدْتَ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ۔

رواہ البخاری ومسلم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کیا کرتے تھے " اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْكَسَلِ ..... تا ...... كَمَا بَاعَدْتَ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ اے میرے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں سستی کاہلی سے اور انتہائی بڑھاپے سے (جو آدمی کو بالکل ہی از کار رفتہ کردے) قرضہ کے بوجھ سے اور ہر گناہ سے۔ اے میرے اللہ میں تیری پناہ لیتا ہوں دوزخ کے عذاب سے اور دوزخ کے فتنہ سے اور فتنۂ قبر سے اور عذاب قبر سے اور دولت وثروت کے فتنہ کے شر سے اور مفلسی ومحتاجی کے فتنہ کے شر سے اور فتنۂ دجال کے شر سے ___ اے میرے اللہ میرے گناہوں کے اثرات دھو دے اولے اور برف کے پانی سے اور میرے دل کو گندے اعمال واخلاق کی گندگیوں سے اس طرح پاک صاف کردے جس طرح سفید کپڑا میل کچیل سے صاف کیا جاتا ہے اور میرے اور میرے گناہوں کے درمیان اتنی دوری پیدا کردے جتنی دوری تو نے مشرق ومغرب کے درمیان کردی ہے (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(**تشریح**) اس دعا میں علاوہ اور چیزوں کے هَرَم یعنی انتہائی بڑھاپے سے بھی پناہ مانگی گئی ہے ___ عمر کی اس حد تک درازی کہ ہوش وحواس صحیح سالم رہیں اور آخرت کی کمائی کا سلسلہ جاری رہے۔ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔ لیکن ایسا بڑھاپا جو بالکل ہی از کار رفتہ کردے جس کو قرآن پاک میں اَرْذَلِ الْعُمُر فرمایا گیا ہے ایسی ہی چیز ہے جس سے اللہ کی پناہ مانگی جائے۔ هَرَم بڑھاپے کا وہی درجہ ہے۔

اس دعا میں "عذاب نار" کے ساتھ "فتنۂ نار" سے اور "عذاب قبر" کے ساتھ "فتنۂ قبر" سے بھی پناہ مانگی گئی ہے ___ عذاب نار سے مراد بظاہر دوزخ کا وہ عذاب ہے جو ان دوزخیوں کا ہوگا جو کفر وشرک جیسے سنگین جرائم کی وجہ سے دوزخ میں ڈالے جائیں گے، اسی طرح عذاب قبر سے مراد بظاہر قبر کا وہ عذاب ہے جو اسی طرح کے بڑے مجرموں کو قبر میں ہوگا ___ لیکن، جو ان سے کم درجہ کے مجرمین ہیں اُن کو اگرچہ دوزخیوں کی طرح

دوزخ میں نہیں ڈالا جائے گا اور قبر میں بھی اُن پر درجہ اول کے ان مجرمین والا وہ سخت عذاب مسلط نہیں کیا جائے گا لیکن دوزخ اور قبر کی کچھ تکلیفوں سے ان لوگوں کو بھی گزرنا پڑے گا اور بس یہی سزا ان کے لیے کافی ہو گی، اس عاجز کے نزدیک "فتنۂ نار" اور "فتنۂ قبر" سے یہی سزا مراد ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "عذاب نار" اور "عذاب قبر" کے ساتھ اس "فتنۂ نار" اور "فتنۂ قبر" سے بھی پناہ چاہی اور اپنے عمل سے ہم کو بھی اس کی تلقین فرمائی ہے۔

دجال کا فتنہ بھی اُن عظیم ترین فتنوں میں سے ہے جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بکثرت پناہ مانگتے تھے اور اہل ایمان کو اس کی تلقین فرماتے تھے ـــــ اللہ تعالیٰ دجالِ اکبر کے فتنہ (جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے) اور ہر دجالی فتنہ سے اپنی پناہ میں رکھے اور مرتے دم تک ایمان و اسلام پر ثابت قدم رکھے۔

اس دعا میں دولتمندی کے فتنہ سے اور اس کے ساتھ فقر و محتاجی کے فتنہ سے بھی اللہ کی پناہ مانگی گئی ہے ـــــ دولت و ثروت بذاتِ خود کوئی بری چیز نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔ اگر اس کا حق ادا کرنے اور اس کو صحیح طور پر استعمال کرنے کی توفیق ملے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی دولت ہی سے وہ مقام پایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے بارہ میں اعلان فرمایا کہ "عثمان اس کے بعد جیسے بھی عمل کریں ان پر کوئی عتاب نہ ہوگا اور اُن سے کوئی بازپرس نہ ہوگی (مَا عَلَىٰ عُثْمَانَ مَا عَمِلَ بَعْدَ هٰذِهٖ[1] ترمذی) اس طرح فقر کے ساتھ اگر صبر و قناعت نصیب ہو تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے لیے اور اپنے گھر والوں کے لیے فقر ہی کی زندگی پسند فرمائی، اور فقر اور اہل فقر کے بڑے فضائل بیان فرمائے ـــــ لیکن اگر بدقسمتی سے دولتمندی و خوش حالی تکبر و غرور پیدا کرے اور مال و دولت کے صحیح استعمال کی توفیق نہ ملے تو پھر وہ فتنہ و نیت ہے، اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے، اسی طرح اگر فقر و محتاجی کے ساتھ صبر و قناعت نہ ہو اور اس کی وجہ سے آدمی ناکردنی کرنے لگے تو وہ خدا کا ایک عذاب ہے اور

---

[1] رواہ الترمذی

اور اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا"
(محتاجی اور مفلسی آدمی کو کفر تک بھی پہونچا سکتی ہے) اس دعا میں غنا اور فقر (دولتمندی اور ناداری)
کے جس شر و فتنہ سے پناہ مانگی گئی ہے وہ یہی ہے، اور وہ ایسی ہی چیز ہے کہ اُس سے ہزار بار پناہ مانگی
جائے۔

اس دُعا کے آخر میں گناہوں کے اثرات دھونے کی، اور دل کی صفائی کی، اور گناہوں سے
بہت دور کیے جانے کی جو دُعا کی گئی ہے وہ اگرچہ بظاہر مثبت دعاؤں میں سے ہے لیکن غور کیا
جائے تو وہ بھی ایک طرح کی سلبی دعا ہے اور گویا استعاذہ ہی ہے۔

عَنْ زَیْدِ بْنِ اَرْقَمَ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ
عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْعَجْزِ
وَالْكَسَلِ وَالْجُبْنِ وَالْبُخْلِ وَالْهَرَمِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ اَللّٰهُمَّ
اٰتِ نَفْسِیْ تَقْوٰهَا وَزَكِّهَا اَنْتَ خَیْرُ مَنْ زَكّٰهَا اَنْتَ وَلِیُّهَا
وَمَوْلَاهَا اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَّا یَنْفَعُ وَمِنْ
قَلْبٍ لَّا یَخْشَعُ وَمِنْ نَّفْسٍ لَّا تَشْبَعُ وَمِنْ دَعْوَةٍ لَّا یُسْتَجَابُ لَهَا۔

رواہ مسلم

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کیا
کرتے تھے

(اے میرے اللہ میں تیری پناہ لیتا ہوں کم ہمتی سے اور سستی کاہلی اور بزدلی سے اور
بخیلی کنجوسی سے، اور انتہائی درجہ کے بڑھاپے سے اور قبر کے عذاب سے! اے میرے
اللہ میرے نفس کو تقویٰ عطا فرما دے اور اُس کا تزکیہ فرما کے اس کو مصفّٰی بنا دے،
تو ہی سب سے اچھا تزکیہ فرمانے والا ہے، تو ہی اُس کا والی اور مولا ہے اے میرے
اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں اُس علم سے جو نفعمند نہ ہو اور ایسے دل سے جس میں خشیت
نہ ہو اور اس (حریص ناک) نفس سے جس کو سیری نہ ہو اور ایسی دعا سے جو قبول نہ ہو۔
(صحیح مسلم)

(تشریح) علم غیر نافع، قلب غیر خاشع، اور ہوسناک نفس جس کی ہوس کی ختم ہی نہ ہو اور وہ دعا جس کی اللہ کے ہاں سماعت نہ ہو ــــ ان چاروں چیزوں سے اللہ کی پناہ مانگنے کا مطلب یہی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ علم نافع عطا فرمائے، قلب کو خشوع کی صفت مرحمت فرمائے، نفس کو ہوسناکی سے پاک فرما کر اسکو قناعت سے آراستہ فرمائے اور دعاؤں کو قبولیت سے نوازے۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ مِنْ دُعَاءِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ زَوَالِ نِعْمَتِكَ وَ تَحَوُّلِ عَافِيَتِكَ وَ فُجَاءَةِ نِقْمَتِكَ وَجَمِيْعِ سَخَطِكَ ــ ـــــ رواہ مسلم

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں سے ایک یہ دعا یہ بھی تھی اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَعُوْذُ بِكَ ــ تا ــ وَجَمِيْعِ سَخَطِكَ" (اے میرے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں تیری نعمتوں کے زائل ہو جانے سے، اور تیری بخشی ہوئی عافیت کے چلے جانے سے، اور تیرے عذاب کے ناگہانی آ جانے سے اور تیری ہر قسم کی ناراضی اور ناخوشی سے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا سے بلکہ اس سلسلہ کی ساری ہی دعاؤں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نبوت و رسالت بلکہ مقام محبوبیت پر بھی فائز ہونے کے باوجود قضا و قدر کے فیصلوں سے آپ کتنے لرزاں و ترساں رہتے تھے اور اپنے کو اللہ تعالیٰ کی نگاہ کرم اور اُس کی حفاظت و پناہ کا کتنا محتاج سمجھتے تھے ــــ سچ ہے قربیاں را بیش بود حیرانی

عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشِّقَاقِ وَالنِّفَاقِ وَسُوْءِ الْاَخْلَاقِ۔

ـــــــــ رواہ ابوداؤد والنسائی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کیا کرتے تھے " اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشِّقَاقِ وَالنِّفَاقِ وَسُوْءِ الْاَخْلَاقِ (اے میرے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں۔ شقاق یعنی آپس

کے سخت اختلاف سے اور نفاق سے اور برے اخلاق سے۔

(تشریح) "شقاق" اس شدید اختلاف کو کہتے ہیں جس کے نتیجہ میں فریقین ایک دوسرے سے بالکل جدا ہو جائیں اور ان کی راہیں الگ الگ ہو جائیں۔ نفاق کے معنی ہیں ظاہر و باطن کا فرق، یہ اعتقادی نفاق کے علاوہ عملی زندگی میں منافقانہ رویہ کو بھی شامل ہے۔ یہ تینوں چیزیں جن سے اس دعا میں اللہ کی پناہ چاہی گئی ہے (یعنی، خلاف و شقاق، نفاق اور برے اخلاق) آدمی کے دین کو بلکہ اس کی دنیا کو بھی برباد کر دیتی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ معصوم اور قطعاً محفوظ تھے لیکن اس کے باوجود ان مہلکات کی ہلاکت خیزی ہی کی وجہ سے ان سے اللہ کی پناہ مانگتے تھے، اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ان چیزوں سے اپنے کو محفوظ رکھنے کی اتنی فکر کریں جتنی ایک مومن کو ہونی چاہئے اور ہمیشہ ان سے اللہ کی پناہ مانگتے رہیں۔

عَنْ شَكَلِ بْنِ حُمَيْدٍ قَالَ قُلْتُ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ عَلِّمْنِي تَعَوُّذًا أَتَعَوَّذُ بِهِ فَأَخَذَ بِيَدِي وَقَالَ قُلْ اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ سَمْعِي وَمِنْ شَرِّ بَصَرِي وَمِنْ شَرِّ لِسَانِي وَمِنْ شَرِّ قَلْبِي وَمِنْ شَرِّ مَنِيِّي" ـــــــ رواہ ابو داؤد والترمذی والنسائی

شکل بن حمید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے کوئی تعوذ تعلیم فرما دیجئے (یعنی کوئی ایسی دعا بتا دیجئے) جس کے ذریعہ میں اللہ سے پناہ و حفاظت طلب کیا کروں۔ آپ نے میرا ہاتھ اپنے دست مبارک میں تھام کر فرمایا کہو "اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ سَمْعِي ...... تا ...... وَمِنْ شَرِّ مَنِيِّي" (اے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں اپنے کانوں کے شر سے، اپنی نگاہ کے شر سے اور اپنی زبان کے شر سے اور اپنے قلب کے شر سے اور اپنے مادہ شہوت کے شر سے)

(سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن نسائی)

(تشریح) سمع و بصر اور زبان و قلب اور اسی طرح جنسی خواہش کا شر یہ ہے کہ

یہ چیزیں احکام خداوندی کے خلاف استعمال ہوں، جس کا انجام اللہ کا غضب اور اس کا عذاب ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اس شر سے محفوظ رہنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے اور اس کی پناہ مانگی جائے، وہی اگر بچائے گا تو بندہ بچ سکے گا ورنہ مبتلا ہو کر ہلاک ہو جائے گا۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ یَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْجُوْعِ فَاِنَّهٗ بِئْسَ الضَّجِیْعُ وَاَعُوْذُبِكَ مِنَ الْخِیَانَةِ فَاِنَّهَا بِئْسَتِ الْبِطَانَةُ

——— رواہ ابوداؤد والنسائی وابن ماجہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کیا کرتے تھے اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ ...... تا ..... بِئْسَتِ الْبِطَانَةُ

(اے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں بھوک اور فاقہ سے وہ بڑا تکلیف دہ رفیقِ خواب ہے اور خیانت کے جرم سے، وہ بہت بُری ہمراز ہے)

(سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ)

(تشریح) جب آدمی کو بھوک اور فاقہ کی تکلیف ہو تو نیند نہیں آتی بس اسی احساس کے ساتھ کروٹیں بدلتا رہتا ہے، اسی لحاظ سے بھوک کو "رفیقِ خواب" (یعنی بستر کا ساتھی) کہا گیا ہے، اور خیانت ہمیشہ چوری چھپے ہی کی جاتی ہے اور اس کا راز بس خیانت کرنے والے ہی کو معلوم ہوتا ہے، اس لیے خیانت کو "بِطَانَةٌ" (ہمراز) کہا گیا ہے

بھوک اور خیانت جیسی چیزوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پناہ مانگنا کمالِ عبدیت کا وہ آخری اور انتہائی مقام ہے جو بلاشبہ آپ کا طرۂ امتیاز ہے، اور اس میں ہمارے لیے بڑا سبق ہے۔

عَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ یَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْبَرَصِ وَالْجُذَامِ وَالْجُنُوْنِ وَمِنْ سَیِّئِ الْاَسْقَامِ ——— رواہ ابوداؤد والنسائی

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دُعا

کیا کرتے تھے "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ ...... تا .... وَمِنْ سَیِّیِٔ الْاَسْقَامِ" اے میرے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں برص، جذام اور پاگل پن سے اور سب خراب بیماریوں سے (سنن ابی داؤد، سنن نسائی)

تشریح برص، جذام، جنون اور اس طرح کی وہ سب بیماریاں جن کی وجہ سے لوگ مریض سے نفرت اور گھن کریں اور جن کی وجہ سے آدمی زندگی پر موت کو ترجیح دینے لگے ـــــــ بلا شبہ ان سے ہر آدمی کو پناہ مانگنی چاہیے، لیکن ہلکی اور معمولی قسم کی بیماریاں بعض پہلوؤں سے یقیناً خدا کی رحمت ہوتی ہیں۔

عَنْ اَبِی الْیَسَرِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یَدْعُوْا اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْھَدْمِ وَاَعُوْذُ بِکَ مِنَ التَّرَدِّیْ وَمِنَ الْغَرَقِ وَالْحَرَقِ وَالْھَرَمِ وَاَعُوْذُ بِکَ مِنْ اَنْ یَّتَخَبَّطَنِیَ الشَّیْطَانُ عِنْدَ الْمَوْتِ وَاَعُوْذُ بِکَ مِنْ اَنْ اَمُوْتَ فِیْ سَبِیْلِکَ مُدْبِراً وَاَعُوْذُ بِکَ مِنْ اَنْ اَمُوْتَ لَدِیْغاً۔

ـــــــــــ رواہ ابوداؤد والنسائی

ابوالیسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کیا کرتے تھے "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ.... تا .... وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ اَنْ اَمُوْتَ لَدِیْغاً" اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں [اپنے اوپر کسی عمارت وغیرہ کے] ڈھے جانے سے، اور [کسی بلندی کے اوپر سے] گر پڑنے سے، اور [دریا وغیرہ میں] ڈوب جانے سے، اور آگ میں جل جانے سے اور انتہائی بڑھاپے سے اور تیری پناہ چاہتا ہوں اس بات سے کہ موت کے وقت شیطان مجھے وسوسوں میں مبتلا کر دے، اور تیری پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ میں میدان جہاد میں پیٹھ پھیر کر بھاگتا ہوا مروں، اور پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ کسی زہریلے جانور کے ڈسنے سے مجھے موت آئے۔

(سنن ابی داؤد، سنن نسائی)

(تشریح) کسی دیوار وغیرہ کے نیچے دب کر مر جانا اور اسی طرح کسی بلندی سے نیچے گر کر یا دریا وغیرہ میں ڈوب کے یا آگ میں جل کر یا کسی زہریلے جانور، سانپ وغیرہ کے ڈسنے سے ختم ہو جانا یہ سب صورتیں مفاجاتی اور ناگہانی موت کی ہیں ــــ علاوہ اس کے کہ انسانی روح موت کی ان سب صورتوں سے فطری طور پر بہت زیادہ گھبراتی ہے، ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان صورتوں میں مرنے والے کو موت کی تیاری، تجدید ایمان اور توبہ و استغفار وغیرہ کا موقع نہیں ملتا جو موت کی دوسری عام شکلوں میں عموماً مل جاتا ہے اس لیے ایک مومن کو موت کی ان سب ناگہانی صورتوں سے پناہ ہی مانگنا چاہیے، اسی طرح اس سے بھی پناہ مانگنا چاہیے کہ میدان جہاد میں پیٹھ پھیر کر بھاگتے ہوئے موت آئے، اللہ کی نگاہ میں یہ نہایت سنگین جرم ہے، علیٰ ہذا اس سے بھی پناہ مانگتے رہنا چاہیے کہ موت کے وقت شیطان وسوسہ اندازی کے ذریعہ ہم کو گڑبڑ اسکے اور گمراہ کر سکے ــــ خاتمہ ہی کے اچھے یا برے ہونے پر سارا دارومدار ہے۔

موت کی جن ناگہانی صورتوں سے اس دعا میں پناہ مانگی گئی ہے، دوسری حدیثوں میں اس قسم کے حوادث سے مرنے والوں کو شہادت کی بشارت سنائی گئی ہے اور ان کو شہید قرار دیا گیا ہے، ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد اور منافات نہیں ہے ــــ اپنی بشری کمزوری کے لحاظ سے موت کی ان سب صورتوں سے ہمیں اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے، لیکن جب تقدیر الٰہی سے کسی بندہ کو اس طرح سے موت آ جائے تو ارحم الراحمین کی رحمت پر نگاہ رکھتے ہوئے توقع رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس مفاجاتی موت ہی کی وجہ سے اُس کو "اعزازی شہادت" کا مقام عطا فرمائیگا اور اگر حقوق اور اعمال کے حساب سے کچھ بھی گنجائش ہوگی تو یقیناً رب کریم کی طرف سے ایسا ہی ہوگا اِنَّہٗ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ٥

عَنْ قُطْبَةَ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ مُنْكَرَاتِ الْاَخْلَاقِ وَالْاَعْمَالِ وَالْاَهْوَاءِ ــــ رواہ الترمذی

قطبہ بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کیا کرتے تھے "اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ مُنْكَرَاتِ الْاَخْلَاقِ وَالْاَعْمَالِ وَالْاَهْوَاءِ" (اے میرے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں۔ بُرے اخلاق، بُرے اعمال اور بُری

خواہشات ہے۔ (جامع ترمذی)

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا عَمِلْتُ وَمِنْ شَرِّ مَا لَمْ اَعْمَلْ۔

______ رواہ مسلم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کیا کرتے تھے "اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا عَمِلْتُ وَمِنْ شَرِّ مَا لَمْ اَعْمَلْ (اے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں ان اعمال کے شر سے جو میں نے کیے اور ان اعمال کے شر سے جو میں نے نہیں کیے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) کسی بُرے عمل کا سرزد ہو جانا، اور اسی طرح کسی اچھے عمل کا فوت ہو جانا دونوں ایسی چیزیں ہیں جن کے شر سے ہم جیسے عامی بھی پناہ مانگتے ہیں لیکن عارفین اچھے سے اچھے عمل کرنے اور بُرے اور گندے اعمال سے دامن بچانے کے بعد بھی ڈرتے ہیں کہ کہیں ہمارے اندر اس کی وجہ سے عُجب وغرور اور نیکی و پاکدامنی کا پندار نہ پیدا ہو جائے (جو اللہ کی نگاہ میں جرم عظیم ہے) اس لیے وہ اپنے اچھے اعمال کے شر اور بُرے اعمال کے ترک کے شر سے بھی اللہ کی پناہ مانگتے ہیں ـــــ سچ ہے حسنات الابرار سیئات المقربین"۔

بیماری اور بُرے اثرات سے تحفظ کے لیے استعاذہ :-

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعَوِّذُ الْحَسَنَ وَالْحُسَيْنَ وَيَقُوْلُ اُعِيْذُكُمَا بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ وَّهَامَّةٍ وَمِنْ كُلِّ عَيْنٍ لَامَّةٍ " وَيَقُوْلُ هٰكَذَا كَانَ اِبْرَاهِيْمُ يُعَوِّذُ اِسْحَاقَ وَاِسْمٰعِيْلَ ـــــ

______ رواہ الترمذی وابوداؤد

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (اپنے دونوں نواسوں) حضرت حسن وحسین پر دم کیا کرتے تھے ' یہ کلمات پڑھ کے دم

فرماتے تھے۔ "اُعِیذُکُمَا بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّامَّةِ مِنْ کُلِّ شَیْطَانٍ وَّھَامَّةٍ وَّمِنْ کُلِّ عَیْنٍ لَامَّةٍ" (میں تم کو اللہ کے پورے پورے کلموں کی پناہ میں دیتا ہوں، ہر شیطان کے اثر سے اور ڈسنے والے ہر زہریلے کیڑے سے، اور لگنے والی ہر نظرِ بد سے،

(جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

(تشریح) یہ کلمات پڑھ کر بچوں پر دم کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور آپ سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بھی سنت ہے ——— بلاشبہ بڑے بابرکت ہیں یہ کلمات۔

عَنْ عُثْمَانَ بْنِ اَبِی الْعَاصِ الثَّقَفِیِّ اَنَّہٗ شَکٰی اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَجَعًا یَجِدُہٗ فِیْ جَسَدِہٖ مُنْذُ اَسْلَمَ فَقَالَ لَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ضَعْ یَدَکَ عَلَی الَّذِیْ یَاْلَمُ مِنْ جَسَدِکَ وَقُلْ بِسْمِ اللّٰہِ ثَلٰثًا وَقُلْ سَبْعَ مَرَّاتٍ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ وَقُدْرَتِہٖ مِنْ شَرِّ مَا اَجِدُ وَاُحَاذِرُ" ——— رواہ مسلم

حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنی تکلیف عرض کی کہ جب سے میں اسلام لایا ہوں جسم کے فلاں حصہ میں درد رہتا ہے ——— آپ نے فرمایا کہ جس جگہ درد ہے اُس جگہ اپنا ہاتھ رکھو اور تین دفعہ بِسْمِ اللّٰہِ پڑھ کر سات دفعہ کہو اَعُوْذُ بِاللّٰہِ وَقُدْرَتِہٖ مِنْ شَرِّ مَا اَجِدُ وَاُحَاذِرُ" (میں اللہ تعالیٰ اور اس کی قدرتِ کاملہ کی پناہ چاہتا ہوں اس تکلیف کے شر سے جو مجھے لاحق ہے اور اس سے بھی جس کا مجھے خطرہ ہے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) ہر جسمانی تکلیف کے لیے یہ عمل اور تعوذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص علاج ہے اور بہت مجرب ہے۔

یک دو ساعت صحبتے با اہلِ دل

مجلس حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی مدظلہ العالی

مرتبہ: مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

(ساتویں مجلس)

۲۶ شوال ۱۳۸۵ھ مطابق ۲۰ جنوری ۱۹۶۶ء خانقاہ شریف ۱۰ ۱/۲ بجے سے ۱۲ بجے تک

جدید حاضرین مجلس میں سے مولوی نظام الدین صاحب اصلاحی (قیم جماعت اسلامی مدھیہ پردیش) محمود الحسینی صاحب، ایڈیٹر الحمراء، محمد صغیر صاحب جلیگ، قاضی عبد الحمید صاحب اندوری وغیرہ۔

راقم سطور نے عرض کیا کہ ادھر کئی سال سے طبیعت تقریروں سے بالکل اُچاٹ ہے، تقریر کے نام سے بخار سا چڑھتا ہے، پہلے یہ کیفیت نہ تھی، فرمایا کہ لوگوں میں طلب و استقبال ہوتا ہے تو طبیعت میں انبساط و انشراح پیدا ہوتا ہے اور مضامین کی آمد ہوتی ہے، ورنہ انقباض پیدا ہوتا ہے، دراصل حاضرین مخاطبین ہی کا عکس متکلم پر پڑتا ہے۔

فرمایا، حیدرآباد میں ایک بزرگ تھے، بہت سے لوگ ان کے مرید تھے، میں بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، بہت شفقت و خصوصیت فرماتے تھے۔ ان کے ایک مرید اور نویش پولیس کے ایک بڑے افسر تھے، ان کی بیوی کا انتقال ہوا اس حادثہ سے وہ بہت متاثر تھے، تعزیت میں حضرت نے ان کو کوئی خط لکھا، ان کو بہت ناگوار ہوا، انھوں نے

ایک نامناسب خط لکھا جس میں ان بزرگ کے لیے بہت نا ملائم اور بے ادبی کے کلمات تھے، حضرت نے اس خط کی بہت سی نقلیں کروائیں، اور اپنے سب مریدین کے نام بھیج دیں، اور تحریر فرمایا کہ میں درراصل ایسا ہوں جیسا ان صاحب نے لکھا ہے، آپ لوگ مغالطہ میں تھے، اب میری حقیقت پہچان لیجئے، میرے پاس بھی اس کی ایک نقل آئی، میں نے اس کے جواب میں عریضہ لکھا کہ ان صاحب کو تو آپ میں چند ہی عیوب نظر آئے ہیں، مجھے تو آپ سرتاپا عیب نظر آتے ہیں، جن لوگوں نے میرا یہ خط پڑھا، انھوں نے کہا، یہ کیا بے تمیزی اور گستاخی ہے، حضرت پڑھیں گے تو سخت ناراض ہوں گے، میں نے ان سے کہا کہ حضرت مجھ سے ناراض ہو جائیں تو پرواہ نہیں، میں حضرت سے ناراض نہ ہوں، یہ سارا مضمون لکھ کر میں نے حضرت کی خدمت میں بھیج دیا، اس سے کچھ عرصہ بعد میں حیدرآباد گیا، مکہ مسجد میں میں نے نماز پڑھی، اس کے آس پاس حضرت کے کئی خدام اور مریدین رہتے تھے، ایک صاحب جن کا خاص تعلق تھا مجھے دیکھا، تو نماز پڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ کر باہر لے گئے، اور ایک طرف لے جا کر کہنے لگے کہ آپ نے حضرت کی خدمت میں کیا لکھا ہے؟ میں نے کہا کہ میں کم عقل آدمی ہوں، کم عقلی کی بات لکھ دی ہوگی، کہنے لگے کہ نہیں ہم لوگوں کے پاس اس خط کی نقل آئی ہے کہ اس خط کا ترجمہ کر کہ میاں یعقوب نے کیا لکھا ہے، کئی ماہ کے بعد حضرت کا تشریف لانا ہوا، میں بھی حاضر ہوا، فرمایا کہ میاں یعقوب میں نے تمہارا خط وظیفہ کی کتاب میں رکھ لیا ہے، میں نے کہا کہ یہ مضمون میرا نہیں ہے، یہ حضرت مرزا مظہر جانجاناں رحمۃ اللہ علیہ کا فیض ہے، فرمایا، کیا واقعہ ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ایک برہمن حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، وہ بڑی ریاضتیں اور نفس کشی کر چکا تھا، اور اس میں کشفی قوت پیدا ہو گئی تھی، ایک دن اس نے حضرت کو تنہا پا کر عرض کیا کہ ایک بات کہنا چاہتا ہوں، مگر کہنے کی ہمت نہیں ہوتی، حضرت نے کہا، بے تکلف کہو، اس نے کہا کہ آپ کا جسم تو نورانی نظر آتا ہے، لیکن قلب بالکل سیاہ ہے، حضرت نے فرمایا کہ ٹھیک ہے، ذرا یہ تو بتاؤ کہ تم کو یہ مراتب کیسے حاصل ہوئے؟ اس نے کہا کہ ہمیشہ نفس کے خلاف کرنے سے، نفس نے جس چیز کا تقاضا کیا، میں نے اس کے خلاف ہی کیا، فرمایا مسلمان ہونے کو طبیعت چاہتی ہے؟

ہے؟ کہا نہیں، فرمایا، پھر تو یہ طبیعت کے لیے بہت ہی ناگوار چیز ہے، اور اپنے قاعدہ کے موافق نفس کی مخالفت کرو، اور اسلام لے آؤ، اس نے کہا کہ جب میں اپنے گرو کی خدمت میں تھا تو وہ کبھی کبھی کہا تھا کہ مجھے تیرے جسم سے اسلام کی بو آتی ہے، اس نے کلمہ پڑھا، حضرت نے فرمایا اب تو ذرا دیکھو، اس نے کہا، حضور اب تو آپ سر تا پا نورانی نظر آتے ہیں، فرمایا یہ تم اپنے کو دیکھتے تھے، اس میں شیخ کامل آئینہ ہے، اور ہر شخص اس میں اپنی صورت دیکھتا ہے، آئینہ جتنا صاف ہوگا، عکس اس میں صاف آئے گا، اور میں نے یہ جو عرض کیا ہے کہ حضرت مجھ سے خفا ہو جائیں تو مجھے پرواہ نہیں، میں حضرت سے خفا نہیں ہوں، یہ بھی شیخ سعدیؒ کے کلام سے ماخوذ ہے، شیخ سعدیؒ نے ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے کہ تمام رات مناجات و دعا میں مشغول رہے، صبح کو ایک غیبی آواز آئی کہ تم مردود بارگاہ ہو، تمہارا کوئی عمل قابل قبول نہیں، ان بزرگ کے چہرہ میں کوئی تغیر نہیں ہوا، مریدوں نے کہا کہ کیا حضرت کے گوش مبارک میں یہ ندائے غیبی نہیں پہونچی؟ فرمایا کہ پہونچی، انھوں نے عرض کیا کہ پھر اس سے حضرت کی طبیعت مبارک پر کوئی اثر نہیں ہوا، انھوں نے کہا کہ ہمارا جو کام ہے، وہ ہم کر رہے ہیں، وہ چاہے مقبول کریں، چاہے مردود، اگر اس کا دروازہ ہمارے لیے بند ہے، تو ہم جائیں کہاں؟ اس کے دروازہ کے سوا کوئی دروازہ بھی تو نہیں، اس پر ارشاد ہوا کہ یہ ابتلا تھا، تم مقبول ہو، شیخ فرماتے ہیں: ؎

شبے تا سحر صالحے زندہ داشت	سحر دستہائے دعا بر فراشت
یکے ہاتف انداخت در گوش پیر	کہ بے حاصلی رو سر خویش گیر
بریں در، دعائے تو مقبول نیست	بخواری برو یا بزاری بایست
شبے دیگر از ذکر و طاعت نخفت	مریدے ز حالش خبر داشت گفت
چو دیدی کز آں روئے بستست در	بہ بے حاصلی سعی چندیں مبر
بدیباچہ بر اشک یاقوت فام	بحسرت ببارید و گفت اے غلام
مپندار اگر وے عناں بر شکست	کہ من باز دارم ز فتراک دست
بنومیدی آنگہ بگریدمے	ازیں راہ کہ راہِ دگر دیدمے

چو خواہندہ محرم گشت اندرے | چہ غم گر شناسد در دیگرے
شنیدم کہ راہم دریں کوئے نیست | دے ہیچ راہے دگر روئے نیست
درین بود سر بر زمین فدے | کہ گفتند در گوش جانش ندے
قبولست گرچہ ہنر نیستش | کہ جز ما پناہے دگر نیستش

توحضرت ناراض ہوا کریں، یہ حضرت کا فعل ہے، ہم حضرت سے ناراض نہ ہوں، ہمارا کام یہی ہے۔

فرمایا کہ قلوب کا قلوب پر بڑا اثر پڑتا ہے، اور صاحب امر اور صاحب اثر کا، اور بھی اثر پڑتا ہے، اخلاق محسنی میں نوشیرواں کی حکایت لکھی ہے، کہ وہ ایک دن شکار کو گئے، جنگل میں ساتھیوں سے علیحدہ ہو گئے، ایک جھونپڑے میں چلے گئے، پیاسے تھے، پانی مانگا، ایک لڑکی گنے کا رس لے کر آئی، اس میں کچھ کچرا پڑا ہوا تھا، بادشاہ نے پیا اور طلب فرمایا اور کہا کہ کچرا نہ ہو، اس نے کہا کہ میں نے یہ کچرا خود ڈال دیا تھا کہ آپ سخت پیاسے معلوم ہوتے تھے، اگر ایک دم سے سارا پی جاتے، تو نقصان ہوتا، اس مرتبہ لڑکی کو رس لانے میں بہت دیر لگی، اس عرصہ میں بادشاہ نے سوچا کہ اس کثرت سے یہاں گنا پیدا ہوتا ہے، اور اتنا اس میں سے رس نکلتا ہے، اس پر محصول بہت کم ہے، اس میں اضافہ ہونا چاہیے، لڑکی رس لے کر آئی، تو رس بہت تھوڑا تھا، بادشاہ نے سبب پوچھا، کہ اتنی دیر کیوں لگی اور اتنا رس کم کیوں لائی، اس نے کہا کہ میں پہلے ایک ہی گنے کا رس لائی تھی، یہ کئی گنوں کا رس ہے، اور بڑی مشکل سے نکلا ہے، معلوم ہوتا ہے، کہ بادشاہ کی نیت میں فرق آگیا ہے، نوشیرواں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، اور تیسری بار فرمائش کی، اور اپنی نیت درست کر لی، اور یہ ارادہ کر لیا کہ محصول میں کوئی اضافہ نہ ہوگا، لڑکی پیالہ بھر کر لائی، اور کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کی نیت ٹھیک ہو گئی، اس مرتبہ خوب رس نکلا۔

فرمایا کہ حاضرین کے قلوب کا اثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی پڑتا تھا، ارشاد فرمایا ہے، کہ میرے قلب پر کثافت سی آجاتی ہے "انہ لیغان علیٰ قلبی" اس لیے میں ایک ایک مجلس میں ستر ستر بار استغفار کرتا ہوں،

فرمایا کہ بزرگانہ شکل وصورت سے کچھ نہیں ہوتا کوئی لفافہ ہی دیکھ کر تعریف کر دے کہ خط بہت اچھا ہے، اس سے کچھ نہیں ہوتا، جب تک خط کا مضمون نہ معلوم ہو، اس کی تعریف نہیں کی جاسکتی، اس حقیقت کو قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے "افلا یعلم اذا بعثر ما فی القبور وحصل ما فی الصدور" کوئی بادام کا چکنا چکنا چھلکا، اور بڑا اسا دانہ دیکھ کر تعریف کرے تو اس کا کچھ اعتبار نہیں، اس تو گری ہے اور اس میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس سے روغن بادام کتنا نکلتا ہے، اس مغز اور روغن کے اظہار کی جگہ تو قبر ہے، اس وقت معلوم ہوگا کہ بادام کڑوا ہے، یا میٹھا، تر ہے یا بالکل خشک، مولانا نے صحیح فرمایا ہے ؎

آدمیت مشکل است اے آدمی   چوں بری روز آوری ہائے غمی
آدمیت لحم و شحم و پوست نیست   آدمیت جز رضائے دوست نیست
آدمیت گر بقوت فی شدے   گاؤ خر از آدمی بہتر بدے

اسی لیے حدیث میں "انما الاعمال بالخواتیم" آتا ہے۔

فرمایا کہ عالی چیز کو حاصل کرنے کے لیے اسی کی شان کے مطابق موانع کو دور کرنا ہوتا ہے۔ نماز کے لیے ضرورت بشری کو پورا کرنا، اور طہارت و وضو ضروری ہے، اگر کوئی شخص کسی کو نماز کی دعوت دے، اور وہ یہ سنتے ہی بیت الخلاء کی طرف روانہ ہو جائے، تو یہ نماز کی تیاری ہے، نسخہ لکھتے وقت مریض یہ چیز کو ضرور پوچھتا ہے، ابتدائی کتابیں پڑھ کر ہی بڑی بڑی کتابوں کو پڑھا جا سکتا ہے، لوگ وظائف تو بہت پوچھتے ہیں، لیکن انکے اثر وقبولیت کے لیے خدا کے نام جو عظمت، اور جس ایمان ویقین اور اعتماد کی ضرورت ہے، اس کی فکر نہیں کرتے، بہت سے لوگ اپنے بچوں کو حفظ کرا دیتے ہیں، اور اس کو فخریہ بیان کرتے ہیں، مگر اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ یہ بچہ اس دولت کی قدر وحفاظت بھی کر سکے گا، یا نہیں، حفظ کرانے کے بعد ایسی تعلیم دلاتے ہیں، کہ وہ اس سب محنت پر پانی پھیر دیتا ہے، اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی قورمہ اچھا تیار کرے، اور اس کو چینی کے پیالہ میں بڑے تکلف سے نکالے پھر گوبر یا کسی نجس چیز کو پیس کر اس پر چھڑک دے، تو کیا یہ سب غارت نہیں چلا جائے گا؟ حفظ قرآن کے بعد جو زندگی اختیار کی جاتی

ے کیا انسان کو معلوم نہیں وہ وقت جب اٹھایا جائے گا قبروں سے اور نکال لیا جائے گا جو کچھ سینوں کے اندر ہے (الفرقان)

ہے، اس کو اس سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی، اگر دل میں خدا کی نام کی عظمت ہو تو ایک آیت زندگی میں انقلاب برپا کرنے کے لیے کافی ہے، حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ جو پہلے ایک رہزن اور ڈاکو تھے، ان کی زندگی میں انقلاب اس سے آگیا کہ وہ کہیں واردات کرنے گئے تھے، کوئی شخص قرآن مجید پڑھ رہا تھا، ان کے کان میں یہ آیت پڑی "الم یأن للذین اٰمنوا أن تخشع قلوبهم لذکر اللہ وما نزل من الحق" (کیا ابھی ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر اور آیات حقانی سے لرز جائیں) کہنے لگے وقت آگیا، وقت آگیا، اور توبہ کی، ولایت کو پہونچ گئے۔

فرمایا، ارادوں کو قابو میں رکھ کر محل پر استعمال کرنا انسانیت ہے، ارادوں کے تابع تو جانور ہوتا ہے، جو اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکے، وہ جانور سے زیادہ مشابہ ہے، لوگ کہتے ہیں کہ ہم اپنے ارادوں اور جذبات کو قابو میں نہیں رکھ سکتے، میں کہتا ہوں کہ آپ شطرنج کھیلنے میں کیا کرتے ہیں، کیا آپ اپنے ارادوں اور خواہشات کو شطرنج کے اصول اور قاعدوں کے ماتحت نہیں رکھتے، پھر شریعت کے احکام کے بارے میں آپ کیوں مجبور ہو جاتے ہیں، بہت سے لوگوں نے شریعت ہی کے احکام میں ترمیم و انتخاب کر لیا ہے، اور اس کو اپنے مطابق بنا لیا ہے ــــــ ایک بادشاہ نے کچھ لوگوں سے کہا کہ میرا یہ تخت اس کوٹھری کے اندر پہونچا دو، کوٹھری تنگ اور اس کا دروازہ چھوٹا تھا ایک درباری نے کہا کہ حضور تخت بڑا ہے، اور کوٹھری چھوٹی، یہ تخت اس کوٹھری میں نہیں سما سکتا، بادشاہ بہت ناراض ہوا، اور کہا کہ یہ بے وقوف ہیں، یورپ سے کچھ سمجھدار لوگ آگئے، انھوں نے کہا کہ ہم ابھی اس تخت کو اس کوٹھری میں پہنچا دیتے ہیں، یہ ناسمجھ لوگ ہیں، یہ ایسا نہیں کر سکتے، انھوں نے اوزار سے اس تخت کے کونے کاٹے، تھوڑا سا ادھر سے لیا، تھوڑا سا ادھر سے لیا اور تخت کو چھوٹا اور مختصر کر کے کوٹھری میں لے گئے، اور تخت کو تختہ کر کے رکھ دیا، اسلام بھی ایک تخت تھا، اس کی ایک کیل بھی نکالنے کی اجازت نہ تھی، لیکن انھوں نے اس تخت کو بھی تختہ بنا دیا، اور اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق کر لیا، حالانکہ ایک ایک پرزہ اپنی جگہ پر ہوتا ہے تو مشین

چلتی ہے "بعض لوگ نوافل اور سنن کو غیر ضروری سمجھتے ہیں، حالانکہ جب کوئی چپراسی خالی اوقات میں کسی سرکاری افسر کے ذاتی اور گھریلو کام کر دیتا ہو تو افسر کے دل میں بڑی وقعت ہوتی ہو، اسی لیے فرمایا گیا " ولا یزال عبدی یتقرب إلیّ بالنوافل" الحدیث۔ آپ کا ملازم آپ کے گھر گھی لے کر آئے اور کہے کہ میں گھر جا رہا تھا، ایک جگہ بڑا خالص اور سستا گھی بک رہا تھا، میں حضور کے لیے لیتا آیا، تو آپ کتنے خوش ہوں گے ـــــ بعض لوگوں کو اگر کسی شرعی امر کے لیے کہا جائے تو بہت دبی زبان سے کہتے ہیں، کہ سنّت ہے، یعنی کوئی ضروری اور اہم چیز نہیں، میں کہتا ہوں کہ یہ فعل تو سنّت ہے مگر یہ لہجہ کفر ہے، زور سے عظمت کے ساتھ کیوں نہیں کہتے کہ سنّت ہے، جوہر ایمان اللہ اور اس کے رسول کی محبت اور عظمت ہے "گناہ اور سرکشی میں کیا فرق ہے؟ ایک کیوں آسانی سے معاف کر دیا جاتا ہے، اور دوسرا غضب اور عتاب کا موجب کیوں ہوتا ہے؟ اس لیے کہ پہلے میں قصداً مخالفت نہیں ہوتی، دوسرے میں مخالفت اور جرأت ہوتی ہے، آپ کوئی بہت پھٹا سا نوٹ جس کے کئی ٹکڑے ہو گئے ہوں صرف نمبر پڑھے جاتے ہوں، بنک کی کھڑکی پر لے کر جائیے، آپ کو اس کے بدلہ میں نیا نوٹ دے دیا جائے گا، لیکن اگر آپ ایک نوٹ بنک سے لیں، اور اس کو بنک کے افسر یا کلرک کے سامنے پھاڑ دیں، تو چاہے اس کے دو ہی ٹکڑے ہوئے ہوں، آپ سزا اور عتاب کے مستحق ہوں گے، اور سرکار کی توہین سمجھی جائے گی، اس لیے کہ پہلے میں ارادہ اور مخالفت کو دخل نہ تھا، اور یہ محض سرکشی اور جرأت ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں آتا ہے لیس[۱] علیکم جناح فیما اخطأتم به، ولکن ما تعمّدت قلوبکم"

سہارنپور کے اسٹیشن کے قریب ایک مسجد میں گاڑی کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا، ایک مولوی صاحب وعظ فرما رہے تھے، ٹخنہ کے نیچے پاجامہ کی بڑی مذمت کر رہے تھے اور وعیدیں سنا رہے تھے، کہنے لگے کم از کم نماز کے وقت تو اونچا کر لیا کریں، میں نے

---

[۱] تم سے جو خطا بے قصد، غلطی اور بھول چوک سے ہو جائے، وہ گناہ نہیں، لیکن دل کے عزم و ارادہ سے جو نافرمانی ہو وہ گناہ ہے (اور اس پر پکڑ ہو گی) الفرقان

کہا، حضرت یہ تو گناہ کبیرہ ہے، اونچا کرنے والے کی نیت یہی ہوتی ہے کہ نماز کے بعد پھر اس کو نیچا کروں گا، تو جس گناہ کے کرنے کا عزم ہو وہ تو گناہ ہی میں داخل ہے، حدیث میں آتا ہے "مرالمریرجع" کیا خدا صرف نماز میں دیکھتا ہے، نماز کے باہر نہیں دیکھتا، یہ تو ایسی بات ہے کہ شراب کا شیشہ مسجد کے باہر رکھ دیا، جب نماز سے فراغت ہوئی تو جا کر پی لیا، جس گناہ کا عزم ہو اس کا نام طغیان ہے،

کسی بزرگ کا قصہ ہے کہ انھوں نے اپنے خادم سے کہا کہ چلم پینے کے لیے آگ لا، اس کو آگ نہیں ملی، تو کہا دوزخ میں سے لے آ، اس نے وہاں جا کر آگ مانگی تو "مالک" داروغہ جہنم نے کہا کہ یہاں آگ واگ نہیں ہے، یہاں ہر شخص اپنی آگ اپنے ساتھ لاتا ہے، یہ ایک تمثیلی حکایت ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر شخص کی آگ اپنے ساتھ ہے۔ وہ ہمارے اعمال و اخلاق ہیں، قرآن شریف میں آتا ہے "ان الذین یاکلون أموال الیتامیٰ ظلماً إنما یأکلون فی بطونھم ناراً وسیصلون سعیراً" شریعت کے احکام بہت سے لوگوں کو معلوم ہیں، عمل کرنے کے لیے عزم اور ارادہ کی ضرورت ہے، شکر و میوہ سب موجود ہے، چولہا سلگ رہا ہے، اور آپ میرے یہاں حلوہ مانگنے آئے ہیں، البتہ آپ بارود میں بھی دیا سلائی رکھ دیں گے تو آگ نہیں جلے گی، جب تک دیا سلائی کو رگڑا نہ جائے، آگ نہیں پیدا ہوتی، ہم اپنی زبان کب تک جلائیں گے، آپ خود کیوں حلوہ نہیں پکا لیتے، جو چیز آپ سمجھتے ہیں وہ ہم میں بھی، قرآن و حدیث آپ کے گھر میں بھی ہے پھر کیوں نہیں رجوع کرتے۔

صفر ۱۳۸۸ھ کے شمارے میں ملفوظات کی جو قسط شائع ہوئی تھی اس میں جگہ کی تنگی کی وجہ سے چند ملفوظات رہ گئے تھے ذیل میں وہ بھی درج کیے جا رہے ہیں۔

۱؎ جو لوگ ظالمانہ طور پر یتیموں کا مال ہڑپ کرتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں صرف انگارے بھرتے ہیں اور یقیناً وہ دہکتی اور بھڑکتی ہوئی جہنم میں جائیں گے۔

دواؤں اور غذاؤں میں جو تاثیر و ذائقہ سینکڑوں برس پہلے تھا وہی آج بھی ہے نمک مرچ میں جو تیزی برسوں پہلے تھی وہی آج بھی ہے، آج بھی ان کو منہ میں رکھنے سے منہ کڑوا ہو جاتا ہے اور آگ سی لگ جاتی ہے، پھر نماز میں وہ تاثیر جو تیرہ سو برس پہلے تھی وہ آج کیوں نہیں ہے، کہا گیا تھا، ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر، یہ خاصیت اس میں آج بھی ہونی چاہیئے۔

غیر مسلم بھی نماز اور مسجد کا مرتبہ جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ پاک چیزیں ہیں، یہاں ہماری مسجد میں ایک موذن تھے بیچارے اذان و نماز کے پابند تھے مگر اخلاق میں کوئی تبدیلی اور ترقی نہیں ہوئی تھی، مسجد کے پاس ایک پھول دار درخت تھا اس میں پھول بہت اچھے لگتے تھے، میں نے کہا تھا کہ دیکھو کوئی یہ پھول نہ توڑے ایک دن ایک اہیر کسی ضرورت سے پھول توڑنے لگا، انھوں نے گالی دی تو کہنے لگا میاں ابھی مسجد سے نکلے ہو گالی تو نہ بکو۔

فرمایا بعض اہل علم ایسے ہیں کہ ان کے گھروں میں فرائض و احکام کا ذکر ہی نہیں ہوتا اور ان کی اولاد تک موٹی موٹی باتوں سے بے خبر ہوتی ہے، ایک مولوی صاحب کے داماد ہمارے یہاں زیور و نقد امانت رکھا کرتے تھے، بعض دفعہ بڑی رقم ہو جاتی تھی۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے کہا کہ کیا آپ اس مال کی زکوٰۃ بھی نکالتے ہیں، بہت سادگی سے کہا کہ اس کا تو کبھی گھر میں کوئی ذکر نہیں ہوا، زکوٰۃ، اور اس کا ان کے گھر میں ذکر ہی نہ ہو؟ اس پر مجھے یہ لطیفہ یاد آگیا کہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بمبئی کے ایک تاجر نے مسجد کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے بمبئی کی دعوت دی، والد صاحب کی طبیعت میں جہاں بہت جلال تھا وہاں سادگی بھی بہت تھی، بلا اطلاع تشریف لے گئے، ہم لوگ بھی ساتھ تھے، بمبئی میں ایک صاحب نے جو بھائی صاحب مرحوم کے سسرالی رشتہ دار ہوتے تھے اور عرصہ تک ہمارے گھر پر رہے تھے، انھوں نے دیکھ لیا، پیچھے پڑ گئے کہ ہمارے گھر تشریف لے چلئے، ہم کو گھر بیٹھے دولت

لہ تمھارے لئے جنت میں وہ سب کچھ ہے جو تمھاری طبیعت چاہتی ہے اور جو تم مانگتے ہو۔

جل گئی ہے آپ کہاں یہاں آتے اور ہمارے گھر تشریف لاتے، والد صاحب نے بہت عذر
کیا کہ ہم کو خاں صاحب نے بلایا ہے، وہیں جائیں گے مگر وہ نہ مانے اور اصرار کیا کہ کم از کم
ایک روز تشریف رکھیں، ہم لوگ گھر پہونچے سب چپ چاپ بیٹھ گئے، والد صاحب بھی مراقب
وہ بھی مراقب، کھانے کا کوئی ذکر فکر نہیں، جب بہت دیر ہوگئی اور بھوک نے ستایا تو والد صاحب
رحمۃ اللہ علیہ نے جیب سے ایک نوٹ نکال کر شفیع اللہ خاں صاحب کو جو ہمراہ تھے دیا کہ بازار
سے کھانا لے آؤ، وہ صاحب چونکے اور کہنے لگے کھانا اب کھانے کا انتظام تو مجھے کرنا تھا میرا گھر تھا
شفیع اللہ صاحب کچھ ٹھٹکے والد صاحب نے فرمایا یہ تو بے وقوف ہیں، تم بے وقوف نہ بنو
غرض کھانا آیا اور ان صاحب نے بھی بیٹھ کر کھایا، یہی قصہ زکوٰۃ کا ہوا کہ سب کچھ ہوتا رہا مگر اسکا ذکر
ہی نہیں کیا، زکوٰۃ کا ذکر تو جب پیدا ہوئے تھے جبھی آگیا تھا وہ تو کلمہ کے ساتھ ہی آگیا
تھا، ایک بزرگ جو رقم آتی تھی دے دیا کرتے تھے کبھی رکھتے نہ تھے، ایک مرتبہ رکھنا
شروع کیا، خدام نے سمجھا مزاج بدل گیا ہے، جب مال زکوٰۃ کے قابل ہوا تو زکوٰۃ دے
کر سب خیرات کر دیا، فرمایا میں زکوٰۃ ادا کرنے کی فضیلت سے محروم تھا، اتنا مال ہی
جمع نہیں ہوتا تھا کہ زکوٰۃ مجھ پر فرض ہو، الحمدللہ ایک مرتبہ یہ سعادت بھی حاصل ہوگئی۔
پھر کبھی روپیہ جمع نہیں کیا۔ یہ ہے فرض کی ادائیگی کی فضیلت۔

درسِ قرآن

۲۳ر جون (یکشنبہ)

جہاد اور ہجرت

سے متعلق سورۂ نساء کی چند آیات

(۲)

جہاد سے متعلق سورۂ نساء کی آیات ۹۴، ۹۵، ۹۶ کی تشریح و تفسیر میں جو کچھ ۲۳ر جون کے درس میں بیان ہوا تھا وہ قارئین کرام پچھلے شمارہ میں پڑھ چکے ہیں۔ اس کے آگے کی آیات ۹۷ تا ۱۰۰ جو ہجرت سے متعلق ہیں ان کی تشریح و تفسیر والا حصہ صفحات میں گنجائش نہ رہنے کی وجہ سے پچھلے شمارہ میں نہیں آسکا تھا، وہ اب ان صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے ـــــ ان آیات کا ترجمہ اگرچہ گزشتہ شمارہ میں درج کیا جا چکا تھا لیکن آج وہ پھر پیش کیا جا رہا ہے تاکہ تشریحی بیان کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

"اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِیْۤ اَنْفُسِهِمْ ...... وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ○

سورۃ النساء آیت ۹۷ تا ۱۰۰

(ترجمہ) جن لوگوں کی روح فرشتے اس حال میں قبض کریں گے کہ انھوں نے اپنے نفسوں پر ظلم ڈھائے ہیں (اور دارالکفر میں پڑے رہنے کی وجہ سے اللہ کے احکام و مطالبات کی ادائیگی میں سخت کوتاہیاں کی ہیں) وہ ان سے پوچھیں گے کہ تم کس حال میں تھے؟ وہ کہیں گے کہ ہم اپنے وطن اور ماحول میں بالکل عاجز اور بے بس تھے (اس لیے

اسلامی احکام پر نہیں چل سکتے تھے اور مسلمانوں والی زندگی نہیں گزار سکتے تھے
فرشتے کہیں گے کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم کسی طرف ہجرت کر جاتے ان لوگوں
کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے (۹۷)
البتہ وہ عاجز ولاچار مرد، عورتیں اور بچے جو ہجرت کی اور ان حالات
سے نکلنے کی کوئی تدبیر نہیں کر سکتے اور کوئی راستہ نہیں پا سکتے ہیں (وہ عنداللہ
معذور ہیں) (۹۸)
توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرما دے گا اور اللہ بہت معاف
فرمانے والا اور بڑا بخشنے والا ہے (۹۹)
اور جو کوئی راہ خدا میں ترک وطن کر کے نکلے (اس کے لیے اللہ کا فیصلہ
ہے کہ) وہ اللہ کی زمین میں (چلنے پھرنے اور رہنے بسنے کے لیے) وسیع میدان
اور پوری کشادگی اور فراخی پائے گا۔ اور جو کوئی چل نکلا اپنے گھر سے اللہ اور
رسول کے لیے ہجرت کر کے پھر آ جائے اس کو (راستہ ہی میں) موت تو راہ خدا
میں صرف قدم اٹھا دینے سے اس کا اجر و ثواب اللہ کے ہاں ثابت ہو گیا
اور اللہ غفور و رحیم ہے (۱۰۰)

تفسیر و تشریح :-

ان آیات کا مطلب اور موقع محل سمجھنے کے لیے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ نبوت
ملنے کے تقریباً ۱۳ سال بعد جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ سے ہجرت
فرمائی اور مدینہ طیبہ گویا اسلام کا وطن اور آپ کی ہدایت و دعوت اور اسلامی تعلیم و تربیت
کا مرکز بن گیا تو اس وقت مدینہ طیبہ کے سوا کوئی بستی روئے زمین پر ایسی نہیں تھی۔
جہاں اسلامی احکام کے مطابق زندگی گزاری جا سکے اور اسلامی زندگی دیکھی اور سیکھی
جا سکے، اس لیے اسلام قبول کرنے والے ہر شخص کے لیے اُس وقت ضروری تھا کہ وہ
اپنا کافرانہ و مشرکانہ ماحول اور غیر اسلامی وطن چھوڑ کر مدینہ ہی میں آ بسے ۔۔۔۔ الغرض

اُس وقت ہجرت بھی نماز روزہ کی طرح ہر مسلمان پر فرض تھی بلکہ گویا ایمان و اسلام کی لازمی شرط تھی، صرف وہی لوگ اس سے مستثنیٰ تھے جو کسی وجہ سے ہجرت سے بالکل ہی مجبور تھے۔

یہ حکم فتح مکہ تک جاری رہا، ۸ھ ہجری میں جب مکہ معظمہ پر مسلمانوں کا اقتدار قائم ہوگیا جس کے بعد کفر کا زور سارے عرب میں ٹوٹ گیا اور ہر جگہ کے مسلمانوں کے لیے اسلامی احکام کے مطابق زندگی گزارنا اور اسلام کے داعیوں اور معلموں کا ہر جگہ آنا جانا آسان ہوگیا تو ہجرت کی فرضیت کا حکم منسوخ ہوگیا اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمادیا "لا هجرة بعد فتح مكة" (فتح مکہ کے بعد ہجرت کی فرضیت ختم ہوگئی)

سورۂ نساء کی یہ چار آیتیں اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِھِمْ" سے لے کر اِنَّ اللّٰہَ کَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا" تک اُسی دور میں نازل ہوئی تھیں جب دارالکفر میں اسلام قبول کرنے والے ہر شخص کے لیے ہجرت کر کے مدینہ آجانا نماز کی طرح ایک دینی و ایمانی فریضہ تھا۔ ان آیتوں میں ان لوگوں کو جنہوں نے کافروں کے علاقہ میں رہتے ہوئے اسلام قبول کرلیا تھا اور ہجرت کے حکم پر ابھی تک عمل نہیں کیا تھا بلکہ اپنے علاقوں ہی میں دورہ بس رہے تھے، نہایت موثر انداز میں ہجرت پر ابھارا گیا ہے اور ہجرت نہ کرنے کے نہایت سخت انجام سے ان کو ڈرایا گیا ہے۔

پہلی آیت "اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِھِمْ قَالُوْا فِیْمَ کُنْتُمْ۔ الآیۃ" میں بتایا گیا ہے کہ موت کے فرشتے جب اُن لوگوں کی روح قبض کریں گے جو اسلام قبول کر لینے کے بعد بھی کفر و جاہلیت کے ماحول میں رہ کر غیر اسلامی زندگی گزار رہے ہیں تو ان سے بطور عتاب کے پوچھیں گے "فِیْمَ کُنْتُمْ" (یعنی تم کس حال میں تھے اور کیسی زندگی گزار رہے تھے، کیا اسلام والی زندگی جس کو تم نے قبول کیا تھا یا کافروں والی غیر اسلامی زندگی جو تمہارے علاقہ اور ماحول کی زندگی تھی؟ —— تو فرشتوں کے اس سوال کے جواب میں یہ لوگ کہیں گے "کُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ" یعنی ہم اپنے ملک اور اپنے وطن میں بالکل دبے ہوئے اور بے بس تھے، وہاں کے حالات میں اسلامی زندگی گزارنے کی ہمارے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں تھی، اس لیے مجبوراً اپنے اس غیر اسلامی

ماحول کے مطابق ہی زندگی گزار رہے تھے ــــ فرشتے ان کے اس عذر کو ناقابل قبول قرار دیتے ہوئے اسی عتاب آمیز انداز میں ان سے کہیں گے اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ۔ کیا خدا کی زمین تمہارے لیے وسیع نہ تھی کہ تم کسی طرف کو ہجرت کر جاتے اور ایسی کسی جگہ چلے جاتے جہاں اسلامی طریقہ پر زندگی گزار سکتے ؟

آیت کے اس جزو سے صاف ظاہر ہے کہ فرشتوں کا یہ عتاب آمیز سوال و جواب ان لوگوں سے ہوگا جن کے لیے ہجرت کے امکانات تھے لیکن انھوں نے اس لیے ہجرت نہیں کی کہ اس میں انھیں مال و جائداد کی جو قربانی دینی پڑتی اور ترک وطن کی وجہ سے جو تکلیفیں اٹھانی پڑتیں وہ ان کے لیے آمادہ نہیں ہوئے، یعنی ان کی عافیت طلبی اور مال و جائداد وغیرہ کی محبت نے انھیں ہجرت سے روکے رکھا، ورنہ اگر وہ مؤمنین صادقین کی طرح ان سب باتوں سے بے پروا ہو کر ہجرت کے لیے تیار ہو جاتے تو کر سکتے تھے ــــ آگے کی آیت میں ان لوگوں کا یہ انجام بتلایا گیا ہے "فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا" یعنی ان کے اس گناہ عظیم کی کہ انھوں نے امکان و استطاعت کے باوجود ہجرت نہیں کی اور دار الکفر کو اپنا وطن بنائے رکھا، آخرت میں سزا یہ ہوگی کہ معاذ اللہ جہنم ان کا ٹھکانا اور وطن بنے گا اور اس کا بے پناہ دکھ اور عذاب انھیں بھگتنا ہوگا۔

تنہا اسی ایک آیت سے سمجھا جا سکتا ہے کہ اس دور میں ہجرت کی کتنی اہمیت تھی۔ بعض علماء اور مفسرین نے لکھا ہے کہ اس دور میں ہجرت فرض و واجب ہونے کے علاوہ اسلام کا شعار بھی تھی اور اسی لیے ہجرت کے بغیر کسی شخص کو قانونی طور پر مسلمان نہیں مانا جاتا تھا، لیکن اگر یہ نہ بھی کہا جائے تو اتنی بات تو اس آیت سے بالکل ظاہر ہے کہ اس وقت ہجرت نہ کرنا شدید ترین معصیت تھی "فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا" ایسی وعید ہے کہ قرآن پاک میں زانیوں اور شرابیوں کو بھی غالباً اتنی سخت وعید نہیں سنائی گئی بلکہ قرآن پاک میں اکثر و بیشتر مقامات پر کافروں اور مشرکوں ہی کا یہ انجام بتایا گیا ہے۔

اسکے بعد والی آیات میں فرمایا گیا ہو کہ کسی کافرانہ علاقہ میں اسلام قبول کرنیوالے جو لوگ اور جو عورتیں بچے اپنے خاص حالات کیوجہ سے ہجرت کرنے سے فی الواقع بالکل ہی مجبور ہوں اور انکے لیے ہجرت کی راہیں بالکل ہی مسدود ہوں، وہ بے شک عنداللہ معذور اور قابل معافی ہیں۔ ارشاد ہے:

إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا فَأُولَٰئِكَ عَسَى اللَّهُ أَن يَعْفُوَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللَّهُ عَفُوًّا غَفُورًا ○

یعنی کفر و شرک یا الحاد کے ماحول میں دبے ہوئے جو مجبور و بے بس لوگ (مرد عورتیں اور بچے) واقعۃً اس حالت میں ہوں کہ وہ ہجرت کر ہی نہ سکتے ہوں اور اپنے علاقوں سے نکلنے کے راستے ان کیلئے بالکل ہی بند ہوں تو اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم سے امید ہے کہ ایسے مجبور لوگوں کے ہجرت نہ کرنے کو وہ معاف فرمادے گا کیونکہ قصوروں کو معاف کرنا اور مجرموں کو بخش دینا اس کی صفت اور شان ہے۔ عَسَى اللَّهُ أَن يَعْفُوَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللَّهُ عَفُوًّا غَفُورًا

اس آیت میں اگرچہ ان معذورین کو ہجرت نہ کرنے پر مواخذہ اور عذاب سے مستثنیٰ کیا گیا ہے لیکن اس استثناء کے لیے بھی انداز بیان ایسا اختیار کیا گیا ہے جس سے ہجرت کے حکم اور مطالبہ کی شدت اور اہمیت اور زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ ان معذورین کے لیے یہ نہیں فرمایا گیا کہ یہ لوگ اپنی مجبوری و بے بسی کی وجہ سے عنداللہ معذور ہیں بلکہ فرمایا گیا "عَسَى اللَّهُ أَن يَعْفُوَ عَنْهُمْ الآية" جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ قصوروں کو معاف کرنے والا اور گناہوں کو بخشنے والا ہے اور یہ اس کی خاص شان اور صفت ہے اس لیے اس سے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ ان معذورین کے ترک ہجرت کے قصور کو معاف کردے اور مواخذہ نہ فرمائے ——— گویا ان معذورین کو بھی سمجھنا چاہیے کہ ہجرت نہ کرنے کی وجہ سے ہم قصوروار ہیں اور ہمیں اللہ تعالیٰ کے دامن عفو و مغفرت ہی میں پناہ مل سکتی ہے۔

اس کے آگے ہجرت کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ فرمایا گیا ہے اور گویا ضمانت دی گئی ہے کہ جب وہ اللہ کی رضا جوئی کے لیے اپنا کافرانہ وطن چھوڑ کر نکل کھڑے ہوں گے تو ان کو رہنے سہنے اور آزادی سے زندگی گزارنے کے لیے وسیع میدان بھی ملیں گے اور فراخی اور کشائش بھی نصیب ہوگی یعنی چھوڑے

ہونے کا قرانہ وطن کی جگہ انہیں زیادہ اچھا اور وسیع وطن بھی ملے گا اور رزق وغیرہ اسباب حیات بھی فراوانی کے ساتھ عطا ہوں گے۔ ارشاد ہے "وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً" (اور جو کوئی راہ خدا میں ترک وطن کرکے نکلا اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ وہ اللہ کی زمین میں آزادی سے رہنے بسنے کے لیے بہت میدان اور پوری فراخی اور کشادگی پائے گا۔)

اس کے بعد اس سلسلہ کی آخری آیت یہ ہے "وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا"

اس آیت میں مہاجرین کو ایک بڑی خوشخبری سنائی گئی ہے، اوپر والی آیت میں ان کے لیے دنیاوی خوش انجامی کی ضمانت کا ذکر فرمایا گیا تھا۔ اس آخری آیت میں اخروی خوش انجامی کی بشارت سنائی گئی ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ ورسول کے لیے ہجرت کرنے والا صاحب ایمان بندہ جب ہجرت کی نیت سے پہلا قدم اٹھاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں مہاجر لکھ لیا جاتا ہے اور آخرت میں مہاجرین کے لیے جس ثواب عظیم اور جن بلند درجات کے وعدے ہیں ان کا مستحق ہو جاتا ہے، منزل تک پہونچنا بلکہ آدھا یا چوتھائی راستہ طے کرنا بلکہ میل دو میل بھی اپنے گھر سے نکل جانا شرط نہیں ہے، اگر بالفرض گھر سے نکلتے ہی وہ مہاجر بندہ کسی حادثہ کا شکار ہو جائے اور اس کی موت واقع ہو جائے تو اس کو آخرت میں وہ سب کچھ ملے گا جس کا مہاجرین کے لیے وعدہ ہے ــــ مثلاً حدیث شریف میں ہے "اِنَّ الْهِجْرَةَ تَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهٗ" (یعنی ہجرت کے عمل کی برکت سے پچھلے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں) تو اس شخص کے بھی سارے گناہ معاف ہو جائیں گے، اسی طرح وہ اللہ تعالیٰ کی ان خاص الخاص رحمتوں اور عنایتوں کا مستحق ہوگا جو مہاجرین کے لیے مخصوص ہیں اگرچہ اللہ کے اس بندے کا دارالکفر ہی میں انتقال ہو گیا ہو اور وہ وہیں دفن کر دیا گیا ہو لیکن ہجرت کی نیت سے پہلا قدم اٹھانے کے بعد وہ اللہ کے یہاں مہاجر لکھ گیا اور قیامت میں وہ مہاجرین ہی کے زمرہ میں اٹھے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایسے بعض واقعات پیش بھی آئے۔ تفسیر معالم التنزیل میں امام بغوی نے نقل فرمایا ہے کہ ایک صاحب جندع ابن ضمرہ تھے۔ یہ مکہ معظمہ میں اسلام قبول کر چکے تھے اور بہت بوڑھے اور ساتھ ہی مریض بھی تھے۔ انھیں کسی طرح سورۂ نساء کی یہ آیتیں پہونچیں تو انھوں نے طے کر لیا کہ میں اب ایک رات بھی مکہ میں نہیں گزاروں گا اور اپنے گھر والوں سے کہا کہ مجھے اٹھا کے کسی بھی طرح یہاں سے لے چلو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینہ پہونچا دو، ان کے گھر والوں کو شاید ان کی حالت پر رحم آیا اور وہ ان کو اسی بیماری کی حالت میں لے کر چل دیئے تنعیم کہ مکہ معظمہ سے قریباً دو ڈھائی میل ہے، مکہ معظمہ سے مدینہ طیبہ جانے کے لیے تنعیم ہی کی طرف سے راستہ تھا۔ یہ بڑے میاں تنعیم ہی تک پہونچے تھے کہ وہیں انتقال ہو گیا۔ اسی طرح کے اور بھی بعض واقعات نقل کیے گئے ہیں ـــــ اس آیت کی بشارت کے مطابق ایسے سب لوگ جو اس زمانہ میں ہجرت کے لیے نکلے اور مدینہ طیبہ پہونچنے سے پہلے ہی راستہ میں ان کا انتقال ہو گیا، اللہ کے یہاں مہاجرین میں ہیں۔

ابھی میں نے ذکر کیا تھا کہ ہجرت کی فرضیت کا حکم اس وقت ختم ہو گیا جب مکہ معظمہ پر مسلمانوں کا اقتدار قائم ہو گیا اور اس کے بعد پورے ملک عرب میں کفر کا زور ٹوٹ گیا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اعلان فرما دیا "لَا ھِجْرَۃَ بَعْدَ فَتْحِ مَکَّۃَ" (مکہ کے فتح ہو جانے کے بعد ہجرت کا حکم نہیں رہا) اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب قیامت تک کبھی اور کسی حال میں بھی ہجرت فرض نہیں ہو گی بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ فتح مکہ سے پہلے جو خاص حالات تھے اور ان حالات کی وجہ سے جو ہجرت کا حکم تھا، ان حالات کے خاتمہ کے ساتھ وہ حکم بھی اٹھا لیا گیا، لیکن اگر دنیا کے کسی حصہ میں وہاں کے رہنے والے مسلمانوں کے لیے کسی وقت ایسے حالات ہو جائیں کہ وہاں اسلامی طریقہ پر زندگی گزارنے کا امکان باقی نہ رہے تو وہاں کے مسلمانوں پر اسی طرح ہجرت فرض ہو گی جس طرح فتح مکہ سے پہلے مکہ وغیرہ میں اسلام قبول کرنے

والوں پر فرض تھی ——— حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہمعصر ہیں اور شاہ صاحب ان کو بیہقیٔ وقت فرمایا کرتے تھے' ان کی تفسیر مظہری" قدیم طرز کی تفسیروں میں بہترین تفسیر ہے اور اسی تفسیر سے اُن کے علمی تبحر کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے اپنے مرشد حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے نام نامی پر اپنی تفسیر کا نام تفسیر مظہری رکھا ہے' اسی تفسیر مظہری میں ہجرت سے متعلق سورۂ نساء کی آیت اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِھِمْ الآیۃ کی تفسیر فرماتے ہوئے حضرت قاضی صاحب نے لکھا ہے۔

ان الھجرۃ من دار الکفر علیٰ من قدر علیہا فریضۃ محکمۃ بالاجماع غیر منسوخۃ وھذہ الآیۃ دلیل علیٰ وجوب الھجرۃ من موضع لا یتمکن فیہ اقامۃ شرائع الاسلام	یعنی دار الکفر جہاں اسلامی احکام کے مطابق زندگی گزاری جاسکتی ہو' اس سے ہجرت کرنا فرض ہو' اس پر اجماع ہے یہ حکم قطعی ہے اور منسوخ نہیں ہوا ہے۔ اور یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ جس ملک اور جس علاقہ میں احکام اسلامی پر نہ چلا جاسکے اور ان کے مطابق زندگی نہ گزاری جاسکے وہاں سے ہجرت کرجانا واجب ہے۔

اب سے قریباً ۵۰ سال پہلے جب روس میں بالشویک حکومت قائم ہوئی تھی تو وہاں کا حال مختلف ذریعوں سے ایسا ہی سنا جاتا تھا' بخارا وغیرہ کے لاکھوں مسلمان اسی لیے اپنے علاقوں سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے' ان کی ایک بڑی تعداد ہندوستان بھی آئی تھی' اُن کے بیانات سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہاں کی بالشویکی حکومت میں اسلامی احکام کے مطابق زندگی گزارنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اور سب سے زیادہ مستند بیان اس سلسلہ میں مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کے رفیق خاص اور معتمد سکریٹری ظفر حسن ایبک کا ہے' جو اب سے ۴۵ سال پہلے مولانا مرحوم کے ساتھ ہی کابل سے روس گئے تھے اور چند سال تک وہاں رہے اور مولانا ہی کی ہدایت سے وہاں انھوں نے ایک سرکاری کالج میں داخلہ بھی لے لیا تھا' وہ الحمد للہ ابھی حیات ہیں' روس سے وہ ترکی چلے گئے

تھے جہاں مولانا سندھی مرحوم ان سے پہلے پہونچ چکے تھے، پھر مولانا مرحوم تو ترکی سے حجاز چلے گئے اور چند سال وہاں رہ کر غالباً ۱۹۳۸ء میں تقریباً ۲۵ سال کی جلاوطنی کے بعد ہندوستان آئے اور چند سال کے بعد سندھ ہی میں انتقال فرما گئے۔ لیکن اُن کے یہ رفیق خاص اور سکریٹری ظفر حسن ایبک ترکی ہی میں رہ گئے اور وہاں کی شہریت حاصل کرکے فوج میں لے لیے گئے۔ انھوں نے اپنے اور مولانا سندھی مرحوم کے اس پورے مجاہدانہ سفر کی جو دراصل انگریز کے خلاف جہاد کے ایک منصوبہ کے تحت ۱۹۱۵ء میں شروع ہوا تھا) مفصل سرگزشت "آپ بیتی" کے نام سے لکھی ہے، اس کی دو جلدیں حال میں شائع ہوئی ہیں۔ پہلی جلد میں انھوں نے اپنی پہلی منزل کابل کے سات سالہ قیام کی سرگزشت لکھی ہے جو بڑی ہی اعبرت آموز ہے، دوسری جلد میں روس کے قیام اور پھر وہاں سے ترکی پہونچنے کا ذکر ہے۔ یہ کتاب اس لائق ہے کہ ہر اردو خواں خاص کر ہمارے عربی مدارس کے فضلاء اور کالجوں کے گریجویٹ اس کو پڑھیں، میں خود اس کتاب سے بہت متاثر ہوا۔

خیر یہ چند جملے تو میں نے ظفر حسن ایبک اور ان کی "آپ بیتی" کے تعارف کے طور پر کہہ دیے، میں بتانا یہ چاہتا تھا کہ ظفر حسن ایبک نے روس میں اپنے زمانۂ قیام کے جو حالات لکھے ہیں، ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بے چارے نماز تک علانیہ نہیں پڑھ سکتے تھے اور کسی طرح چھپ کر پڑھتے تھے تو خطرہ رہتا تھا کہ کوئی جاسوس نہ ہو۔۔۔۔۔۔ مولانا سندھی مرحوم تو روسی حکومت کے سرکاری مہمان تھے، ان کے لیے تو کوئی پابندی نہیں ہوگی، لیکن ظفر حسن جنھوں نے مولانا کی ہدایت سے وہاں کے کالج میں داخلہ لیا تھا اور ہوسٹل میں قیام تھا، ان کے لیے اس کا امکان نہیں تھا کہ کھلے طور پر نماز پڑھ سکیں یا کوئی ایسا اسلامی عمل کر سکیں۔۔۔۔۔ مجھے تحقیق نہیں کہ اب وہاں کے حالات اس لحاظ سے کیسے ہیں، سنا ہے کہ اب وہ پہلے جیسی سختیاں باقی نہیں رہی ہیں پالیسی کچھ ڈھیلی ہوگئی ہے واللہ اعلم۔

اسی طرح چین کے متعلق بھی یہی معلوم ہوا ہے کہ وہاں اسلامی زندگی گزارنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اب سے چند ہی سال پہلے جب کمیونسٹ چین نے تبت پر قبضہ

کیا تو وہاں کے دیندار مسلمانوں نے بھی یہی محسوس کیا کہ وہ چین کی کمیونسٹ حکومت میں مسلمان رہ کر زندگی نہیں گزار سکیں گے، چنانچہ انھوں نے بھی بخارا کے مسلمانوں کی طرح وطن کو خیرباد کہا اور زیادہ تر تو ہندوستان ہی آئے۔ کئی خاندان تو آپ کے شہر لکھنؤ ہی میں آ بسے تھے، لیکن بعد میں ان سے زیادہ تر حجاز وغیرہ چلے گئے۔ مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ خدا کے ان بندوں نے اپنی اس ہجرت کی وجہ سے بڑی تکلیفیں اٹھائیں، ان میں سے جو حجاز گئے، ان بیچاروں کو بھی بہت مشکل سے اور کئی سال کے بعد وہاں قیام کی قانونی اجازت مل سکی۔

میں نے اس وقت روس اور چین کا ذکر تو صرف مثال کے طور پر کیا ہے ورنہ میں کہہ یہ رہا تھا کہ دین کے دوسرے احکام کی طرح ہجرت کا حکم بھی قیامت تک کے لیے ہے اور جب کبھی کسی ملک کے حالات ایسے ہوں کہ وہاں مسلمان اپنے دینی فرائض بھی ادا نہ کر سکیں اور مسلمانوں والی زندگی نہ گزار سکیں تو ان کے لیے وہاں سے ہجرت کرنا اسی طرح فرض ہو جائے گا جس طرح فتح مکہ سے پہلے مکہ سے ہجرت کرنا فرض تھا۔

ایک سوال اور اس کا جواب :-

اس موقع پر ایک صاحب نے اثناء درس ہی میں سوال کیا کہ ہمارے ملک ہندوستان کے بارے میں موجودہ حالات میں شریعت کا کیا حکم ہے۔ کیا یہاں سے ہجرت فرض نہیں ہو؟

——— مولانا نے فرمایا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہاں کے نظام حکومت سے ہمیں بہت سی شکائتیں ہیں اور ان میں بعض شکائتیں بڑی سنگین قسم کی ہیں اور ہم ان شکائتوں میں بالکل حق بجانب ہیں اور ہم حکومت کو قصوروار سمجھتے ہیں اور ہماری جدوجہد جاری ہو اور جاری رہے گی لیکن خود ہم سے بھی حق و انصاف کا یہ تقاضا ہے کہ ہم اس کو محسوس کریں اور اس کا اعتراف کریں کہ محدود ہی قسم کی جو آزادی خاص کر مذہبی امور کے بارے میں ہمیں یہاں اب تک حاصل ہے، آج کی دنیا کے بہت سے ان ملکوں میں بھی جو مسلمانوں کے ملک کہلاتے ہیں اُس سے زیادہ آزادی حاصل نہیں ہے۔ ابھی چند روز ہوئے ایک ایسے ہی ملک کے ایک عالم دین کا جو نہایت صالح اور دین کے مخلص خادم ہیں اور میرے

اور مولانا علی میاں کے خاص دوستوں میں ہیں، خط آیا تھا اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ آپ کے ملک میں تو مسلمان مظلوم ہیں اور ہمارے ملک میں بے چارہ اسلام مظلوم ہے۔

اس سوال جواب کے بعد سلسلۂ درس جاری رکھتے ہوئے مولانا نے فرمایا

اب ہجرت کے سلسلہ میں مجھے صرف ایک بات اور ذکر کرنی ہے۔ اصل ہجرت اور حقیقی ہجرت تو وہی ہے جو کسی ایسے دار الکفر سے جہاں اسلامی زندگی نہ گزاری جا سکتی ہو کسی دوسرے ایسے علاقہ کی طرف کی جائے جہاں اسلامی ماحول ہو اور اسلامی زندگی گزارنے کی آزادی حاصل ہو، سورۂ نساء کی ان آیتوں کا تعلق اسی ہجرت سے ہے اور ظاہر ہے کہ ہمارے سامنے اس کا اس وقت کوئی سوال الحمد للہ نہیں ہے ـــــ لیکن بعض احادیث سے علماء کرام نے سمجھا ہے کہ کسی بھی اچھے مقصد کے لیے وطن چھوڑ کر نکلنا اور سفر اور پردیس کی تکلیفیں برداشت کرنا یہ بھی ایک طرح کی ہجرت ہی ہے اور ان ہجرتوں کے راستے ہمارے اور آپ کے لیے آج بھی کھلے ہوئے ہیں۔

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ جن کا میں نے ابھی ذکر کیا تھا اور جو بہت بڑے عالم دین محدث اور مفسر ہونے کے ساتھ اپنے وقت کے عارف کامل بھی ہیں۔ انھوں نے ہجرت سے متعلق سورۂ نساء کی ان ہی آیات کی تفسیر سے فارغ ہو کر آخر میں لکھا ہے

قالو کل ھجرۃٍ لِطَلَبِ علمٍ اَوحجٍّ اوجہاد او فرارٍ
الی بلدٍ یزداد فیہ طاعۃً او قناعۃً او زھداً
او ابتغاء رزقٍ طَیِّبٍ فھی ھجرۃٌ اِلی اللّٰہ و
رسولہ۔

مطلب یہ ہے کہ علم دین کی طلب میں یا حج کے لیے یا کسی دینی جدوجہد کے لیے وطن چھوڑ کر نکلنا بھی ہجرت الی اللہ و رسولہ میں شامل ہے۔ اسی طرح اپنا وطن چھوڑ کر دوسری کسی ایسی جگہ جانا جہاں رہنے سے طاعت و عبادت میں ترقی ہو اور قناعت اور زہد جیسے ایمانی اخلاق حاصل ہونے کی امید ہو جیسے طالبین پہلے خانقاہوں

میں مشائخ سے تربیت حاصل کرنے اور تزکیہ نفس کے لیے جایا کرتے تھے، الغرض اس طرح کے سارے سفر بھی ہجرت میں شامل ہیں اور آخری بات یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حلال روزی کی تلاش میں بھی اپنا گھر چھوڑ کر پردیس جائے اور اس کی نیت یہی ہو کہ وہاں جا کر حلال روزی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا تو فرماتے ہیں کہ یہ بھی ایک درجہ کی ہجرت ہے

الغرض کسی بھی ایسے نیک مقصد کے لیے جو اللہ و رسول کو پسند ہو دیس چھوڑ کر پردیس جانا اور سفر کی صعوبتیں اٹھانا "ھجرۃ الی اللہ و رسولہ" کے وسیع مفہوم میں شامل ہے —— اور یہ ہجرت کی وہ شکلیں ہیں جن کے دروازے ہم سب کے لیے اس وقت بھی کھلے ہوئے ہیں۔ یہ بڑی محرومی کی بات ہے کہ جو نہ ہو سکتا ہو اس کی تو آرزو کریں اور جو ہو سکتا ہے اسے حقیر سمجھیں اور اس سے غفلت برتیں — اللہ تعالیٰ ہم سب کو عقل سلیم نصیب فرمائے۔

ہجرت سے متعلق ان آیات کے بعد پورا ایک رکوع سفر کی "نماز قصر" اور حالت جنگ کی "صلوٰۃ خوف" سے متعلق ہے۔ (باقی)

آخری قسط

سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ

مکتوبات، علمی و ادبی تبرکات (۵)

(مرتبہ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

حضرت شاہ صاحب کا عربی کلام

بیاض رشیدی میں ۷ صفحات پر حضرت شاہ صاحب کا منظوم کلام درج ہے۔ میں نے اس حصۂ نظم میں سے دو نظمیں نقل کر لی تھیں ان نظموں کی فصاحت و بلاغت، سلاست و روانی، سوز و گداز اور کیف و دل آویزی ادب عربی سے ادنیٰ مناسبت رکھنے والے کو بھی محسوس ہو جائے گی۔ الفاظ کی بندش میں ترنم انگیزی اور وجد آفرینی کی کیفیت نمایاں ہے۔ کتنا کچھ کلام ہوگا جو دست برد زمانہ سے ضائع ہو گیا۔ اب جتنا بھی مل جائے غنیمت ہے۔ ترجمہ اشعار کے ساتھ لکھا جائے گا لیکن حق بات یہ ہے کہ اردو میں اس کلام کی پوری کیفیات منتقل کرنے میں کم از کم میں تو کامیاب نہ ہو سکوں گا۔ پہلی نظم عاشقانہ ہے اور مجازی رنگ میں ہے۔ کہیں کہیں حقیقت و معرفت کا رنگ بھی جھلک رہا ہے۔ دوسری نظم کے چھ اشعار قصیدۂ نعتیہ کی تشبیب اور تمہید کے طور پر ہیں اس کے بعد نعتیہ اشعار ہیں۔ یہ نعتیہ قصیدہ یا تو لکھا ہی مختصر ہوگا یا اس کے اور اشعار بھی ہوں گے جو بیاض میں شامل نہیں کئے گئے۔

(۱) ایا نسیم الشمال اذکر لقصۃ الشوق فی حماہ — فان قلبی یذوب غما و حال جسمی کما تراہ

اے باد شمال تو میرا قصۂ شوق محبوب کی بارگاہ میں سنا دیجئے۔ میرا قلب غم سے پگھل رہا ہے اور میرے جسم کا جو حال ہے وہ تجھے نظر آ ہی رہا ہے۔

(۲) تبیت جفنی بلا منام و ما دمعی علی انسجام — و نار شوقی علی اضطرام ولیس لی منیۃ سواہ

میری پلکیں بغیر نیند کے رات گذارتی ہیں میرے آنسو مسلسل بہہ رہے ہیں میری آتش شوق بھڑک رہی ہے اور میری کوئی آرزو محبوب کے علاوہ نہیں ہے۔

(۳) اغوص بالدمع فی بحار و مہجتی فی خلال نار — فکیف اشکو الی عداہ علی ما قد جنت یداہ

آنسوؤں کی کثرت کے باوجود میری جان آگ کے درمیان ہے۔ میں اس جور و ستم کا شکوہ کسی غیر سے کیسے کروں جو اس نے میرے اوپر روا رکھا ہے۔

(۴) اتی رسولی بلا جواب و سلام و لا خطاب — فما رجائی کما بدا لی و لست ادری لقرار ما ہو

میرا قاصد بغیر جواب لئے اور اسکی جانب سے سلام و پیام کا تحفہ لئے بغیر واپس آگیا۔ میرا حال خود مجھ پر منکشف ہوا اور مجھے معلوم نہیں کہ قرار کیا ہوتا ہے۔

(۵) سلوہ عنی بای ذنب اباح قتلی و ہتک ستری — ولیس ذنبی سوی ہواہ و لا ہمی غیر ان اراہ

اس سے دریافت کرو کہ اس نے میرے کس گناہ کی پاداش میں میرا قتل مباح کر دیا اور میرا راز فاش کر دیا۔ میرا گناہ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور اسکے دیدار کے علاوہ میرا کوئی مسلک نہیں۔

(۶) اقوم شوقا اذا بدت لی کلاب حیی لما مقامہ — ولو عدوی جری بفیہ لذیذ ذکرہ لثمت فاہ

میں کوئے محبوب کے کتوں کو بھی دیکھتا ہوں تو فرط شوق میں کھڑا ہو جاتا ہوں۔ میرا دشمن بھی میرے محبوب کا ذکر شیریں کرے تو میں اس کا منھ چوم لوں۔

فلی غرام لہ دوام بلا تمام ولا انفصام   وفی فوادی خیال وجہ تنور الکون من سناہ (۷)

میری شیفتگی دوامی ہے ختم ہونے والی نہیں ہے اور میرے دل میں ایک ایسے چہرے کا خیال ہے جس کی روشنی سے عالم کون ومکاں جگمگا گیا۔

الی متی الصبر فی صیاح وفی بکاء وفی نیاح   ولا استماع ولا التفات ولا اعتذار ولا انتباہ (۸)

میں کب تک غم میں روتا، چیختا اور چلاتا رہوں اور دوسری طرف سے استماع، التفات، اعتذار اور انتباہ کا معاملہ بالکل نہ ہو۔

---

(۱) الا یا عاذلی دم فی ملامی   فانی لا احول عن الغرام

اے ملامت کرنے والے تو خوب ڈٹ کر مجھے ملامت کرلے۔ میں عشق وعاشقی سے باز آنے والا نہیں ہوں۔

(۲) فجفنی ساہر ما دمت حیاً   وقلبی ہائم والدمع ہام

جب تک میں زندہ ہوں میری آنکھ انتظارِ دوست میں جاگتی رہے گی۔ میرا قلب حیران اور آنسو جاری رہیں گے۔

(۳) فیا ریح الصبا عطفاً ورفقاً   الی ذاک الحمیٰ بلغ سلامی

اے بادِ صبا نہایت محبت اور نرمی کے ساتھ اس کی بارگاہ میں میرا سلام پہونچا دے۔

(۴) وقل یا اہل ودی فی ہواکم   مضی شہری وایامی وعامی

اور یہ بھی کہدے کہ اے دوستو تمھارے عشق وفراق میں میرے سال، ماہ اور دن گذر رہے ہیں۔

(۵) وصرت بعدکم کالعود جسمی   علی نار ودمعی فی انسجام

میں تمھاری جدائی کے غم میں سوکھی لکڑی کے مانند ہو گیا ہوں، میرا جسم آتش سوزاں پر ہے اور میری آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں۔

(۶) فان عدتم بوصلی والتیام   فاہلاً بالعناق وبالتزام

اگر تم اپنی ملاقات سے شادکام کرتے ہو تو فبہا۔

(۷) وان جرتم علی، فلی غیاث بباب المصطفیٰؐ خیر الانام

ورنہ اگر تم بدستور سابق میرے اوپر جبر ائی کا ظلم وجور جاری رکھنا چاہتے ہو تو میں خیر الانام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بابِ عالی پر فریاد کر دوں گا۔

(۸) والیہ توجہی ولہ، استنادی وفیہ مطامعی وبہ اعتصامی

دراصل ان کی ذاتِ عالی میری توجہ کا مرکز ہے اور وہی میرا سہارا ہیں اور انھیں سے مجھے غرض ہے اور انھیں کا دامن میرے ہاتھ میں ہے۔

(۹) فمن لی بعد ما وہنت عظامی واستشد البلاء سواک حامی

اے سرکار رسالتمآب میری ہڈیاں جب کہ کمزور ہو گئیں اور مجھ پر سخت بلاؤں کا ہجوم ہے ایسے وقت میں میرا کون حامی ہو سوائے آپ کے۔

(۱۰) فان اک ظالماً عظمت ذنوبی فحبک سیدی ماحی الآثام

میں نے مانا کہ میں اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہوں اور میرے گناہ بہت بڑھے ہوئے ہیں مگر آپ کی محبت بھی تو گناہوں کو مٹانے والی ہے۔

فقد اعطیت ما لم یعط خلق علیک صلوٰۃ ربک بالسلام

حضورؐ! آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ کچھ عطا کیا گیا ہے جو اوّلین و آخرین میں سے کسی کو نہیں دیا گیا۔ آپ پر (لاکھوں) درود اور (لاکھوں) سلام۔

مکتوب شاہ صاحبؒ بنام مولانا کفایت اللہ[۱] مراد آبادیؒ

مولوی صاحب عالی مراتب مولوی صاحب عالی مراتب مجمع حسنات

[۱] مولانا کفایت اللہ حنفی مراد آبادیؒ۔ ایک جید نعت گو عالم تھے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مجمع حسنات و مناقب مہربان فقراء	مناقب مہربان فقراء ـــ اللہ تعالیٰ
سلمہ اللہ تعالیٰ ـــ زاد فاضل علیکم	تم کو سلامت رکھے اور تم پر پے در پے
برکاتہ، بعد السلام والتحیۃ والادعیۃ	برکات نازل فرمائے۔ بعد سلام
الصافیۃ الزکیۃ مکشوف خاطر صفا	وتحیۃ اور بعد دعا ہائے مخلصانہ
ذخائر باد کہ عنایت نامہ بہجت	واضح ہو کہ عنایت نامہ بہجت
شمامہ پس از وقوع فترات طویلہ	شمامہ بڑی مدت کے بعد پہونچا۔
کہ اسباب آنہا را خود در رقیمہ کریمہ	تاخیر تحریر کے جو اسباب تم نے
تحریر فرمودہ اند و از یں طرف	اپنے خط میں تحریر کئے ہیں۔ اس
نیز ہماں اسباب بعینہا صورت	طرف بھی بالکل ایسے ہی اسباب

(بقیہ حاشیہ ۲ؔ) نسیم خلد (شرح منظوم شمائل ترمذی) اور نسیم جنت (منظوم در فضیلت درود شریف) نیز ایک دیوان نعتیہ اور چند رسائل مدح رسولؐ اور ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اردو زبان کے اندر ان کی تصنیفات میں سے ہیں ۱۲۷۳ھ میں وفات پائی۔

(نزہۃ الخواطر جلد ہفتم بحوالہ مہر جہاں تاب) عام طور پر یہ مولانا کفایت علی کے نام سے مشہور ہیں کافی تخلص تھا ۱۸۵۷ء مطابق ۱۲۷۳ھ میں انگریز نے بغاوت کے جرم میں ان کو پھانسی دی ـــ تفصیلی حالات باوجود تفتیش کے معلوم نہ ہو سکے ـــ یہ مکتوب احقر نے مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی مرحوم کے ذخیرہ مخطوطات میں رکھے ہوئے ایک کاغذ سے نقل کر لیا تھا ـــ اس مکتوب کو بعض اور کتب خانوں میں قلمی مجموعہ افادات شاہ عبد العزیزؒ میں دیکھ چکا ہوں۔ بیاض رشیدی کے مندرجات ختم کرنے کے بعد میں نے مناسب سمجھا کہ اس کو بھی یہاں تبرکات عزیزیہ میں شامل کر دوں ـــ ابھی تھوڑا سا یہ خلجان ہے کہ مولانا کفایت اللہ اور مولانا کفایت علی کافی مراد آبادی کہیں علیحدہ علیحدہ دو شخصیتیں تو نہیں ـــ ہے اگرچہ صاحب نزہۃ الخواطر نے مہر جہاں تاب کے حوالے سے جو تحریر فرمایا ہے اس سے دونوں نام ایک ہی شخصیت کے معلوم ہوتے ہیں۔

تحقق گرفتہ ــ وصولِ عزت شمول نمود ــ بدریافت نوید عافیت، کسب جمعیت کردہ ــ حق تعالیٰ مدام شمولِ عافیت و انعام خود دارد بالنبی و آلہ الامجاد ــــــ

تحریر احوالِ مزاجِ فساد امتزاج و تزایدِ اعراض و استحکام امراض از انجا کہ مورثِ ملال خاطرِ محبّان و مشفقان است قلم انداز ساختہ عنانِ ادہم قلم بصوب مقصودِ اصلی معطوف می نماید ـ مہربانِ من وقتِ رویت ہلالِ شعبان تراکمِ (ابر) سخت و غلیظ ـ رو دادہ بود لہٰذا بست و نہم رجب، اتفاقِ رویت ہلالِ شعبان در شام آنروز علی العموم ممکن نشد ـ تا ششم شعبان بحساب آنکہ ماہِ رجب سلخ داراست، عدّ تاریخ نمودند ـ من بعد بحضور بادشاہ ثابت شد کہ غرّہ شعبان ـ روزِ پنجشنبہ بود یعنی ماہِ رجب بست و نُہ روزہ شد بارسلخ نداشت ــ چنانچہ رسومِ شبِ برات روزِ چہارشنبہ در تمام شہر اتفاق افتاد ــــ فقیر ہم

تھے رجو مانع تحریر بنے رہے، عافیت کی خوشخبری پاکر اطمینان ہوا ـ حق تعالیٰ ہمیشہ تم کو عافیت سے رکھے اور اپنے انعامات سے نوازے بطفیل حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم و آل و اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ـ

اب میں اپنے ناساز مزاج کے احوال اور زیادتی و استحکام امراض کے حالات اس بنا پر قلم انداز کرتے ہوئے کہ ان کو پڑھ کر سوائے اس کے کہ دوستوں کے قلب کو صدمہ ہو اور کچھ حاصل نہیں، اسپ قلم کی لگام کو مقصودِ اصلی کی طرف موڑتا ہوں ـ مہربان من! رویت ہلال شعبان کے وقت یہاں (دہلی میں) ابر غلیظ محیط تھا ـ ۲۹ رجب کو شام کے وقت رویت ہلال کا ہونا علی العموم ممکن نہ ہوا ـ ۶ شعبان تک اس حساب سے کہ ماہِ رجب پورے تیس دن کا ہوا ہے تاریخ کا شمار کیا گیا ـ اس کے بعد بادشاہ کے سامنے یہ ثابت ہو گئی کہ رجب کا مہینہ ۲۹ دن کا تھا چنانچہ شب برات تمام شہر میں بدھ کے دن کی گئی ــــــ

فقیر نے بھی مزید تحقیق کے لیے ایک شخص کو اللہ بندہ کفش دوز کے

بنابر مزید تحقیق، شخصے را نزد اللہ بندہ
نام کفش دوز (کہ) بحضور بادشاہ
شہادت او گزشتہ بود فرستاد
۔ او اقرار کرد کہ من بچشم خود
ہلالِ شعبان را بشام چہار شنبہ
دیدہ بودم ۔ و مقارنِ ایں حال
شخصے دیگر ازانہ وارد سکندر آباد
نیز بحضور برادر عزیز مولوی رفیع الدین
ہمیں نوع اقرار کرد و نصابِ
شہادت بکامل پذیرفت آما ہلالِ
رمضان پس شام جمعہ مکشوف و
ظاہر و نمودار گشت و کسانیکہ غرّہ
شعبان روز پنجشنبہ می گفتند حمل
بر تمامی شہر نمودند یعنی سی روز
کامل بر آمد ۔ و کسانیکہ غرّہ شعبان
روز جمعہ قرار دادہ بودند موافقاً
لتقادیم، ماہ شعبان را ناقص العدد
اعتبار کردہ اند ۔ غرضکہ پردہ
ہر دو فریق فروہشتہ ماند و خطاء
کسے متعین نشد ۔ چوں بیشتر
کار ہمیں ماہ بود و دریں ہلال ارتفاع
شبہ مطلقاً شد دیگر حاجت تفتیش
حالِ شعبان فضول نمود ۔

پاس بھیجا جس کی شہادت بحضور بادشاہ
گزری تھی، اس نے اقرار کیا کہ میں
نے بچشم خود ہلالِ شعبان بدھ کا دن
گزار کر شام کو دیکھا تھا ۔ اسی
زمانہ میں ایک شخص سکندر آباد سے
وارد ہوا اس نے برادر عزیز
مولوی رفیع الدین کے سامنے یہی
اقرار کیا (کہ میں نے بدھ کی
شام کو شعبان کا چاند دیکھا ہے)
اس طرح نصابِ شہادت کامل ہو گیا۔
بہر حال ہلالِ رمضان شام جمعہ کو
نمودار ہوا ۔ جو لوگ غرّہ شعبان
بروز پنجشنبہ کہتے تھے انھوں نے
شعبان کو تیس دن پر محمول
کیا، اور جو لوگ جنتریوں کی
موافقت میں غرّہ شعبان روز جمعہ
کو قرار دیتے تھے انھوں نے ماہ
شعبان کو ناقص العدد (یعنی ۲۹ دن
کا اعتبار کیا ۔ غرضکہ ہر دو فریق کا
پردہ ڈھکا رہا اور کسی کی خطا متعین
نہیں ہوئی ۔ چونکہ زیادہ کام اسی
ماہ (رمضان) سے تھا اور اسکے ہلال
میں شبہ مطلقاً اٹھ گیا تھا اس لیے

اما جواب مسئلہ مرقوم پس بالفعل فتویٰ
بریں روایت است کہ رویت ہر بلد بر
مردم دیگر بلد لازم است، ہرگاہ خبر
رسد قضا نمایند ـــ در فتاویٰ عالمگیری
می نویسند ولا عبرة لاختلاف
المطالع فی ظاهر الروایة
کذا فی فتاوی قاضی خان
وعلیه الفتویٰ..... وبه
کان یفتی شمس الائمة الحلوائی
قال لو رای اهلُ مغربٍ هلالَ
رمضان یجب الصومُ علیٰ اهلِ
مشرق کذا فی الخلاصة
ـــ بعضے فقہاء حنفیہ ہم
موافقاً للشافعیہ اختلاف مطالع
را اعتبار کردہ اند و گفتہ کہ اگر
اہلِ دہلی ہلالِ رمضان را بہ بینند
و بآں حساب روزہ گیرند اہلِ
مرادآباد و رامپور را کہ ہلال ندیدہ
باشند بآں حساب روزہ گرفتن لازم
نیست بلکہ ایشاں را رویتِ خود
کافیست ـ لیکن ایں قدر ملاحظہ
(باید) داشت کہ بلد مقدم الرویت
جانبِ مغرب باشد و بلد متاخر الرویت

حال شعبان کی مزید تحقیقات کرنی فضول
سمجھی گئی ـــ رہا جواب مسئلہ مرقومہ کا
پس اس کا مدار اس روایت پر ہے کہ
رویت ہر شہر کی دوسرے شہر والوں پر
لازم ہوتی ہے ..... فتاویٰ عالمگیری
میں ہے ـ "اختلاف مطالع کا کوئی
اعتبار نہیں جیسا کہ فتاویٰ قاضی خاں
میں ہے ....اور اسی پر فتویٰ ہے۔
شمس الائمہ حلوائی بھی یہی فتویٰ دیا
کرتے تھے ـــ ان کا قول ہے کہ
اگر اہلِ مغرب رمضان کا چاند دیکھ
لیں تو اہلِ مشرق پر روزہ واجب
ہو جاتا ہے، جیسا کہ خلاصہ میں مرقوم
ہے"۔ بعضے فقہاء حنفیہ نے شافعیہ کی موافقت
میں اختلاف مطالع کا اعتبار کیا ہے۔
اور کہا ہے کہ اگر مثلاً اہلِ دہلی رمضان
کا چاند دیکھ لیں اور اس حساب سے
روزہ رکھیں تو اہلِ مرادآباد اور
اہلِ رامپور کو (جو مشرق میں ہیں) جنہوں
نے چاند نہیں دیکھا اس حساب سے
روزہ رکھنا لازم نہیں بلکہ ان کو اپنی
رویت کافی ہے ـــ یہ بات ملحوظ
رکھنا چاہیے کہ وہ شہر جس میں رویت

جانب مشرق باشد.........	پہلے ہوئی ہے جانب مغرب میں ہو اور
.... زیرا کہ ہلال	وہ شہر جس میں رویت بعد کو ہوئی ہو
بجانب مغرب است پس ایں معنیٰ	جانب مشرق میں ہو ــــ اس لیے کہ
ممکن نیست کہ مغربیاں نہ بینند و	ہلال جانب مغرب میں ہوتا ہے لہٰذا یہ
مشرقیاں مشاہدہ نمایند دوم آنکہ	نہیں ہو سکتا کہ مغرب والے نہ دیکھیں
فاصلہ درمیان بلد مغربی و بلد مشرقی	اور مشرق والے دیکھ لیں، دوسرے
بقدر تفاوت...... باشد تا تفاوتِ	یہ کہ فاصلہ، بلادِ مغربی اور بلادِ مشرقی
اُفق بہم رسد و بدونِ ایں شرط	کے درمیان اسقدر: (پڑھنے میں
اختلافِ بلدان را اعتبار نیست و	نہیں آیا) ہو کہ تفاوتِ اُفق ثابت ہو سکے
قُریٰ و قصبات ہر شہر بالاجماع	بغیر اس شرط کے اختلافِ بلاد کا اعتبار
تابع آں شہر اند...... صحیفۂ شریفہ	نہیں......... مولوی رعایت علی
مولوی رعایت علی خاں بنامِ	خاں کا خط تمہارے پاس آتا ہے
نامی آں مہربان ورود یابد از	فقیر کی طرف سے بھی ان کو بکمالِ
طرف فقیر ہم بکمالِ اخلاصِ دلی	اخلاصِ دلی سلام و دُعا لکھ دینا.
سلام و دعا باید آورد والسلام علیکم۔	والسّلام علیکم۔

اختلاف مطالع رویتِ ہلال کے سلسلے میں اختلافِ مطالع کا مسئلہ ایک اہم اور قابلِ غور مسئلہ ہے ــــ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس مسئلے پر اپنے مکتوبِ گرامی کے اندر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی ہے ــــ اس مکتوب کا ایک جملہ پڑھا نہیں گیا۔ اور دو ایک جملے قصداً حذف کر دیے تاکہ ناظرین کو اصل مسئلہ سمجھنے میں دقت نہ ہو ــــ حضرت مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلیؒ نے اس مسئلہ پر اپنے فتاویٰ میں کئی جگہ تفصیلی بحث کی ہے۔ ملاحظہ ہو مجموعہ فتاویٰ عبدالحیٔ جلد اول ص ۲۶۶ تا ۲۶۸ و ص ۲۷۴ تا ۲۷۸ ــــ مولانا فرنگی محلیؒ کے ایک جواب کا کچھ حصہ فارسی سے اُردو میں ترجمہ کر کے یہاں پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

"اختلافِ مطالع کے بارے میں فقہاء حنفیہ چند اقوال پر مختلف ہیں بعض کا قول یہ ہے کہ اختلاف مطالع معتبر ہے اور ایک شہر کی رویت کا اعتبار دوسرے شہر میں نہیں ہوتا بلکہ ہر شہر کی رویت اُسی شہر کے لیے معتبر ہے اور اکثر مشائخ حنفیہ کے نزدیک ظاہر روایت کی رو سے اختلافِ مطالع کا مطلقاً اعتبار نہیں ہے پس ایک شہر کی رویت دوسرے شہر کی لیا اگرچہ دونوں کے درمیان فاصلہ کثیر ہی کیوں نہ ہو ___ معتبر ہوگی ___ بشرطیکہ ثبوتِ شرعی بہم پہونچ جائے۔ لیکن محققین حنفیہ کے ایک گروہ کا یہ قول ہے کہ وہ دو شہر جو بحسب قواعدِ علم ہیئت اختلاف مطالع رکھتے ہیں یعنی ایک ماہ کی (پیدل) مسافت رکھتے ہیں اُن میں ایک جگہ کی رویت دوسری جگہ کے لیے معتبر نہ ہوگی اس سے کم فاصلے میں معتبر ہوگی" (مجموعہ فتاویٰ عبد الحیٔ جلد اول ص۲۷۶)

مجموعہ فتاویٰ مفتی محمد سہول بھاگلپوری (قلمی) میں ایک فتویٰ حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی کا اختلاف مطالع کے سلسلے میں درج ہے اس میں اکثر مشائخ حنفیہ کے اُس قول کو جو ظاہر روایت کے پیش نظر ہے مدلل طریقے سے قوت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ مولانا ناظر حسن دیوبندی اور مفتی محمد سہول صاحب بھاگلپوری کی اس فتویٰ پر تائید و تصویب ہے۔

مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ نے اپنے رسالے رویت ہلال رمضان و عید میں دورِ حاضر کے شبہات و اعتراضات کو پیش نظر رکھتے ہوئے عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ ص۲۶ سے ص۵۵ تک اس مسئلے پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور آخر میں حضرت مولانا فرنگی محلی کے اُس فتویٰ کا حوالہ دیتے ہوئے (جو اوپر نقل کیا گیا ہے) ___ اور علامہ زیلعی شارح کنز کا قول نقل کرتے ہوئے جس میں ممالک بعیدہ اور فاصلۂ کثیر کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ محدث کشمیری کا یہ قول درج کیا ہے "واقعہ یہ ہے کہ علامہ زیلعی کا قول ہی تسلیم کرنا ضروری ہے اس کے بغیر چارہ نہیں ہے۔"

مکتوب گرامی بنام سید امیر حیدر حسینی بلگرامی

[دربارۂ امتیاز و اختصاص حجۃ اللہ البالغہ]

کتاب الحجۃ اللہ البالغۃ التی ھی عمدۃ تصانیف بقیۃ المحدثین حجۃ اللہ البالغہ بقیۃ المحدثین شاہ ولی اللہ دہلوی کی علم اسرار حدیث میں ایک

الشاہ ولی اللہ الدہلوی فی علم اسرار الحدیث
ولم یتکلم فی ہذا العلم احدٌ قبلہٗ علیٰ ہذا
الوجہ من تاصیلِ الاصول وتفریع الفروع
وتمہید المقدماتِ والمبادی واستنتاج
المقاصد منہا الی المجلس والنادی
وانما یستشم نفحاتٌ قلیلۃٌ من ہذا
العلمِ فی کتاب الاحیاء للغزالیؒ وکتاب
القواعد الکبریٰ للشیخ عزّ الدین عبد السلام
المقدسی ورُبّما یوجد بعض فوائد ہذا العلم
فی مواضع من الفتوحات المکیۃ للشیخ
الاکبرؒ والکبریت الاحمر للشیخ ابن عربیؒ و
کذا فی مولفات تلمیذہٖ الشیخ الکبیر
صدر الدین القونوی قدس اللہ سرھما
وقد جمعہا الشیخ عبد الوہاب الشعرانیؒ
فی کتاب المیزان ؎

بہترین تصنیف ہے۔ اس علم کے اندر آپ سے
پہلے کسی نے اس انداز سے کلام نہیں کیا۔
اس کتاب میں تاصیلِ اصول، تفریع فروع
تمہید مقدمات و مبادی اور پھر مقاصد کا
استنتاج و استخراج سب کچھ پایا جاتا ہے
اس علم کی کچھ خوشبو امام غزالیؒ کی احیاء
العلوم میں اور شیخ عزّ الدین عبد السلام
مقدسی کی کتاب قواعد کبریٰ میں پائی
جاتی ہے علم اسرارِ حدیث کے کچھ فوائد
شیخ اکبرؒ کی فتوحات مکیہ اور کبریت احمر
میں نیز شیخ اکبرؒ کے شاگرد شیخ کبیر
صدر الدین قونوی قدس اللہ سرہما کی
تالیفات میں چند مواضع میں پائے جاتے
ہیں جن کو شیخ عبد الوہاب شعرانیؒ نے
کتاب المیزان میں جمع کر دیا ہے۔

؎ یہ مکتوب گرامی کتاب حجۃ اللہ البالغہ قلمی (کتب خانہ دار العلوم دیوبند) نمبر ۵۷۴ کے اول ورق
پر درج ہے وہیں سے نقل کیا گیا ہے۔ مکتوب کے آخر میں یہ عبارت ہے۔ جو غالباً مکتوب الیہ کے
قلم کی لکھی ہوئی ہے۔ ہذا مکتبہٗ مولانا شاہ عبد العزیز ابن الشاہ ولی اللہؒ للعبد الاحقر امیر حیدر حسینی
بلگرامی فی صحیفۃٍ مُحرّرۃٍ فی الحادی والعشرین من ذی القعدہ سنہ ۱۲۱۳ھ ــــ یعنی یہ مکتوب حضرت شاہ
عبد العزیزؒ نے عبد احقر امیر حیدر حسینی بلگرامی کے نام ہے جو ۲۱ ذی قعدہ سنہ ۱۲۱۳ھ کو تحریر فرمایا گیا ہے
نزہۃ الخواطر جلد ہفتم میں مکتوب الیہ کا تذکرہ درج ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔ المفتی امیر حیدر بن نور الحسین
بن غلام علی الحسینی الواسطی البلگرامیؒ مشہور علماء میں سے ہیں۔ سنہ ۱۱۶۵ھ میں پیدا ہوئے۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مقالے سے متعلق چند ضروری باتیں

(۱) مقالے کی پہلی قسط میں سرّ الشہادتین کے متعلق غلطی سے تصنیف شاہ صاحبؒ ہونے میں شبہ ظاہر کیا گیا ہے، بعد میں یہ تحقیق ہوا کہ یہ کتاب حضرت شاہ صاحب ہی کی ہے، بڑا ثبوت یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے شاگرد رشید مولانا سلامت اللہ کشفی بدایونی ثم کانپوریؒ نے اپنے استاد کی تصنیف کی حیثیت سے اس کی شرح تحریر الشہادتین لکھی ہے جو شائع ہو چکی ہے۔

(۲) تصانیفِ شاہ صاحبؒ کے ضمن میں اسولہ و اجوبہ مرتبہ حاجی رفیع الدین مراد آبادیؒ کا ذکر آیا ہے — اس حیثیت سے کہ یہ شاہ صاحبؒ کے جوابات ہیں اس کو ان کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب کئی کتب خانوں میں موجود ہے، اور اس میں دیگر فتاویٰ، مکتوبات وغیرہ بھی شامل کر لیے گئے ہیں — اب چاہے اس کو اسولہ و اجوبہ کہہ لیجئے یا افاداتِ عزیزیہ — بلکہ میرا خیال ہے کہ فتاویٰ عبدالعزیز کو اسی قسم کے مجموعوں سے مرتب کیا گیا ہے — ایک صاحب نے معارف میں ایک مضمون کے ضمن میں یہ انکشاف کیا ہے کہ میں نے اس کتاب کا نام اسولہ و اجوبہ بتانے میں غلطی کی ہے اس کا اصل نام افاداتِ عزیزیہ ہے — اس کے جواب میں اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ انوار العارفین مولفہ صوفی محمد حسین مراد آبادیؒ میں ذکرِ حاجی رفیع الدینؒ کرتے ہوئے اس کتاب کا نام اسولہ و اجوبہ ہی لکھا ہے۔ بعد میں خود حاجی صاحب نے یا ان کے بعد والوں نے اس میں اضافے کئے، تو اس کا نام افاداتِ عزیزیہ پڑ گیا ہوگا —

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ

بعض کتب درسیہ اپنے وطن میں سید محمدؒ بن عبدالجلیل بلگرامیؒ سے پھر اپنے دادا علامہ غلام علی آزاد بلگرامیؒ کے پاس اورنگ آباد پہونچ کر ان کے زیر تربیت رہ کر تمام کتب درسیہ شیخ نور الہدیٰ بن قمر الدین حسینی اورنگ آبادیؒ سے پڑھیں۔ فنِ طب کی تحصیل حکیم عبدالسلام برہان پوری سے کی۔ بعدہٗ کلکتہ چلے گئے وہاں منصب افتار پر سولہ برس تک فائز رہے۔ پھر اپنے وطن بلگرام کا اشتیاق ہوا تو اثنائے سفر میں مرشد آباد پہونچ کر انتقال فرمایا۔ سنِ انتقال ۱۲۱۲ھ ہے۔ آپ کی چند تصنیفات بھی ہیں۔

غرضکہ افادات عزیزیہ نام کی نہ حاجی رفیع الدین مراد آبادی کی کوئی کتاب ہے اور نہ حضرت شاہ صاحبؒ کی کوئی مستقل تصنیف ہے۔

(۳) بیاض رشیدی میں ایک مکتوب حضرت شاہ اہل اللہؒ کا وہ ہے جس کو آثار الصنادید میں غلطی سے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔

سر سید احمد خاں مرحوم نے اس مکتوب کے درج کرنے سے پہلے لکھا ہے۔

"اگرچہ وہ نثر عربی جس کو آپ نے (شاہ عبدالعزیزؒ نے) دل لگا کر لکھا ہو راقم کو دستیاب نہیں ہوئی مگر دو چار رقعے جو آپ نے قلم برداشتہ نہایت سرسری طور پر لکھ دیئے تھے ہاتھ لگے ان میں سے ایک رقعہ تیمناً لکھ دیتا ہوں الخ"

(آثار الصنادید صفحہ ۵۲ و ۵۲۱ جدید ایڈیشن باہتمام سنٹرل بکڈپو اردو بازار دہلی)

اس کے بعد حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا سمجھ کر وہ مکتوب یا رقعہ درج ہے جو بیاض رشیدی کی رو سے حضرت شاہ اہل اللہؒ کا ہے۔

(۴) بیاض رشیدی کے مندرجات میں کئی تحریریں وہ ہیں جو فتاوی عبدالعزیز (مطبوعہ) میں بھی ہیں۔ مطبوعہ فتاوی میں سائلین کے نام درج نہیں ہیں تب شاید قصداً ایسا کیا ہے۔ بہتر یہی تھا کہ سوال کے ساتھ ساتھ مستفتی کا نام بھی درج کیا جاتا۔

حضرت شاہ صاحبؒ سے سوال کرنے والے بعض بہت ہی اہم شخصیت رکھتے ہیں، میں یہاں چند ناموں کی نشان دہی کرتا ہوں۔

(الف) فتاوی جلد دوم صفحہ ۳۹ و ۳۰ پر ایک تحقیق بما تعلمون محیط کی قرأت سے متعلق درج ہے جو ایک اہم اور معرکۃ الآرا تحقیق ہے مگر مطبوعہ فتاوی سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ سوال کس نے کیا تھا۔ بیاض رشیدی سے معلوم ہوا کہ قاضی محمد اعلیٰ تھانویؒ مؤلف کشاف اصطلاحات الفنون نے یہ سوال کیا تھا۔

(ب) فتاوی جلد دوم صفحہ ۱۲۲ پر وضع میزان در شرح متعلق ایک تحقیق ہے۔ بیاض رشیدی سے معلوم ہوا کہ حاجی رفیع الدین مراد آبادیؒ کے سوال کے جواب میں یہ تحقیق ہے۔

(ج) فتاوی جلد دوم صفحہ ۲۳ پر حکم اراضی مدد معاش تحریر ہے۔ بیاض رشیدی کی رو سے اس سوال کو قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے لکھ کر بھیجا تھا اس کے جواب میں ارقام فرمایا گیا ہے۔

(د) فتاوی جلد دوم صفحہ ۲۰۹ پر مدت خلافت سے متعلق ایک تحقیق ہے۔ بیاض رشیدی سے معلوم ہوا کہ یہ تحقیق بھی قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کے جواب میں تحریر فرمائی گئی ہے۔

موجودہ قیمت 3/75

[جمادی الثانی ۱۳۸۸ھ]

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟
کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ ہندوستان سے ...... ۵۰/۷ پاکستان سے ...... ۵۰/۷ ششماہی ہندوستان سے ...... ۴/- پاکستان سے ۴/-	لکھنؤ ماہنامہ # الفرقان فی کاپی ...... ۷۰ پیسے	سالانہ چندہ غیر ممالک سے ۱۵ شلنگ ہوائی ڈاک سے مزید محصول ڈاک کا اضافہ

جلد ۳۶ | بابتہ ماہ جمادی الآخرہ ۱۳۸۸ھ مطابق ستمبر ۱۹۶۸ء | شمارہ (۶)

اگر اس دائرہ میں سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی اطلاع ۳۰ ستمبر تک آ جائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی، پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار: اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دیدیں، نئے خریدار بھی اسی طریقہ سے چندہ ارسال فرمائیں۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں، اسکی اطلاع ۳۰ تاریخ تک آ جانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

مشہور حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ـــ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ تم مسلمان دوسری قوموں کے لیے لقمۂ تر اور نعمتِ یغما بن جاؤ گے ... عرض کیا گیا کہ کیا اسوقت ہم دنیا میں بہت تھوڑے رہ جائیں گے، اور قلتِ تعداد کی وجہ سے ہمارا یہ حال ہوگا؟ ـــ آپ نے فرمایا، نہیں اُس وقت تم دنیا میں بہت بڑی تعداد میں ہوگے، لیکن سیلاب کے کوڑے کرکٹ کی طرح بالکل بے وزن اور بے جان ہوگے، تمہارے دشمنوں کے دل سے اللہ تمھارا رعب اور تمہاری ہیبت نکال دے گا اور تمھارے دلوں میں وہن آجائے گا ـــ کسی نے عرض کیا کہ حضرت وہن کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے فرمایا "حُبُّ الدُّنیا وَکَرَاھِیَۃُ الموت" یعنی دنیا کی محبت اور موت کی ناخوشگواری۔

صادقِ مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے مستقبل بعید کے بارہ میں یہ خبر اُسوقت دی تھی جب مسلمان اپنی قوتِ ایمانی، تعلق مع اللہ، اور دنیا کے مقابلہ میں آخرت کی ترجیح کی وجہ سے ناقابلِ تسخیر طاقت بنے ہوئے تھے اور ان میں سے ایک ایک ہزاروں پر بھاری ہوتا تھا ـــ کسقدر بعید از قیاس تھی اُس وقت یہ بات کہ یہی مسلمان کسی دن دنیا کی میزان میں اتنے بے وزن ایسے بے جان اور دشمنوں کے لئے ایسا نرم چارہ بن جائیں گے جن کا نگلنا اُن کے لئے اتنا آسان ہوگا۔

لیکن آج ہم آپ سب ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس انتباہی اطلاع اور پیشینگوئی کو اپنی کھلی آنکھوں واقعہ کی شکل میں دیکھ رہے ہیں ـــ پچھلے سال جون میں اسرائیل اور عربوں کے تصادم میں جو کچھ سامنے آیا وہ بین الاقوامی سطح پر اس کی آخری عبرتناک مثال تھی، اور ہم ہندوستانی مسلمان مقامی طور پر آئے دن اُن مسلم کش حملوں میں اس کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں جن کا اخباری عنوان "فرقہ وارانہ فسادات" تجویز کر لیا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انتباہی انداز میں اور ہوشیار اور خبردار کرنے ہی کے

لئے مسلمانوں کی ذلت و نکبت کی یہ خبر سنائی تھی تو ساتھ ہی یہ بھی واضح فرما دیا تھا کہ اس انتہائی گراوٹ و پستی اور ناطاقتی و درماندگی کا سبب نہ اُن کی تعداد کی قلت ہوگی اور نہ کوئی اور اس قسم کی مادّی پسماندگی، بلکہ اسکی بنیاد بس دلوں کی یہ تبدیلی ہوگی کہ دنیا اور اُس کے عیش و عشرت کی محبت اور اُس سے وابستگی بڑھ جائے گی اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مرنے کو جی بالکل نہ چاہے گا شوقِ شہادت سے بھی دل خالی ہو جائیں گے۔

اگر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تشخیص پر اُس طرح یقین کریں جس طرح ایک سچے مومن کو کرنا چاہیئے تو قدرتی طور پر اس صورت حال کو بدلنے کے سلسلے میں ہماری سب سے بڑی فکر اور جدوجہد کا خاص الخاص ہدف یہ ہونا چاہیئے کہ دلوں سے دنیا کی وہ محبت نکلے جس نے واقعہ یہ ہے کہ خدا اور رسول کی محبت اور شوقِ جنت کی جگہ لے لی ہے اور پھر موت خاص کر شہادت کی موت صرف عقیدہ کے طور پر نہیں بلکہ ذوقی طور پر ہمارے لئے مرغوب اور محبوب ہو جائے ـــــ لیکن غریب پر بھی نظر ڈال لیجئے اور عجم پر بھی، سب سے پہلے اُس طبقہ کو دیکھئے جس کے ہاتھ پر تقریباً سب ہی جگہ قوم کی قیادت کی باگ ہے اور جو ملت کی کشتی کا ناخدا بنا ہوا ہے۔ کیا اُس کے سامنے کسی درجہ میں بھی مسئلہ کا یہ پہلو ہے؟ کون نہیں جانتا کہ اُن میں بہت سے تو اس حال میں ہیں کہ اگر اُن کے سامنے یہ بات کہی جائے تو وہ سکون و سنجیدگی سے اس کو سُن بھی نہ سکیں گے اور اس "ملایانہ بیوقوفی" پر اپنے غصّہ کو ضبط کرنا بھی اُن کے لئے مشکل ہوگا ـــــ اچھا ان بیچاروں کو چھوڑیئے، اس طبقہ میں تو زیادہ تر وہی ہیں جنھیں ان ایمانی حقائق سے آشنا ہونے کا کبھی موقع ہی نہیں ملا، انھوں نے جو کچھ سیکھا ہے مادہ پرست مغرب ہی سے سیکھا ہے۔ لیکن ان میدانوں میں کام کرنے والے دین کے واقفین و حاملین بلکہ اُس کے نامور داعیوں تک میں بھی بڑی تعداد آپکو ایسے ہی حضرات کی ملے گی جو اگر خود دیانتداری سے اپنا اور اپنے طرز فکر کا جائزہ اس نقطۂ نظر سے لیں گے تو یقیناً محسوس کریں گے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس اہم بنیادی تشخیص کو سامنے رکھ کر اپنا لائحۂ عمل اور راستہ طے نہیں کیا ہے بلکہ اس دور کی عام مادہ پرستانہ فضا میں جس طرح سوچنے والے عام طور سے سوچتے ہیں اُسی طریقہ پر اور اُسی کی روشنی میں انھوں نے بھی سوچا ہے ـــــ کاش وہ اپنے اُس

علم کو راہنما بنا کر سوچیں جس کو وہ میراث نبوت کہتے ہیں تو یقیناً ان کے غور و فکر اور ان کی جد و جہد کا راستہ دوسرا ہوگا ——— اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ.

ناظرین کرام کو رفیق محترم مولانا سید ابو الحسن علی میاں ندوی کی والدۂ ماجدہ کے سانحۂ وفات کی اطلاع اخبارات سے ہو چکی ہوگی۔ توالد و تناسل کے عام قانون کے تحت کسی کا اس دنیا میں آنا اور موت کے راستہ یہاں سے چلا جانا کوئی عجیب اور اہم واقعہ نہیں، روزانہ لاکھوں ہی یہاں ... آتے اور یہاں سے جاتے ہیں، لیکن اللہ کے بعض بندوں اور بندیوں کی زندگیاں غیر معمولی ہوتی ہیں اس لئے ان کا دنیا سے جانا بھی غیر معمولی قسم کا حادثہ ہوتا ہے اور قرآن مجید کے ایک اشارہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر زمین و آسمان بھی روتے ہیں ——— مولانا علی میاں کی والدہ ماجدہ مرحومہ کی خصوصیت یہی نہیں تھی کہ وہ ایسے نامور اور بافیض فرزند کی والدہ اور مربیہ تھیں ——— بلکہ وہ بذات خود ایک عابدہ زاہدہ اور صلاح و تقوی کے لحاظ سے مثالی خاتون تھیں۔

راقم سطور کی اہلیہ کبھی کبھی ان کی خدمت میں رہیں، انہوں نے اپنا تاثر یہی بتایا کہ وہ اس دور کی "رابعہ" اور طبقۂ اناث کے لئے اعلی نمونہ اور بہترین مثال ہیں ——— قرآن مجید کی حافظہ تھیں اور بہت اچھا یاد تھا جب تک طاقت و توانائی رہی اپنے گھر میں تراویح میں قرآن پاک سنانے کا معمول رہا۔

بالکل نوعمری میں ایک دفعہ خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئیں اور آپ سے بیعت کی حضور نے بیعت لی۔ اُن کے والد ماجد حضرت حافظ ضیاء الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ شیخ وقت تھے۔ جب بیٹی کا یہ خواب اُن کے علم میں آیا تو حضور کی اس بیعت کے بعد ان کو خود بیعت کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اسی خوابی بیعت کو ان کے لئے کافی سمجھا، پھر اب سے ۲۶ سال پہلے (سنہ ۱۳۶۲ھ) جب حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ اپنی جماعت کے ساتھ لکھنؤ تشریف لائے اور ایک دن کے لئے رائے بریلی بھی تشریف لے گئے تو محترمہ مرحومہ نے ان سے بیعت کی درخواست کی اور حضرت رحمۃ اللہ نے بیعت لے لی اور اس کے ٹھیک ایک ہی سال بعد حضرت مولانا کا وصال ہو گیا تو حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی تجدید فرمائی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ مرحومہ کو خود باکمال خاتون سمجھتے تھے ——— جو لوگ حالات سے باخبر تھے وہ ان کو مستجاب الدعوات جانتے تھے ——— اللہ کے فضل و کرم سے ۹۰ سال سے زیادہ عمر پائی، بتایا گیا کہ آخری وقت ذکر جاری تھا، اور دیکھنے والوں کو محسوس ہوتا تھا کہ ارواح طیبہ اور ملائکہ سامنے ہیں ——— واللہ اعلم

اولاد میں رفیق محترم مولانا علی میاں اور ان کی محترمہ بہن امۃ اللہ تسنیم ہیں، ہمارے اکثر ناظرین اُن کی تصانیف "قصص الانبیاء" (اردو) اور امام نووی کی "ریاض الصالحین" کے ترجمہ "زادِ سفر" وغیرہ اور رسالہ "رضوان لکھنؤ" کے ذریعہ ان سے واقف ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کے ساتھ مغفرت اور رحمت کا خاص الخاص معاملہ فرمائے اور درجات عالیہ سے نوازے۔ ناظرین کرام سے بھی دعوات صالحہ اور ایصال ثواب کی استدعا ہے۔

کتاب الدعوات

معارف الحدیث

(مسلسل)

استغفار و توبہ

دعا ہی کی ایک خاص قسم استغفار ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں اور قصوروں کی معافی اور بخشش مانگنا ــــــ اور توبہ گویا اس کے لوازم میں سے ہے، بلکہ یہ دونوں ہی آپس میں لازم و ملزوم ہیں ــــــ توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ جو گناہ اور نافرمانی یا ناپسندیدہ عمل بندہ سے سرزد ہو جائے اس کے برے انجام کے خوف کے ساتھ اس پر اسے دلی رنج اور ندامت ہو اور آئندہ کے لیے اس سے بچے رہنے اور دور رہنے کا اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور اس کی رضا جوئی کا وہ عزم اور فیصلہ کرے۔

ظاہر ہے کہ جب یہ توبہ والی کیفیت نصیب ہوگی تو جو گناہ سرزد ہو چکے ہیں بندہ اللہ تعالیٰ سے ان کی معافی اور بخشش کی استدعا بھی ضرور کرے گا تاکہ ان کی سزا اور برے انجام سے بچ سکے۔ اور اسی طرح جب سزا اور عذاب کے خوف سے معافی اور بخشش مانگے گا تو اس کو گناہ پر رنج و افسوس اور آئندہ کے لیے اس کے پاس نہ جانے کا عزم بھی ضرور ہوگا ــ اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ فی الحقیقت یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

توبہ و استغفار کی حقیقت اس مثال سے اچھی طرح سمجھی جا سکتی ہے کہ کوئی آدمی مثلاً غصہ کی حالت میں خودکشی کے ارادہ سے زہر کھا لے، اور جب وہ زہر اندر پہونچ کر اپنا

عمل شروع کرے اور آنتیں کٹنے لگیں اور درد ناقابلِ برداشت تکلیف اور بےچینی ہونے لگے جو زہر کے نتیجے میں ہوتی ہے اور موت سامنے کھڑی نظر آئے۔ تو اس کو اپنی اس احمقانہ حرکت پر رنج و افسوس ہو اور اس وقت وہ چاہے کہ کسی بھی قیمت پر اس کی جان بچ جائے اور جو دوا حکیم یا ڈاکٹر اسے بتائیں وہ اسے استعمال کرے اور اگر قے کرنے کے لیے کہیں تو قے لانے کے لیے بھی ہر تدبیر اختیار کرے ـــــ یقیناً اس وقت وہ پوری صدقدلی کے ساتھ یہ بھی فیصلہ کرے گا کہ اگر میں زندہ بچ گیا تو آئندہ کبھی ایسی حماقت نہیں کروں گا۔

بالکل اسی طرح سمجھنا چاہیئے کہ کبھی کبھی صاحبِ ایمان بندہ غفلت کی حالت میں اغواء شیطانی یا خود اپنے نفسِ امّارہ کے تقاضے سے گناہ کر بیٹھتا ہے۔ لیکن جب اللہ کی توفیق سے اس کا ایمانی حاسّہ بیدار ہوتا ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ میں نے اپنے مالک و مولیٰ کی نافرمانی کر کے اپنے کو ہلاک کر ڈالا، اور اللہ کی رحمت و عنایت اور اس کی رضا کے بجائے میں اس کے غضب اور عذاب کا مستحق ہو گیا اور اگر میں اسی حالت میں مر گیا تو قبر میں اور اس کے بعد حشر میں مجھ پر کیا گزرے گی اور وہاں اپنے مالک کو کیا منھ دکھاؤں گا، اور آخرت کا عذاب کیسے برداشت کر سکوں گا ـــــ الغرض جب توفیقِ الٰہی سے اس کے اندر یہ فکر و احساس پیدا ہوتا ہے تو وہ بہ یقین و عقیدہ رکھتے ہوئے کہ میرا مالک و مولیٰ بڑا رحیم و کریم ہے، معافی مانگنے پر بڑے سے بڑے گناہوں قصوروں کو وہ بڑی خوشی سے معاف فرما دیتا ہے، وہ اس سے معافی اور بخشش کی استدعا کرتا ہے اور اسی کو گناہ کے زہر کا علاج سمجھتا ہے ـــــ نیز اس کے ساتھ وہ آئندہ کے لیے فیصلہ کرتا ہے کہ اب کبھی اپنے مالک کی نافرمانی نہیں کروں گا اور کبھی اس گناہ کے پاس نہیں جاؤں گا ـــــ بس بندہ کے اسی عمل کا نام استغفار اور توبہ ہے۔

توبہ و استغفار بلند ترین مقام:-

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ مقبولین و مقربین کے مقامات میں سب سے بلند مقام عبدیت اور بندگی کا ہے اور دُعا چونکہ عبدیت اور بندگی کا سب سے اعلیٰ مظہر ہے بلکہ ارشادِ نبوی کے مطابق وہی مخ العبادہ " (یعنی بندگی اور عبادت کا مغز اور جوہر ہے)

اس لیے انسانی اعمال و احوال میں سب سے اکرم و اشرف دُعا ہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اپنے موقع پہ درج ہو چکا ہے لیس شیئ اکرم علی اللہ من الدعاء (اللہ کے یہاں کوئی چیز دُعا سے زیادہ عزیز اور قیمتی نہیں ہے)

اور استغفار و توبہ کے وقت بندہ چونکہ اپنی گنہگاری اور تقصیر کے احساس کی وجہ سے انتہائی ندامت اور احساس پستی کی حالت میں ہوتا ہے اور گناہ کی آلودگی کی وجہ سے مالک کو منہ دکھانے کے قابل نہیں سمجھتا اور اپنے کو مجرم اور خطاوار سمجھ کر معافی اور بخشش مانگتا اور آئندہ کے لیے توبہ کرتا ہے اس لیے بندگی اور تذلل اور گنہگاری و قصور واری کے احساس کی جو کیفیت استغفار و توبہ کے وقت میں ہوتی ہے وہ کسی دوسری دعا کے وقت نہیں ہوتی بلکہ نہیں ہو سکتی۔ اس بنا پر استغفار و توبہ دراصل اعلیٰ درجہ کی عبادت اور قرب الٰہی کے مقامات میں بلند ترین مقام ہے اور توبہ و استغفار کرنے والے بندوں کے لیے صرف معافی اور بخشش ہی کی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت و محبت اور اس کے پیار کی بشارت سنائی گئی ہے۔

وہ حدیثیں آگے آئیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت توبہ و استغفار کرتے تھے۔ اوپر کی سطروں میں توبہ و استغفار کے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا اس کی روشنی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کثرت استغفار کی وجہ آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے۔

دراصل یہ خیال بہت ہی عامیانہ اور غلط ہے کہ استغفار و توبہ عاصیوں اور گنہگاروں ہی کا کام ہے اور انہی کو اس کی ضرورت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ کے خاص مقرب بندے یہاں تک کہ انبیاء علیہم السلام جو گناہوں سے محفوظ و معصوم ہوتے ہیں ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی وہ محسوس کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کا حق بالکل ادا نہ ہو سکا۔ اس لیے وہ برابر توبہ و استغفار کرتے ہیں اور اپنے ہر عمل کو حتیٰ کہ اپنی نماز دل تک کو قابل استغفار سمجھتے ہیں۔ اس سلسلہ کی تیسری جلد کتاب الصلوٰۃ" میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی حدیث گزر چکی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کا سلام پھیرنے کے بعد تین مرتبہ کہتے تھے، اَسْتَغْفِرُاللہ ، اَسْتَغْفِرُاللہ ، اَسْتَغْفِرُاللہ (یعنی اے اللہ میں تجھ سے بخشش و معافی چاہتا ہوں)

نماز کے بعد آپ کا یہ استغفار اسی بنیاد پر ہوتا تھا کہ آپ محسوس کرتے تھے کہ نماز کا حق ادا نہیں ہوا۔ واللہ اعلم

بہرحال توبہ و استغفار عاصیوں اور گنہگاروں کے لیے مغفرت و رحمت کا ذریعہ اور مقربین و معصومین کے لیے درجاتِ قرب و محبوبیت میں بے انتہا ترقی کا وسیلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان حقائق کا فہم و یقین اور ان سے استفادہ کی توفیق عطا فرمائے ۔۔۔

اس تمہید کے بعد استغفار و توبہ سے متعلق احادیث پڑھیے اور سب سے پہلے وہ احادیث پڑھیے جن میں توبہ و استغفار کے باب میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول ذکر کیا گیا ہے۔

توبہ و استغفار کے باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ :-

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "وَاللّٰهِ اِنِّیْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ فِی الْيَوْمِ اَكْثَرَ مِنْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً" ——— رواہ البخاری

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، خدا کی قسم میں دن میں ستر دفعہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں توبہ و استغفار کرتا ہوں۔ (صحیح بخاری)

(تشریح) اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی اور جلال و جبروت کے بارہ میں جس بندہ کو جس درجہ کا شعور و احساس ہوگا وہ اسی درجہ میں اپنے آپ کو ادائے حقوقِ عبودیت میں قصوروار سمجھے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ یہ چیز بدرجۂ کمال حاصل تھی اس لیے آپ پر یہ احساس غالب رہتا تھا کہ عبودیت کا حق ادا نہ ہو سکا، اسی واسطے آپ بار بار اور مسلسل توبہ و استغفار فرماتے تھے ——— اور اس کا اظہار فرما کر دوسروں کو بھی اس کی تلقین فرماتے تھے۔

عَنِ الْاَغَرِّ الْمُزَنِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

يَا اَيُّهَا النَّاسُ تُوبُوا اِلَى اللّٰهِ فَاِنِّي اَتُوبُ اِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ مِائَةَ مَرَّةً

(رواہ مسلم)

حضرت اغر مزنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگو اللہ کے حضور میں توبہ کرو میں خود دن میں سو سو دفعہ اس کے حضور میں توبہ کرتا ہوں۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) پہلی حدیث میں "اکثر من سبعین مرۃ" (ستر دفعہ سے زیادہ) اور اس حدیث میں "مائۃ مرۃ" (سو دفعہ) در اصل صرف کثرت کے بیان کے لیے ہیں، اور قدیم عربی زبان کا یہ عام محاورہ ہے، ورنہ حضور کے استغفار و توبہ کی تعداد یقیناً اس سے بہت زیادہ ہوتی تھی جیسا کہ آگے درج ہونے والی حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ظاہر ہوتا ہے۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ اِنْ كُنَّا لَنَعُدُّ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَجْلِسِ يَقُوْلُ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَتُبْ عَلَيَّ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُوْرُ مِائَةَ مَرَّةٍ

(رواہ احمد والترمذی وابوداؤد وابن ماجہ)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک نشست میں شمار کر لیتے تھے کہ آپ سو سو دفعہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں عرض کرتے تھے "رَبِّ اغْفِرْ لِي وَتُبْ عَلَيَّ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُوْرُ" (اے میرے رب مجھے معاف کر دے بخش دے اور میری توبہ قبول فرما کر مجھ پر عنایت فرما، بے شک تو بہت ہی عنایت فرمانے والا بہت ہی بخشنے والا ہے۔) (مسند احمد، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ)

(تشریح) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے اس بیان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطور ورد و وظیفہ کے استغفار و توبہ کا یہ کلمہ ایک نشست میں سو دفعہ پڑھتے تھے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ مجلس میں تشریف فرما ہوتے ہم

لوگ بھی حاضر رہتے، بات چیت کا سلسلہ بھی جاری رہتا اور آپ اسی درمیان میں بار بار اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر ان کلمات کے ساتھ استغفار و توبہ بھی کرتے رہتے اور ہم اپنے طور پر اس کو شمار کرتے رہتے تو معلوم ہوتا کہ ایک نشست میں آپ نے سو دفعہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں یہ عرض کیا۔ واللہ اعلم۔

عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ الَّذِيْنَ اِذَا اَحْسَنُوْا اِسْتَبْشَرُوْا وَاِذَا اَسَاءُوْا اسْتَغْفَرُوْا

(رواہ ابن ماجہ والبیہقی فی الدعوات الکبیر)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرمایا کرتے تھے

"اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ الَّذِيْنَ اِذَا اَحْسَنُوْا اِسْتَبْشَرُوْا وَاِذَا اَسَاءُوْا اسْتَغْفَرُوْا"

اے اللہ مجھے اپنے ان بندوں میں سے کر دے جو نیکی کریں تو خوش ہوں اور ان سے جب کوئی غلطی اور برائی سرزد ہو جائے تو تیرے حضور میں استغفار کریں۔

(سنن ابن ماجہ، دعوات کبیر للبیہقی)

(تشریح) کسی بندہ کو ان اچھے اعمال کی توفیق ملنا جن کے صلہ میں جنت اور رضائے الٰہی کا وعدہ ہے اس بات کی علامت اور نشانی ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی نظر عنایت ہے اس لیے اس کا حق ہے اور اس کو چاہیئے کہ وہ اعمال حسنہ کی اس توفیق پر خوش ہو اور شکر ادا کرے، قرآن پاک میں ارشاد فرمایا گیا ہے " قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا " (اللہ کے فضل اور اس کی رحمت و عنایت پر اس کے بندوں کو خوش ہونا چاہیئے) اسی طرح جب کسی بندہ سے کوئی چھوٹی بڑی معصیت یا لغزش ہو جائے تو اسے اس کا رنج اور دکھ ہونا چاہیئے اور فوراً اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنا چاہیئے ــــــ جس بندہ کو یہ دونوں باتیں حاصل ہوں وہ بڑا خوش نصیب ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے لیے دعا فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی یہ دونوں باتیں نصیب فرمائے۔

گناہوں کی سیاہی اور توبہ و استغفار سے اس کا ازالہ:-

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْمُؤْمِنَ اِذَا اَذْنَبَ کَانَتْ نُکْتَۃٌ سَوْدَاءُ فِیْ قَلْبِہٖ فَاِنْ تَابَ وَاسْتَغْفَرَ صُقِلَ قَلْبُہٗ وَاِنْ زَادَ زَادَتْ حَتّٰی تَعْلُوَ قَلْبَہٗ فَذٰلِکُمُ الرَّانُ الَّذِیْ ذَکَرَ اللّٰہُ تَعَالٰی کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ۔ ——— رواہ احمد، الترمذی و ابن ماجہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مومن بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے نتیجہ میں اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے، پھر اگر اس نے اس گناہ سے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں معافی اور بخشش کی التجا و استدعا کی تو وہ سیاہ نقطہ زائل ہو کر قلب صاف ہو جاتا ہے اور اگر اس نے (گناہ کے بعد توبہ و استغفار کے بجائے مزید گناہ کیے اور گناہوں کی وادی میں قدم بڑھائے تو دل کی وہ سیاہی اور بڑھ جاتی ہے یہاں تک کہ قلب پر چھا جاتی ہے ——— آپ نے فرمایا کہ یہی وہ زنگ اور سیاہی ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر فرمایا ہے "کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ" (مسند احمد، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

(**تشریح**) قرآن مجید میں ایک موقع پر بدانجام کافروں کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے "کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ" جس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی بدکرداریوں کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ اور سیاہی آگئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مندرجہ بالا حدیث سے معلوم ہوا کہ گناہوں اور بدکرداریوں کی وجہ سے صرف کافروں ہی کے دل سیاہ نہیں ہوتے بلکہ مسلمان بھی جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں بھی گناہ کی نحوست سے ظلمت پیدا ہوتی ہے لیکن اگر وہ سچے دل سے توبہ و استغفار کر لے تو یہ سیاہی اور ظلمت ختم ہو جاتی ہے اور دل

حسب سابق صاف اور نورانی ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر گناہ کے بعد توبہ و استغفار نہ کرے بلکہ معصیت و نافرمانی ہی کے راستہ پر آگے بڑھتا رہے تو پھر یہ ظلمت برابر بڑھتی رہتی ہے یہاں تک کہ پورے دل پر چھا جاتی ہے۔ اور کسی مسلمان کے لیے بلاشبہ یہ انتہائی بدبختی کی بات ہو کہ گناہوں کی ظلمت اس کے دل پر چھا جائے اور اس کے قلب میں اندھیرا ہی اندھیرا ہو جائے۔ اعاذنا اللہ منہ۔

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کُلُّ بَنِیْ اٰدَمَ خَطَّاءٌ وَخَیْرُ الْخَطَّائِیْنَ التَّوَّابُوْنَ

——— رواہ الترمذی و ابن ماجۃ والدارمی

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر آدمی خطاکار ہے (کوئی نہیں ہے جس سے کبھی کوئی خطا اور لغزش نہ ہو) اور خطاکاروں میں وہ بہت اچھے ہیں جو (خطا قصور کے بعد) مخلصانہ توبہ کریں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو جائیں　　(جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ، سنن دارمی)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ خطا اور لغزش تو گویا آدمی کی سرشت میں ہے، آدم کا کوئی فرزند اس سے مستثنیٰ نہیں، لیکن وہ بندے بڑے اچھے اور خوش نصیب ہیں جو خطا قصور اور گناہ کے بعد نادم ہو کر اپنے مالک کی طرف رجوع ہوں اور توبہ و استغفار کے ذریعہ اس کی رضا و رحمت حاصل کریں۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَہٗ۔

——— رواہ ابن ماجہ والبیہقی فی شعب الایمان

حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گناہ سے توبہ کر لینے والا گنہگار بندہ بالکل اس بندہ کی طرح ہے جس نے گناہ کیا ہی نہ ہو۔　　(سنن ابن ماجہ، شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ سچی توبہ کے بعد گناہ کا کوئی اثر اور داغ دھبہ باقی نہیں

رہتا، اور بعض روایات میں ہے کہ آدمی گناہوں سے توبہ کے بعد ایسا بے گناہ ہو جاتا ہے جیسا کہ وہ اپنی پیدائش کے وقت بے گناہ تھا (کیَوْمِ وَلَدَتْهُ اُمُّهُ) اور وہ احادیث انشاء اللہ آگے درج ہوں گی جن سے معلوم ہوگا کہ توبہ کا نتیجہ صرف اتنا ہی نہیں ہوتا کہ گناہ معاف ہو جائیں اور معصیات کی ظلمت اور سیاہی کے داغ دھبے مٹا دیے جائیں بلکہ تائب بندہ اللہ کا محبوب بھی بن جاتا ہے اور اس کی توبہ سے اس کو بے حد خوشی ہوتی ہے اللھم اجعلنا من التوابین۔

غفاریت کے ظہور کے لیے گناہوں کی ضرورت :-

عَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ اَنَّهٗ قَالَ حِیْنَ حَضَرَتْهُ الْوَفَاةُ کُنْتُ کَتَمْتُ عَنْکُمْ شَیْئًا سَمِعْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ سَمِعْتُهٗ یَقُوْلُ لَوْلَا اَنَّکُمْ تُذْنِبُوْنَ لَخَلَقَ اللّٰهُ خَلْقًا یُذْنِبُوْنَ یَغْفِرُ لَهُمْ

رواہ مسلم

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے اپنی وفات کے وقت فرمایا کہ میں نے ایک بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی اور تم سے اب تک چھپائی تھی (اب جبکہ میرا آخری وقت ہے وہ میں تم کو بتاتا ہوں اور وہ امانت تمھارے سپرد کرتا ہوں) میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے سنا آپ فرماتے تھے کہ اگر بالفرض تم سب (ملائکہ کی طرح) بے گناہ ہو جاؤ اور تم سے کوئی گناہ سرزد نہ ہو تو اللہ اور مخلوق پیدا کرے گا جن سے گناہ بھی سرزد ہوں گے پھر اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کا فیصلہ فرمائے گا (اور ان طرح اس کی شان غفاریت کا ظہور ہوگا) (صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث سے یہ سمجھنا کہ اللہ تعالیٰ کو معاذ اللہ گناہ مطلوب ہیں اور وہ گناہگاری کو پسند کرتا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد کے ذریعہ گناہوں اور گناہگاروں کی ہمت افزائی فرمائی ہے بڑی سخت غلطی ہوگی۔ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا

مقصد بھی یہ ہے کہ لوگوں کو گناہوں سے بچایا جائے اور اعمالِ صالحہ کی ترغیب دی جائے۔
دراصل حدیث کا منشاء اور مدعا اللہ تعالیٰ کی شانِ غفاریت کو ظاہر کرنا ہے اور مطلب یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی صفتِ خالقیت کے ظہور کے لیے ضروری ہے کہ کوئی مخلوق پیدا کی جائے، اور صفتِ رزاقیت کے لیے ضروری ہے کہ کوئی مخلوق ہو جس کو رزق کی ضرورت ہو اور اللہ تعالیٰ اس کو رزق عطا فرمائے۔ علیٰ ہٰذا جس طرح اللہ تعالیٰ کی صفتِ ہدایت کے لیے ضروری ہے کہ کوئی مخلوق ہو جس میں ہدایت لینے کی صلاحیت ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو ہدایت ملے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی شانِ غفاریت کے لیے ضروری ہے کہ کوئی ایسی مخلوق ہو جس سے گناہ بھی سرزد ہوں پھر وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں استغفار کرے اور گناہوں کی معافی اور بخشش چاہے اور پھر اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت اور بخشش کا فیصلہ فرمائے ــــ اس لیے ناگزیر ہے اور ازل سے طے ہے کہ اس دنیا میں گناہ کرنے والے بھی ہوں گے، اُن میں سے جن کو توفیق ملے گی وہ استغفار بھی کریں گے اور اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت کا فیصلہ بھی فرمائے گا اور اس طرح اس کی صفتِ مغفرت اور شانِ غفاریت کا ظہور ہوگا۔

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا .... اپنی زندگی میں اس خیال سے کبھی تذکرہ نہیں کیا کہ کم فہم لوگ غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں پھر اپنے آخری وقت میں اپنے خاص لوگوں سے اظہار فرما کر امانت گویا ان کے سپرد کر دی۔

یہی مضمون الفاظ کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔

بار بار گناہ اور بار بار استغفار کرنے والے:۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ عَبْدًا اَذْنَبَ ذَنْبًا فَقَالَ رَبِّ اَذْنَبْتُ فَاغْفِرْهُ فَقَالَ رَبُّهٗ

اَعَلِمَ عَبْدِیْ اَنَّ لَہٗ رَبًّا یَغْفِرُ الذَّنْبَ وَیَاْخُذُ بِہٖ غَفَرْتُ لِعَبْدِیْ ثُمَّ مَکَثَ مَاشَاءَ اللّٰہُ ثُمَّ اَذْنَبَ ذَنْبًا قَالَ رَبِّ اَذْنَبْتُ ذَنْبًا فَاغْفِرْہُ فَقَالَ اَعَلِمَ عَبْدِیْ اَنَّ لَہٗ رَبًّا یَغْفِرُ الذَّنْبَ وَیَاْخُذُ بِہٖ غَفَرْتُ لِعَبْدِیْ ثُمَّ مَکَثَ مَاشَاءَ اللّٰہُ ثُمَّ اَذْنَبَ ذَنْبًا قَالَ رَبِّ اَذْنَبْتُ ذَنْبًا اٰخَرَ فَاغْفِرْہُ لِیْ فَقَالَ اَعَلِمَ عَبْدِیْ اَنَّ لَہٗ رَبًّا یَغْفِرُ الذَّنْبَ وَیَاْخُذُ بِہٖ غَفَرْتُ لِعَبْدِیْ فَلْیَفْعَلْ مَاشَاءَ ــــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ اللہ کے کسی بندہ نے کوئی گناہ کیا پھر اللہ سے عرض کیا اے میرے مالک مجھ سے گناہ ہوگیا، مجھے معاف فرمادے! تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا کوئی مالک ہے جو گناہوں پر پکڑ بھی سکتا ہے اور معاف بھی کرسکتا ہے۔ میں نے اپنے بندہ کا گناہ بخشدیا اور اس کو معاف کر دیا ــــ اس کے بعد جب تک اللہ نے چاہا وہ بندہ گناہ سے رکا رہا اور پھر کسی وقت گناہ کر بیٹھا اور پھر اللہ سے عرض کیا میرے مالک مجھ سے گناہ ہوگیا تو اس کو بخشدے اور معاف فرمادے، تو اللہ تعالیٰ نے پھر فرمایا کیا میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا کوئی مالک ہے جو گناہ و قصور معاف بھی کرسکتا ہے اور پکڑ بھی سکتا ہے۔ میں نے اپنے بندہ کا گناہ معاف کردیا اس کے بعد جب تک اللہ نے چاہا وہ بندہ گناہ سے رکا رہا اور کسی وقت پھر کوئی گناہ کر بیٹھا اور پھر اللہ تعالیٰ سے عرض کیا اے میرے مالک و مولا مجھ سے اور گناہ ہوگیا تو مجھے معاف فرمادے اور میرا گناہ بخشدے! تو اللہ تعالیٰ نے پھر ارشاد فرمایا کیا میرے بندہ کو یقین ہے کہ اس کا کوئی مالک و مولا ہے جو گناہ معاف بھی کرتا ہے اور سزا بھی دے سکتا ہے، میں نے اپنے بندہ کو بخشدیا، اب جو اس کا جی چاہے کرے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار گناہ اور بار بار استغفار

کرنے والے جس بندہ کا واقعہ بیان فرمایا ہے بعض شارحین نے کہا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ وہ آپ ہی کا کوئی امتی ہو اور ممکن ہے کہ انبیاء سابقین میں سے کسی کا امتی ہو، لیکن اس عاجز کے نزدیک زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ یہ کسی خاص اور معین واقعہ کا بیان نہیں ہے بلکہ ایک کردار کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لاکھوں کروڑوں بندے ہوں گے جن کا حال اور کردار یہی ہے کہ اللہ اور آخرت پر ایمان کے باوجود ان سے گناہ ہو جاتا ہے اور پھر وہ نادم و پشیمان ہو کر اللہ تعالیٰ کے حضور میں استغفار کرتے ہیں، اور اس کے بعد بھی ان سے بار بار گناہ سرزد ہوتے ہیں اور وہ ہر بار سچے دل سے استغفار کرتے ہیں۔ ایسے بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہی کریمانہ معاملہ ہے جو اس حدیث میں بیان فرمایا گیا ہے۔

آخری دفعہ کے استغفار اور اس پر معافی کے اعلان کے ساتھ فرمایا گیا ہے "غَفَرْتُ لِعَبْدِيْ فَلْيَفْعَلْ مَا شَاءَ" (یعنی میں نے اپنے بندہ کو بخش دیا اب اس کا جو جی چاہے کرے) اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اب اس کو گناہوں کی بھی اجازت دے دی گئی، بلکہ ان الفاظ میں بندہ کے مالک و مولا کی طرف سے صرف اس لطف و کرم کا اعلان فرمایا گیا ہے کہ اے بندے تو جتنی بار بھی گناہ کر کے اس طرح استغفار کرتا رہے گا میں تجھے معاف ہی کرتا رہوں گا اور تو اپنے اس صادق و مومنانہ استغفار کی وجہ سے گناہوں کے زہر سے ہلاک نہ ہوگا۔ بلکہ یہ استغفار ہمیشہ تریاق کا کام کرتا رہے گا۔

اللہ تعالیٰ نے جن بندوں کو بندگی کا کچھ ذوق نصیب فرمایا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ مومن بندہ کے ضمیر پر ایسے کریمانہ اعلان کا کیا اثر پڑے گا اور اس کے دل میں مالک کی کامل وفاداری اور فرمانبرداری کا کیسا جذبہ ابھرے گا۔

اس حدیث کی صحیح مسلم کی روایت میں تصریح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کا یہ پورا مضمون اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے بیان فرمایا ——— اس روایت کی بنا پر یہ "حدیث قدسی" ہے۔

عَنْ أَبِيْ بَكْرِ الصِّدِّيْقِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا أَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ وَإِنْ عَادَ فِي الْيَوْمِ سَبْعِيْنَ

مَرَّةً ________ رواہ الترمذی و ابوداؤد

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بندہ (گناہ کرکے) استغفار کرے (یعنی سچے دل سے اللہ سے معافی مانگے) وہ اگر دن میں ستر دفعہ بھی پھر وہی گناہ کرے تو (اللہ کے نزدیک) وہ گناہ پر اصرار کرنے والوں میں نہیں ہے۔ (جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

(تشریح) گناہ پر اصرار، یعنی بے فکری اور بے خوفی کے ساتھ گناہ کرتے رہنا اور اس پر دائم قائم رہنا، بڑی بدبختی اور بہت بُرے انجام کی نشانی ہے، اور ایسا عادی مجرم گویا اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مستحق نہیں ہے ـــ اس حدیث میں واضح فرمایا گیا ہے کہ اگر بندہ گناہ کے بعد اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے یعنی معافی مانگے تو پھر بار بار گناہ کرنے کے باوجود وہ "اصرار کرنے والوں" میں سے نہیں ہے، ـــ مگر ملحوظ رہے کہ استغفار صرف زبان سے نکلنے والے الفاظ کا نام نہیں ہے بلکہ وہ دل کی ایک طلب ہے زبان اس کی صرف ترجمانی کرتی ہے، اگر استغفار اور معافی طلبی دل سے ہو تو بلاشبہ ستر دفعہ بلکہ ستر ہزار دفعہ گناہ کرنے کے بعد بھی آدمی رحمتِ الٰہی کا مستحق ہے اور گناہ پر اصرار کرنے والے مجرموں میں سے نہیں ہے۔

کس وقت تک کی توبہ قابل قبول ہے :-

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللّٰهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يُغَرْغِرْ۔

________ رواہ الترمذی و ابن ماجہ

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بندہ کی توبہ اس وقت تک قبول کرتا ہے جب تک غرغرہ کی کیفیت شروع نہ ہو۔ (جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

(تشریح) موت کے وقت جب بندہ کی رُوح جسم سے نکلنے لگتی ہے تو حلق کی

نالی میں ایک قسم کی آواز پیدا ہو جاتی ہے جسے عربی میں "غرغرہ" اور اردو میں "خرہ چلنا" کہتے ہیں، اس کے بعد زندگی کی کوئی آس اور امید نہیں رہتی یہ موت کی قطعی اور آخری علامت ہے — اس حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ غرغرہ کی اس کیفیت کے شروع ہونے سے پہلے پہلے بندہ اگر توبہ کرلے، تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائے گا۔ غرغرہ کی کیفیت شروع ہونے کے بعد آدمی کا رابطہ اور تعلق اس دنیا سے کٹ کر دوسرے عالم سے جڑ جاتا ہے، اس لیے اُس وقت اگر کوئی کافر اور منکر ایمان لائے یا کوئی نافرمان بندہ گناہوں اور نافرمانیوں سے توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں قابل قبول نہ ہوگا، ایمان اور توبہ اسی وقت تک کی معتبر اور قابل قبول ہے جب تک زندگی کی آس اور امید ہو اور موت آنکھوں کے سامنے نہ آگئی ہو۔ قرآن پاک میں بھی صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے۔

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ	ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں جو برابر گناہ
السَّيِّئَاتِ حَتّٰى إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ	کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں
الْمَوْتُ قَالَ إِنِّيْ تُبْتُ الْآنَ۔	سے کسی کے سامنے موت آکھڑی ہو تو کہنے
(النساء ع ۳)	لگے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں۔

حدیث کے مضمون کا ماخذ بظاہر یہی آیت ہے اور اس کا پیغام یہی ہے کہ بندہ کو چاہیے کہ توبہ کے معاملہ میں ٹال مٹول نہ کرے، معلوم نہیں کس وقت موت کی گھڑی آجائے اور خدانخواستہ توبہ کا وقت ہی نہ ملے۔

مرنے والوں کے لیے سب سے بہتر تحفہ استغفار:-

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا الْمَيِّتُ فِي الْقَبْرِ إِلَّا كَالْغَرِيْقِ الْمُتَغَوِّثِ يَنْتَظِرُ دَعْوَةً تَلْحَقُهُ مِنْ أَبٍ أَوْ أُمٍّ أَوْ أَخٍ أَوْ صَدِيْقٍ فَإِذَا لَحِقَتْهُ كَانَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا وَإِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى لَيُدْخِلُ عَلٰى أَهْلِ الْقُبُوْرِ مِنْ دُعَاءِ أَهْلِ الْأَرْضِ أَمْثَالَ الْجِبَالِ وَإِنَّ

هَدِيَّةُ الْاَحْيَاءِ اِلَى الْاَمْوَاتِ الْاِسْتِغْفَارُ لَهُمْ۔

رواہ البیہقی فی شعب الایمان

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قبر میں مدفون مُردے کی مثال بالکل اُس شخص کی سی ہے جو دریا میں ڈوب رہا ہو اور مدد کے لیے چیخ پکار رہا ہو، وہ بے چارہ انتظار کرتا ہے کہ ماں یا باپ یا بھائی یا کسی دوست آشنا کی طرف سے دعائے رحمت و مغفرت کا تحفہ پہونچے، جب کسی طرف سے اس کو دُعا کا تحفہ پہونچتا ہے تو وہ اس کو دنیا و مافیہا سے زیادہ عزیز و محبوب ہوتا ہے ۔۔۔ اور دنیا میں رہنے بسنے والوں کی دعاؤں کی وجہ سے قبر کے مردوں کو اتنا عظیم ثواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتا ہے جس کی مثال پہاڑوں سے دی جا سکتی ہے ۔۔۔ اور مُردوں کے لیے زندوں کا خاص ہدیہ ان کے لیے دُعائے مغفرت ہے۔

(شعب الایمان للبیہقی)

عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ لَيَرْفَعُ الدَّرَجَةَ لِلْعَبْدِ الصَّالِحِ فِي الْجَنَّةِ فَيَقُوْلُ يَا رَبِّ اَنّٰى لِيْ هٰذِهٖ؟ فَيَقُوْلُ بِاسْتِغْفَارِ وَلَدِكَ لَكَ۔

رواہ احمد

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت میں کسی مرد صالح کا درجہ ایک دم بلند کر دیا جاتا ہے تو وہ جنتی بندہ پوچھتا ہے کہ اے پروردگار! میرے درجہ اور مرتبہ میں یہ ترقی کس وجہ سے اور کہاں سے ہوئی؟ جواب ملتا ہے کہ تیرے واسطے تیری فلاں اولاد کے دُعائے مغفرت کرنے کی وجہ سے۔ (مسند احمد)

(تشریح) اس حدیث میں اولاد کی دُعا سے درجہ میں ترقی کا ذکر صرف تمثیلاً کیا گیا ہے ورنہ دوسرے اہلِ ایمان کی دُعائیں بھی اسی طرح نفع مند ہوتی ہیں۔ زندگی

میں جس طرح سب سے بڑا حق اولاد پر والدین کا ہے اور ان کی خدمت و اطاعت فرائض میں سے ہے، اسی طرح مرنے کے بعد اولاد پر والدین کا خاص حق ہے کہ ان کے لیے رحمت و مغفرت کی دعا کرتے رہیں، مرنے کے بعد ان کی خدمت اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا یہی خاص راستہ ہے — حضرت عبد اللہ بن عباس اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما کی ان دونوں حدیثوں کا مقصد صرف ایک حقیقت کی اطلاع دینا ہی نہیں ہے بلکہ ایک بلیغ انداز میں اولاد اور دوسرے اقارب و متعلقین کو ترغیب دی گئی ہے کہ وہ مرنے والوں کے لیے مغفرت و رحمت کی دعائیں کرتے رہیں۔ ان کے یہ تحفے قبروں میں اور جنت تک مرحومین کو پہونچتے رہیں گے۔

راقم سطور عرض کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی کبھی اپنے بعض بندوں کو اس کا مشاہدہ بھی کرا دیتا ہے کہ کسی کی دعاؤں سے کسی بندہ کو اس عالم میں کیا ملا اور اس کے حال اور درجہ میں کیسی ترقی ہوئی — اللہ تعالیٰ ان حقائق کا یقین نصیب فرمائے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی توفیق دے۔

یک دو ساعت صحبتے با اہل دل

مجلس حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی مدظلہ العالی

مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

(آٹھویں مجلس)

۲۷ شوال ۱۳۸۷ھ مطابق ۲۸ جنوری ۱۹۶۸ء خانقاہ شریف بھوپال، وقت ساڑھے دس بجے سے ساڑھے بارہ بجے تک۔

چونکہ اتوار تھا اس لیے مجمع بہت تھا، خانقاہ کے دالان و صحن سب بھرے ہوئے تھے، ایک جلسہ سا معلوم ہوتا تھا۔ حضرت نے کچھ دیر کے بعد کھڑے ہو کر تقریر فرمانی شروع کی۔ آواز بہت بلند تھی اور طبیعت میں جوش بہت تھا۔ تین مرتبہ ایسا ہوا کہ تقریر ختم کر دی اور بیٹھ گئے پھر کچھ یاد آیا اور طبیعت میں تقاضا پیدا ہوا اور تقریر فرمانی شروع کر دی۔ کسی قسم کا سہارا لینا یا کرسی پر بیٹھنا منظور نہیں فرمایا۔ تقریر بھی پوری مسلسل اور مربوط تھی۔ حاضرین ہمہ تن متوجہ اور بہت متاثر تھے۔ بعض حضرات پر رقت بھی طاری ہو جاتی تھی۔ شہر کے متعدد عمائد، افسران اور بڑے ملازمین، جدید تعلیم یافتہ اصحاب، کالجوں کے اساتذہ، طلبا اور شہر کے متعدد علماء بھی موجود تھے۔

فرمایا کہ اہلِ طلب کے آنے سے سینہ کھلتا ہے، ان کی وجہ سے مضامین کا ورود ہوتا ہے۔ آپ ٹونٹی کھولیں گے تو پانی نکلے گا آپ سمجھتے ہیں کہ ٹونٹی کا احسان ہے نہیں

بلکہ ٹونٹی پر آپ کا احسان ہے، وہ تو گرم رہتی پانی نکلنے سے ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ پیر کون ہے معنیٰ مرید ہونے والا پیر ہے کیونکہ اس نے ترغیب دلائی کہ اللہ کا راستہ بتایا جائے۔ علم امانت ہے۔ علم و حکمت کی باتیں اللہ کے بندوں کو پہونچانا عالم کے فرائض میں سے ہے مولانا حسین احمد مدنی بھوپال تشریف لائے ہوئے تھے۔ تین روز کا قیام تھا۔ میاں (بڑے صاحبزادے مولوی محمد سعید صاحب) اور ان کے ماموں خانقاہ تشریف لانے کی دعوت دینے کے لیے گئے مولانا نے معذرت فرما دی کہ سب اوقات گھر چکے ہیں اب کوئی وقت باقی نہیں ہے دونوں ناکام واپس آئے۔ میں نے کہا تم نچے ہو ابھی تمھیں کہنا نہیں آیا۔ میں گیا حضرت آرام فرما رہے تھے مجھے دیکھ کر اٹھنے لگے میں نے کہا نہیں آپ آرام فرمائیے۔ مجھے صرف ایک مسئلہ پوچھنا ہے۔ میں یہ دریافت کرتا ہوں کہ ایک شخص نے مسجد بنائی وہ دروازہ پر کھڑا ہو جاتا ہے اور اندر آنے والوں کو روکتا ہے۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ جب وہ مسجد بنا چکا اور وقف کر چکا تو اب اس کو کیا حق ہے؟ میں نے کہا آپ بھی مسجد ہیں آپ نے اپنے آپ کو دین کے لیے وقف کر دیا ہے اب جو چاہے آپ سے فائدہ اٹھائے۔ فرمایا میں ضرور آؤں گا لیکن کھانے کے بجائے چائے پر اکتفا کریں میں نے عرض کیا مجھے تو دوسرا ہی فائدہ اٹھانا ہے میں پانی پلا کر رخصت کر دوں گا۔ چنانچہ تشریف لائے میں نے نظر بچا کر ان کی جوتیاں سیدھی کیں کہ عالموں کا احترام اللہ و رسول کی محبت کی دلیل ہے اور وہ تو حدیث نبوی کے شیخ تھے۔ دیر دیر رات تک حدیث کا درس دیتے تھے۔ اہلِ دنیا کا حال ہے کہ ان کی محفل میں کوئی بڑا عہدہ دار آجاتا ہو تو مجلس میں کھلبلی مچ جاتی ہے اور کوئی دیندار آتا ہے تو کسی کو توجہ بھی نہیں ہوتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت نہیں۔

مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ دُنیا نے غور کرنے ہی سے ترقی کی ہے۔ پہلے ہمارے یہاں میٹھے تیل کا چراغ جلتا تھا۔ بارات میں مشعلیں لے کر لوگ چلتے تھے دنیا نے اس پر اکتفا نہیں کیا اور سوچتی اور تفکر کرتی رہی کہ اس سے آگے بھی روشنی ہونی چاہیے یہاں تک کہ آج اس بجلی کی روشنی تک پہونچ گئی۔ ایمان اور دین کے بارے میں یہی اصول ہونا چاہیے کہ جتنی روشنی ہمارے پاس ہے اس سے زیادہ کی طلب اور تلاش ہو کہ ترقی کی انتہا نہیں ہو۔ اہلِ یورپ

زمین سے جب ترقی کر چکے تو انھوں نے اب آسمانوں سیاروں اور چاند کی طرف توجہ کی ہے۔ میرے نزدیک یہ فطرت کے عین مطابق ہے اور اسی سے کمالات حاصل ہوتے ہیں۔ دین کے بارے میں بھی یہی نظریہ ہونا چاہیے۔ شاعر نے ٹھیک کہا ہے ؎

ترقی طلب کیجئے ہر گھڑی
خدا بے نہایت ہے رہ اس کی بڑی

دنیا نے اپنی ترقی پر اکتفا نہیں کیا۔ دین والوں نے اپنی حالتوں پر کیوں اکتفا کرلیا۔ بات یہ ہے کہ جس طرح دنیا کی عظمت اور وفاداری ان کے خیال میں ہے اس طرح دین کی عظمت ہمارے خیال میں نہیں ہے۔ اگر میں بتادوں کہ فلاں جگہ خزانہ ہے تو آپ اس کے لیے کیا کچھ نہ کریں گے۔ موجودہ ترقیات اور کمالات کی حقیقی ترقیات اور کمالات کے مقابلہ میں مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص اس پر فخر کرے کہ میں نے گوبر کے کنڈے (اُپلے) بہت تھاپ لیے ہیں بہت کام آئیں گے۔ یہ دراصل اس کے دماغ کی رکاکت اور پستی کی نشانی ہے۔ جن کے دل میں اللہ کی عظمت ہے وہ اس نظر سے ہم کو دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ع

برعکس نہند نام زنگی کافور

جب ہم انتہائی تنزل میں آگئے تو اس کو انتہائی ترقی کا نام دے دیا۔ دل کا سکون اور روح کا اطمینان بالکل غائب۔ زندگی ایسی ہوگئی ہے جیسے ریشمی چادر کو کانٹوں پر ڈال کر کھینچیں، جس طرح وہ چادر پھٹ جاتی ہے اس طرح ہماری زندگی پارہ پارہ اور تار تار ہے۔ میرے یہاں دو لڑکے مزدوری کرنے آئے۔ کپڑے بالکل پھٹے ہوئے تھے لیکن سارے دن ہنستے کھیلتے رہے۔ بات بات پر ان کی باچھیں کھل جاتی تھیں اور ٹھٹھے لگاتے تھے کام میں جٹے رہے۔ جب کھانے کا وقت آیا تو بھاجی اور سوکھی روٹی نکال کر کھانے بیٹھ گئے ایسے مست اور مگن تھے جیسے بڑی نعمت کھا رہے ہوں۔ یہ اسباب سے بالکل خالی تھے لیکن خوش تھے ان کو یہ فکر نہیں تھی کہ امریکا میں فلاں فلاں سامان ہیں ولایت میں فلاں سامان، اسی کو کہا گیا ہے خیر الغنیٰ غنی النفس (سب سے اچھی تونگری نفس کی تونگری ہے)

میں کلکتہ میں ایک ڈاکٹر کے بنگلہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جاپان کے

گولہ، پر حملہ کا خطرہ تھا ٹیلیفون آیا اس کو سن کر سب ہنسنے لگے۔ میں نے پوچھا کہ کیا بات تھی کہنے لگے شہر کے بہت بڑے سیٹھ کا ٹیلیفون تھا کہ جب سے انھوں نے سنا ہے کہ جاپان کا ایک گولا فلاں مقام پر گرا ہے ان کو دست لگ گئے ہیں لوگ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہے تھے ان لڑکوں کو کیوں اتنی ہنسی آتی تھی اور وہ اتنے مست کیوں تھے۔ جوانی کا گرم خون، صحت اور بے فکری۔ اور حقیقت میں جان جتنی بڑی دولت ہے اتنی بڑی دولت کوئی نہیں۔ قرآن مجید حیات ابدی کا ضامن ہے لا یمسھم فیھا نصب وماھم منھا بمخرجین (نہیں چھوئے گی جنت میں ان کو تھکن اور نہ وہ اس سے نکالے جائیں گے) بنی نوع میں کون ہے جو اس دولت کو نہ لے۔ اب اگر دنیا کی دولت اس کے مقابلہ میں چھوڑی تو کیا کمال کیا؟ اس حقیقی دولت کے مقابلہ میں وہ دولت کنڈے اور اپلوں کی طرح ہے۔ جب وہ دولت چلی گئی تو سب کے سامنے جھکنے اور سجدہ کرنے لگے۔

آج میں دیکھتا ہوں کہ افسر کے نام سے کلیجہ لرز جاتا ہے اور اللہ اکبر کی آواز کا کوئی اثر نہیں پڑتا حالانکہ یہ افسر و حاکم خیالی اور خود ساختہ ہیں "ما انزل اللّٰہ بھا من سلطان ان الحکم الا للّٰہ" (نہیں اتاری ہے اللہ نے اس بات کی کوئی دلیل۔ حکمرانی تو بس اللہ ہی کا حق ہے)

لوگ فرمائش کرتے ہیں کہ وظیفہ بتا دیجئے۔ آج بیشی ہے۔ عظمت تو دل میں حاکم کی بٹھالی ہے اب وظیفہ کیا اثر کرے گا۔ ایک بی بی تشریف لائیں۔ مصیبت بیان کی۔ میں نے لاحول ولا قوۃ الا باللہ کا وظیفہ بتایا کہا یہ تو میں پڑھتی رہی ہوں۔ میں نے کہا کہ آپ تشریف لے جائیے۔ اللہ کے رسول نے تو فرمایا تھا کہ یہ عرش کے خزانوں میں سے خزانہ ہے اور آپ کے نزدیک کوئی بات ہی نہیں، اس کے مقابلہ میں ایک دوسرے صاحب تشریف لائے اپنی ایک پریشانی بیان کی میں نے لاحول ولا قوۃ الا باللہ کا ختم بتایا۔ انھوں نے کہا یہ تو بڑے حضور (حضرت پیر ابو احمد[1] صاحب) نے بتایا تھا۔ اس کے پڑھنے سے ایک شخص جس کو پھانسی کی

---

[1] صاحب ملفوظات حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی کے والد ماجد اور شیخ۔

سزا ہوئی تھی بری ہوگیا۔ انھوں نے عظمت کے ساتھ پڑھا اور غیبی طریقہ پر ان کی ایسی مدد ہوئی کہ حیرت ہوگئی۔ ایسے بہت سے واقعات پیش آئے ہیں۔ فائدہ اٹھانے والا اور ٹھگنے والا جب تک بری چیز کو اچھا کرکے نہ بتائے گا فائدہ نہ اٹھا سکے گا۔ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ والد نے ایک انگوٹھی بنا کر دی تھی، میں مکتب پڑھنے جاتا تھا۔ ایک عیار مجھے راستہ میں ملا اس نے مجھے ایک کھجور دی میں نے کھایا تو میٹھی تھی کہا کہ اب انگوٹھی چوس کر دیکھو میں نے چوسا تو پھیکی اور بے مزہ تھی۔ کہا کہ اب یہ پھیکی اور بے مزہ چیز مجھے دے دو اور میٹھی کھجور لے لو۔ اس طرح اس نے انگوٹھی ٹھگ لی۔ یہی ہماری مثال ہے لوگوں نے ہم سے کہا یہ کیا ہے؟ ہم نے کہا اس کا نام اسلام ہے۔ یہ باپ دادا سے چلا آرہا ہے یہ ہم کو بڑی تکلیف دیتا ہے۔ ہم کو میٹھی نیند نہیں سونے دیتا چیچڑیوں اور جوؤں کی طرح ہم کو کاٹتا ہے اور ہم کو اس کی وجہ سے صبح اٹھنا پڑتا ہے۔ انھوں نے کہا اس میں کچھ نفع بھی ہے؟ ہم نے کہا محض خیالی نفع ہے! انھوں نے کہا ہم کو یہ دے دو اور یہ دولت اور کرسیاں ہم سے لے لو۔ ہم جس بستی میں تھے اُس بستی میں ہم کو اسلام پست اور بے کار نظر آتا تھا اور یہ دنیا کی دولتیں بلند دکھائی دیتی تھیں۔ ایک شخص کھائی میں پڑا ہوا ہے اوپر بلندی پر بلی ہے وہ کہتا ہے کہ بلی انسان سے اونچی ہوتی ہے اب جب تک اس بلی کو کھائی میں نہ لایا جائے یا اس شخص کو بلندی پر نہ بٹھایا جائے وہ اسی پر اصرار کرتا رہے گا کہ بلی انسان سے اونچی ہوتی ہے۔ یہی وہ حالت ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے "ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ" (پھر لوٹا دیا ہم نے اس کو پست سے پست تر حالت میں) اب اگر پوچھا جائے کہ کھائی میں سے نکلنے کا کیا راستہ ہے، کہا جائے گا ہاں ایک جوہر ہے "الا الذین آمنوا وعملوا الصالحات فلهم اجر غیر ممنون" (ہاں مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عملی کو اپنایا تو ان کے لیے ابدی اجر ہے) آج ہماری قوم اس پستی میں پہونچ گئی ہے کہ اسلام کا کوئی جوہر اس میں نہیں پایا جاتا نہ صداقت ہے نہ امانت۔ نہ اخلاق نہ عمل، ہر قسم کی بد اخلاقیاں اور جرائم ان میں مل جائیں گے۔ چور، دغاباز، عیار، رہزن سب ملیں گے، نام عبدالرحمٰن محمد سلطان وغیرہ وغیرہ، جذبات پر قابو رکھنا اور غصہ کو دبانا تو آتا ہی نہیں، دو شخصوں میں ذرا گفتگو ہوئی اور ایک نے دوسرے کو چاقو مار دیا۔ غصہ کا محل

کیا ہے؟ اور خوشی کا محل کیا ہے؟ یہ جانتے ہی نہیں، ساتھی پر تو اتنا غصہ آیا اور نفس کی شرارتوں پر کبھی غصہ نہیں آتا، وجہ یہ ہے کہ ہم کو اپنی حقیقت معلوم نہیں" یا ایہا الانسان ما غرک بربک الکریم، قتل الانسان ما أکفرہ، من أیّ شیئ خلقہ، من نطفۃ، خلقہ، فقدرہٗ ثم السبیل یسرہ ثم اماتہ فاقبرہ ثم إذا شاء انشرہٗ (اے انسان تجھے کس چیز نے اپنے رب کریم کی بابت دھوکے میں ڈالا ہے ـــــ اللہ کی مار ہو انسان پر وہ کیا ناشکرا ہے (دیکھتا نہیں کہ کس چیز سے اس کو پیدا کیا، نطفہ سے پیدا کیا اس کو، پھر اندازہ ٹھیرایا اُسکا پھر آسان کیا راستہ پھر اسے موت دی، پھر قبر میں پہونچایا، پھر جب چاہے گا اسے قبر سے نکال کر کھڑا کرے گا۔)

اگر یہ غصہ کرنے والا اور اپنے ساتھی پر حملہ کرنے والا نفس کی ذلت کو سمجھ لیتا تو یہ نہ کرتا۔ شیخ سعدیؒ نے حکایت لکھی ہے کہ ایک آبرو باختہ شخص نے ایک بزرگ سے کچھ پیسے مانگے انھوں نے عذر کیا کہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ؎

طمع بر دشوخے بصاحب دلے ۔۔۔ بنود آں زماں درمیاں حاصلے

یہ سن کر وہ شخص جامہ سے باہر ہوگیا اور ان بزرگ کی کھڑے ہوکر ہجو بیان کرنی شروع کردی، کہنے لگا کہ ان جیسے لوگوں کے دھوکہ میں نہ آنا یہ جب وقت مراقب اور سر بزانو ہوتے ہیں تو بڑے بزرگ معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ اپنے شکار کی تاک میں رہتے ہیں یہ مسجد اس لیے آتے ہیں کہ یہاں بہت لوگ آتے ہیں کوئی موٹا سا شکار ہاتھ آجائے گا۔ ان کو گھر میں شکار نہیں ملتا تو خانۂ خدا میں شکار کرنے آتے ہیں۔ ع ؎

کہ چوں گربہ زانو بدل بر نہند ۔۔۔ وگر صیدے اُفتد چو سگ درجہند

سوئے مسجد آوردہ دکان شید ۔۔۔ کہ در خانہ کمتر تواں یافت صید

کہنے لگا قافلہ پر تو شیر مرد ڈاکہ ڈالتے ہیں جو کھلے میدان میں اپنی شجاعت کا جوہر دکھاتے ہیں لیکن یہ درویش نما رہزن تو لوگوں کی جیب کاٹتے ہیں۔ یہ اپنی گدڑی میں سفید اور سیاہ پیوند لگائے ہوئے ہوتے ہیں لیکن وہ اس کے اندر سونا چھپائے ہوئے ہیں ؎

رہ کارواں شیر مرداں زنند ۔۔۔ ولے جامۂ مردم ایناں کنند

سپید و سیاہ پارہ بر دوختہ ۔۔۔ لباسے پنہاں زر اندوختہ

کہنے لگا کہ یہ عبادت میں تو بہت ضعیف اور سست نظر آتے ہیں لیکن رقص اور حالتِ وجد میں بڑے جوان اور چست بن جاتے ہیں سہ

مبیں در عبادت کہ پیران سست — کہ در رقص و حالت جوانند و چست

یہ دیکھنے میں بڑے ضعیف و نحیف اور زار و نزار نظر آتے ہیں لیکن یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا ہیں جو اژدھوں اور سانپوں کو ہضم کر لیتا تھا اور ایسا ہی سوکھا کا سوکھا اور سونٹا بنا رہتا تھا سہ

عصائے کلیم اند بسیار خوار — بس آنگہ نمایند خود را نزار

نہ یہ متقی پرہیزگار ہیں نہ عالم و حکیم۔ بس صرف اتنی بات ہے کہ دین کے ذریعہ دنیا کھاتے ہیں سہ

نہ پرہیزگار و نہ دانشورا اند — ہمیں بس کہ دنیا بدیں میخورند

اس نے کہا کہ تمام سنتوں میں سے انھوں نے دو ہی سنتوں کا انتخاب کیا ہے۔ ایک سنتِ قیلولہ اور ایک طعام سحور سہ

ز سنت نہ بینی در ایشاں اثر — مگر خواب پیشیں و نان سحر

ان بزرگ نے جب اپنی یہ ہجو سنی تو فرمایا اس نے تو محض اپنے گمان و قیاس سے یہ باتیں کہی ہیں مجھے تو ان کا یقین حاصل ہو کیونکہ میں اپنے عیوب کا مشاہدہ کرتا ہوں سہ

زر دے گماں بر من ایں ہا کہ بست — من از خود یقینی می شناسم کہ ہست

اس بیچارے کا تجربہ تو صرف ایک سال کا ہے کہ اس کی ملاقات کو اس سے زیادہ عرصہ نہیں ہوا اور مجھے تو اپنی عمر ستر سال کا حال معلوم ہے سہ

دے امسال پیوست با ما وصال — کجا داندم عیب ہفتاد سال

اگر میدانِ حشر میں یہی میرے خلاف گواہ گزرے گا تو مجھے بڑا اطمینان ہے کہ میرے ساتھ اچھا ہی معاملہ ہوگا۔ پھر مجھے دوزخ کا ڈر نہیں سہ

بمحشر گواہِ گناہم گر اوست — نہ دوزخ نترسم کہ عالم نکوست

سعدیؒ علیہ الرحمہ ایک دوسری حکایت سناتے ہیں کہ حضرت جنید بغدادیؒ عید کے روز حمام سے نہا کر اور صاف کپڑے پہن کر نکلے، ایک شخص نے کوٹھے پر سے ان پر کوڑا پھینک دیا۔

انھوں نے فرمایا میں تو اس قابل تھا کہ مجھ پہ پتھر پڑیں تیری رحمت ہے کہ پتھر کو میرے لیے پھرا دیا۔

تقسیم کے بعد یہاں ہڑبونگ کا زمانہ تھا۔ مولوی نعمان صاحب جا رہے تھے ایک شخص نے پیچھے سے ان کے مکا مار دیا۔ انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور ایک لات ماری۔ وہ شخص گر گیا یہ آگے بڑھ گئے۔ اس کا ذکر خانقاہ میں ہوا۔ مولوی عبدالرشید صاحب بیٹھے تھے۔ کہنے لگے نعمان میاں کسی سے مار کھانے والے نہیں۔ میں نے کہا یہ مت کہیے۔ ہم آپ کی بہادری جب سمجھتے کہ آپ پر رنگ اور گوبر ڈالا جاتا تو خاموش چلے آتے۔ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں سے

چوں نہ داری ناخنِ درندہ تیز با بداں آں بہ کہ کم داری ستیز

نرم چیز جتنا عمدہ کام دیتی ہے سختی نہیں دیتی۔ بے وقت کی تیزی اور گرمی بنے بنائے کھیل بگاڑ دیتی ہے۔ جیسے اس قصہ میں مسلمانوں کا جیتا ہوا مقدمہ ہار گیا جس میں کلثوم بیا کی مسجد پر حملہ ہوا اور حکام کو مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی تھی۔ لیکن جامع مسجد میں کچھ لوگ جوابی کارروائی کرنے کے ارادے سے بیٹھے اور وہ گرفتار ہو گئے اور کھیل بگڑ گیا۔[۱] اگر ایسے موقع پر بجائے جوابی کارروائی کے جس کا سوائے ذلت و پریشانی کے کوئی نتیجہ نہیں دو رکعت نماز پڑھ کر دعا کرتے اور کہتے اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَجْعَلُکَ فِیْ نُحُوْرِھِمْ وَنَعُوْذُ بِکَ مِنْ شُرُوْرِھِمْ تو بہتر تھا۔

دوسری قوم اتنی ذلیل نہیں ہوئی جتنا ہم ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ہم نے تم پر اتنے بڑے بڑے انعامات کیے لیکن تم نے نافرمانی کی۔ ومن یبدل نعمۃ اللہ من بعد ما جاءتہ فان اللہ شدید العقاب (اور جس نے بدل ڈالا اللہ کی نعمت کو تو اللہ بڑا ہی سخت سزا دینے والا ہے) ہم میں سے چور ڈاکو اور سب برائیوں والے موجود ہیں دوسری قوم والے کم ہوں گے۔ بھیرا گڑھ[۲] میں ایک سندھی عورت نے کچھ رقم جمع کی تھی اس کو رات پڑ گئی ایک صاحب دیندار صورت کے یہاں جن کی نیچی ڈاڑھی تھی اس نے پناہ

---

[۱] یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ ایک پچھلے ملفوظ میں آ چکا ہے۔ [۲] بھوپال کا ایک نواحی محلہ جس میں دوسری جنگ کے موقعہ پر غیر ملکی قیدی اور نظر بند رکھے گئے تھے۔

لی کہ یہ مسلمان ہیں اور دیندار ہیں۔ انھوں نے رات کو اس کو قتل کر کے اس کی بارقہ پر قبضہ کر لیا۔ بالآخر گرفتار ہوئے اور اب بھی جیل میں پڑے ہوئے ہیں۔ مجھے رسالہ بیّن الجبایۃ والجھل ادیۃ میں پڑھ کر بڑا مزہ آیا کہ لوگ اسلام کا بڑا معجزہ اور صحابۂ کرامؓ کی بڑی کرامت یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا لشکر دریائے دجلہ کو گھوڑوں پر بیٹھ کر عبور کر گیا اور نہ کوئی ڈوبا اور نہ کسی کی کوئی چیز ضائع ہوئی۔ اسلام کا بڑا معجزہ اور صحابہ کرام کی اصل کرامت یہ تھی کہ دولت کے دریا اُمنڈ آئے اور قیصر و کسریٰ کے خزانے ان کے قدموں سے لگ گئے وہ اس دریا میں سے ہو کر صاف نکل گئے اور ان کا دامن بھی تر نہ ہوا۔

میں نے ایک دوست سے کہا کہ لوگ جنازہ میں شامل ہوتے ہیں۔ مجھے ایک بھی جنازہ میں شامل ہوتا نظر نہیں آیا۔ جنازہ میں صحیح شمولیت یہ ہے کہ آدمی یہ سمجھے کہ یہ جنازہ فلاں آدمی کا نہیں پڑا ہے دراصل میں مرا ہوں یہ نماز جنازہ میری نماز جنازہ کا ریہرسل ہے لیکن مجھے زندگی کی ایک مہلت مل گئی ہے۔ مجھ سے کسی نے کہا کہ فیض اللہ خاں نے جہانگیرآباد میں انتقال کیا۔ میں نے کہا غلط! صحیح یہ ہے کہ میں مرا ہوں یہ میرے انتقال کی خبر ہے۔ مجھے سمجھنا چاہیے کہ یہ میری ہی نماز پڑھائی جارہی ہے اور پھر قبر دیکھ کر یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ سب ارادے اور آرزوئیں دفن ہو رہی ہیں۔ لیکن اس کے برخلاف میں نے دیکھا ہے کہ نماز جنازہ کے بعد دعا کے لیے سب نے ہاتھ اٹھائے ایک صاحب سگریٹ پی رہے تھے اس کو ذرا جھکا دیا کہ بجھے نہیں اور ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے لگے پھر بدستور سگریٹ پینے میں مشغول ہو گئے۔ میں نے منشی حلیم الدین صاحب سے کہا کہ دیکھئے مردہ سگریٹ پی رہا ہے۔ قبر حجلۂ عروسی ہے کامیاب وہی ہے جو ایمان سلامت لے گیا۔ ع۲؎

بیرونِ گور لاف کرامت چہ می زنی
ایماں اگر بگور بری صد کرامت است

۱؎ راقم السطور کا ایک عربی رسالہ جو عرصہ ہوا شائع ہوا تھا۔ ۲؎ حضرت نے یہی لفظ استعمال کیا اور متعدد بار متعدد موقعوں پر یہ لفظ استعمال فرماتے تھے۔

اگر بارات بڑی دھوم دھام کی ہے اور بڑا تزک و احتشام ہے لیکن نوشہ اہل نہیں تو کچھ فائدہ نہیں۔

خدمت میں جو لطف ہے وہ مخدومیت میں نہیں۔ میری کسی نے خدمت کی تو معلوم ہوا کہ کھانا تو کھا رہا ہوں مگر پھیکا۔ اور میں نے جب کسی کی خدمت کی تو معلوم ہوا کہ میں نے نہایت لذیذ اور چٹ پٹی چیز کھائی۔ ایک بزرگ نے جب اپنے نفس پر غور کیا تو بہت موٹا پایا۔ انھوں نے نفس سے کہا کہ میں نے اتنے مجاہدے کیے مگر تم موٹے کے موٹے ہے؟ نفس نے کہا کہ میرے موٹاپے کی وجہ یہ ہے کہ جو آپ کے پاس آتا ہے وہ جھکا ہوا آتا ہے۔ لوگ بادشاہوں کی بھی ایسی تعظیم نہیں کرتے جیسی آپ کی۔ کوئی دست بوسی کرتا ہے۔ کوئی قدم بوسی۔ تو وہ آپ جو کھانا کھاتے تھے وہ آپ کے جسم کو پہونچتا تھا لیکن یہ تعظیم میری غذا تھی اسی وجہ سے میں موٹا ہو گیا ہوں۔ بالآخر انھوں نے اس کا علاج کیا اور ایسا سامان کیا کہ نفس پر ضرب لگی اور اس کا علاج ہو گیا۔ طویل قصہ ہے۔ کل ختم کے بعد میں نے کہا کہ فلاں کا نکاح ہوگا اور حضرت قدوۃ السالکین نکاح پڑھائیں گے۔ مطیع اللہ خاں صاحب نے کہا وہ کون ہیں؟ میں نے کہا یہی شاہ محمد یعقوب صاحب جو بیٹھے ہوئے ہیں۔ لوگ ایسے ایسے القاب لکھتے ہیں کہ نفس پھول جائے۔ مجھے تو اپنے ایک بچے کا یہ لکھنا بہت پسند آیا کہ میرے اچھے میاں۔ جس ہاتھ کو بوسے دیئے جاتے ہیں اگر احساس ہو تو اس میں زخم ہیں اور پھوڑے جن پر مرہم اور زندہ طلسمات ملنے کی ضرورت ہے۔

اِنسانی قانون اور اسلامی قانون

ایک اُصولی موازنہ

(از مولانا امین احسن اصلاحی[۱])

۱۔ انسانی قانون کے قانون ہونے کا تمام تر انحصار اس بات پر ہے کہ اس کو شیخ قبیلہ یا بزرگ خاندان کی منظوری حاصل ہے یا کسی عدالت نے اس پر عمل کیا ہے یا کسی حکومت نے اس کو تسلیم کیا ہے۔ اگر ان باتوں میں سے کوئی چیز بھی اس کو حاصل نہ ہو تو پھر اس کی قانونیت ختم ہو جاتی ہے[۲]۔ برعکس اس کے اسلامی قانون کی قانونیت ان چیزوں میں سے کسی چیز کی بھی محتاج نہیں ہے۔ وہ بہر حال قانون ہے۔ کوئی عدالت اس کو مانے یا نہ مانے اور کوئی حکومت اس کو تسلیم کرے یا نہ کرے وہ اس کائنات کے حقیقی مالک اور حکمراں کا قانون ہے، اگر کوئی عدالت یا حکومت اس کو تسلیم نہیں کرتی تو اس کے تسلیم نہ کرنے سے اس کی قانونیت متاثر نہیں ہوتی بلکہ خود وہ عدالت یا حکومت نافرمانی اور بغاوت کی مجرم ٹھہرتی ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ	جو لوگ اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے
فَأُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ۔	مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہی لوگ نافرمان ہیں۔

---

[۱] مصنف کی کتاب "اسلامی قانون کی تدوین" سے ماخوذ۔

[۲] ملاحظہ ہو سرجان سالمنڈ کی کتاب JURIS PRUDENCE (اصول قانون) ص۳۱

اس حقیقت کا اظہار ان ناموں سے بھی ہوتا ہے جو اسلام نے اپنے قانون کے لیے اختیار کیے ہیں۔ اسلامی قانون کے لیے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان میں ایک لفظ کتاب ہے جس کے معنے ہیں مَاکَتَبَهُ اللّٰهُ لَنَا (جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دیا ہے) دوسرا لفظ سُنّت کا ہے جس کے معنیٰ ہیں مَاسَنَّهُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ (جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے مقرر کر دیا ہے) تیسرا مشہور لفظ شریعت کا ہے جس کے معنیٰ ہیں مَاشَرَعَهُ اللّٰهُ لَنَا (جو اللہ نے ہمارے لیے ٹھہرا دیا ہے) اسی طرح دوسرے الفاظ سے بھی یہی حقیقت واضح ہوتی ہے۔

۲۔ انسانی قانون اپنے ساتھ احترام یا تقدیس کا کوئی پہلو نہیں رکھتا۔ وہ آدمی کے ایمان کا جزو نہیں ہوتا اس کے متعلق آدمی کا یہ تصور نہیں ہوتا کہ جس نے اس قانون کو دیا ہے وہ اس کی نافرمانی یا فرمانبرداری کو دیکھ بھی رہا ہے۔ اس کے بارے میں یہ عقیدہ بھی نہیں ہوتا کہ اس کی اطاعت سے جنت ملتی ہے اور اس کی خلاف ورزی سے آدمی دوزخ کے عذاب میں گرفتار ہوتا ہے۔

اس کے برعکس اسلامی قانون خدا کا قانون ہونے کے سبب سے نہایت مقدس و محترم مانا جاتا ہے۔ وہ ہر مسلمان کے ایمان کی بنیاد ہوتا ہے جس کو مانے بغیر اس کا ایمان ہی درست نہیں ہوتا۔ اس کے دینے والے کے متعلق ہر مسلمان کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ وہ دلوں کے بھیدوں اور خلوت خانوں کے رازوں سے بھی واقف ہے۔ اس کی کھلی ہوئی خلاف ورزی تو درکنار اگر دل کے کسی گوشے میں اس سے انحراف کا وسوسہ بھی موجود ہو تو وہ اس سے بھی باخبر ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کے متعلق ہر مسلمان کا یہ عقیدہ بھی ہوتا ہے کہ خدا کی رضا اس کے مانے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کے اندر دنیا کی صلاح بھی ہے اور آخرت کی فلاح بھی۔

۳۔ انسانی قانون کا اصلی رول انسانی زندگی کے اندر صرف منفی قسم کا ہے۔ جو چیز اس کو وجود میں لائی ہے خود اس کے اپنے ماہرین کے بیان کے مطابق وہ یہ ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے پر تعدّی اور دست درازی سے روکا جا سکے۔ اگر انسان کے اندر یہ خرابی نہ ہوتی تو اس کی سرے سے کوئی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ برعکس اس کے اسلامی قانون اپنی ضرورت صرف تعدّی اور دست درازی کی روک تھام ہی نہیں بتاتا بلکہ اپنا کام انسان کی ہدایت

رہنمائی بتاتا ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی ــــ خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی'
کی تہذیب و تکمیل کے لیے اس کا محتاج ہے، اس کے بغیر اس کی قوتوں اور صلاحیتوں کی صحیح
تربیت ممکن ہی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی قانون صرف ہمارے مروّجہ ضابطۂ دیوانی'
یا ضابطۂ فوجداری کے قسم کی دفعات پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ طہارت اور عبادت
کا ایک ضابطہ بھی ہے۔ تربیت اخلاق اور تزکیۂ نفس کے قواعد اور احکام بھی ہیں، اور
اجتماعی و معاشرتی تہذیب و اصلاح کے اُصول و آئین بھی ہیں۔ انسانی قانون کے اندر اگر
اس طرح کی کچھ چیزیں داخل ہوئی ہیں تو وہ بعد کی پیداوار اور اس کے اصلی مزاج کے
خلاف ہیں۔ لیکن اسلامی قانون میں یہ ساری چیزیں اس کے اپنے مزاج کے اقتضاء سے داخل
ہوئی ہیں۔ حالات زندگی کی اصلاح و تہذیب میں اس کا رول منفی سے زیادہ مثبت ہو۔
ایک اسلامی حکومت دوسری حکومتوں کے مقابلہ میں زیادہ وسیع ذمہ داریاں رکھتی ہے،
اس کو عوام کی زندگی کے ان گوشوں پر بھی نگاہ رکھنی پڑتی ہے جو اس زمانہ میں حکومت کی نگرانی
سے بالعموم الگ خیال کیے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ اسلامی قانون کی یہی وسعت اور ہمہ گیری ہے۔

۴۔ انسانی قانون کی اصل بنیاد، جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے' عرف و عادت اور رسوم و رواج
پر ہے۔ خاندانوں اور قبیلوں میں جو باتیں رواج پکڑ گئیں انہی چیزوں نے ضرورت کے وقت
قانون کا درجہ حاصل کر لیا۔ ان میں علمی اور فلسفیانہ نظریات کی آمیزش بعد میں زمانہ کی ترقی
سے ہوئی ہے۔ اس کے ابتدائی مواد میں خاندانی اور قبائلی روایات و تعصبات کی تمام
تنگ نظریاں ملی ہوئی ہیں۔ البتہ اب اس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جانے لگا ہے کہ اٹھارویں
صدی کے اواخر سے اس کو رحم، عدل، مساوات اور انسانیت کی عالمگیر بنیادوں پر استوار
کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس کے معنیٰ دوسرے الفاظ میں یہ ہوئے کہ اس کے ماضی اور
حاضر میں کوئی ربط نہیں ہے اور اس کے مستقبل کے بارہ میں بھی کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ
یہ کیا شکل اختیار کرے گا۔

اس کے برعکس اسلامی قانون روز اول سے انسانی فطرت اور خدا کی دی ہوئی ہدایات
پہ مبنی ہے اس میں خاندانوں اور قبیلوں کے رجحانات و تعصبات کو کوئی دخل نہیں ہے، رسوم و

رواج اس میں اگر کوئی دخل رکھتے ہیں تو صرف ایک محدود گوشہ کے اندر رکھتے ہیں اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ وہ خدا اور رسول کی کسی ہدایت کے خلاف نہ ہوں۔ اس کے ماضی اور حاضر میں گہرا ربط ہے اور مستقبل میں اس کی ترقی کے خطوط بھی بالکل معین ہیں۔ انسانی قانون، عدل، مساوات اور رحم وانسانیت کی جس منزل تک اب پہونچنے کی آرزو کر رہا ہے۔ اسلامی قانون کا پہلا ہی قدم وہیں سے اٹھا ہے بلکہ یہ کہنا بھی بے جا نہیں ہے کہ اگر انسانی قانون اپنی اس معراج آرزو کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو جس دن اس کو یہ کامیابی حاصل ہو گی اسی دن وہ اسلامی قانون میں تبدیل ہو جائے گا۔

۵۔ قانون کے اندر وحدت ویکسانی ایک مطلوب شے ہے۔ اس کے بغیر اس کا اصلی مقصد، قیام عدل پورا نہیں ہو سکتا۔ لیکن انسانی قانون کے متعلق اوپر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اس میں وحدت ویکسانی اول تو ہے نہیں اور اگر کسی حد تک ہے بھی تو وہ اس کے اپنے مزاج کے تقاضے سے وجود میں نہیں آئی ہے بلکہ اس کو مصنوعی طور پر ریاست نے اپنے مصالح کے تحت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور اب یہ بین الاقوامی ادارے ہیں جو اس بات کے لیے زور لگا رہے ہیں کہ قوموں قوموں کے قوانین میں جو اختلافات ہیں وہ دور ہوں اور ان کے اندر یک رنگی وہم آہنگی پیدا ہو۔

اس کے برعکس اسلامی قانون کا سرچشمہ چونکہ خاندانوں اور قبیلوں کی روایات اور ان کے رسوم وعادات نہیں ہے بلکہ اللہ وحدہٗ لاشریک کی شریعت ہے اس وجہ سے وحدت ویکسانی اس کی اپنی فطرت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام نبیوں کو ایک ہی قانون عطا فرمایا۔ اس میں اگر کوئی فرق تھا تو وہ محض ظاہری فرق تھا۔ قرآن نے اسلامی قانون کی اس یکسانی کی تصریح سورۂ شوریٰ کی آیت ۱۳ میں اس طرح فرمائی ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا	اور تمہارے لیے بھی اسی دین کو مشروع کیا
وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْ	ہے جس کی تعلیم نوح کو دی تھی۔ اور اے پیغمبر
حَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ	یہ دین بھی جس کی وحی ہم نے تمہاری طرف
اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى	کی ہے وہی ہے اور یہی دین ہے جس کی
اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا	تعلیم ہم نے ابراہیمؑ، عیسیٰؑ اور موسیٰؑ کو

تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ دی تھی کہ اس دین کو قائم کرو اور اس میں

اختلاف نہ ڈالو۔

اس میں اگر اختلاف واقع ہوا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ یہ اختلاف اس کے اپنے مزاج کا تقاضہ تھا۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ قوموں نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی، تعصب اور تنگ نظری کے سبب سے اپنے اپنے دائروں کے اندر ہی اپنے کو محبوس کرلیا اور اسلامی قانون کی ترقی کے ساتھ ساتھ خود بھی آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کی۔ مشرکین عرب اور یہود و نصاریٰ نے اسلام کی جو مخالفت کی قرآن نے اس کو ان کی بغی یعنی ضد اور عداوت کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ اگر ان کے اندر ضد اور تعصب کی جگہ حق پسندی موجود ہوتی تو وہ جس طرح حضرت ابراہیمؑ و حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا رسول مانتے تھے اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی خدا کا رسول مانتے اور تمام نبیوں کی تعلیم پر بغیر کسی امتیاز کے عمل کرتے۔

اِسلامی تاریخ کا ایک بہرُوپیا
مُختار بن اَبُو عُبَید ثقفی

(از جناب ڈاکٹر خورشید احمد فاروق)

مختار بن ابی عبید الثقفی، اسلامی تاریخ کی ایک معروف شخصیت ہے۔ وہ ایک حوصلہ مند عرب تھا۔ یزید کی تخت نشینی کے بعد جب ملت اسلامیہ کے تعزقوں میں ایک نیا اُبال آیا تو اُس نے بھی اقتدار کا خواب دیکھا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت اور پھر یزید کی وفات نے اس کے لیے قسمت آزمائی کا میدان کھول دیا۔ وہ وابستگانِ اہل بیت میں سے تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ سے کوفہ میں رہا ہوا تھا۔ اور یزید کے زمانہ میں نکال دیا گیا تھا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد قصاص اہل بیت کا علم اٹھا کر اور حضرت محمد بن الحنفیہ کی خلافت کا ڈھونگ رچا کر وہ کوفہ پہونچا۔ اٹھارہ مہینے تک کوفہ اور اس کے اردگرد اُس کا قبضہ رہا۔ اپنے اقتدار کے لیے اُس نے جو جو جتن کیے ان میں ایک مذہبی بہروپ بھی تھا۔

"حضرت عمر کے سرکاری خطوط" کے مرتب جناب خورشید احمد فاروق نے مختار پر اپنی مختصر کتاب "قرن اول کا ایک مدبر" میں مختار کے اس رُخ پر

بھی روشنی ڈالی ہے۔ حال ہی میں اس کتاب کے مطالعہ کا اتفاق ہوا اور اس میں جو چیز سب سے
زیادہ قابلِ عبرت نظر آئی جی چاہا کہ اس سے استفادہ میں ناظرین الفرقان کو بھی شریک
کر لیا جائے ——————— مرتّب

مختار کو اپنی مقصد برآری کے لیے پرواہ نہ تھی کہ اُس کو کیا بننا پڑتا ہے۔ اس کی زندگی
کا انداز بھی اس قسم کی بہروپ کے لیے سازگار تھا کیونکہ وہ اپنی روزمرہ زندگی میں ایک سنجیدہ
دیندار آدمی کی طرح رہتا تھا۔ وہ ہر اہم موقع پر مسجّع الہامی زبان استعمال کرتا اور سامعین
کو اپنی لیاقت سے مرعوب کیا کرتا، قید سے پہلے، قید خانہ کے اندر اور قصرِ امارت میں داخل ہونے
تک بھی اُس نے ایک مکمل الہامی شخص کی سیرت رکھی۔ محل کے محاصرہ سے پہلے گورنر کی فوج
سے جب اُس کا مقابلہ ہوا تو وہ روزہ رکھے ہوئے تھا۔ اُس کی فوج کے کچھ لوگوں میں اس موضوع
پر گفتگو ہوئی ایک نے کہا: امیر روزہ نہ رکھتے تو فوج کی کمان زیادہ اچھی طرح کر سکتے، دوسرا
بولا: امیر معصوم ہیں اُن کے بارے میں ایسی بات نہ کہو، وہ اچھے برے کو تم سے بہتر جانتے
ہیں۔ ابن سبا کی تحریک کی بدولت حضرت علی کی غیب دانی اور الہامیت کے بہت سے قصے
کوفہ کے شیعوں اور ضعیف الاعتقاد موالی میں مشہور ہو گئے تھے، مثلاً صفین کو جاتے ہوئے
میدان کربلا میں حضرت حسین سے اُن کی یہ پیشن گوئی کہ اس جگہ اہل بیت مارے جائیں گے،
یا پستان والے خارجی کے بارے میں اُن کی پیشن گوئی اور نہروان کی جنگ میں اُس کا پورا
ہونا۔ مختار نے حضرت علی کے اس کردار کی نقالی کی، وہ بلند آہنگی سے مجمع میں مستقبل کے بارے
میں پیشن گوئیاں کرتا اور اپنے متبعین بالخصوص غلاموں اور موالی کو اُن کے ذریعہ خوشحالی
اور کامرانی کی بشارتیں دیتا اور اُن کے دلوں کو گرماتا۔

بہروپ میں توسیع

جب اس کو حکومت حاصل ہوئی اور کوفہ، شام اور حجاز میں دشمن سر اٹھانے لگے تو
اس کو اپنا بہروپ بڑھانا پڑا، دشمن کے مقابلہ میں اپنی فوجوں کا حوصلہ بڑھانے یا ان کی

اخلاقی توانائی برقرار رکھنے کے لیے وہ ظاہر کرتا کہ مافوق الانسان قوتیں اس کی تابع ہیں جنکی بدولت وہ ناقابل تسخیر ہے، اس کی روحانی نظر اتنی تیز ہے کہ غیب کے پردوں کو چیر کر مستقبل تک پہونچ جاتی ہے۔ وہ کاہن کے درجہ سے ترقی کر کے نبی کے درجہ تک پہونچ گیا، اور اگرچہ اس نے اپنی نبوت کا کبھی برملا اعلان نہیں کیا وہ ہر نفسیاتی موقع پر ایسی تقریریں اور باتیں خوب کیا کرتا جو اس کی غیب دانی پر دلالت کرتیں، بعض راویوں نے تو اس بات کی بھی تصریح کی ہے کہ وہ اپنی لڑکی کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتا: صلی اللہ علی عیسی بن مریم، اس رمز کی تشریح کرتے ہوئے اس کے ایک رازدار نے بتایا کہ وہ کہتا ہے کہ میری لڑکی تمام اہل مریم سے بیاہی جائیگی[1]

ایک کرسی

اس بہروپ میں ایک کرسی بہت کام آئی۔ حضرت علی کی بہن کے پوتے کا بیان ہے کہ میرے پاس خرچ نہ رہا تھا اور مجھے روپیہ کی سخت ضرورت تھی، میں ایک دن گھر سے نکلا تو اپنے پڑوسی تیلی کے ہاں ایک کرسی دیکھی جس پر میل کچیل جما ہوا تھا، میں نے دل میں کہا کیوں نہ اس کے بارے میں مختار سے جا کر کوئی چال چلیں! میں گھر لوٹا اور تیلی کے گھر سے کرسی منگوائی، پھر مختار کے پاس گیا اور کہا: میں ایک بات آپ سے چھپاتا رہا ہوں لیکن اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس سے باخبر کر دوں، مختار نے پوچھا وہ بات کیا ہے، تو میں نے کہا: میرے پاس ایک کرسی ہے جس پر جعدہ بن ہبیرۃ (راوی کے والد اور حضرت علی کے بھانجے) بیٹھا کرتے تھے، لوگ کہتے ہیں کہ اس میں حضرت علی کا غیبی اور روحانی علم حلول کر گیا ہے" مختار نے کہا حیرت ہے تم آج تک اتنی اہم بات چھپاتے رہے، اس کو ابھی منگواؤ، ابھی منگواؤ۔" کرسی لائی گئی، اس کو دھویا جا چکا تھا، میل کچیل کے نیچے کی لکڑی تیل پینے سے خوب چمکدار ہو گئی تھی، اس پر کپڑا ڈال دیا گیا، مختار نے مجھے چھ ہزار روپے کا عطیہ دیا اور جامع مسجد میں کرسی رکھوا کر تقریر کی "پچھلی

---

[1] انساب الاشراف ۵/ ۲۳۶

قوموں میں کوئی بات ایسی نہیں ہوئی جس کی نظیر ہمارے ہاں نہ موجود ہو، بنو اسرائیل کے ہاں تابوت تھا جس میں آلِ موسیٰ و ہارون کا باقی ماندہ علم حلول کر گیا تھا، ہمارے یہاں یہ کرسی تابوت کی طرح ہے[1] یہ کہہ کر اس نے کرسی کا غلاف ہٹانے کا حکم دیا، جب کرسی کھلی تو سبائی ذہنیت کے لوگوں نے کھڑے ہو کر نہایت عقیدت سے ہاتھ اٹھا کر تین بار تکبیریں کہیں[2] کرسی پر ریشم کا غلاف چڑھا دیا گیا، وہ ایک مقدس ادارہ بن گئی، مختار کے بعض مقرب اس کے مجاور ہو گئے، مشہور صحابی ابوموسیٰ اشعری کے صاحبزادے، اس کے ناظم اور مقرر ہوئے، یہ کرسی غیبی قوتوں کی سرچشمہ تھی، اس کا طواف کیا جاتا، ہر خطرہ اور مصیبت میں اس سے مدد مانگی جاتی، یا نئی اس کی معرفت برسوایا جاتا، جنگ میں اس سے نصرت طلب کی جاتی، جب مختار کی فوجیں لڑنے نکلتیں تو آگے آگے کوفہ سے کچھ دور تک ایک بھورے خچر پر یہ کرسی جاتی، اس کے دائیں بائیں مجاور بڑے احترام سے اس کو پکڑتے ہوئے چلتے۔ شہر سے کچھ دور نکل کر لوگ اس کے سامنے کھڑے ہوتے اور اس کی طرف ہاتھ پھیلا کر گڑگڑاتے اور دعائیں مانگتے اور اس کو خدا کی طرح مخاطب کرتے، ان مراسم کے بعد فوج آگے بڑھ جاتی اور کرسی کو پورے احترام کے ساتھ کوفہ واپس پہونچا دیا جاتا۔[3] کرسی کے ظہور کے بعد مختار کی پہلی جنگ شام کی فوجوں سے ہوئی جو ابن زیاد کی قیادت میں عراق پر چڑھی آرہی تھیں، مختار کی فوج کرسی سے استعانت لے کر گئی تھی، اتفاق کی بات کہ جنگ میں شامیوں کو شکست ہوئی اور ان کے بہت سے آدمی مارے گئے، اس واقعہ نے شیعوں کو کرسی کی کرامت

---

[1] تاریخ الامم ۷/۱۴۱۔

[2] بعض مؤرخوں نے کرسی کا قصہ دوسرے انداز سے پیش کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ مختار نے کوفہ پر قابض ہونے کے بعد ایک دن جعدہ بن ہبیرہ (حضرت علی کے بھانجہ) کے لڑکوں سے کہا: علی ابن ابی طالب کی کرسی مجھے لاکر دو۔" انھوں نے کرسی کے بارے میں لاعلمی ظاہر کی، مختار بولا: حماقت نہ دکھاؤ، کرسی لاکر دو، اس اصرار سے لڑکوں نے نتیجہ نکالا کہ وہ محض کرسی چاہتا ہے، اور جو کرسی بھی اس کو لاکر دی جائے گی وہ قبول کرے گا۔ چنانچہ انھوں نے ایک کرسی لاکر دی، اور کہا کہ یہ وہی کرسی ہے جس پر حضرت علی بیٹھا کرتے تھے۔" — تاریخ الامم ۷/۱۴۱

[3] انساب الاشراف۔ ۵/۲۴۲۔

کا تہہ کفر تک معتقد کر دیا، بعض اعیانِ شہر نے احتجاج کیا تو کرسی چھپا دی گئی لیکن بلاذریؒ کے رپورٹر کہتے ہیں کہ مختار کے ساتھی اس کے قتل تک کرسی سے رجوع کرتے رہے۔"[1]

جبرئیل اور میکائیل

ایک بڑے عرب کا بیان ہے کہ میں مختار سے ملنے گیا تو دو تکیے اس کے سامنے رکھے تھے، مجھے دیکھ کر اس نے غلام کو آواز دی اور میرے لیے تکیہ منگوایا، میں نے پوچھا یہ تکیے کس کے لیے ہیں تو مختار بولا: ایک سے ابھی جبرئیل اور دوسرے سے میکائیل اٹھ کر گئے ہیں۔[2]

میدانِ جنگ میں فرشتے

مختار کے خلاف غیر شیعی اکابر کوفہ کی بغاوت کے بعد .... ایک مجرم قید ہو کر آیا، اور مختار کو خوش کرنے کے لیے کہنے لگا: اہل کوفہ سے آپ کی لڑائی کے دوران میں نے دیکھا کہ فرشتے ابلق گھوڑوں پر آپ کی طرف سے لڑ رہے ہیں۔" مختار واقعی مسرور ہوا اور اس نے مجرم کو حکم دیا کہ مسجد میں جا کر لوگوں کو اپنے تجربہ سے آگاہ کرے، اس انکشاف سے حامیان اہل بیت کے دلوں میں مختار کی عظمت اور زیادہ بڑھ گئی، مجرم کو معاف کر دیا گیا۔[3]

عرب و غیر عرب مختار کی غیب دانی کے قائل

امام شعبی نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غیر عرب ہی نہیں بلکہ عرب بھی مختار کو غیب داں سمجھتے تھے، مختار کی فوجیں ابراہیم بن اشتر کی کمان میں عبیداللہ بن زیاد سے لڑنے گئی ہوئی تھیں، شہر میں یہ افواہ مشہور ہوئی کہ ابراہیم مارا گیا اور عبیداللہ فتح کا جھنڈا لہراتا ہوا کوفہ کی طرف چلا آ رہا ہے۔ مختار نے فوراً رسالے تیار کیے اور عبیداللہ سے لڑنے

---

[1] انساب الاشراف ۵/۲۴۲ [2] انساب الاشراف ۵/۲۴۲

[3] انساب الاشراف ۲/۲۴۳

نکلا۔ اس کی فوج سستانے اور رسد لینے مدائن میں خیمہ زن ہوئی۔ شعبی کہتے ہیں کہ ایک دن مختار اپنی تقریر میں ہمیں تلقین کر رہا تھا کہ ہم دشمن کا بہادری سے مقابلہ کریں اور اہل بیت کے خون کا انتقام لیں کہ اس کو شامیوں کی شکست اور عبید اللہ کے قتل کی خبر موصول ہوئی، مختار نے باغ باغ ہو کر مسانت سے کہا: خدائی فوجدار و کیا میں نے تم کو پہلے ہی اس فتح کی بشارت نہیں دے دی تھی، سب نے عقیدت اور جوش سے اقرار کیا، اس وقت قبیلہ ہمدان کا ایک شخص جو میرے پاس بیٹھا تھا بولا شعبی اب بھی تم کو یقین نہیں آیا؟ میں نے پوچھا کس بات کا؟ ہمدانی عرب۔ "مختار کی غیب دانی کا۔" میں نے کہا: میں تو ہرگز باور نہیں کر سکتا، ہمدانی عرب۔ کیا انھوں نے پیشین گوئی نہیں کی تھی کہ شامی ہار یں گے، میں نے کہا: انھوں نے تو کہا تھا شامیوں کو نصیبین (جزیرہ کا شہر) میں شکست ہوگی، اور شکست ہوئی ہے۔ ان کو خازر (ضلع موصل) میں! "وہ عرب کھسیا کر کہنے لگا: بخدا تم اس وقت تک ایمان نہ لاؤ گے جب تک تم پر عذاب الیم نازل نہ ہوگا[1] یہ واقعہ ۶۷ھ کا ہے جب مختار کا آفتاب اقبال نصف النہار پر تھا۔

مسعودی لکھتا ہے: کوفہ میں مختار کی طاقت اور اس کے متبعین کی تعداد خوب بڑھ گئی۔ بہت سے لوگ اس کی تحریک میں داخل ہو گئے، وہ لوگوں کو ان کے عقیدہ اور رجحان کے مطابق دعوت دیتا، کچھ لوگوں سے کہتا کہ محمد بن حنفیہ امام ہیں اور میں ان کی خلافت کی مہم چلانے پر مامور ہوں۔ اور کچھ لوگوں پر ظاہر کرتا کہ میرے اوپر وحی آتی ہے اور جبرئیل مجھے غیب کی باتیں بتاتا ہے[2]"

مختار کا ایک خطبہ

بلاذری نے انساب الاشراف میں مختار کے متعدد مقفی خطبے بیان کیے ہیں جو قرآنی یا الہامی اسلوب میں ہیں، جن کو وہ نفسیاتی موقعوں پر اپنے متبعین یا مخالفین کو مرعوب

---

[1] تاریخ الامم ۷/۱۴۱ و انساب الاشراف ۵/۲۵۰ [2] مروج الذہب مسعودی مصری حاشیہ تاریخ کامل ابن اثیر ۶/۱۵ نیز کتاب المعارف ابن قتیبہ مصری ۱۹۳۴ء ص ۱۰۴

دہ ہوش کرنے کے لیے دیا کرتا تھا، ان میں سے ایک خطبہ جس میں اس نے اپنی روحانی پوزیشن کی وضاحت بھی کی ہے، یہاں پیش کیا جاتا ہے:۔

"قسم ہے بلد امین کے رب کی اور طور سینین کی حرمت کی، میں کمینے شاعر کو قتل کر کے رہوں گا جس کا نام اعشیٰ ناعطین ہے، جو جلولا سے پکڑی ہوئی باندی کا لڑکا ہے، جس پر میں نے احسان کیا لیکن جس نے احسان فراموشی کی، پہلے میری پیروی کی پھر بے وفائی برتی، کل بچھاڑ کر اس کو ذبح کیا جائے گا، پھر وہ جہنم رسید ہوگا اور عذابِ اکبر کا مزہ چکھے گا، تباہ ہو ابن ہمام لعین جس کا تعلق بنو اسد سے ہے جو شیطانوں کے دوست ہیں اور کافروں کے احباب، جنھوں نے میری طرف جھوٹی باتیں منسوب کی ہیں اور میرے اوپر بے ہودہ بہتان لگائے ہیں، جنھوں نے مجھے کذاب کا لقب دیا ہے حالانکہ میں سچا آدمی ہوں جس کی صداقت کی شہادت دی جاچکی ہے، وہ مجھے کاہن کہتے ہیں حالانکہ میں بُرے بھلے میں بڑا تمیز کرنے والا ہوں اور صاحب کرامات ہوں۔[1]" وَرَبِّ البَلَدِ الامين وحرمة طور سينين لاقتلن الشاعر الهجين أعشى الناعطين وسوء برق البارقين، ابن الامة من جلولاء خانقين الذى مَنَنْتُ عليه فكفروتابعنى فَغَدَرَ وغداً يلقى فيخر ثم يصير الى سَقر فيذوق فيها العذاب الاكبر، وويلٌ لابن همّام اللعين وأخى الأسديين اولئك اولياء الشياطين وإخوان الكافرين الّذين قَرَفوا عَلَىّ الأَبَاطِيلَ وَتَقَوَّلُوا عَلَىّ الاقاويل فسمونى كذّابا وأنا الصّادق المصدوق وكاهناً وانا العجيب الفاروق؟

اعشیٰ ہمدان کوفہ کا ممتاز شاعر تھا، جس کی شاعری ہجو اور واقعہ نگاری کے لیے مشہور ہے، امام شعبی اس کے بہنوئی تھے، اس کا شمار کوفہ کے فقہا اور قرّا میں ہوتا تھا لیکن جب قرآن اور فقہ سے اس کی تمنائیں پوری نہ ہوئیں تو وہ شاعر ہوگیا، اور ہجو و تعریف کے ذریعہ عزت، دولت اور رسوخ حاصل کیا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع شروع میں وہ مختار کا مقرب تھا لیکن بعد میں

---

[1] انساب الاشراف ۵/ ۲۳۵-۲۳۶

کسی وجہ سے ناراض ہوگیا اور اس کے بہروپ کا شہر میں مذاق اڑانے لگا (اغانی ابو الفرج اصفہانی مصر ۵/۱۴۶)

ابن ہمام سلولی بھی کوفہ کا شاعر تھا جس کی وفاداریاں عثمان غنی اور ان کے خاندان سے وابستہ تھیں، پھر وہ ابن زبیر کا وفادار ہوگیا اور جب کوفہ میں ابن زبیر کی حکومت ختم ہوئی اور مختار کا ستارہ چمکا تو اس نے مختار کی مدح میں قصیدہ لکھا اور انعام حاصل کیا، لیکن حامیانِ اہل بیت کی ایک جماعت اس کو منافق اور عثمانی ہی سمجھتی رہی اور اس کو ستاتا رہا کہ وہ بھاگ گیا اور مختار اور اس کے متبعین کی ہجو کی۔ (انساب الاشراف ۵/۲۲۹)

اپنے بارے میں مختار کا اعتراف۔

اس بات کا سب سے بڑا ثبوت کہ مختار ایمانداری سے نہ تو خود کو نبی سمجھتا تھا اور نہ کاہن بلکہ اپنی مقصد برآری کے لیے اور اپنے متبعین کی متلون مزاجی اور عدم اعتمادی کے پیش نظر کبھی اس کو کاہن، کبھی غیب داں اور کبھی نبی کا روپ بھرنا پڑتا، اس کا وہ اعتراف ہے جو مرنے سے کچھ پہلے اس نے اپنے مقرب سے کیا، یہ وہ موقع تھا جب مصعب بن زبیر (برادر ابن زبیر) کی فوجیں اس کے محل کا گھیرا ڈالے تھیں، اس کے اقبال کا آفتاب غروب ہو رہا تھا، اس کے بہروپ کا پول کھل چکا تھا، اس کے ساتھیوں کے حوصلے پست ہو چکے تھے اور ان کا دل جنگ و قتال سے اُچاٹ ہو چکا تھا، ایک ماہ سے زیادہ انتظار کرنے کے بعد بھی جب اُن کا جمود نہ ٹوٹا تو مختار اپنے جانثاروں کی ایک ٹولی کے ساتھ محل سے نکلا اور اپنے ایک مقرب سے جس کا نام سائب تھا کہنے لگا: کہو کیا رائے ہے؟ سائب: صوابدید تو آپ کی ہے، آپ اپنی رائے بتائیے، مختار: صوابدید میری یا خدا کی؟ ارے احمق میری حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ میں ایک بڑا عرب ہوں، میں نے دیکھا کہ ابن زبیر حجاز پر قابض ہو گئے۔ مروان شام پر، نجدہ (خارجی لیڈر) یمامہ پر، میں کسی سے کم نہ تھا میں نے ادھر کے علاقوں پر قبضہ کرلیا، اور ان کی طرح اقتدار حاصل کیا، ہاں یہ ضرور ہے کہ میں نے اہل بیت کے انتقام کا بیڑا اٹھایا جب کہ دوسرے عرب ادھر سے غافل رہے اور ان کے قتل کرنے والوں کو فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ (تاریخ الاسلام ۲/۱۰۰)

درس قرآن

۳۰ جون ۱۹۶۸ء

حالتِ سفر اور میدانِ جنگ میں نماز

(حمد و صلوٰۃ، اور "اعوذ باللہ" اور "بسم اللہ" کے بعد)

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَوٰةِ ۖ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ إِنَّ الْكٰفِرِينَ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِينًا ۝ .... الیٰ قولہٖ تعالیٰ إِنَّ الصَّلَوٰةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا ۝

(سورۃ النساء آیات ۱۰۱ تا ۱۰۳)

(ترجمہ) اور جب تم سفر میں نکلو تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ تم نماز میں قصر کیا کرو، (یعنی چار رکعت والی نماز دو رکعت پڑھو) اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ اہلِ کفر تمہارے ساتھ کوئی شرارت اور فتنہ پردازی کریں گے، بیشک یہ کفار تمہارے کھلے ہوئے دشمن ہیں (یہ ہرنا کردنی کر سکتے ہیں) (۱۰۱) ______ اور اے پیغمبر جب تم (میدانِ جنگ میں) مجاہدین کے درمیان موجود ہو اور ان کو نماز پڑھاؤ (یعنی نماز میں ان کی امامت کرو) تو چاہیئے کہ لشکرِ مجاہدین کا ایک حصہ (نماز پڑھنے کے لیے) تمہارے ساتھ کھڑا ہو جائے اور وہ اپنے اسلحہ ساتھ لے لے (یعنی پوری طرح مسلح ہو کر آپ کے ساتھ نماز میں شریک ہو) پھر جب یہ لوگ سجدہ کر لیں تو یہ تمہارے پیچھے ہو جائیں اور (ان کی جگہ) لشکر کا وہ دوسرا حصہ آ جائے جو نماز میں ابھی شریک نہیں ہوا تھا، وہ اب آپ کے ساتھ نماز میں شریک ہو جائے اور یہ بھی

(پورا) دفاعی سامان اور اپنے اسلحہ لے کر نماز میں شریک ہو، ان کافروں کی یہ دلی تمنا ہے کہ تم اپنے اسلحہ اور سامان سے ذرا غافل ہو تو یہ تم پہ ایک دم ٹوٹ پڑیں ـــ اور اگر (ایسی صورت ہو کہ) بارش (وغیرہ) کی وجہ سے یا بیماری کے سبب سے تمہیں تکلیف ہو اور پورا سامان جنگ ساتھ لے کر نماز میں شرکت اور نقل و حرکت مشکل ہو) تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ (دشمن پر حملہ میں کام آنے والے) اسلحہ اتار دو (لیکن) دفاعی سامان ضرور ساتھ لے لو، اللہ تعالیٰ نے ان کافروں کے لیے نہایت رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔[(۱۰۲)]

پھر جب تم نماز (اس طریقہ پر) ادا کر چکو تو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے کی حالت میں (یعنی ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے رہو (اور اس سے غافل نہ ہو) پھر جب تمہاری حالت اطمینان والی ہو جائے (یعنی دشمن کی طرف سے خطرہ نہ رہے) تو نماز کو (مقررہ طریقہ پر) خوب اچھی طرح اہتمام کے ساتھ پڑھو، نماز اہل ایمان پر وقت کی پابندی کے ساتھ فرض ہے[(۱۰۳)] (اس لیے عام حالات میں ٹھیک وقت پر پورے سکون و وقار اور دل کی توجہ کے ساتھ ادا کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے)

یہ سورۂ نساء کا پندرھواں[۱۵] رکوع ہے۔ اس سے پہلے رکوع میں ہجرت کی اہمیت بیان فرمائی گئی تھی اور اس کے بارے میں ہدایات دی گئی تھیں، اور اس سے پہلے جہاد کا بیان چل رہا تھا۔ اس رکوع میں پہلے تو صرف ایک آیت میں بحالتِ سفر نماز میں قصر کرنے کا حکم بیان فرمایا گیا ہے اور اس کے بعد خاص میدان جنگ میں جب دشمن کے حملہ کا خطرہ ہو، نمازِ باجماعت ادا کرنے کا ایک خاص طریقہ بتایا گیا ہے جس کو "صلوٰۃ الخوف" کہتے ہیں۔ آپ میں سے اکثر بھائیوں نے غالباً اس صلوٰۃِ خوف کا طریقہ نہ سنا ہوگا اور آپ کو تعجب ہوگا کہ کوئی نماز اس طرح بھی پڑھی جاتی ہے! ـــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آیتوں کے نازل ہونے کے بعد مختلف غزوات میں اسی طریقہ پر نماز پڑھی اور پڑھائی، حدیثوں میں آپ کی ان نمازوں

کا تفصیل سے ذکر آتا ہے۔ یہ طریقہ تو میں ان شاء اللہ آیت کی تشریح کے ضمن میں ابھی بتاؤں گا پہلے یہ عرض کرنا ہے کہ جہاد اور ہجرت کے بیان کے ساتھ سفر اور حالتِ جنگ کی نماز کے احکام اور طریقہ بیان کرنے کی کیا خاص حکمت ہے؟ ـــــــ اس کی مختلف حکمتیں بیان کی گئی ہیں لیکن میرے نزدیک سب سے بڑی حکمت اس کی یہ ہے کہ مسلمان اچھی طرح سمجھ لیں کہ اسلام کے نظامِ زندگی میں نماز اتنی اہم چیز ہے کہ سفر کی بے اطمینانی کی حالت میں اور خاص میدانِ جنگ میں بھی جب دشمن کے اچانک حملہ کا خطرہ ہو اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، بلکہ وہ وقت پر ادا کرنی ہوگی اور تا امکان جماعت کے ساتھ ادا کی جائیگی اور یہ اس لیے کہ اسلامی جہاد کا مقصد دنیا کی دوسری قومی اور ملکی جنگوں کی طرح یہ نہیں ہے کہ مسلمان قوم یا کسی مسلمان ملک کو غلبہ اور اقتدار حاصل ہو اور دنیا میں اُس کا بول بالا اور اُس کا جھنڈا اونچا ہو، بلکہ جہادِ اسلامی کا مقصد صرف یہ ہے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو، دنیا میں بندگی، خدا پرستی اور فرمانبرداری والی زندگی کا رواج ہو، شر و فساد ختم ہو، فسق و فجور کا خاتمہ ہو اور اس کی جگہ نیکی اور خدا ترسی کا دور دورہ ہو ـــــــ اس بارے میں خود مسلمانوں کے ذہنوں اور ان کے انداز فکر کو صحیح رکھنے کے لیے اور صحیح اسلامی لائن پر ان کی تربیت کے لیے یہ ضروری تھا کہ عین میدانِ جنگ میں دشمن فوج کے حملہ کے خطرہ کی حالت میں بھی نماز کا وقت آجانے پر وہ نماز ادا کریں اور اُن کے دشمن بھی اُن کو اس حال میں دیکھیں کہ وہ میدانِ جنگ میں بھی اللہ سے غافل نہیں ہوتے، اُس کی عبادت کو ہر چیز پر مقدم رکھتے ہیں اور جب وقت آجاتا ہے تو اُس کے حضور میں نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں اور رکوع و سجود کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کو دشمن کے حملہ کا خطرہ ہو۔

اس کے علاوہ یہ بھی امکان تھا کہ جن مجاہدین کی پوری تربیت نہ ہوئی ہو، شیطان انھیں سمجھائے کہ وہ تو سر سے کفن باندھ کر خدا کی راہ میں نکلے ہوئے خدا کے سپاہی ہیں، اُن کا تو چلنا پھرنا، اُٹھنا، بیٹھنا حتیٰ کہ کھانا پینا اور سونا بھی عبادت ہے، ایسی حالت میں خاص کر جب لشکرِ اسلام ہتھیار بند ہو کر دشمن فوج کے سامنے صف بستہ ہو اور دشمن بھی کیل کانٹے سے بالکل تیار ہو تو ایسی صورت میں تو میدانِ جہاد کی یہ صف بندی نماز کی صف بندی کے قائم مقام ہو جانی چاہیے اور مجاہدین کو نماز میں مشغول ہونے کا حکم نہ ہونا چاہیے۔ یہ دفاع کی مصلحت کے بھی

خلاف ہے ــــ تو جہاد و ہجرت کی آیات کے ساتھ ہی ان آیات میں صلوٰۃ خوف کا بیان فرما کر اس طرح کے شیطانی وسوسوں کا بھی سدِ باب فرما دیا گیا اور واضح کر دیا گیا کہ جہاد جب ہی جہاد ہے جب اس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ رابطہ قائم رہے، اُس کے احکام کی فرمانبرداری ہو، خاصکر نماز کا اہتمام ہو جو خدا کی بندگی اور اطاعت و فرمانبرداری کا رمز اور اس کی نشانی ہے۔ جو جنگ خدا کی رضا جوئی اور اُس کے نماز جیسے احکام سے بے پروا ہو کر اور اُنکو پامال کر کے لڑی جائے وہ اللہ کی نگاہ میں جہاد نہیں سراسر فساد ہے ــــ ان آیات کا یہ سبق نہایت اہم ہے اور اس سے اسلام کی روح، اس کے بنیادی نقطۂ نظر اور اسکے نصب العین کو سمجھا سکتا ہے ــــ

ہمارے مولانا علی میاں کے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب مرحوم کو آپ میں سے اکثر حضرات نے دیکھا ہوگا، بالکل فرشتہ صفت انسان تھے، وہ بیان فرماتے تھے کہ اسی لکھنؤ میں مسلمانوں کے کسی قومی اور ملی مسئلہ کے سلسلہ میں کوئی میٹنگ بلائی گئی، ڈاکٹر صاحب بھی مدعو تھے اور شریک ہوئے، نماز کا وقت آیا تو ڈاکٹر صاحب نے انتظار کیا کہ خود داعی صاحبان ہی نماز کے لیے میٹنگ ملتوی کرنے کا اعلان کریں گے، جب کسی نے اس سلسلہ میں کچھ نہیں کہا اور تاخیر زیادہ ہونے لگی تو ڈاکٹر صاحب نے خود ہی لوگوں کو توجہ دلائی، ایک صاحب نے بڑی بے تکلفی سے فرمایا یہ بھی تو نماز ہی کا کام ہو رہا ہے۔

دراصل ہماری بربادیوں کے اسباب میں ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ اسلام کے نام پر اسلامی احکام کو پامال کیا جاتا ہے۔

اب میں ایک ایک آیت کا مطلب بیان کرتا ہوں

پہلی آیت ہے "وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلٰوةِ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنَّ الْكَافِرِينَ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُبِينًا ۝"

اس کا سادہ ترجمہ یہ ہے کہ جب تم سفر میں نکلو تو تمہارے لیے اس میں کوئی گناہ اور مضائقہ نہیں ہے کہ نماز میں "قصر" یعنی کمی اور تخفیف کر دو، اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ کفار تمہارے ساتھ

کوئی فتنہ پردازی اور شرارت کریں گے۔ یہ کفار تمہارے کھلم کھلا دشمن ہیں"۔

اِس آیت میں بحالتِ سفر نماز میں قصر کرنے کا حکم بیان فرمایا گیا ہے' اس میں کئی خاص باتیں خاص طور سے تشریح طلب ہیں۔ پہلی بات یہ کہ اس میں سفر کی کوئی حد نہیں بیان کی گئی یعنی یہ نہیں بتایا گیا کہ کم سے کم کتنی دور کا سفر کرنے والے کے لیے یہ سہولت اور رخصت دی جا رہی ہے' اسی طرح یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ قصر کس طرح کیا جائے گا۔ اور نماز میں کیا کمی اور تخفیف کی جائے گی ——— قرآن مجید کا یہ عام قاعدہ ہے کہ اس میں بطور متن کے اصولی حکم بیان فرمادیا جاتا ہے' اس کی تفصیلات اُمت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپ کے عمل سے معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً قرآن پاک میں جا بجا نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن اس کے بارے میں یہ تفصیل کہ نماز کیسے پڑھی جائے اور کن کن وقتوں میں پڑھی جائے' یہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپ کے طرز عمل سے معلوم ہوا ہے' اسی طرح آپ کی احادیث اور آپ کے مستقل طرز عمل سے قصر کے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ قصر کا مطلب صرف اتنا ہے کہ چار رکعت والی نمازیں (یعنی ظہر' عصر' عشاء) دو دو رکعت پڑھی جائیں' فجر اور مغرب میں کوئی تخفیف نہیں۔ اسی طرح آپ کے اشارات اور طرز عمل سے اُمت کے ائمہ اور علماء نے اپنے اپنے فہم کے مطابق یہ سمجھا کہ کم سے کم کتنی مسافت کے سفر میں قصر کیا جائے گا۔

اسی طرح کی ایک دوسری تشریح طلب بات یہ ہے کہ اس آیت میں لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ (گناہ) کے لفظ سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ نماز میں قصر کرنے کی صرف اجازت اور رخصت ہے اور قصر نماز پڑھنے والے کو کوئی گناہ نہ ہوگا اور اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ بہتر یہی ہے کہ سفر میں بھی نماز پوری پڑھی جائے' لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے نازل ہونے کے بعد سفر میں ہمیشہ قصر ہی کیا' ایک دفعہ بھی آپ سے ثابت نہیں کہ سفر میں آپ نے ظہر' عصر یا عشاء کی چار رکعت پڑھی ہوں' پھر اسی کے مطابق تمام اکابر صحابہ کا عمل رہا اس لیے اکثر ائمہ کے نزدیک سفر میں ہمیشہ نماز قصر ہی پڑھی جائے اور وہی افضل ہے۔ لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ کے بارے میں وہ حضرات فرماتے ہیں کہ اس آیت میں یہ لفظ بالکل اسی طرح استعمال ہوا ہے جس طرح سورۂ بقرہ کی آیت "اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ

شَعَائِرِ اللّٰہِ فَمَنْ حَجَّ الْبَیْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْہِ اَنْ یَّطَّوَّفَ بِھِمَا
میں "لَا جُنَاحَ" استعمال ہوا ہے اس آیت میں حج اور عمرہ کرنے والے کے لیے کہا گیا ہے کہ " لَا جُنَاحَ عَلَیْہِ اَنْ یَّطَّوَّفَ بِھِمَا " (یعنی کوئی گناہ اور مضائقہ نہیں ہے کہ وہ صفا اور مروہ کی سعی کرے) حالانکہ یہ سعی مناسک حج میں سے ہے اور ضروری ہے تو جس طرح اس آیت میں "لَا جُنَاحَ" فرما کر صفا اور مروہ کی سعی کا حکم بیان فرمایا گیا ہے جو بجائے خود ضروری ہے' اسی طرح سورۂ نساء کی اس آیت میں لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ فرما کر سفر میں قصر کا حکم دیا گیا ہے اور حضور کے طرزِ عمل سے معلوم ہو گیا کہ سفر میں ہمیشہ قصر ہی کرنا چاہیے ـــــ اور ان دونوں حکموں کے لیے گناہ کی نفی کا عنوان اختیار کرنے میں ایک خاص نکتہ ہے جس کو عربی داں حضرات ہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

اسی طرح کا ایک اشکال اس آیت کے بارے میں یہ ہے کہ آیت کے آخری الفاظ "اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا" سے مفہوم ہوتا ہے کہ قصر کا حکم اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ کافروں کی طرف سے کسی شرارت اور فتنہ پردازی کا خطرہ ہو' جس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر مسافر کو سفر میں اس طرح کا کوئی خطرہ اور اندیشہ نہ ہو اور امن و امان کی فضا ہو تو نماز میں قصر نہیں کیا جائے گا' حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کا مستقل عمل یہ رہا کہ امن و امان اور پورے اطمینان کی صورت میں بھی سفروں میں ہمیشہ قصر ہی کیا گیا اور مسلم شریف میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے ایک دفعہ حضورؐ سے پوچھا کہ اس آیت کے ان الفاظ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ قصر کا حکم اُسی صورت میں ہے جب کہ سفر میں دشمنوں سے خطرہ ہو' اور الحمد للہ اب خوف و خطر کا وہ زمانہ ختم ہو گیا' اللہ تعالیٰ نے اسلام اور مسلمانوں کو غالب کر دیا تو اب کیا حکم ہے؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "صَدَقَۃٌ تَصَدَّقَ اللّٰہُ بِھَا عَلَیْکُمْ فَاقْبَلُوْا صَدَقَتَہٗ" یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ کرم فرمایا ہے کہ حالتِ اطمینان میں بھی قصر ہی کا حکم ہے' تم اللہ تعالیٰ کی اس عنایت کو شکریہ کے ساتھ قبول کرو' یعنی امن و اطمینان کی حالت میں بھی سفر میں قصر ہی پڑھو۔"

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہمیشہ یہی رہا۔ حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں (جبکہ قریب قریب پورے عرب پر اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی) مدینہ سے مکہ اور مکہ سے مدینہ تک کا سفر ایسی حالت میں فرمایا کہ اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ تھا (یعنی کسی دشمن کی طرف سے کوئی خطرہ اور اندیشہ نہیں تھا) آپ نے اس پورے سفر میں چار[۲] رکعت والی نمازیں دو[۲] ہی رکعت پڑھیں۔ بہر حال مسئلہ یہی ہے اور اس پر قریب قریب اجماع ہے کہ امن و اطمینان کی حالت میں بھی سفر کی نمازوں میں قصر کیا جائے گا۔ "اِنْ خِفْتُمْ" کے الفاظ سے جو اشکال ہوتا ہے اس کا ایک جواب تو یہ دیا گیا ہے کہ یہ شرط احترازی نہیں ہے بلکہ آیت کے نزول کے وقت چونکہ صورتِ حال ایسی ہی تھی اس لیے ان الفاظ میں اس صورتِ حال کا ذکر کر دیا گیا ہے اور قرآن مجید میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً فرمایا گیا ہے "لَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا" (نہ مجبور کرو اپنی باندیوں کو زنا کی کمائی پر اگر وہ پاکدامنی چاہیں) ظاہر ہے کہ "إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا" (اگر باندیاں پاکدامنی چاہیں) حکم کی شرط نہیں بلکہ صورتِ حال کی طرف اشارہ ہے۔ اگر اس کو شرط کہا جائے تو مطلب یہ ہو جائے گا کہ اگر باندیاں پاکدامنی نہ چاہیں تو ان کو زنا کی کمائی کے لیے مجبور کیا جا سکتا ہے حالانکہ ظاہر ہے کہ آیت کا مدعا ہرگز یہ نہیں ہے بلکہ "إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا" صورتِ حال کی طرف اشارہ ہے بس اسی طرح "اِنْ خِفْتُمْ" کی شرط کو سمجھنا چاہیے۔

بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ "إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا" کا تعلق اگلی آیت سے ہے جس میں صلوٰۃ خوف کا بیان کیا گیا ہے۔ اس کی تائید بعض روایات سے بھی ہوتی ہے اور حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر مظہری میں اس کے بارے میں لکھا ہے "وھذا ان کان بعیداً من حیث النظم لکنہ قریب من حیث المعنی" یعنی یہ اگرچہ عبارت کے نظم اور نحوی ترکیب کے لحاظ سے بظاہر بعید ہے لیکن معنی کے لحاظ سے یہی قریب ہے کہ اس کو صلوٰۃ خوف کے حکم سے متعلق کیا جائے اور اسی کی شرط قرار دیا جائے۔

اس کے بعد دوسری آیت ہے "وَإِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَاةَ فَلْتَقُمْ

طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ۔ الآیۃ۔

اس میں میدان جنگ کی خاص نماز (صلوٰۃ خوف) کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ جنگ کے میدان میں جب آپ خود بنفس نفیس مسلمان مجاہدین کے ساتھ موجود ہوں اور نماز کا وقت آجانے پر اُن کو نماز پڑھائیں تو لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اُن میں سے ایک حصہ اپنے پورے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر آپ کے پیچھے نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہو جائے اور دوسرا حصہ دشمن کی فوج کے سامنے ہر خطرہ کے مقابلہ کے لیے تیار کھڑا رہے پھر جب آپ پہلی رکعت کا سجدہ کر کے ایک رکعت پوری کر لیں، تو لشکر کے جس حصہ نے آپ کے ساتھ یہ رکعت ادا کرلی، یہ اُس جگہ سے ہٹ کر پیچھے کی جانب دشمن کے مقابلہ پر چلا جائے اور دفاع کی ذمہ داری سنبھالے اور دوسرا حصہ جو نماز میں شریک نہیں ہوا تھا وہ اب آکر اُس کی جگہ کھڑا ہو جائے اور دوسری رکعت میں آپ کے ساتھ شریک ہو جائے اور یہ لوگ بھی اپنے پورے اسلحہ کے ساتھ نماز میں شریک ہوں۔

قرآن مجید میں صلوٰۃ خوف کے بارے میں بس اتنی ہی اصولی اور اجمالی ہدایت دی گئی ہے اس سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ لشکر کا ہر ایک حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف ایک ایک رکعت پڑھے گا، اس طرح ہر ایک کو حضور کے ساتھ اور آپ کی اقتدا میں نماز پڑھنے کی سعادت حاصل ہو جائے گی اور دفاع کے فریضہ کی طرف سے غفلت بھی نہ ہوگی۔ قرآن مجید کی اس آیت سے یہ بات بھی واضح نہیں ہوتی کہ لشکریوں کی نماز ایک ہی رکعت ہوگی یا وہ بعد میں اپنی اپنی جگہ دوسری رکعت پڑھ کر اپنی نماز پوری کریں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی ہدایت کے مطابق مختلف غزوات میں اسی طرح لشکر کو تقسیم کر کے نماز پڑھائی ہے، کتب حدیث میں ان نمازوں کی پوری تفصیل موجود ہے، ان میں سے اکثر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ لشکریوں نے ایک رکعت تو آپ کے ساتھ اور آپ کی اقتدا میں پڑھی اور دوسری رکعت بعد میں الگ پڑھ کر اپنی نماز پوری کی۔

بعض تاریخی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضور کے بعد صحابہ کے دور میں بھی کبھی کبھی

اسی طریقہ پر صلوٰۃ خوف پڑھی گئی ہے، لیکن امام ابو حنیفہؒ کے مشہور شاگرد قاضی ابو یوسفؒ کا مسلک یہ ہے کہ اس طریقہ پر صلوٰۃ خوف کا حکم صرف ان جنگوں کے لیے تھا جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس شریک ہوئے تھے۔ آپ کے نہ ہونے کی صورت میں دو جماعتیں الگ الگ ہونی چاہئیں اور آیت کے پہلے لفظ "وَاِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ" سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس میں آپ کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے کہ جب آپ مجاہدین کے ساتھ ہوں اور نماز پڑھائیں تو اس طریقہ پر پڑھائیں۔ ان الفاظ کا ظاہری تقاضا یہی ہے کہ یہ حکم آپ کے ساتھ مخصوص ہو۔ اور یہ اس لیے کہ آپ کے ہوتے ہوئے ہر مسلمان کی لازماً یہی خواہش ہوگی کہ وہ نماز آپ کی اقتدا میں پڑھے، کوئی بھی اس سعادت سے محرومی پر راضی نہ ہوگا، اس لیے ایسا طریقہ تجویز کر دیا گیا کہ ہر شخص آپ کے پیچھے نماز بھی پڑھ لے۔ اور دفاع سے غفلت بھی نہ ہو۔

قرآن مجید کی ان آیتوں میں میدان جنگ کی نماز کے بارے میں جو ہدایت دی گئی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح اس پر عمل فرمایا اس میں آپ کی امت کے لیے چند بڑے سبق ہیں　　میرے نزدیک پہلا اہم سبق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عالم کو عالم اسباب بنایا ہے اور ہمارے لیے جائز نہیں ہے کہ ہم توکل کا نام لے کر اسباب و تدابیر کی طرف سے غفلت برتیں ــــــــ اگر اس کی ذرا بھی گنجائش ہوتی تو حکم یہ ہوتا کہ میدان جنگ میں بالکل اسی طرح نماز ادا کی جائے جس طرح مسجد نبوی میں ادا کی جاتی تھی اور سارا لشکر ایک ساتھ حضور کی اقتدا میں نماز پڑھے۔ کہا جاتا ـــ کہ دشمن ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، اللہ ہماری حفاظت کے لیے کافی ہے، ہمیں کسی حفاظتی فکر اور تدبیر کی ضرورت نہیں، ہم نماز پڑھیں گے تو آسمان کے فرشتے ہماری حفاظت کریں گے ــــــــ لیکن یہ حکم نہیں دیا گیا بلکہ اسباب کی رعایت کرتے ہوئے، جنگ کی ضرورت اور دفاع کی مصلحت سے نماز کا قانون بدل دیا گیا، نماز کے درمیان میں طویل نقل و حرکت کی اجازت دے دی گئی اور صراحت کیساتھ حکم دیا گیا کہ مجاہدین اپنے پورے اسلحہ سے مسلح ہو کر نماز میں شریک ہوں، وہ ہتھیار بھی لگے ہوں جن سے دشمن پر حملہ کیا جاتا ہے اور وہ بھی جو دشمن کے حملہ سے بچاؤ کے لیے استعمال ہوتے ہیں (وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ)

جس اُمت کو یہ ہدایت دی گئی ہو اور جس کے پیغمبر نے اسی کے مطابق عمل کیا ہو اور جس نے ایسی ہدایت پر عمل کیا ہو اس کے لیے کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ وہ اسباب و تدابیر سے غفلت برتے اور اس کا نام توکل رکھے ——— بہرحال یہ ان آیتوں کا بڑا اہم سبق ہے۔

دوسرا اصولی سبق صلوٰۃ خوف کی اسی ہدایت سے یہ ملا کہ دنیا کی مادہ پرستوں کی طرح اسباب و تدابیر ہی کو سب کچھ نہ سمجھا جائے بلکہ مناسب حد تک اسباب و تدابیر کا لحاظ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور مشیت ہی کو فیصلہ کن سمجھا جائے اور اس کی نصرت اور رحمت کا استحقاق حاصل کرنے کی فکر و کوشش کو ہر چیز پر مقدم رکھا جائے ——— اگر یہ بات نہ ہوتی تو فوج کے کسی حصہ کو کبھی دشمن کے سامنے سے ہٹا کر نماز میں مشغول ہونے کی اجازت نہ دی جاتی ——— اس معاملہ میں مسلمانوں کے بعض طبقے سخت افراط و تفریط میں مبتلا ہیں، اسلام کی روح اور اس کی تعلیمات سے مطابقت رکھنے والی بات وہی ہے جو صلوٰۃ خوف کے بارے میں قرآن مجید کی ہدایت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے معلوم ہوتی ہے۔

صلوٰۃ خوف کے اس حکم کا تیسرا اہم سبق یہ ہے کہ اسلام میں باجماعت نماز کی اتنی اہمیت ہے کہ میدان جنگ میں سنگین خطرہ کے وقت بھی مسلمانوں کو جماعت سے نماز ادا کرنے کا مکلف کیا گیا اور اس کی اجازت نہیں دی گئی کہ لوگ اپنی سہولت کے مطابق انفرادی طور پر ادا کر لیں۔

آگے ارشاد ہے "وَدَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُمْ مَيْلَةً وَاحِدَةً" اس میں بتایا گیا ہے کہ میدان جنگ کی نماز کا جو یہ خاص طریقہ مقرر کیا گیا اور نماز کی حالت میں بھی ہر طرح کے ہتھیاروں سے مسلح ہونے کی جو ہدایت کی گئی اس کا سبب یہ ہے کہ تمہارے دشمنوں کا یہ پلان اور منصوبہ ہے کہ تم اپنے ہتھیاروں وغیرہ سے اور دفاع کی طرف سے ذرا بھی غافل ہو تو وہ ایک دم تم پر ٹوٹ پڑیں اسی اندیشہ کی وجہ سے یہ احکام دیے گئے ہیں۔

آگے فرمایا گیا ہے "وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ كَانَ بِكُمْ أَذًى مِنْ مَطَرٍ أَوْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَنْ تَضَعُوا أَسْلِحَتَكُمْ وَخُذُوا حِذْرَكُمْ إِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا ۝

اس کا مطلب یہ ہے کہ بارش وغیرہ کی وجہ سے یا بیماری جیسی کسی مجبوری سے سارے ہتھیاروں کے بوجھ کے ساتھ نماز ادا کرنا اگر مشکل ہو تو اس کی اجازت ہے کہ حملہ میں کام آنے والے اسلحہ اتار کر نماز پڑھ لو لیکن دفاع اور بچاؤ والے ہتھیاروں سے بہر حال مسلح رہنا ضروری ہے، ان کو الگ رکھنے کی اجازت نہیں۔ "اِنَّ اللّٰہَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا" آیت کا تتمہ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے یہ دشمن اللہ کے دشمن ہیں۔ تم پوری ہمت کے ساتھ ان کا مقابلہ کرو، اللہ دنیا میں تم کو ان پر غالب کرے گا اور آخرت میں ان کے لیے اس نے رسواکن عذاب تیار کیا ہے۔ آگے ارشاد ہے۔ فَاِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ○ "

یعنی جب تم میدان جنگ میں اوپر بتلائے ہوئے طریقہ پر نماز ادا کر لو، تو اس کے بعد کھڑے بیٹھے اور لیٹنے کی حالت میں بھی یعنی ہر حالت میں اللہ کے ذکر کا خاص اہتمام کرو (یہ حکم اس لیے دیا گیا کہ جب نماز اس طرح پڑھی جائے گی جس میں خوب نقل و حرکت بھی ہو گی اور سارے ہتھیار بھی لگے ہوں گے تو قدرتی طور پر حضور قلب اور خشوع کی کیفیت میں بہت کمی رہے گی، اسی کسر کے جبر اور اسی کمی کے پورا کرنے کے لیے فرمایا گیا کہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد ہر حالت میں اللہ کے ذکر کا زیادہ اہتمام کرو) آگے فرمایا گیا کہ پھر جب دشمن اور اس کے حملہ کا کوئی اندیشہ باقی نہ رہے۔ امن و اطمینان کی فضا قائم ہو جائے تو پھر پورے اہتمام سے اور ظاہری و باطنی تمام آداب کی رعایت کے ساتھ ہر وقت کی نماز ادا کیا کرو۔ نماز اہل ایمان پر وقت کی پابندی کے ساتھ فرض کی گئی ہے اور وہ اللہ کا خاص الخاص فریضہ ہے اس لیے اس کا حق ہے کہ بندے اس کو اچھے سے اچھے طریقہ پر ادا کرنے کی کوشش کریں۔

اس آیت کے آخری جز میں فرمایا گیا ہے کہ مسلمانوں پر نماز اوقات کے تعین کے ساتھ فرض ہے، یعنی ہر نماز کا وقت معین اور مقرر ہے کہ فلاں وقت سے شروع ہوتا ہے اور فلاں وقت پر ختم ہوتا ہے ـــــــ اس سے ایک اصولی بات یہ معلوم ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شریعت کے جو تفصیلی احکام بتائے ہیں، جو قرآن مجید میں بیان نہیں ہوئے ہیں، وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہیں، یہ بات اس

طرح معلوم ہوئی کہ نماز کے جن معین اوقات کا اس آیت میں حوالہ دیا گیا ہے وہ قرآن مجید میں کہیں بھی بیان نہیں ہوئے ہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپ کے طرز عمل سے معلوم ہوئے ہیں، اور قرآن مجید کی اس آیت میں انہیں اوقات کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ اس کی صریح دلیل ہے کہ آپ کے یہ احکام بھی گویا اللہ تعالیٰ ہی کے احکام ہیں۔

موجودہ قیمت 3.75

Regd. No. L-353

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow

VOL. 36 NO. 6 SEPTEMBER 1968

[illegible] پرنٹرس اینڈ پرنٹرس [illegible] روڈ، لکھنؤ ۳ میں چھپا۔

[رجب المرجب ۱۳۸۸ھ]

OCTOBER 1968

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

ماہنامہ

الفرقان لکھنؤ

فی کاپی ......۷۰ پیسے

سالانہ چندہ
ہندوستان سے —— ۷/۵۰
پاکستان سے —— ۷/۵۰

ششماہی
ہندوستان سے ۴/-
پاکستان سے ۴/-

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کیلئے
مزید محصول ڈاک کا اضافہ

جلد ۳۶ | بابت ماہ رجب ۱۳۸۸ھ مطابق اکتوبر ۱۹۶۸ء | شمارہ ۷

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہِ کرم آئندہ کیلئے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۱۳ر اکتوبر تک آ جائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا

پاکستان کے خریدار: - اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں۔ نئے خریدار بھی اسی طریقہ سے چندہ ارسال فرمائیں۔

نمبر خریداری: - براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت: - الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اسکی اطلاع ۱۳ر اکتوبر تک آ جانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

افسوس ہے کہ ۲ ماہ سے الفرقان کی اشاعت میں تاخیر ہو رہی ہے۔ مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ اس کا سبب راقم سطور کی علالت ہے۔ اگر الفرقان کی اشاعت کا انحصار میرے ہی اوپر ہوتا تو بظاہر تاخیر کے بجائے ناغہ کی نوبت آتی، مگر والد ماجد مدظلہ کی دلچسپی کی بدولت سلسلہ برقرار رہا۔ اس ماہ (اکتوبر) کی دوسری تاریخ کو وہ رابطہ عالم اسلامی (مکہ مکرمہ) کے اجلاس میں شرکت کیلئے روانہ ہو گئے ہیں اسلئے مزید تاخیر ہوئی۔ والد ماجد کا یہ سفر کم سے کم ۱۰ نومبر تک ہی گا۔ اسلئے نومبر (شعبان) کی اشاعت کا امکان بہت کم ہے۔

كِتَابُ الدَّعْوَاتِ

معارف الحدیث

(مسلسل)

استغفار و توبہ (۲)

توبہ وانابت سے بڑے سے بڑے گناہوں کی معافی :-

قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی رحمت بیحد وسیع ہے اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ توبہ کرنے اور معافی مانگنے پر بڑے سے بڑا گناہ معاف فرما دیتا ہے اور بڑے سے بڑے پاپیوں اور گناہگاروں کو بخشدیتا ہے۔ اگرچہ اس میں قہر وجلال کی صفت بھی ہے اور یہ صفت بھی اس کی شانِ عالی کے مطابق بدرجۂ کمال ہے لیکن وہ انہی مجرموں کے لیے ہے جو جرائم اور گناہ کرنے کے بعد بھی توبہ کرکے اس کی طرف رجوع نہ ہوں اور اس سے معافی اور مغفرت نہ مانگیں۔ بلکہ اپنے مجرمانہ رویہ ہی پر قائم رہیں اور اسی حال میں دنیا سے چلے جائیں۔ مندرجۂ ذیل حدیثوں کا یہی مدعا اور یہی پیغام ہے۔

سنّو آدمیوں کا قاتل سچی توبہ سے بخشدیا گیا :-

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ اَنَّ نَبِیَّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَانَ فِيْمَنْ قَبْلَكُمْ رَجُلٌ قَتَلَ تِسْعَةً وَّتِسْعِيْنَ نَفْسًا فَسَاَلَ

عَنْ اَعْلَمِ اَهْلِ الْاَرْضِ فَدُلَّ عَلٰى رَاهِبٍ فَاَتَاهُ وَقَالَ اِنَّهٗ قَتَلَ تِسْعَةً وَّتِسْعِيْنَ نَفْسًا فَهَلْ لَهٗ مِنْ تَوْبَةٍ فَقَالَ لَا فَقَتَلَهٗ فَكَمَّلَ بِهٖ مِائَةً ثُمَّ سَاَلَ عَنْ اَعْلَمِ اَهْلِ الْاَرْضِ فَدُلَّ عَلٰى رَجُلٍ عَالِمٍ فَقَالَ اِنَّهٗ قَتَلَ مِائَةَ نَفْسٍ فَهَلْ لَهٗ مِنْ تَوْبَةٍ فَقَالَ نَعَمْ وَمَنْ يَّحُوْلُ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ التَّوْبَةِ؟ اِنْطَلِقْ اِلٰى اَرْضِ كَذَا وَكَذَا فَاِنَّ بِهَا اُنَاسًا يَعْبُدُوْنَ اللّٰهَ تَعَالٰى فَاعْبُدِ اللّٰهَ تَعَالٰى مَعَهُمْ وَلَا تَرْجِعْ اِلٰى اَرْضِكَ فَاِنَّهَا اَرْضُ سُوْءٍ فَانْطَلَقَ حَتّٰى اِذَا نَصَفَ الطَّرِيْقَ اَتَاهُ الْمَوْتُ فَاخْتَصَمَتْ فِيْهِ مَلَائِكَةُ الرَّحْمَةِ وَمَلٰٓئِكَةُ الْعَذَابِ فَقَالَتْ مَلٰٓئِكَةُ الرَّحْمَةِ جَاءَ تَائِبًا مُّقْبِلًا بِقَلْبِهٖ اِلَى اللّٰهِ وَقَالَتْ مَلٰٓئِكَةُ الْعَذَابِ اِنَّهٗ لَمْ يَعْمَلْ خَيْرًا قَطُّ فَاَتَاهُمْ مَلَكٌ فِيْ صُوْرَةِ اٰدَمِيٍّ فَجَعَلُوْهُ بَيْنَهُمْ فَقَالَ قِيْسُوْا مَا بَيْنَ الْاَرْضَيْنِ فَاِلٰى اَيَّتِهِمَا كَانَ اَدْنٰى فَهُوَ لَهٗ فَقَاسُوْا فَوَجَدُوْهُ اَدْنٰى اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ اَرَادَ فَقَبَضَتْهُ مَلٰٓئِكَةُ الرَّحْمَةِ۔

—— رواہ البخاری ومسلم واللفظ لہ

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ تم سے پہلی کسی اُمّت میں ایک آدمی تھا جس نے اللہ کے ننانوے بندے قتل کیے تھے (پھر ایک وقت اس کے دل میں ندامت اور اپنے انجام اور آخرت کی فکر پیدا ہوئی) تو اس نے لوگوں سے دریافت کیا کہ اس علاقہ میں سب سے بڑا عالم کون ہے تاکہ اس سے جا کر پوچھے کہ میری بخشش کی کیا صورت ہو سکتی ہے) تو لوگوں نے اس کو ایک راہب (کسی بزرگ درویش) کے بارے میں بتایا، چنانچہ وہ ان کے پاس آیا اور ان سے عرض کیا کہ میں (ایسا بدبخت ہوں) جس نے ننانوے خون کیے ہیں تو کیا ایسے آدمی کی بھی توبہ قبول ہو سکتی ہے (اور وہ بخشا جا سکتا ہے؟) اس راہب بزرگ نے کہا بالکل نہیں۔ تو ۹۹ آدمیوں کے اس قاتل نے اس بزرگ راہب کو بھی قتل کر ڈالا

اور سو کی گنتی پوری کر دی (لیکن پھر اس کے دل میں وہی خلش اور فکر پیدا ہوئی) اور پھر اس نے کچھ لوگوں سے کسی بہت بڑے عالم کے بارے میں پوچھا انھوں نے اس کو کسی بزرگ عالم کا پتہ بتا دیا، وہ ان کے پاس بھی پہونچا اور کہا کہ میں نے سو خون کیے ہیں تو کیا ایسے مجرم کی توبہ بھی قبول ہو سکتی ہے (اور وہ بخشا جا سکتا ہے؟) انھوں نے کہا ہاں ہاں (ایسے کی توبہ بھی قبول ہوتی ہے) اور کون ہے جو اس کے اور توبہ کے درمیان حائل ہو سکے۔ (یعنی کسی مخلوق میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اس کی توبہ کو قبول ہونے سے روک دے) پھر انھوں نے کہا میں تجھے مشورہ دیتا ہوں کہ تو فلاں بستی میں چلا جا وہاں اللہ کے عبادت گزار کچھ بندے رہتے ہیں تو بھی (وہیں جا پڑ اور) ان کے ساتھ عبادت میں لگ جا، (اس بستی پر خدا کی رحمت برستی ہے) اور پھر وہاں سے کبھی اپنی بستی میں واپس نہ آ، وہ بڑی خراب بستی ہے چنانچہ وہ اس دوسری بستی کی طرف چل پڑا، یہاں تک کہ جب آدھا راستہ اس نے طے کر لیا تو اچانک اس کو موت آ گئی، اب اس کے بارے میں رحمت کے فرشتوں اور عذاب کے فرشتوں میں نزاع ہوا، رحمت کے فرشتوں نے کہا کہ یہ توبہ کر کے آیا ہے اور اس نے صدق دل سے اپنا رخ اللہ کی طرف کر لیا ہے اس لیے یہ رحمت کا مستحق ہو چکا ہے اور عذاب کے فرشتوں نے کہا کہ اس نے کبھی بھی کوئی نیک عمل نہیں کیا ہے (اور یہ سو خون کر کے آیا ہے اس لیے یہ سخت عذاب کا مستحق ہے) اس وقت ایک فرشتہ (اللہ کے حکم سے) آدمی کی شکل میں آیا فرشتوں کے دونوں گروہوں نے اس کو حکم مان لیا، اس نے فیصلہ دیا کہ دونوں بستیوں تک کے فاصلہ کی پیمائش کر لی جائے (یعنی شر و فساد اور خدا کے عذاب والی وہ بستی جس سے وہ چلا تھا اور اللہ کے عبادت گزار بندوں والی وہ قابل رحمت بستی جس کی طرف وہ جا رہا تھا، پھر جس بستی سے وہ نسبتہً قریب ہو اس کو اسی کا مان لیا جائے چنانچہ پیمائش کی گئی تو وہ نسبتاً اسی بستی سے قریب پایا گیا جس کے ارادہ سے وہ چلا تھا تو رحمت کے فرشتوں نے اس کو اپنے حساب میں لے لیا (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) یہ حدیث در اصل صرف ایک جزئی واقعہ کا بیان نہیں ہے بلکہ اس پیرایہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کی وسعت

اور اس کے کمال کو بیان فرمایا ہے اور اس کی روح اور اس کا خاص پیغام یہی ہے کہ بڑے سے بڑا گنہگار اور پاپی بھی اگر سچے دل سے اللہ کے حضور میں توبہ اور آئندہ کے لیے فرمانبرداری والی زندگی اختیار کرنے کا ارادہ کرے تو وہ بھی بخش دیا جائے گا اور ارحم الراحمین کی رحمت بڑھ کر اس کو اپنے آغوش میں لے لیگی، اگرچہ اس توبہ و انابت کے بعد وہ فوراً ہی دنیا سے اٹھا لیا جائے اور اسے کوئی نیک عمل کرنے کا موقع بھی نہ ملے اور اس کا اعمال نامہ اعمال صالحہ سے بالکل خالی ہو۔

اس حدیث کے مضمون پر ایک علمی اور اصولی اشکال بھی کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ "ناحق قتل" ان گناہوں میں سے ہے جن کا تعلق صرف حق اللہ ہی سے نہیں بلکہ حق العباد سے بھی ہے، جس مجرم اور قاتل نے کسی بندہ کو ناحق قتل کیا۔ اُس نے اللہ کی نافرمانی کے علاوہ اُس مقتول بندہ پر اور اس کے بیوی بچوں پر بھی ظلم کیا۔ اور مُسلّمہ اُصول یہ ہے کہ اس طرح کے مظالم صرف توبہ سے معاف نہیں ہوتے بلکہ ان کے لیے مظلوم بندوں سے معاملہ صاف کرنا بھی ضروری ہوتا ہے ـــــــ شارحین نے اس کا یہ جواب دیا ہے اور صحیح جواب دیا ہے کہ بے شک اصول اور قانون یہی ہے لیکن مظلوموں کے حق کی ادائیگی اور ان سے معاملہ صاف کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں اُن پر ظلم کرنے والے اور پھر اُس ظلم سے سچی اور گہری توبہ کرنے والے بندوں کی طرف سے ان کے مظلوموں کو اپنے خزانۂ رحمت سے دے کر راضی کر دے، اس حدیث میں سو خون کرنے والے جس تائب بندہ کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اس کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ یہی کرے گا اور اس کی طرف سے اس کے مقتولوں اور سب مظلوموں کو اپنے خزانۂ رحمت سے اتنا دے دیگا کہ وہ راضی ہو جائیں گے ـــ اور یہ سو خون کرنے والا تائب بندہ اللہ کی رحمت سے سیدھا جنت میں چلا جائے گا۔

مشرکوں اور کافروں کے لیے بھی منشورِ رحمت :-

عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَا اُحِبُّ اَنَّ

لِیَ الدُّنْیَا بِھٰذِہِ الْاٰیَۃِ "یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ لَا تَقْنَطُوْا" الآیۃ
فَقَالَ رَجُلٌ فَمَنْ اَشْرَکَ؟ فَسَکَتَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ اَلَا وَمَنْ
اَشْرَکَ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ ——— رواہ احمد

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔ آپ فرماتے تھے کہ مجھے اس آیت کے مقابلہ میں ساری دنیا (اور اس کی نعمتوں) کا لینا بھی پسند نہیں۔

"یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اِنَّہٗ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ o"

اے میرے بندو جنھوں نے (گناہ کر کرکے) اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہے (اور اپنے کو تباہ کر لیا ہے) تم اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو۔ اللہ سارے گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ وہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔ ایک شخص نے عرض کیا "حضرت! جن لوگوں نے شرک کیا ہے کیا ان کے لیے بھی یہی ارشاد ہے؟" آپ نے پہلے تو کچھ سکوت کیا پھر تین دفعہ فرمایا " اَلَا وَمَنْ اَشْرَکَ " سن لو! مشرکوں کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کا یہی ارشاد ہے، سن لو مشرکوں کے لیے بھی یہی ارشاد ہے، ہاں! مشرکوں کے لیے بھی میرے مالک کا یہی ارشاد ہے۔ (مسند احمد)

(تشریح) اس حدیث میں جس آیت کا حوالہ ہے، یہ سورۂ زمر کی آیت ہے۔ بلا شبہ اسمیں ہر قسم کے گنہگاروں کے لیے بڑی بشارت ہے۔ خود ان کا مالک و پروردگار ان ہی کو مخاطب کر کے فرما رہا ہے کہ تم بھی میری رحمت سے ناامید نہ ہو۔ آگے اس کا تکملہ یہ ہے۔

وَاَنِیْبُوْٓا اِلٰی رَبِّکُمْ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَکُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ o وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَکُمُ الْعَذَابُ بَغْتَۃً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ o	اور رُخ کرو اپنے پروردگار کی طرف قبل اس کے کہ تم عذاب میں گرفتار ہو جاؤ اور پھر کوئی تمہاری مدد اور حمایت نہ کر سکے، اور جو بہترین ہدایت تمہارے لیے تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل کی گئی ہو۔ اس کی پیروی اختیار کرلو اس وقت کے آنے سے پہلے جب اچانک خدا کا عذاب نازل

ہو کہ تم کو اپنی گرفت میں لے اور تمہیں

پہلے سے پتہ بھی نہ ہوگا۔

اس تکملہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہر قسم اور ہر درجہ کے مجرموں اور گنہگاروں کے لیے اللہ کی رحمت کا دروازہ کھلا ہوا ہے، کسی کے لیے بھی دروازہ بند نہیں ہے، شرط یہ ہے کہ عذاب یا موت کے آنے سے پہلے توبہ کرلیں اور نافرمانی کی راہ چھوڑ کر ہدایت ربانی کی فرمانبرداری اختیار کرلیں۔

اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ "رحمت خداوندی کا یہ "منشورِ عام" سب کے لیے ہے کافر اور مشرک بھی اس کے مخاطب ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خود رحمۃ للعالمین تھے اس لیے آپ کو اس منشورِ رحمت سے بیحد خوشی تھی اور فرماتے تھے کہ مجھے اس آیت کے نزول کی اتنی خوشی ہے کہ اگر ساری دنیا مجھے دیدی جائے تو اتنی خوشی مجھے نہ ہوگی۔

توبہ و استغفار کے خاص کلمات:۔

توبہ اور استغفار کی جو حقیقت بیان کی گئی ہے اُس سے ناظرین نے سمجھ لیا ہوگا کہ اُس میں اصل اہمیت اور بنیادی حیثیت معنی اور مقصد اور دل کی کیفیت کی ہے، بندہ جس زبان میں اور جن مناسب الفاظ میں توبہ و استغفار کرے وہ اگر سچے دل سے ہے تو اللہ کے نزدیک حقیقی توبہ و استغفار ہے اور قابل قبول ہے۔ اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توبہ و استغفار کے بعض کلمات بھی تلقین فرمائے ہیں اور اُن کی خاص فضیلت اور برکت بیان فرمائی ہے، اس سلسلے کی چند حدیثیں ذیل میں پڑھیے۔

عَنْ بِلَالِ بْنِ يَسَارِ بْنِ زَيْدٍ مَوْلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ حَدَّثَنِيْ اَبِيْ عَنْ جَدِّيْ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ قَالَ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ غُفِرَ لَهٗ وَاِنْ كَانَ قَدْ فَرَّ مِنَ الزَّحْفِ ـــــــ (رواہ الترمذی و ابو داؤد)

بلال بن یسار بن زید نے اپنے والد یسار سے نقل کیا اور انھوں نے اپنے والد حضرت زیدؓ سے (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک آزاد کردہ غلام تھے) نقل کیا کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ نے ارشاد فرمایا کہ جس بندہ نے ان الفاظ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور میں توبہ و استغفار کیا۔

اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الَّذِی لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْہِ

میں اُس اللہ سے معافی اور بخشش چاہتا ہوں جو حی و قیوم ہے اور اُس کے حضور میں توبہ کرتا ہوں۔

تو وہ بندہ ضرور بخش دیا جائے گا، اگرچہ اُس نے میدان جنگ سے بھاگنے کا گناہ کیا ہو۔ (جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

(تشریح) جان بچانے کے لیے میدان جہاد سے بھاگنا بدترین کبیرہ گناہوں میں سے ہے، لیکن اس حدیث میں فرمایا گیا کہ اگر اس بدترین اور سخت ترین گناہ کا مرتکب بھی ان الفاظ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں استغفار اور توبہ کرے گا تو وہ بھی بخش دیا جائے گا — یہ بھی ظاہر ہے کہ اس طرح کی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی وحی والہام کے بغیر نہیں فرما سکتے۔ اس لیے سمجھنا چاہیے کہ گناہ گاروں کے لیے معافی اور مغفرت کی درخواست کے یہ الفاظ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعلیم فرمائے گئے ہیں اور ان الفاظ کے ساتھ درخواست کرنے والوں کے لیے بڑے سے بڑے گناہوں کی معافی اور مغفرت کا حتمی وعدہ بلکہ فیصلہ فرما دیا گیا ہے — قربان اس رحمت کے — لیکن یہ بات پھر ملحوظ رہے کہ استغفار صرف الفاظ کا نام نہیں ہے۔ اللہ کے نزدیک حقیقی استغفار وہی ہے جو دل سے ہو۔

ؔ یہ زید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ نہیں ہیں، بلکہ یہ دوسرے صحابی ہیں۔ ان کا نام بھی زید ہے اور ان کے والد کا نام بولی بتایا گیا ہے۔ یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام تھے، آپ نے ان کو بھی آزاد فرما دیا تھا۔

"سید الاستغفار":-

مندرجہ ذیل حدیث میں استغفار کے ایک کلمہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "سید الاستغفار" بتایا ہے۔ اور اس کی غیر معمولی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ اور بلاشبہ اپنے مضمون و مفہوم کے لحاظ سے بھی وہ ایسا ہی کلمہ ہے۔

عَنْ شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَيِّدُ الْاِسْتِغْفَارِ اَنْ تَقُوْلَ "اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ خَلَقْتَنِيْ وَاَنَا عَبْدُكَ وَاَنَا عَلٰى عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ اَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ وَاَبُوْءُ بِذَنْبِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَاِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ" قَالَ وَمَنْ قَالَهَا مِنَ النَّهَارِ مُوْقِنًا بِهَا فَمَاتَ مِنْ يَوْمِهٖ قَبْلَ اَنْ يُّمْسِيَ فَهُوَ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَمَنْ قَالَهَا مِنَ اللَّيْلِ وَهُوَ مُوْقِنٌ بِهَا فَمَاتَ قَبْلَ اَنْ يُّصْبِحَ فَهُوَ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ ———— رواہ البخاری

حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "سید الاستغفار" (یعنی سب سے اعلیٰ استغفار) یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں یوں عرض کرے۔

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ خَلَقْتَنِيْ وَاَنَا عَبْدُكَ وَاَنَا عَلٰى عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ اَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ وَاَبُوْءُ بِذَنْبِيْ فَاغْفِرْ لِيْ اِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ۔

اے اللہ تو ہی میرا رب (یعنی مالک و مولا) ہے، تیرے سوا کوئی مالک و معبود نہیں، تو نے ہی مجھے پیدا فرمایا اور وجود بخشا، میں تیرا بندہ ہوں اور جہاں تک مجھ عاجز ناتواں سے ہو سکے گا۔ تیرے ساتھ کئے ہوئے (ایمانی) عہد و میثاق اور (اطاعت اور فرمانبرداری کے) وعدہ پر قائم رہوں گا، تیری پناہ چاہتا ہوں۔ اپنے عمل و کردار کے

شر سے میں اقرار کرتا ہوں کہ تو نے مجھے نعمتوں سے نوازا اور اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے تیری نافرمانیاں کیں اور گناہ کیے، اے میرے مالک و مولا تو مجھے معاف فرما دے اور میرے گناہ بخش دے، تیرے سوا گناہوں کو بخشنے والا کوئی نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس بندہ نے اخلاص اور دل کے یقین کے ساتھ دن کے کسی حصہ میں اللہ کے حضور میں یہ عرض کیا (یعنی ان کلمات کے ساتھ استغفار کیا) اور اسی دن رات شروع ہونے سے پہلے اس کو موت آگئی تو وہ بلاشبہ جنت میں جائے گا۔ اور اسی طرح اگر کسی نے رات کے کسی حصہ میں اللہ تعالیٰ کے حضور میں یہ عرض کیا اور صبح ہونے سے پہلے اس رات میں وہ چل لیا تو بلاشبہ وہ جنت میں جائے گا۔ (صحیح بخاری)

(تشریح) اس استغفار کی اس غیر معمولی فضیلت کا راز بہ ظاہر یہی ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ میں عبدیت کی روح بھری ہوئی ہے۔ سب سے پہلے عرض کیا گیا ہے "اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ خَلَقْتَنِيْ وَ اَنَا عَبْدُكَ" (اے اللہ تو ہی میرا رب ہے، تیرے سوا کوئی مالک و معبود نہیں، تو نے ہی مجھے وجود بخشا ہے اور میں بس تیرا بندہ ہوں) اس کے بعد عرض کیا گیا ہے کہ "وَ اَنَا عَلٰى عَهْدِكَ وَ وَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ" (یعنی میں نے ایمان لاکے تیری عبادت و اطاعت کا جو عہد و میثاق اور وعدہ کیا ہے، جہاں تک مجھ سے بن پڑے گا اس پر قائم رہنے کی کوشش کروں گا) یہ بندہ کی طرف سے اپنی کمزوری کے اعتراف کے ساتھ ایمانی عہد و میثاق کی تجدید ہے، اس کے آگے عرض کیا گیا ہے "اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ" (مجھ سے جو غلطیاں اور کوتاہیاں ہوئیں اور آئندہ ہوں ان کے برے نتیجہ سے اے میرے مالک و رب میں تیری پناہ کا طالب ہوں) اس میں اعتراف قصور کے ساتھ اللہ کی پناہ بھی چاہی گئی ہے، اس کے بعد عرض کیا گیا ہے "اَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ وَ اَبُوْءُ بِذَنْبِيْ" (میں تیرے

انعامات و احسانات کا اور اپنی گناہگاریوں اور خطاکاریوں کا اعتراف کرتا ہوں، آخر میں عرض کیا گیا ہے "فَاغْفِرْلِیْ ذُنُوْبِیْ اِنَّهٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ" (میرے مالک و مولا تو اپنے رحم و کرم سے میرے جرائم، میرے گناہ بخش دے، جرموں اور گناہوں کو بخشنے والا بس تو ہی ہے)

حق یہ ہے کہ جس صاحب ایمان بندہ کو وہ معرفت و بصیرت نصیب ہو جس کے ذریعہ وہ اپنی اور اپنے اعمال کی حقیقت کو سمجھتا ہو اور اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت اور اُس کے حقوق کو بھی کچھ جانتا ہو تو وہ اپنے کو صرف قصوروار اور گناہگار اور خیر اور بھلائی کے معاملہ میں بالکل مفلس اور تہی مایہ محسوس کرے گا اور پھر اُس کے دل کی آواز اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں اُس کی التجا یہی ہوگی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیم فرمائے ہوئے اس استغفار میں محسوس ہوتی ہے — اس کو "سید الاستغفار" اسی خصوصیت کی وجہ سے کہا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پہونچ جانے کے بعد آپ پر ایمان رکھنے والے ہر امتی کو چاہیے کہ وہ اس کا اہتمام کرے کہ ہر دن اور رات میں کم از کم ایک دفعہ ضرور وہ سچے دل سے اللہ تعالیٰ کے حضور میں یہ استغفار کرلیا کرے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو ہمارے استاذ حضرت مولانا سراج احمد صاحب رشیدیؒ پر اب سے ۴۵ سال پہلے دار العلوم دیوبند میں ان ہی سے مشکوٰۃ شریف پڑھی تھی، جب سبق میں یہ حدیث آئی تو حضرت مولانا نے پوری جماعت کو حکم دیا کہ یہ "سید الاستغفار" سب یاد کرلیں کل میں سب سے سنوں گا، چنانچہ اگلے دن قریب قریب سب طلبا سے سنا، اور وصیت فرمائی کہ دن رات میں کم از کم ایک دفعہ اس کو ضرور پڑھ لیا کرو۔

عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ کَانَ یَدْعُوْ بِهٰذَا الدُّعَاءِ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ خَطِیْئَتِیْ وَجَهْلِیْ وَاِسْرَافِیْ فِیْ اَمْرِیْ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّیْ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ هَزْلِیْ وَجِدِّیْ وَخَطَایَایَ وَعَمْدِیْ وَکُلُّ ذٰلِكَ عِنْدِیْ۔

—————— رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بارگاہ خداوندی میں اس طرح عرض کیا کرتے تھے " اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ خَطِیْئَتِیْ ......

..... تا ..... وَكُلُّ ذَالِكَ عِنْدِي ۔ (اے اللہ میری خطا میرے قصور معاف کر دے اور (علم و معرفت کے تقاضے کے خلاف) جو نادانی کا کام میں نے کیا ہو اُس کو معاف فرما دے اور اپنے جس معاملہ میں بھی میں نے تیرے حکم اور تیری رضا کی حد سے تجاوز کیا ہو اس کو بخش دے۔ اے میرے اللہ میرے وہ گناہ بھی معاف فرما دے جو ہنسی مذاق میں مجھ سے سرزد ہو گئے ہوں اور وہ بھی معاف کر دے جو میں نے سوچ سمجھ کے اور سنجیدگی سے کیے ہوں میرے مالک، میری وہ خطائیں بھی معاف کر دے جو بلا ارادہ مجھ سے سرزد ہو گئی ہوں اور وہ بھی معاف فرما دے جو میں نے جان بوجھ کے ارادہ سے کی ہوں ـــــ اور (اے میرے مالک تو جانتا ہے کہ) یہ سب طرح کی خطائیں میں نے کی ہیں۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) اللہ اکبر! سید المرسلین محبوبِ رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم جو یقیناً معصوم تھے اُن کے احساسات اپنے بارہ میں یہ تھے اور وہ اپنے کو سرتاسر خطا کار اور قصور وار سمجھتے ہوئے بارگاہ خداوندی میں اس طرح استغفار کرتے تھے حق یہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ کی جتنی معرفت ہوگی وہ اُتنا ہی زیادہ اپنے کو ادائے حقِ عبدیت کے بارے میں قصور وار سمجھے گا ـــــ "قرب یاں را بیش بود حیرانی۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس استغفار کے ایک ایک لفظ میں عبدیت کی روح بھری ہوئی ہے اور ہم امتیوں کے لیے اس میں بڑا سبق ہے۔

حضرت خضر کا استغفار:۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَثِيرًا مَّا يَقُولُ لَنَا مَعْشَرَ اَصْحَابِي مَا يَمْنَعُكُمْ اَنْ تُكَفِّرُوا ذُنُوبَكُمْ بِكَلِمَاتٍ يَسِيرَةٍ قَالُوا يَا رَسُولَ اللهِ مَا هِيَ؟ قَالَ تَقُولُونَ مَقَالَةَ اَخِي الْخَضِرِ قُلْنَا يَا رَسُولَ اللهِ مَا كَانَ يَقُولُ؟ قَالَ كَانَ يَقُولُ؟ اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَسْتَغْفِرُكَ لِمَا تُبْتُ اِلَيْكَ مِنْهُ ثُمَّ عُدْتُّ فِيهِ وَاسْتَغْفِرُكَ لِمَا اَعْطَيْتُكَ مِنْ نَفْسِي ثُمَّ لَمْ اُوْفِ لَكَ بِهِ وَاسْتَغْفِرُكَ لِلنِّعَمِ الَّتِي اَنْعَمْتَ بِهَا

عَلیٰ تَقَوَّیْتُ بِھَا عَلیٰ مَعَاصِیْكَ وَاَسْتَغْفِرُكَ لِکُلِّ خَیْرٍ اَرَدْتُّ بِهٖ وَجْھَكَ فَخَالَطَنِیْ فِیْهِ مَا لَیْسَ لَكَ اَللّٰھُمَّ لَا تُخْزِنِیْ فَاِنَّكَ بِیْ عَالِمٌ وَلَا تُعَذِّبْنِیْ فَاِنَّكَ عَلَیَّ قَادِرٌ

——— رواہ الدیلمی

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں سے اکثر فرمایا کرتے تھے اے میرے ساتھیو! تمہارے لیے کیا چیز اس سے مانع ہو سکتی ہے کہ چند آسان کلموں کے ذریعہ اپنے گناہوں کی صفائی کر لیا کرو! عرض کیا گیا یا رسول اللہ وہ کون سے کلمے ہیں؟ آپ نے فرمایا وہ کہا کرو جو میرے بھائی خضر کہا کرتے تھے۔

عرض کیا گیا یا رسول اللہ وہ کیا کہا کرتے تھے؟ فرمایا وہ کہا کرتے تھے "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْتَغْفِرُكَ لِمَا تُبْتُ اِلَیْكَ مِنْهُ ثُمَّ عُدْتُّ فِیْهِ .... تا .... اَللّٰھُمَّ لَا تُخْزِنِیْ فَاِنَّكَ بِیْ عَالِمٌ وَلَا تُعَذِّبْنِیْ فَاِنَّكَ عَلَیَّ قَادِرٌ" اے میرے اللہ! میں تجھ سے معافی اور بخشش چاہتا ہوں۔ اُن گناہوں کی جن سے میں نے تیرے حضور میں توبہ کی ہو [اور شامتِ نفس سے] پھر پلٹ کر دہی گناہ دوبارہ کیے ہوں، اور میں تجھ سے معافی اور بخشش چاہتا ہوں اس عہد کے بارے میں جو میں نے اپنی ذات کی طرف سے تجھ سے کیا ہو اور پھر میں نے اس کو وفا نہ کیا ہو [بلکہ عہد شکنی کی ہو] اور میں تجھ سے معافی اور بخشش چاہتا ہوں اُن نعمتوں کے بارے میں جن سے طاقت و قوت حاصل کر کے میں نے تیری نافرمانیاں کی ہوں اور تجھ سے معافی اور بخشش کا سوال کرتا ہوں ہر اس نیکی کے بارہ میں جو میں نے تیری رضا جوئی کی نیت سے کرنے چاہی ہو پھر اُس میں تیرے ماسوا دوسرے اغراض کی آمیزش ہو گئی ہو ——— اے میرے اللہ مجھے [دوسروں کے سامنے] رسوا نہ کرنا بے شک تو مجھے خوب جانتا ہے۔ تجھ سے میرا کوئی راز ڈھکا چھپا نہیں ہے اور [میرے گناہوں پر] مجھے عذاب

نہ دینا تجھے مجھ پر ہر طرح قدرت حاصل ہے [اور میں بالکل عاجز اور تیرے قبضہ و اختیار میں ہوں]) (مسند فردوس دیلمی)

تشریح) بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اللہ کا بندہ پورے صدق و خلوص کے ساتھ کسی گناہ سے توبہ کرتا ہے لیکن پھر اس سے وہی گناہ ہو جاتا ہے اسی طرح بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد و میثاق کرتا ہے اور پھر کسی وقت اس کے خلاف کر بیٹھتا ہے ـــــ اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بندہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق اور راحت و آرام وغیرہ کی جو نعمتیں حاصل ہوتی ہیں، ان کے استعمال سے وہ جو قوت و طاقت یا دولت حاصل کرتا ہے اس کو وہ بجائے طاعت کے معصیت کی راہ میں استعمال کرتا ہے، اسی طرح بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی نیک عمل خالص اللہ کے لیے اور اس کی رضا جوئی کے جذبہ کے ساتھ شروع کیا جاتا ہے لیکن بعد میں دوسرے غلط جذبات اور ناپسندیدہ اغراض کی اس میں آمیزش ہو جاتی ہے ـــــ یہ سب روزمرہ کے تجربے اور روزمرہ کی واردات ہیں اور اچھے اچھوں کو پیش آتی ہیں ـــــ ایسے حالات میں اللہ سے تعلق اور آخرت کی فکر رکھنے والے بندوں کے دل و زبان کی استدعا کیا ہونی چاہیے؟ ـــــ مندرجہ بالا استغفار کے کلمات میں اسی کی پوری رہنمائی اور تلقین فرمائی گئی ہے اور یہ کلمات اپنے مضمون کی گہرائی اور جامعیت کے لحاظ سے یقیناً معجزانہ ہیں اسی لیے اس حدیث کو یہاں درج کیا گیا ہے اگرچہ "کنز العمال" میں اس کی تخریج صرف دیلمی سے کی گئی ہے جو محدثین کے نزدیک سند کے لحاظ سے ضعیف ہونے کی علامت ہے "کلمات استغفار" کے زیرعنوان یہاں صرف ان چار ہی حدیثوں پر اکتفا کیا ہے، نماز سے متعلق دعاؤں میں، اور اسی طرح مخصوص حالات و اوقات کی دعاؤں میں، اور علی ہذا جامع اور ہمہ گیر دعاؤں میں ان کے علاوہ استغفار کے بیسوں بلکہ پچاسوں کلمات گزر چکے ہیں۔ اس طرح استغفار کے اُن کلمات کی مجموعی تعداد بہت زیادہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کتب حدیث میں ماثور و منقول ہیں اور بلاشبہ وہ سب ہی بڑے بابرکت ہیں۔

استغفار کی برکات :-

استغفار کی اصل غرض و غایت اور اس کا موضوع تو اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کو معاف

کراتا ہے تاکہ بندہ اُن کے عذاب و وبال سے بچ جائے لیکن قرآن مجید سے بھی معلوم ہوتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بتلایا ہے کہ استغفار بہت سی دنیوی برکات کا بھی باعث بنتا ہے اور بندہ کو اس دنیا میں بھی اُس کے طفیل بہت کچھ ملتا ہے، اللہ تعالیٰ یقین و عمل نصیب فرمائے۔

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ لَزِمَ الْاِسْتِغْفَارَ جَعَلَ اللّٰهُ لَهٗ مِنْ كُلِّ ضِيْقٍ مَخْرَجًا وَّمِنْ كُلِّ هَمٍّ فَرَجًا وَّرَزَقَهٗ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ——— رواہ احمد وابوداؤد وابن ماجۃ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا جو بندہ استغفار کو لازم پکڑ لے (یعنی اللہ تعالیٰ سے برابر اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہے) تو اللہ تعالیٰ اُس کے لیے ہر تنگی اور مشکل سے نکلنے اور رہائی پانے کا راستہ بنا دے گا، اور اُس کی ہر فکر اور ہر پریشانی کو دور کر کے کشادگی اور اطمینان عطا فرما دے گا، اور اُس کو ان طریقوں سے رزق دے گا جن کا اُس کو خیال و گمان بھی نہ ہوگا۔

(مسند احمد، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ)

(تشریح) ملحوظ رہے کہ یہ وعدہ صرف زبان سے کلماتِ استغفار پڑھنے پر نہیں ہے، بلکہ استغفار کی حقیقت پر ہے جس کی پہلے وضاحت کی جا چکی ہے، اللہ تعالیٰ شانہ نصیب فرمائے۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ بُسْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طُوْبٰى لِمَنْ وَجَدَ فِیْ صَحِيْفَتِهٖ اِسْتِغْفَارًا كَثِيْرًا ——— رواہ ابن ماجہ والنسائی

حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ خوشی ہو اور مبارک ہو اُس بندہ کو جو اپنے اعمالنامہ میں بہت زیادہ استغفار پائے (یعنی آخرت میں وہ دیکھے کہ اُس کے اعمالنامہ میں استغفار بکثرت درج ہے)

(سنن ابن ماجہ، سنن نسائی)

(تشریح) واضح رہے کہ اعمالنامہ میں حقیقی استغفار کے طور پر وہی استغفار درج ہوگا جو حقیقت

کے لحاظ سے اور عند اللہ بھی استغفار ہوگا، اور جو صرف زبان سے استغفار ہوگا وہ اگر درج ہوگا تو صرف زبانی اور لفظی استغفار کے طور پر درج ہوگا، اور اگر اندراج پانے کے قابل نہ ہوگا تو درج ہی نہ ہوگا، اسی لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں یہ نہیں فرمایا کہ "طُوبٰی لِمَنْ اِسْتَغْفَرَ کَثِیْرًا" (خوشی ہو اور مبارک ہو اس کو جو بکثرت استغفار کرے) بلکہ یہ فرمایا کہ "طُوبٰی لِمَنْ وَجَدَ فِیْ صَحِیْفَتِہٖ اِسْتِغْفَارًا کَثِیْرًا" (خوشی اور مبارک ہو اُس بندہ کو جو اپنے اعمالنامہ میں بہت زیادہ استغفار پائے) امت کی مشہور عارفہ حضرت رابعہ عدویہ قدس سرہا سے منقول ہے، وہ فرماتی تھیں کہ ہمارا استغفار خود اس قابل ہوتا ہے کہ اللہ کی حضور میں اُس سے بہت زیادہ استغفار کیا جائے۔

اس حدیث میں "طوبیٰ" کا لفظ بہت ہی جامع ہے دُنیا اور آخرت اور جنت کی ساری ہی بہاریں اور نعمتیں اس میں شامل ہیں، بلاشبہ جس بندہ کو تحقیقی استغفار نصیب ہو اور خوب اور کثرت سے نصیب ہو وہ بڑا خوش نصیب ہے اور اُس کو سب ہی کچھ نصیب ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے نصیب فرمائے۔

استغفار پوری امت کے لیے امان:-

مندرجہ بالا دونوں حدیثوں میں استغفار کی جن برکات کا ذکر کیا گیا وہ انفرادی تھیں یعنی وہ استغفار کرنے والے افراد ہی کو حاصل ہوں گی، مندرجہ ذیل حدیث سے معلوم ہوگا کہ ان انفرادی برکات کے علاوہ استغفار کرنے والوں کے استغفار کی ایک بہت بڑی اور عمومی برکت یہ ہے کہ وہ پوری اُمت کے لیے عذاب عام سے امان ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سے قیامت تک اُمت گویا اسی کے سایہ میں ہے۔

عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیَّ اَمَانَیْنِ لِاُمَّتِیْ "وَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَہُمْ وَاَنْتَ فِیْہِمْ وَمَا کَانَ اللّٰہُ مُعَذِّبَہُمْ وَہُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ" فَاِذَا مَضَیْتُ تَرَکْتُ فِیْہِمُ الْاِسْتِغْفَارَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ —————— رواہ الترمذی

حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد

فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لیے دو امانیں مجھ پر نازل فرمائیں (سورۃ انفال میں ارشاد فرمایا گیا) "وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ الآیۃ" یعنی اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کرے گا کہ تم اُن کے درمیان موجود ہو اور اُن پر عذاب نازل کر دے، اور اللہ انھیں عذاب میں مبتلا نہیں کرے گا جبکہ وہ استغفار کرتے ہوں گے اور معافی و مغفرت مانگتے ہوں گے) ——— (آپ نے فرمایا) پھر جب میں گزر جاؤں گا تو قیامت تک کے لیے تمہارے درمیان استغفار کو (بطور امان) چھوڑ جاؤں گا۔ (جامع ترمذی)

تشریح سورۂ انفال کی آیت ۳۳ "مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ" جس کا اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حوالہ دیا ہے اس کا مدعا اور مقتضا یہ ہے کہ ایک تو خود آپ کی ذات اور آپ کا وجود امت کے لیے عذاب سے امان ہے، جب تک آپ ان میں موجود ہیں، ان پر عذاب عام نازل نہیں کیا جائے گا، اور دوسری چیز جو اُن کے لیے وسیلۂ امان ہے وہ خود ان کا استغفار ہے، جب تک یہ اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی اور مغفرت مانگتے رہیں گے اور استغفار کرتے رہیں گے، عذاب عام سے ہلاک نہیں کیے جائیں گے ——— گویا ایک امان خود آپ کا وجود باجود تھا، جس سے اُمت آپ کی وفات کے بعد محروم ہو گئی، دوسری امان خود اُمت کا استغفار ہے، وہ بھی اُمت کو آپ ہی کے ذریعہ ملا ہے اور وہ قیامت تک باقی رہے گا ——— اور اُمت انتہائی بداعمالیوں کے باوجود جو عذاب عام سے آج تک محفوظ ہے، یہ استغفار کرنے والے بندوں کے استغفار ہی کی برکت ہے۔

(بقیہ یک دو ساعت صحبتے)

الآیۃ ـــ (ارنی! ہمارے واسطے بھی ایک معبود بنا دے جیسے ان کے معبود ہیں) ہم کو قدر نہیں کہ اللہ نے ہم کو کیسا آسان دین اور کیسی سہل اور قابل عمل شریعت عطا فرمائی ہے نہ ہم کو حکم دیا کہ نجاست لگنے پر جسم کو چھیل ڈالو نہ یہ کہ کپڑے کو پھاڑ دو، صرف دھونا اور پاک کر لینا کافی ہے۔

یک دو ساعت صحبتے با اہلِ دل

مجلس حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی مدظلہ العالی

(مرتبہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی)

نویں مجلس

۲۹ جنوری ۱۹۶۸ء خانقاہ شریف بھوپال، حاضرین مجلس بدستور
وقت ساڑھے دس بجے سے ساڑھے بارہ بجے تک

فرمایا کوئی شخص کمال سے خالی نہیں، کمال ہر ایک میں موجود ہے، بعض میں کالمعدوم ہوتا ہے مگر ہوتا ہے، ہر شخص میں استعداد ودیعت ہے۔ جو اس وقت نظر نہیں آتی، اگر کوئی شخص کہے کہ اس بیج میں دس ہزار پھل اور دس لاکھ پتیاں ہیں تو کون مانے گا، اہل باطن اس کمال اور مخفی استعداد پر نظر رکھ کر ہر شخص کی توقیر کرتے ہیں۔ جیسے قصہ ہے کہ دہلی کے بانکے جن کی ڈاڑھی منڈی ہوئی تھی، جسم پر انگرکھا، سر پر ترچھی ٹوپی، ٹخنے سے نیچے پاجامہ، حضرت شاہ غلام علی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت ان کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے، اور بہت عزت کے ساتھ بٹھایا، لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی کہ حضرت بڑے بڑے رؤسا اور فضلاء کے لیے کھڑے نہیں ہوتے، ان میں کیا خوبی دیکھی کہ اس قدر تعظیم کی، تھوڑی دیر میں انھوں نے ایک پرچہ نکالا اور کہا کہ یہ حضرت مرزا مظہر جانجاناں کا خط ہے، حضرت نے فرمایا کہ مجھے اس کے انوار محسوس ہوئے۔ پس جس طرح ان کی جیب میں حضرت مرزا صاحب کا خط چھپا ہوا تھا۔

جس کے انوار حضرت شاہ غلام علی صاحب کو محسوس ہوئے اسی طرح انسان کے اندر کا ایمان یا اُس کی فطری استعداد، یا اس کا کوئی کمال تعظیم و احترام پر مجبور کرتا ہے۔ میں حیدر آباد میں جلالی پڑھنے کے لیے ایک صاحب کے پاس جاتا تھا جو بہت سی کمزوریوں میں گرفتار تھے، لوگ مجھے بہت سمجھاتے تھے اور کہتے تھے کہ آپ نے بہت غلط انتخاب کیا، میں کہتا تھا کہ ان میں بہت سی خرابیاں ہیں مگر اللہ نے ان کو ایک کمال عطا فرمایا ہے۔ یہ بھی معنی ہیں " وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ" کے۔

فرمایا کہ کلام کا صحیح ترجمہ متکلم کی حالت اور موقعہ کلام کو دیکھنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے، کسی صاحب کے یہاں ایک غیر ملکی خادم تھے جو زبان اچھی طرح نہیں سمجھتے تھے، وہ صاحب ایک مرتبہ بیت الخلاء میں تھے، انھوں نے کہا پانی لاؤ، خادم نے کسی سے دریافت کیا کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ انھوں نے لوٹے کی طرف اشارہ کیا کہ اس میں پانی لے کر جاؤ، وہ بے چارہ سمجھا کہ اس جملہ کا یہی ترجمہ ہے، ایک دن انھوں نے دسترخوان پر پانی مانگا وہ خادم صاحب پاخانہ کے لوٹے میں پانی لے کر پہونچے، لوگوں نے ان کو ٹوکا اور کہا گلاس میں پانی لے کر پیش کرو، اب وہ سمجھے اب اس جملہ کا یہی ترجمہ ہو گیا، ایک مرتبہ صاحب خانہ نے پھر پاخانہ سے پانی مانگا وہ اب کی گلاس میں پانی لے کر پہونچ گئے۔ یہی حال اچھے اچھے سمجھدار لوگوں کا ہے اور یہی وحدۃ الوجود اور بڑے بڑے جھگڑوں کا حل ہے کہ کلام متکلم کی حالت سمجھے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ متکلم نے جب یہ کلام کیا تو وہ کس مقام پر تھا اس پر کیا حالت طاری تھی، اس کی کیا کیفیت تھی، بے محل اگر فصیح و بلیغ الفاظ بولے جائیں تو ان سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ کسی نے دہقانی سے کہا " اے کناسہ تیری جاروب کشی نے میرا دماغ معنبر کر دیا۔" وہ بے چارہ کچھ نہ سمجھی، دوسرے نے کہا ہلکے ہاتھ جھاڑو گرد آرہی ہے، کسی نے دیہاتیوں سے پوچھا کہ " آپ کے قریات میں امسال تقاطر امطار ہوا یا نہیں؟ وہ کچھ نہ سمجھے، ایک شخص نے کہا کہ پوچھتے ہیں کہ چھینٹا پڑا یا نہیں تو وہ سمجھ گئے۔

ایک بزرگ نے اپنے ایک مرید سے اجازت کے بعد کہا کہ جانتے ہو کہ تصوف

کا خلاصہ کیا ہے "پختن خیال" میں نے کہا اس کا نام تو جنون ہے، مجنوں کے دل میں بھی ایک بات جم جاتی ہے اور وہی کہتا رہتا ہے۔ یہاں چند آدمی ایک صاحب کو لے کر آئے، انھوں نے کہا حضرت یہ میرے بھانجے اور بھتیجے مجھے دیوانہ سمجھتے ہیں، حالانکہ میں دیوانہ نہیں ہوں، میں تو کہتا ہوں کہ زمین پر جب میں دو انگلیاں رکھتا ہوں تو ہلنے لگتی ہے، دیکھئے میں نے یہ انگلیاں رکھی ہیں، یہ ہلی کہ نہیں، رام پور کے ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے انھوں نے کہا ہل رہی ہے، یہی مسمریزم میں ہوتا ہے کہ توجہ کو کسی ایک نقطہ پر مرکوز کر کے طاقت پیدا کر لی جاتی ہے پھر اس سے تغیرات ہونے لگتے ہیں۔ میں نے کہا کہ سلوک سے مراد حصول یقین ہے، اپنی سمجھ کو ٹھیک کرنا مقصود ہے، حقائق موجود ہیں، اُن پر یقین پیدا کرنا ہے، قرآن شریف میں ہے۔ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ اِلیٰ آخر۔ الایتہ۔ (دنیا کی ہر چیز اللہ کی حمد تسبیح کرتی ہے لیکن تم لوگ اُس کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو)

فرمایا کہ ایک مرتبہ میں دہلی گیا ہوا تھا اور اسی زمانہ میں وہاں سخت سیلاب اور زلزلہ آیا ہوا تھا، کاندھلہ کے احباب اصرار کر کے دہلی سے اپنے یہاں لے گئے وہاں جا کر دو افسوسناک باتوں کا علم ہوا، ایک یہ کہ کاندھلہ اور ریوٹی والوں میں جو ایک دوسرے کے عزیز ہیں سخت مخالفت ہے۔ ایک دوسرے کا مقاطعہ ہے، یہاں کا آدمی وہاں نہیں جا سکتا، وہاں کا آدمی یہاں نہیں آ سکتا، آپس میں عہد کر رکھا ہے کہ ایک دوسرے کے جنازہ میں بھی شریک نہیں ہوں گے، دوسری مصیبت یہ تھی کہ ایک شریف خاندان کی دو لڑکیاں جنکی عمر تجاوز کر رہی ہے بے شادی کئے بیٹھی ہوئی ہیں، اگر ایک جگہ ان کا رشتہ کرنے کا خیال ہوتا ہے تو ایک بزرگ اور عزیز کہتے ہیں کہ ان کے جنازہ میں شریک نہیں ہوں گا، اگر دوسری جگہ رشتہ کرنے کا خیال ہوتا ہے تو دوسرے بزرگ کہتے ہیں کہ میں نہیں شریک ہونگا مختلف جگہوں سے پیام آتے تھے، اور نامنظور ہو جاتے تھے، بعض لوگوں نے مجھ سے یہ حالت بتائی اور وعظ و نصیحت کی فرمائش کی، ایک جگہ دونوں مقام کے لوگ جمع

ؔ ضلع میرٹھ۔ تحصیل باغپت میں ایک قصبہ ہے۔

تھے یہیں نے وعظ کہنا شروع کیا، پہلے عہد و معاہدہ کی اہمیت، اس کے پورا کرنے کا شرعی حکم اور تاکید بیان کی، اس پر اُن لوگوں کے کان کھڑے ہوئے جنھوں نے خود فرمائش کی تھی، اور یہ سمجھتے تھے کہ میرے کہنے سننے سے مصالحت کا جذبہ پیدا ہوگا، ان کو تعجب ہوا کہ اس عہد و معاہدہ نے ہی تو اتنی دوری پیدا کر دی ہے، یہ علاوہ اس عہد و معاہدہ کی اہمیت اور اس کے پورا کرنے کی تاکید بیان کر رہا ہے۔ جب میں نے اس مضمون کو خوب بیان کر لیا تو میں نے حاضرین سے پوچھا کہ اگر ایک شخص آج یہ عہد کرتا ہے کہ فلاں شہر میں نہ جائے گا، فلاں آدمی سے بات نہ کرے گا اور کل یہ عہد کرتا ہے کہ وہ اس شہر میں جائے گا اور اس آدمی سے بات کرے گا تو ان دونوں عہدوں میں سے کون سا عہد قابل لحاظ ہے اور کس کا ایفاء زیادہ ضروری ہے؟ لوگوں نے کہا کہ پہلے عہد کا۔ میں نے کہا اب آپ حضرات غور کریں کہ آپ کا پہلا عہد کیا ہے، قرآن شریف میں آتا ہے، اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يَا بَنِيْ آدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (اے اولادِ آدم کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا کہ تم شیطان کی پرستش اور بندگی نہ کرو، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے) یہ عہد اس دنیا میں آنے سے پہلے عالم ارواح میں ہوا، اس کی پابندی اور ایفاء ضروری ہے یا اس عہد کا جو آپ نے ابھی کچھ دن پہلے کیا ہے؟ اس پر وہ مقاطعہ ختم ہو گیا اور برسوں کے بعد ایک قصبہ کے لوگ دوسرے قصبہ کے لوگوں سے ملنے، اس عرصہ میں بچے سیانے ہو گئے تھے، کسی نے اپنے بھانجے کو نہیں دیکھا تھا، کسی نے اپنے بھتیجے کو، سب ایک دوسرے سے گلے ملتے تھے اور بچوں کو دکھلاتے تھے کہ یہ آپ کا بھانجہ ہے، یہ آپ کا بھتیجہ ہے، غرض دونوں قصبوں میں ملاپ ہو گیا۔

ادھر اُن بچیوں کی ماں نے بیعت کی خواہش کی، میں نے کہا تم جو نماز روزہ کرتی ہو، کافی ہے، مرید ہونے کی ضرورت نہیں، انھوں نے کہا ہم سے کیا قصور ہوا ہے کہ ہم کو مریدی میں قبول نہیں کیا جاتا، میں نے کہا مرید ہونے کے بعد ہر بات ماننی پڑے گی، انھوں نے کہا ہم کو منظور ہے، میں نے ان کو مرید کیا اور کہا کہ اب میں ان لڑکیوں کی شادی کر دوں گا، جہاں جہاں سے پیام آئے ہیں، مجھے دے دو

میں نے اُن کے نام حاصل کر لیے اور اُن کے حالات و تفصیلات بھی معلوم کر لیں، میں ایک باغ میں کچھ وقت تنہا گزارا کرتا تھا، وہاں میں نے ان پر غور کیا اور دو لڑکوں کا جن کے پیام آئے تھے انتخاب کر لیا، معلوم ہوا کہ اُن کا پیام رد کیا جا چکا ہے اور جب انھوں نے تقاضہ اور یاددہانی کے خطوط لکھے تو اُن کو لکھ دیا گیا کہ اگر تم کو ڈاکخانہ کو فائدہ پہونچانا ہی ہے تو یوں ہی روپیہ دیدو۔ ہم تمہارے خط بے پڑھے جلا دیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اُن کو تار دے کر بلا لیا جائے غرض وہ لڑکے اور اُن کے والد آئے، میں نے ایک دم سے نکاح کا اعلان کر دیا۔ نہایت سادگی سے ایجاب و قبول ہو گیا، مہر کا سوال ہوا تو لڑکوں کے والد بولے مہر فاطمی، میں نے کہا نہیں مہر مثل جو اس لڑکی کی ماں کا مہر تھا وہی ہوگا، انھوں نے کہا کہ مہر فاطمی تو سنت ہے میں نے کہا، حضرت فاطمہ کا مہر ادا کرنا تھا تو علی مرتضیٰ کی شکل بھی بنائی ہوتی۔ لڑکوں کو دکھیو غیر شرعی صورت، کیا علی مرتضیٰ کی یہی صورت و سنت تھی۔ غرض وہ نکاح ہو گئے، میں نے کہا کہ شادی میں آپ کیا صرف کرتے؟ کہنے لگے بارات آتی ہزار ڈیڑھ ہزار صرف ہوتا ہی۔ میں نے کہا کہ اب وہ ہزار ہماری لڑکی کے لیے امانت ہیں۔ وہ اس کو دے دیجئے گا۔

فرمایا ایک بات آج عرض کرنی ہے، کل بہت مجمع تھا۔ عرض کرنے کی بات یہ ہے کہ ہوا، تیل، بتی، الگ الگ چیزیں ہیں، ان کے ملنے کا نام روشنی رکھا گیا ہے۔ روشنی آسمان سے نہیں آتی، جب تیل، بتی ملتے ہیں اور اُن کو حرارت پہونچتی ہے۔ پھر جلانے والی ہوا (آکسیجن) ان کو پہونچتی ہے تو وہ بتی روشن ہوتی ہے۔ اگر بجھانے والی ہوا (کاربن ڈائی آکسائڈ) سے حفاظت کر لی جائے ——— انبیا علیہم السلام کا احسان یہی ہے کہ وہ روشنی پیدا کر دیتے ہیں، اس کی مثال یوں سمجھیے کہ ایک شخص آپ کو ایک اندھیرے مکان میں لے جاتا ہے وہ آپ کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر وہاں کی چیزیں دکھلاتا ہے اور وہاں کا سامان بتاتا ہے۔ دس بیس چیزیں اس نے بتائیں، ابھی معلوم نہیں کہ مکان میں اور کیا کیا ہے، اگر آپ کو دس چیزیں

ے حضرت یہ دونوں اصطلاحی نام جناب بدیع الحسن ایم۔ایس۔سی، استاد سلیفیہ کالج سے پوچھ کر فرماتے تھے جو خانقاہ کے خاص حاضرباش لوگوں میں سے ہیں۔

معلوم ہوئیں تو پچاس چیزیں نہیں معلوم ہیں، ایک دوسرا شخص آیا اور اس نے بٹن دبایا، سارا مکان روشن ہوگیا، اب آپ اپنی آنکھوں سے سب چیزیں دیکھ لیں گے، اس کی ضرورت نہ رہے گی کہ ہاتھ پکڑ پکڑ کے بتایا جائے۔ یہی حال سلوک کا ہے کہ آپ کو شیخ نے انگلی پکڑ پکڑ کر چلایا اور ہاتھ پکڑ پکڑ کر، دس پانچ چیزیں بتائیں، آپ پیر و مرشد کی تعریف کرتے ہیں کہ ہم نے انکی مہربانی سے اتنی چیزیں دیکھ لیں، کل کو انھوں نے اور چیزیں بتا دیں، آپ نے کہا اور سلوک طے ہوگیا۔ قرآن مجید اور انبیاء نے کیا کیا؟ بتی جلا دی۔ اب سب روشن ہوگیا — ہر شخص کی ذات میں روشنی کا پورا سامان ہے۔ ہر ایک کی بتی ہر ایک کے پاس ہے، خون اپنی شفقتیں اور عبادات اس کا تیل ہے۔ یہ خون وہ ہے جو جلنے سے بڑھتا ہے، آپ بجھانے والی ہوا سے حفاظت یعنی کفر و معاصی اور حب دنیا سے پرہیز ضروری ہے، سب کا متفق علیہ مسئلہ ہے کہ انسان خلاصہ موجودات ہے۔ جو کچھ دنیا میں باہر ہے وہ سب اس کے اندر ہے۔

فرمایا: میرے اندر محبت کا مادہ شروع سے ہے۔ اچھی آواز اور اچھے شعر سے مجھ پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ بعض مرتبہ ایک ایک شعر کئی کئی دن تک زبان پر جاری رہتا ہے۔ حکیم ابو تبیب صاحب فرمایا کرتے تھے کہ تم پر چشتیت کا رنگ غالب ہے، میں حیدرآباد میں ایک قہوہ خانہ کے پاس سے گزر رہا تھا کہ ایک لڑکا یہ شعر پڑھ رہا تھا ؎

میری لحد پر کوئی پردہ پوش آتا ہے
چراغ گور غریباں صبا بجھا دینا

پہلا مصرع تو میری سمجھ میں آیا، دوسرے مصرعہ کا مطلب پوری طرح سمجھ میں نہیں آیا، میرے بعض بے تکلف دوست سید عمر صاحب کے مزار پر پکڑ لے گئے، وہاں عرس تھا، قوال یہی شعر پڑھ رہا تھا، میرے ذہن میں بجلی کی طرح اس شعر کا مطلب آگیا، بزرگانِ دین اس جسم کو لحد کہتے ہیں۔ وہ جسم کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، جس طرح آپ قبر پر جا کر مٹی کی طرف متوجہ نہیں ہوتے روح کی طرف متوجہ ہو کر آپ فاتحہ پڑھتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ چراغ دنیا جب تک نہ بجھے وہ انوار نہیں پہونچ سکتے۔

فرمایا کہ شادیوں میں سب بلائے جاتے ہیں صرف خدا اور رسول کو رخصت کر دیا
(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جاتا ہے۔ صرف شادی کے اوقات میں وہ باہر رہتے ہیں، پھر ان سے راہ و رسم پیدا کر دی جاتی ہے، بہت سے حضرات ایسے ہیں کہ نماز بھی جاری ہے۔ خدا سے واسطہ بھی ہے۔ مگر گھر میں بے پردگی بڑھ رہی ہے اور ان کو کچھ پرواہ نہیں ہے، اب یہ بات اتنی بڑھ گئی گویا مسلمانوں میں پردہ کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ عورتیں بے محابہ منھ کھولے پھرتی ہیں، حدیث میں ایسی بے حیائی کے لیے کتنے سخت الفاظ آئے ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ کے حکم کو پس پشت ڈالنے والوں کے لیے کیسے سخت الفاظ ہیں۔ وَاَمَّا الَّذِیْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰهُمُ النَّارُ" ـــــــ (جن لوگوں نے نافرمانی کی راہ اختیار کی اُن کا ٹھکانا دوزخ ہے) بعض مرتبہ دواخانہ[2] جانا ہوا میں نے دیکھا کہ بعض ترقی پسند حضرات اپنی بیوی یا بیٹی کا ڈاکٹر سے تعارف کراتے ہیں اور وہ اُن سے ہاتھ ملاتی ہیں۔ قرآن مجید نے تمام مسلمانوں کو اُمت واحدہ قرار دیا ہے" وَاِنَّ هٰذِهٖ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً " کثرت میں وحدت ہے اور وحدت میں کثرت، اس لیے یہ سب ہمارے ہی اعمال اور ہماری کمزوریاں ہیں اور ہم کو ان پر شرمندہ ہونا چاہیے۔ شیخ سعدی نے غلط نہیں کہا۔

بنی آدم اعضائے یکدیگر اند چوں در آفرینش ز یک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار دگر عضوہا را نماند قرار

آپ نے ایک مرتبہ میری تحریک پر مسجد میں تقریر کی تھی، اس میں کہا تھا کہ بھوپال میں بے پردگی برابر بڑھتی نظر آتی ہے اور جس قوم میں بے پردگی عام ہوئی اور بے حیائی بڑھی، تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں تیزی کے ساتھ زوال آیا اور بالآخر وہ تباہ ہوگئی، قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے عمل اور بے عنوانیوں سے غضب الٰہی اتنا حرکت میں نہیں آتا جتنا مسلمانوں کی نافرمانیوں اور بے عنوانیوں سے، اس لیے کہ کفار کے متعلق تو

---

[1] یہ زمانہ (شوال کا مہینہ) بھوپال میں کثرت سے شادیوں کا ہوتا ہے، اس لیے کہ بہت سے جہلاء ذیقعدہ میں (جس کو خالی کا مہینہ کہتے ہیں) اس قسم کی تقریبات نہیں کرتے، اس زمانہ میں بھی شادیوں کا زور تھا اور مجلسوں میں برابر وہ لوگ آیا کرتے تھے جن کا ان تقریبات سے کسی نہ کسی طرح تعلق ہوتا تھا اسلیے بار بار یہ مضمون دہرایا جاتا تھا۔ [2] اہل حیدر آباد شفا خانہ کو دواخانہ کہتے ہیں حضرت کی زبان پر ابھی تک حیدر آباد کی زبان غالب ہے۔

کہہ دیا گیا ہے "فَذَرْهُمْ يَخُوضُوا وَيَلْعَبُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ" لیکن مسلمانوں کو ایسی مہلت نہیں ملتی۔ نافرمانیاں دور کرکے عبادت کرنی چاہیے۔ جنبی ہونے کی حالت میں نماز پڑھنا اور گناہوں کو بڑھاتا ہے۔

فرمایا کہ مشکل سے مشکل چیز بھی نفع کی توقع اور فائدہ کی اُمید میں آسان ہو جاتی ہے، یہ سب امور کسبی ہیں، مشکل بھی آسان ہے۔ اور آسان بھی مشکل، ایک شخص کہتا ہے کہ یہ پتھر جو پڑے ہیں، میرے گھر پہونچا دیجئے، پتھر بھاری اور فاصلہ بہت اور گرمی دھوپ کا وقت، آپ کہتے ہیں کہ یہ تو قیامت تک مجھ سے نہیں ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ اچھی بات ہے، اگر اس پتھر کو پہونچا دینے کا انعام یا مزدوری ایک لاکھ روپیہ، اب آپ کہنے لگیں گے کہ میں ہی پہونچاؤں گا، ہزار کہا جائے کہ نہیں کوئی دوسرا پہونچا دے گا آپ مانیں گے نہیں، اور کسی کے حق میں اس سے دستبردار نہیں ہوں گے، یہی پردہ اور بے پردگی کا معاملہ ہے کہ اگر اخروی اجر و ثواب اور اللہ و رسول کی خوشنودی کی مقدار و قیمت نہیں معلوم تو پردہ بہت مشکل اور بے پردگی بہت آسان اگر معلوم ہے تو بے پردگی بہت مشکل اور پردہ بہت آسان۔ آج جن لوگوں کو پردہ بہت مشکل معلوم ہو رہا ہے آج سے پچاس برس پہلے اُن کے بزرگوں کو بے پردگی پہاڑ معلوم ہوتی تھی اور اُس کے تصور سے ان کے رونگٹے کھڑے ہوتے تھے سلطان جہاں بیگم صاحبہ نے رزیڈنٹ سے دستانہ پہن کر مصافحہ کیا تھا اس پر اُن کے شوہر سلطان دولہا کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

اللہ کے پاس جانے کا خیال برسوں میں بیٹھتا ہے اور ذرا میں نکل جاتا ہے۔ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ کے ساتھ برسوں رہے اور بیسیوں معجزے دیکھے، پھر ایک بت پرست قوم کو دیکھ کر پکار اُٹھے "يَا مُوسَى اجْعَل لَّنَا إِلَٰهًا كَمَا لَهُمْ (۱۸)

لے ان کو چھوڑ دو۔ یہ لگے رہیں باطل میں، اور کھیل تماشوں میں، اور باطل آرزوئیں ان کو غافل رکھیں۔ وہ عن قریب جان لیں گے۔ (یعنی ان کا حساب آخرت میں پورا کیا جائے گا)

شریعت کے استحکام کی بنیادیں

شیخ محمد المدنی ——— ترجمہ: عارفہ اقبال

انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ پابندیوں کو ناپسند کرتا ہے اور مشقت سے بھاگتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ بالکل آزاد ہو، جو چاہے کرے، اس پر کوئی قید نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کائنات کا ایک ایسا وجود ہے جسے اپنی فہم و فکر، عقلی برتری اور شخصی آزادی کا پورا پورا احساس ہے۔ یہ سوال ہمیشہ اس کے ذہن میں رہتا ہے کہ کیا اس پر پابندی لگانے والوں نے عدل و انصاف سے کام لیا ہے یا وہ اس میں حد سے گزر گئے ہیں؟

کسی بھی پابندی کو قبول کرنے سے پہلے انسان کے ذہن میں تین سوال اٹھتے ہیں۔

——— میں یہ پابندی کیوں قبول کروں؟ جبکہ بنیادی طور پر انسان آزاد مطلق ہے۔

——— میرے اوپر پابندی عائد کرنے کا حق کسے ہے۔ کیا اسے یہ قانونی برتری حاصل ہے۔ اور کیا یہ قانونی برتری ایسی ہے کہ میرے اوپر یہ پابندی اور قانون لاگو کروا سکے؟

جب پابندی کی بنیادی ضرورت کا احساس ہو جائے اور پابندی لگانے والے کے اختیار کا اعتراف کر لیا جائے تو تیسرا سوال یہ اٹھتا ہے کہ

——— اس بااختیار قوت نے مجھے پابند کرنے میں انصاف سے کام لیا ہے یا بے جا طور پر حد سے بڑھ کر کام کیا ہے؟

جب انسان کو ان تینوں سوالوں کا معقول جواب مل جاتا ہے، خواہ وہ اس نے خود ڈھونڈے ہوں یا کسی اور سے سن کر مطمئن ہو گیا ہو تو وہ اس قوت کے آگے جھک جاتا ہے جس نے اُسے پابند کیا ہے۔ وہ اس کے احکام کی برضا و رغبت اطاعت کرنے لگتا ہے اور اعلانیہ یا پوشیدہ، کسی طور سے بھی اس پابندی سے چھٹکارا پانے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ وہ اس سے تعلق محسوس کرتا ہے اور اس میں راحت پاتا ہے۔ وہ اس کے لئے ایک مانوس چیز ہو جاتی ہے اور ضرورت پڑ جائے تو وہ اس کی مدافعت بھی کرتا ہے۔ اور اگر

کبھی کوئی اس پابندی کو ہٹانا چاہے تو وہ اسی پابندی کی حمایت کے لئے جوش میں آجاتا ہے جیسا اپنے اوپر عائد کرنے کا خیال ہی کبھی اسے مشتعل کر دیتا تھا۔ اور یہ اس لئے کہ اب اس کا دل مطمئن ہو چکا ہے اسے ان تین سوالوں کے تسلی بخش جواب مل چکے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ قوانین و احکامات اپنے قیام و بقاء کے لئے تین ستونوں کے محتاج ہیں جو یہ ہیں:۔

۱۔ لوگوں کو مکلف کرنے اور ان پر قوانین نافذ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ان میں اس قسم کی پابندی کی ضرورت کا احساس موجود ہو۔ دوسرے الفاظ میں معاشرہ میں اس پابندی اور قانون کے ضروری ہونے کا ایک عام احساس و شعور پیدا ہوئے بغیر اس کو نافذ کرنا مناسب نہیں ہے۔

۲۔ پابندی ایک ایسی بالاتر قانونی قوت کی طرف سے ہونی چاہیئے جو یہ حق رکھتی ہو کہ قانون بنائے اور لوگوں کو مکلف کرے۔

۳۔ لازم ہے کہ یہ پابندی بقدر ضرورت ہو اور اس میں کسی قسم کی زیادتی نہ ہو۔

جس قانون سازی کی عمارت ان تین ستونوں کے اوپر کھڑی ہو اس کی بنیادیں سالم اور مضبوط ہوتی ہیں اور جہاں یہ نہ ہوں وہاں اس کی عمارت ہمیشہ متزلزل رہتی ہے۔ اور موقع ملنے پر انسان خود اس کو گرا دینے کی کوشش کرتا ہے۔

قرآن کریم میں جو قوانین بیان کئے گئے ہیں، ان میں بنیادی طور پر ان تینوں باتوں کا خیال رکھا گیا ہے اب ہم ایک ایک کر کے ان کا جائزہ لیں گے۔

جس نظام قانون کو قبول کرنے کے لئے لوگوں کے دل آمادہ نہ ہوں اس کا آنا مناسب نہیں ہے۔ معاشرہ میں اس کو قبول کرنے کی ضرورت کا عام احساس موجود ہونا چاہیئے۔ سب جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تیرہ برس اور مدینہ میں دس برس دعوت اسلام کی جدوجہد میں مصروف رہے۔ مکی دور طویل تر ہے لیکن اس عرصہ میں کوئی تفصیلی قانون سازی نہیں ہوئی۔ قرآن کی آیات کا محور توحید کے مبادی رہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہونی چاہیئے۔ بتوں اور پتھروں کی پوجا انسان کے شایانِ شان نہیں، بلکہ یہ اس کی عقل اور اس کے وقار کے منافی ہے۔ ان فضائل اخلاقِ عالیہ پر بھی زور دیا گیا جن پر اسلام معاشرہ کی تعمیر چاہتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ مکی دور اسلامی قانون سازی کا دور نہیں تھا۔ یہ صرف بنیادی امور کی وضاحت کا دور تھا۔ اسلام کا منشا یہ تھا

کہ پہلے لوگوں کو بُت پرستی اور شرک کی نجاست سے پاک کر کے دلوں کو ایمان کے لئے تیار کر دے۔ اس کے بعد ایک ایسی قوم اور ایسی سلطنت وجود میں آئے جو مفصل قانون کی ضرورت خود محسوس کرتی ہو۔ اگر یہ قانون اسی دور میں نازل ہو جاتا تو عربوں کے لئے اس کا نفاذ آسان نہ تھا اس لئے کہ ابھی ان کو اس کی ضرورت کا احساس نہیں ہوا تھا بت پرستوں کا ایک ایسا گروہ جو جنگ و جدل، قتل و خونریزی اور ڈاکہ و لوٹ مار کا عادی ہو۔ اس سے چھوٹتے ہی یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ایک نظام قانون کا پابند کر دیا ہے؟ ہونا یہ چاہیئے کہ پہلے ان کو اللہ کے نام سے روشناس کرایا جائے اور پھر ان میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ جس طرح وہ اپنی پیدائش اور تخلیق میں اللہ کے محتاج ہیں۔ اسی طرح اپنی زندگی کے قانون اور نظامِ تہذیب کے لئے بھی وہ اسی کے محتاج ہیں۔ اس کے بعد قانون کا نزول ہونا چاہیئے۔

پھر جب نبی اکرمؐ اپنی جماعت کے ساتھ مکّہ سے مدینہ منتقل ہو گئے۔ تو بھی ہم یہ نہیں دیکھتے کہ قانون سازی کا کام بیک دم ہو گیا ہو۔ شاید یہ ہوا کہ مذہبی اور معاشرتی زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں تمام حکم ایک ساتھ آگئے ہوں اور ایک جامع و مانع کتاب لوگوں کے ہاتھ میں تھما کر کہہ دیا گیا ہو کہ یہ لو صحیفہ، اس میں وہ تمام قوانین موجود ہیں جن کے تم مکلف کئے گئے ہو ——— اگر اللہ چاہتا تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ایک ہی دفعہ میں تمام قوانین نازل ہو جاتے لیکن اللہ تعالےٰ نے یہ نہیں کیا بلکہ اس نے شریعت کے نفاذ میں تدریج سے کام لیا۔ اس سلسلہ میں شراب اور سود کے متعلق شریعت کے طرزِ عمل کو میں ذرا وضاحت سے بیان کروں گا۔

شراب کی حرمت

اللہ تعالیٰ نے شراب کو بیک جنبش قلم حرام قرار نہیں دے دیا بلکہ شراب کی حرمت کا حکم چار مراحل میں نازل ہوا۔ سب سے پہلے مکّی دور میں قرآن نے تو ہلکا اشارہ کیا۔ سورہ نحل کی اس آیت میں شراب کی حرمت یا خباثت کی کوئی تصریح نہیں ہے۔

ومن ثمرات النخیل والاعناب	"اور کھجور اور انگور کے پھلوں سے تم نشہ کی چیز
تتخذون منہ سکرا ورزقا حسنا	اور عمدہ کھانے کی چیز بناتے ہو"

یہاں دو چیزوں کا ذکر ہے "سکر" جو کھجور اور انگور سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کا کوئی وصف بیان کئے بغیر چھوڑ دیا گیا۔ دوسری چیز ہے "رزق حسن" یعنی وہ مشروبات ہیں جو نشہ لانے والے اور عقل پر چھا جانے والے نہیں۔ ان کے متعلق کہا گیا کہ یہ "رزق حسن" ہیں۔ "سکر" کو "رزق حسن" نہیں کہا گیا۔ پھر عطف

خود مغایرت کا متقاضی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شراب "رزق حسن" نہیں ہے۔ شراب کی حرمت کے لئے ذہنوں کو تیار کرنے کا یہ پہلا مرحلہ تھا۔ دوسرا مرحلہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد تھا:

"یسألونک عن الخمر والمیسر قل فیھما اثم کبیر ومنافع للناس واثمھما اکبر من نفعھما"	"آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہہ دیجئے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے فائدے ہیں اور ان کا گناہ ان کے فائدے سے بڑھ کر ہے"

"یسألونک عن الخمر والمیسر۔۔۔" سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشرہ میں ان دونوں چیزوں کے بارے میں سوالات پیدا ہو رہے تھے اور لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا حکم پوچھتے تھے۔ یہی اس آیت کی شان نزول کے سلسلہ میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے کہا کہ "اے اللہ ہمارے لئے شراب کے بارے میں اپنے حکم کی وضاحت کر دے" تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا قل فیھما اثم کبیر ومنافع للناس پہلے گناہ کبیرہ اور منافع کا ذکر ہوا پھر کہا اثمھما اکبر من نفعھما یعنی ان کا گناہ ان کے نفع سے بڑھ کر ہے۔ اب جس چیز کا گناہ اس کے فائدے سے بڑھ کر ہو وہ مستحسن نہیں ہو سکتی اور نہ ہی شریعت اسے مباح کر سکتی ہے لیکن اس کے باوجود اس کی حرمت کی صراحت نہیں کی گئی اور صرف اتنی بات کہنے پر اکتفا کیا گیا اثمھما اکبر من نفعھما اور دوسری تمہید کے بعد تیسرے مرحلہ پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"یاایھا الذین آمنوا لاتقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ حتی تعلموا ماتقولون"	اے ایمان لانے والو! نشہ کی حالت میں نماز کے قریب مت جاؤ۔ یہاں تک کہ تم جو کہو اسے سمجھنے لگو"

اس آیت نے شراب اور نشہ کی تحریم کر دی لیکن یہ جزئی حرمت تھی یعنی یہ کہ نماز کی حالت میں نشہ حرام ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے اوقات کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں کی گئی۔

اس تیسرے مرحلہ نے ذہنوں کو بالکل تیار کر دیا اور اب آخری مرحلہ آ پہنچا۔

یاایھا الذین آمنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون"	"اے مومنو! شراب، جوا، بت اور فال شیطان کے گندے کاموں میں سے ہیں۔ پس ان سے اجتناب کرو شاید کہ تم فلاح پالو"

یہ واضح اور قطعی تحریم تھی ——— آپ اسلام کا اسلوب دیکھئے کہ اس نے شراب کی حرمت کا حکم

کس طرح دلوں میں جاگزیں کیا۔ شراب ان کو محبوب تھی۔ ان کی فطرت کا جزو بن چکی تھی، اس حد تک کہ یہ روایت ہے کہ مشہور شاعر اعشیٰ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جانے کے لئے ناقہ پر سوار ہو کر چلا کسی نے پوچھا "کہاں کا ارادہ ہے؟"۔ تو کہا "میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جا رہا ہوں تاکہ مسلمان ہو جاؤں" لوگوں نے کہا کہ وہ یہ اور یہ حکم دیتے ہیں۔ اعشیٰ نے جواب دیا "میں ان کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا" پھر کہا گیا کہ "وہ ان ان چیزوں سے روکتے ہیں" جواب ملا "میں ان کے تمام نواہی تسلیم کروں گا"۔

آخر میں لوگوں نے کہا "اے ابو بصیر (اعشیٰ کی کنیت) وہ شراب پینے کو بھی منع کرتے ہیں" اور اعشیٰ یہ برداشت نہ کر سکا۔ اس نے کہا "میں شراب پینے سے باز نہیں آسکتا۔ اس لئے واپس جاتا ہوں۔ اب میں انتظار کروں گا کہ کب بوڑھا ہو جاؤں اور شراب سے دل پھر جائے تو پھر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آؤں"۔ لیکن اس کے بعد ہی وہ اونٹنی سے گر کر مر گیا۔

عام طور پر عربوں کی حالت بالعموم اسی شخص کی مانند تھی کہ جس کے دل میں شراب کی محبت اس حد تک گھر کئے ہوئے تھی۔ اس لئے اسلام نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا کہ ان کو ایک دم شراب کے مٹکے توڑنے کا حکم دیدے بلکہ اس کے لئے رفتہ رفتہ میدان ہموار کیا۔

سود کی حرمت سود کے معاملہ میں بھی قرآن نے یہی طرز عمل اختیار کیا۔ جاہلیت میں سود کا عام رواج تھا جو قدیم زمانے سے چلا آرہا تھا، کیا اسلام نے اچانک سود کو حرام قرار دے کر لوگوں کو یکدم اس سے کنارہ کش ہو جانے پر مجبور کیا؟ نہیں۔ بلکہ سود کی تحریم بھی شراب کی طرح چار مراحل میں ہوئی۔ اور دونوں کے معاملہ میں مکمل یکسانیت رہی۔ دونوں جگہ پہلا مرحلہ مکی دور میں آیا اور آخری تین مراحل مدینہ میں تکمیل پذیر ہوئے۔ سود کے بارے میں سب سے پہلے مکی سورہ الروم میں ارشاد ہوا۔

وما آتیتم من ربا لیربوا فی اموال الناس فلا یربوا عند اللہ وما آتیتم من زکاۃ تریدون وجہ اللہ فاولئک ھم المضعفون۔	"اور جو چیز تم اس غرض سے دو گے کہ وہ لوگوں کے مال میں پہنچ کر زیادہ ہو جائے تو یہ خدا کے نزدیک زیادہ نہیں ہوتی اور جو زکوٰۃ دو گے اللہ کی رضا طلب کرتے ہوئے تو ایسے لوگ خدا تعالیٰ کے پاس بڑھاتے رہیں گے۔"

یہ آیت بس ایک خبر دیتی ہے کہ اللہ سود میں برکت نہیں دیتا۔ یہاں سود کی تحریم سے تعرض نہیں کیا گیا۔

شراب کے معاملہ میں یہ اس آیت سے مشابہ ہے کہ تتخذون منہ سکرا ورزقا حسنا جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شراب پاکیزہ رزق نہیں ہے۔

سود کے سلسلہ میں دوسری آیت یہ نازل ہوئی:۔

فبظلم من الذین ھادوا حرمنا علیھم طیبات احلت لھم وبصدھم عن سبیل اللہ کثیرا، واخذھم الربا وقد نھوا عنہ، وأکلھم اموال الناس بالباطل" (سورۃ النساء)

"یہودیوں کے ظلم کی وجہ سے ہم نے ان پر ان طیبات کو حرام کر دیا جو ان کے لئے حلال تھیں، اور اللہ کی راہ سے بہت زیادہ روکنے کی وجہ سے، اور ان کے سود لینے کی وجہ سے، حالانکہ انھیں اس سے منع کیا گیا تھا اور لوگوں کا مال ناحق کھانے کی وجہ سے۔"

یہاں پر بنی اسرائیل کا صرف ایک رویہ بیان کیا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ بنی اسرائیل ممانعت کے باوجود سود لے کر اللہ کو ناراض کرتے تھے لیکن مسلمانوں کے لئے سود کی ممانعت بصراحت نہیں کی گئی۔ اگرچہ بنی اسرائیل اور سود کے اس طرح ذکر سے ذہنوں کو یہ سوچنے کے لئے تیار کیا گیا کہ کسی دن مسلمانوں کے لئے بھی سود حرام قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ دوسرا مرحلہ شراب کے سلسلہ میں اس آیت سے مشابہت رکھتا ہے کہ یسألونک عن الخمر والمیسر۔

تیسرے مرحلہ پر سود کے بارے میں یہ حکم آیا:

"یا ایھا الذین آمنوا لا تأکلوا الربا اضعافا مضاعفۃ"

"اے ایمان والو! دو گنا چوگنا سود مت کھاؤ۔"

کئی گنا سود لینے سے منع کیا گیا ہے۔ یہ جزئی تحریم تھی کہ سود کی بعض صورتوں کو حرام قرار دیا گیا اور بعض کی طرف سے سکوت برقرار رہا۔ یہ تحریم خمر کے اس مرحلہ سے مشابہ ہے جب کہ شراب کی جزئی تحریم کی گئی تھی۔ "لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ"

اس کے بعد تحریم ربا کے سلسلہ میں چوتھا اور آخری مرحلہ آیا۔

"یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وذروا

"اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو اور اگر تم مومن ہو تو

ما بقی من الربا ان کنتم مومنین۔ فان لم تفعلوا فأذنوا بحرب من اللہ ورسولہ، وان تبتم فلکم رؤوس اموالکم لا تظلمون ولا تظلمون۔

سود کا باقی رہ جانے والا حصہ چھوڑ دو۔۔۔۔ اگر تم یہ نہیں کرتے تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اور اگر تم توبہ کر لو تو تمھارے اصل مال تمھارے لئے ہیں۔ نہ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے۔"

اصحاب نزول کی روایت کے مطابق یہ آخری آیت ہے جو قرآن میں سود کے متعلق نازل ہوئی۔ اس آیت نے سود کی قطعی حرمت بیان کر دی۔ خواہ وہ کم ہو یا زیادہ اور یہ تحریم خمر کے سلسلہ کی آخری آیت یا ایھا الذین آمنوا انما الخمر والمیسر۔۔۔۔۔۔ سے مماثل ہے۔ دونوں کا بیان واضح اور محکم مفصل اور قطعی ہے، اسلوب ایسا ہے جس سے معاملہ کا قطعی فیصلہ ظاہر ہوتا ہے۔ ایسی تحریم جس میں کوئی شک نہیں، کوئی اشتباہ نہیں، سابقہ تین مراحل سے گزر کر ذہن اس فیصلہ کے لئے تیار ہو چکے تھے چنانچہ اس آخری مرحلہ میں ایک واضح، قوی اور موثر اسلوب کے ذریعہ اس کا نفاذ کر دیا گیا۔

اس تفصیل سے ہمارے اس قول کی صداقت آپ پر واضح ہو گئی ہوگی کہ قرآن کریم نے پوری شریعت کا نفاذ ایک ساتھ نہیں کیا بلکہ اس نے معاشرے کے رجحانات اور ذہنی کیفیات کا پورا پورا لحاظ رکھکر قوانین کا بتدریج نفاذ کیا۔

اس بات کے ثبوت میں ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ قرآن نے ہر شرعی حکم کے ساتھ اس کی علت اور اس کے محرکات کا بیان بھی کیا ہے وہ یہ نہیں چاہتا کہ لوگوں پر قانون مسلط کر دے اور حکم دیدے کہ بس یہ تمھارا قانون ہے، اب اسے مانے بغیر چارہ نہیں۔ یہی تمھاری زندگی کی بنیاد ہونا چاہیئے۔ اس کا اسلوب یہ ہے کہ وہ پہلے لوگوں کو مطمئن کرتا ہے تاکہ وہ برضا و رغبت اس قانون کو قبول کر لیں۔ اس لئے قرآن میں احکام کی وجوہات بیان کی گئی ہیں۔ مثلاً ارشاد ہے، یسألونك عن المحيض قل هو أذى فاعتزلوا النساء في المحيض ولا تقربوهن حتى يطهرن"

(آپ سے حیض کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہدیجیئے یہ گندگی ہے۔ لہٰذا تم عورتوں سے دور رہو اور ان کے قریب نہ جاؤ جب تک کہ وہ پاک نہ ہو جائیں۔)

یہ تحریم کی وجہ کا بیان ہے کہ یہ گندگی ہے جس سے طبیعت کو انقباض محسوس ہوتا ہے اور جسم کو ضرر پہنچتا ہے۔

اسی طرح مسلمانوں کو یہ حکم دیتے ہوئے کہ وہ ازواج مطہرات سے صرف پردے کے پیچھے سے بات کرسکتے ہیں ـــــ ارشاد ہوتا ہے:

"ذالکم اطھر لقلوبکم وقلوبھن" (یہ طریقہ تمھارے اور ان کے دلوں کیلئے پاکیزہ ہے)

صرف یہ حکم نہیں دے دیا گیا کہ یہ میرا حکم ہے اور تمھیں اس کی تعمیل کرنا ہے جس چیز سے میں روک رہا ہوں اس سے باز رہو کیونکہ میں خدا ہوں اور میرا یہ حق ہے کہ اپنے اقتدار و جبروت سے کام لے کر تمھارے لئے قانون بناؤں ـــــ بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ بندوں کو مطمئن کرتا ہے کہ میں نے یہ قانون کیوں بنایا ہے اور یہ حکم کیوں دیا ہے۔ علت کی یہ وضاحت قرآن کے تمام یا اکثر احکام کے ساتھ موجود ہے۔ ابن قیمؒ لکھتے ہیں: "اگر وہ احکام جن کی علت بیان کی گئی ہے دس، بیس یا سو، دو سو ہوتے تو ہم ان کو جمع کر دیتے لیکن تشریعات، اخبار اور عقائد سے متعلق ایسی آیات کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے اور ہم اس کتاب میں ان سب کا بیان نہیں کر سکتے۔"

آپ جانتے ہیں کہ ابن قیم بڑی تحقیقی اور تفصیلی بحث کرنے والے صاحب قلم ہیں لیکن یہاں احکام معللہ کی کثرت تعداد نے ان کو عاجز کر دیا۔ اس سلسلہ میں آپ یہ آیت دیکھئے:

"ولا تنکحوا المشرکات حتی یؤمن ولأمة مؤمنة خیر من مشرکة ولو اعجبتکم ولا تنکحوا المشرکین حتی یؤمنوا، ولعبد مؤمن خیر من مشرک ولو اعجبکم اولئک یدعون الی النار واللہ یدعوا الی الجنة والمغفرة باذنه ویبین آیاته للناس لعلھم یتذکرون"

"مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو یہاں تک کہ وہ مسلمان ہو جائیں۔ ایک مومن لونڈی مشرکہ سے بہتر ہے خواہ وہ تمھیں پسند ہو اور مشرکوں سے نکاح نہ کرو یہاں تک کہ وہ مسلمان ہو جائیں ایک مومن غلام مشرک سے بہتر ہے خواہ وہ تمھیں پسند ہو۔ یہ لوگ آگ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ جنت اور مغفرت کی طرف دعوت دیتا ہے اور لوگوں کے لئے اپنی آیات واضح کرتا ہے تاکہ وہ یاد رکھیں۔"

شریعت کا یہ حکم ہے کہ کسی مسلمان مرد کے لئے مشرکہ سے اور مسلمان عورت کے لئے مشرک سے نکاح کرنا جائز نہیں۔ یہ حکم ایسے معاملہ سے متعلق ہے جس کا عرب میں عام چلن اور رواج تھا۔ ایک عرب کی زندگی قبائلی نظام میں بسر ہوتی تھی۔ ایک قبیلہ کے لوگ ایک ہی خاندان کے افراد کی طرح ہوتے تھے۔ کوئی قرشی ہوتا، کوئی تیمی اور کوئی تیمی۔ اس کا طرز فکر یہ ہوتا کہ اپنے قبیلہ کی عورت سے شادی کرنے میں بھلا مجھے کیا تکلف

ہو سکتی ہے؟ کیا اس کا مشرکہ ہونا؟ لیکن کیا وہ میرے قبیلہ کی نہیں ہے؟ میرے چچا یا خالہ کی بیٹی نہیں ہے؟
چنانچہ یہ حکم اس پر شاق گزرنا چاہئے تھا اور ان کو مطمئن کرنا ضروری تھا۔ اس لئے کہا گیا

"ولامة مومنة خير من مشركة ولو اعجبتكم"

اصل بات یہ ہے کہ بذات خود ایمان وہ چیز ہے جس کے آگے کوئی دنیوی چیز اہمیت نہیں رکھتی۔ مسلمان کے لئے اس کا ایمان اس کی سب سے قیمتی متاع ہے۔ اور اس کی مشرکہ بیوی اسے شرک اور بت پرستی کے ذریعہ دوزخ کی طرف لے جا سکتی ہے۔ مزید برآں، وہ اس کی اولاد کے لئے بھی فتنہ کا باعث ہو گی۔
والله يدعو الى الجنة والمغفرة باذنه ________ اگر اس کے دل میں ایمان ہے، اللہ کی محبت ہے، اس کی رضا کی جستجو ہے تو اسے یقین ہونا چاہئے کہ اس حرمت میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہے۔ یہ اٹکل پچو حکم نہیں ہے، پابندی برائے پابندی نہیں ہے بلکہ اس میں اس کے لئے کوئی مصلحت ہے۔

جدید قانون سازی میں توضیحی نوٹس دینے کا طریقہ رائج ہے۔ ہر قانون کے ساتھ ایک توضیحی نوٹ ہوتا ہے جو اس کو نافذ کرنے کی غرض، اس سے حاصل ہونے والے فوائد اور نتائج و اثرات پر روشنی ڈالتا ہے۔ یہ چیز اب شروع کی گئی ہے سینکڑوں سال پہلے سے شریعت اسلامیہ اس طریقۂ عمل کا آغاز کر چکی تھی۔ میں اس سے زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ آپ غور کرنے پر خود ہر حکم میں کسی نہ کسی طرز کی علت پا سکتے ہیں۔

کسی قانون کے بارے میں جب انسان کو یہ یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ اسے قبول کرنے ہی میں اس کی مصلحت اور بہتری ہے تو پھر وہ یہ سوچتا ہے کہ یہ قانون دینے والا کون ہے اور کیا اسے مجھے پابند کرنے کا حق حاصل ہے؟ کوئی بھی انسان فطرتاً ہر کسی کا پابند ہونا گوارا نہیں کر سکتا بلکہ پہلے وہ یہ یقین کرنا چاہتا ہے کہ یہ قوت مجھ سے بالاتر ہے اور اسے میرے لئے قانون بنانے کا اختیار حاصل ہے۔ اس کے بعد ہی وہ اس کی عائد کردہ پابندیوں کو دل کی پوری رضامندی کے ساتھ قبول کرتا ہے۔
قرآن نے اس کا خاص خیال رکھا ہے کئی جگہ اس لئے یہ وضاحت کی ہے کہ اقتدار اور قوت اللہ ہی کے لئے ہے۔

"ان الحكم الا لله"	"حکم صرف اللہ ہی کے لئے ہے"
"ولا يشرك فى حكمه احدا"	"حکم میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں"۔
"قل تعالوا اتل ما حرم ربكم عليكم"	"کہئے لوگو آؤ میں تم کو پڑھ کر سناؤں جو تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے"

قرآن تشریع کا حق خدا تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی کو نہیں دیتا۔ رسولوں کا حکم اور علم بھی اسی کا عطا کردہ ہے۔

"واتیناہ حکمًا وّعلمًا (ہم نے اسے حکم اور علم دیا)

قانون بنانے کا حق خدا کے سوا کسی کو نہیں۔ یہ نظریہ بالکل غلط ہے کہ کوئی قوم یعنی اس کے عوام خود حکمرانی اور قانون سازی کا سرچشمہ ہیں۔ قرآن تو اللہ ہی کو منبع و مصدر ٹھیراتا ہے۔

" یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیٔ فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تؤمنون باللہ والیوم الآخر ذالک خیر و احسن تأویلا"

"اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو۔ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اور اپنے اولو الامر کی۔ اگر کسی چیز میں تمہارا جھگڑا ہو تو اسے اللہ اور رسولؐ کی طرف لوٹاؤ۔ اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو یہ زیادہ بہتر اور اچھا طریقہ ہے۔"

اقتدار اعلیٰ کی تعبیر "اطیعوا اللہ" سے کی گئی ہے۔ دوسرے درجہ پر "اطیعوا الرسول" ہے پھر "اولی الامر" ہیں اور وہ ارباب حل وعقد اور اہل نظر و صاحب اجتہاد اشخاص ہیں۔ جو اپنے علم و فضل، عقل و دانش اور قوت استنباط کی بنا پر امت میں ممتاز مقام کے مالک ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول واولی الامر منکم

اطیعوا کا لفظ صرف اللہ اور رسول کے ساتھ ہے یہ نہیں کہا گیا کہ واطیعوا اولی الامر منکم، اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اولی الامر کی اطاعت اللہ اور رسول کی مقرر کردہ حدود کے اندر ہی ہوگی۔ وہ بذات خود مستقل طاعت نہیں ہیں اس لطیف اسلوب سے یہ اصول معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کا مصدر کتاب اللہ اور پھر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے تیسرا سرچشمہ "اجتہاد" ہے اور اس کے قابل قبول ہونے کی شرط ہی یہ ہے کہ یہ اسلام کے بنیادی اصولوں کے مطابق اور کتاب و سنت کے دائرے کے اندر ہو، اور کسی نص صریح سے متصادم نہ ہو۔ ہر انسان کو یہ حق ہے کہ وہ ان شرائط کے ساتھ اگر وہ اس تفکر کی اہلیت رکھتا ہو تو اس شریعت میں غور و فکر کرے۔ اس حق کو اللہ نے صرف ابو حنیفہؒ یا شافعیؒ یا جعفر صادقؒ تک محدود نہیں رکھا بلکہ شریعت اسلامی اور اصول دین کے دائرے میں رہ کر ہر مسلمان اجتہاد کر سکتا ہے اور اس اجتہاد میں وہ صحیح نتیجہ پر بھی پہنچ سکتا ہے اور غلطی بھی کر سکتا ہے۔ اگر وہ حق کو پالیتا ہے تو اس کے لئے دو اجر ہیں، اور اگر

غلطی کرتا ہے تو بھی ایک اجر اس کے لئے ہے۔ دنیا میں آزادیٔ فکر کی اس سے زیادہ بلند، عظیم اور مقدس مثال اور کہاں مل سکتی ہے، جہاں غلطی کرنے والے کو نہ صرف یہ کہ سزا نہ ملے بلکہ وہ اجر کا بھی مستحق ہو۔

ایک اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ شریعت کے تمام احکام کتاب و سنت میں نہیں آگئے۔ ان میں سے بعض مصالح اور حالات و ماحول کے اختلاف کی رعایت کرتے ہوئے غور و فکر کے لئے چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ اجتہاد ان کی صورت گری کرتا ہے اور قیامت تک کے لئے اس کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ لیکن شریعت کا ایک پہلو بہر حال ایسا ہے جس میں اجتہاد کا کوئی دخل نہیں اور اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ مثلاً اسلام کے بنیادی اصول ہیں۔ اللہ ایک ہے، محمدؐ اس کے رسول ہیں، کعبہ تمام مسلمانوں کا قبلہ ہے، قرآن اللہ کا کلام ہے اور وہ "ما بین الدفتین" ہے۔ اللہ نے رسول بھیجے ہیں، عیسیٰؑ ایک رسول ہیں اسی طرح الیاسؑ اور اسحاقؑ بھی۔ حشر و نشر اور جنت و دوزخ حقیقت ہیں۔ یہ سب بنیادی اور یقینی باتیں ہیں۔ قرآن میں ان بنیادی امور کے لئے جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ مقررہ معانی رکھتے ہیں۔ ان میں اجتہاد کی گنجائش نہیں، حالات کے تغیر سے ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اللہ بھی ایک ہے اور کائنات کی تخلیق سے پہلے بھی ایک تھا۔ ایسا بھی نہیں کہ پہلی صدی میں ایک ہو، دوسری صدی میں دو ہو گئے ہوں اور تیسری صدی میں تین (اور اب بیس ہوں!) وہ ازل سے ابد تک ایک ہے اور ایک ہی رہے گا۔ چنانچہ یہ حقیقت محلِ اجتہاد اور مقامِ غور و فکر نہیں۔ البتہ شریعت کے دوسرے کئی پہلو ایسے ہیں جن میں اختلاف کی گنجائش ہے۔ کئی ایسی عبارات ہیں جن سے مالکؒ کے ذہن میں کوئی ایک مفہوم آتا ہے اور شافعیؒ ان سے دوسرا مطلب سمجھتے ہیں۔ عہدِ قدیم کا مجتہد ان سے ایک معنی مراد لیتا تھا اور آج کا مجتہد کوئی دوسرے معنی مراد لیتا ہے اور یہ رحمت ہے۔ مشہور روایت ہے کہ فقہی اختلاف جو اصول سے ہٹ کر فروع میں ہو۔ خدا کی رحمت ہے۔ اس سے لازم آتا ہے کہ یہاں دو نوعیت کی چیزیں ہیں۔ ایک وہ بنیادی اصول جن پر امت متحد ہوتی ہے۔ ہر قوم کو متفق رکھنے والی اور جوڑنے والی کوئی بنیاد ہوتی ہے۔ خواہ وہ زبان ہو، اس کے اخلاق ہوں، اس کی اغراض ہوں یا وہ چیز ہو جس پر وہ ایمان رکھتی ہے۔ ان چیزوں میں اختلاف کا حق کسی کو نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ ہی کچھ مختلف فیہ چیزیں بھی ہوتی ہیں اور یہ ضروری ہیں۔ اگر اختلاف کا وجود نہ ہو تو ہم اس کی جستجو کریں گے۔ اس کا دوسرا نام حریتِ فکر ہے۔ انسان کی عقل کے لئے جولانگاہ مہیا کرنا ضروری ہے۔ ایسے

یہ احساس ہونا چاہیئے کہ وہ ایسی زنجیروں سے جکڑا ہوا نہیں ہے جنھوں نے اس کی زندگی و موت اور اسکی فکر و احساس کو باندھ رکھا ہو۔ فروع میں اگر کوئی اختلاف نہ ہو تو ہم پیدا کریں گے۔ موجودہ دور کے ایک لیڈر کا کہنا ہے کہ اگر اختلاف و معارضہ کا وجود نہ ہو تو میں پیدا کر دوں گا۔

یہاں ایک اور بات کا ذکر بھی ضروری ہے، اور وہ یہ کہ شریعت اسلامیہ نے جب اجتہاد کا دروازہ کھولا اور کچھ مسائل میں اجتہاد کو جائز اور کچھ میں ناجائز ٹھیرایا تو اس کے ساتھ ہی مسائل کی دو نوعیتیں بھی بتا دیں یعنی، عبادات اور معاملات —— عبادات کا تو مقررہ طریقہ ہے۔ اللہ کی عبادت اسی طرز پر کی جا سکتی ہے جو اس نے بتا دیا ہے میرے لئے یہ جائز نہیں کہ قرب حاصل کرنے یا عبادت کے لئے خود کوئی نیا طریقہ ایجاد کر کے اس پر عمل شروع کر دوں۔ اللہ نے مجھے ظہر کی چار رکعات پڑھنے کا حکم دیا ہے اور میں زیادتی کر کے آٹھ رکعات پڑھنے لگوں۔ اللہ نے مجھے ایک رکعت میں ایک رکوع کرنے کا حکم دیا ہے اور میں یہ کہوں کہ میں زیادہ ثواب حاصل کرنے کے لئے دو یا تین رکوع کروں گا۔ عبادات میں اس قسم کے اختراع کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔ ہر عبادت کے بارے میں یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ وہ اللہ ہی نے مقرر کی ہے اور اس کے بارے میں نص وارد ہوا ہے تقرب کی کوشش کرنے سے پہلے یہ یقین کرنا ضروری ہے کہ کیا اس کا طریقہ اللہ نے بتایا ہے۔ تمام بدعات کا دور کرنا اور تمام خرافات کا دروازہ بند کرنا مسلمان کا فرض ہے۔ واضح نص اور محکم شریعت کی بنیاد پر ہی اللہ کی عبادت کرنا چاہیئے۔ جب اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں ایک مقررہ مہینہ (رمضان) میں روزے رکھ کر اس کی عبادت کروں تو میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں تو جولائی، مارچ یا شعبان کے مہینہ میں روزے رکھوں گا۔ بلکہ میں اللہ ہی کے بتائے ہوئے طریقہ پر عبادت کروں گا اور خود سے اپنے لئے کوئی طریقہ مقرر نہیں کروں گا۔ معاملات کی کیفیت یہ نہیں ہے۔ یہ ایک نہایت اہم بحث ہے اور ہمارے دور کے لئے بے حد مفید اور کارآمد۔ شریعت اسلام یا کسی بھی شریعت کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ معاملات کی ایک ایک نوع کا تعین کر دے اور بتا دے کہ اس کا حکم یہ ہوگا اور اس کا حکم یہ ہوگا اور پھر یہ کہے کہ اے مسلمانو! تم ان امور میں ان طریقوں کے سوا اور کسی کے مطابق عمل نہ کرو جن کا میں نے بیان کیا ہے۔ شریعت کا کام تو یہ ہے کہ وہ لوگوں کے معاملات پر نظر ڈالے اور پھر یہ بتا دے کہ یہ طریقے اور شکلیں جن پر لوگ عمل پیرا ہیں، میرے مزاج سے مطابقت رکھتے ہیں۔

ان میں کینہ توزی، دھوکہ بازی اور فریب دہی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ جو معاملہ بھی اس طرح میرے مزاج اور اصول پر پورا اترے گا میں اس کو قبول کرکے مرحبا کہتا ہوں اور اگر میرے کسی اصول کے منافی ہے۔ اور میرے بنیادی مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا تو میں اسے مٹادوں گا یا اس کو صحیح شکل میں پیش کروں گا۔ شارع کی شان سے یہ بعید ہے کہ وہ ہمارے لئے معاملات کی دس نوعیتیں مقرر کرکے کہدے کہ تم بس انہی کے مطابق معاملہ کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ جاکر لوگوں کو مقررہ طریقوں پر کاروبار اور تجارت میں شرکت کرتے پایا۔ معاملات مختلف نوعیت کے تھے۔ آپ نے یہ کیا کہ ان معاملات پر نظر ڈالی اور ان کو بنیادی اصولوں پر قیاس کیا۔ پھر جسے صحیح پایا اسے قبول کیا اور لوگوں کو اس کی اجازت دے دی۔ اور جس کو ناقابل اصلاح پایا اسے منسوخ کردیا۔ اور جس میں تھوڑی سی گنجائش نکل سکتی تھی اس میں مصالح کے مطابق رخصت عطا کی اور دفع حرج کے لیے بعض قیود و شرائط کو نرم کردیا۔ اس اصول کو دیکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مختلف نوعیت کے معاملات پر غور کرکے ان کے رد یا قبول کا فیصلہ کریں۔ معاملات کی اصل حلت اور اباحت ہے۔ اگر وہ شریعت کی روح سے مغائرت نہ رکھتے ہوں تو مباح ہیں۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اللہ نے اس چیز کو حرام قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ اللہ نے ہمیں کسی شے کو خود حرام کرنے اور اپنے اوپر جھوٹ باندھنے کی اجازت نہیں دی ہے لیکن ہم غور و خوض کرسکتے ہیں اگر میں کسی چیز کو اسلام کے بنیادی اصول و قواعد اور نصوص صریحہ کے خلاف پاؤں تو رد کرسکتا ہوں۔ بصورت دیگر اسے قبول کروں گا۔

اس مزاج اور اصول کو اپنا کر ہم اپنے تمام اقتصادی معاملات کو طے کرسکتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ شرعی اصولوں پر جانچے بغیر چھوٹی بڑی چیز پر حرام کا ٹھپہ لگا دیں۔

اب میں قانون سازی کے تیسرے اہم نکتہ کی طرف آتا ہوں۔ اور وہ قانون کا بقدر استطاعت ہونا ہے۔ میں نے پابندی قبول کرلی، اسے عائد کرنے والے کے حق اور قانونی اقتدار کو تسلیم کرلیا، اس کے بعد ایک چیز باقی رہ جاتی ہے۔ اس قانون کے احکام میری طاقت سے باہر تو نہیں ہیں؟ کیا میں ان پر عمل کرنے پر قادر ہوں؟ اگر آپ ایسا قانون لاگو کرتے ہیں جو میری برداشت

سے باہر ہے تو اگرچہ پابندی کی روح کو قبول کر چکا ہوں اور آپ کو صاحب امر و نہی اور اپنے معاملہ میں صاحب اختیار تسلیم کر چکا ہوں لیکن میں ضرور یہ سوچنے پر مجبور ہوں گا کہ کیا آپ نے میری طاقت و قدرت کو پیش نظر رکھ کر مجھے حکم دیا ہے؟ قرآن ہمیں کوئی ایسا قانون نہیں دیتا جو انسان کی طاقت سے باہر ہو۔

"لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا" "اللہ کسی نفس کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا"

لا یکلف اللہ نفسا الا ما آتاھا "اللہ نفس کو اپنی عطا کردہ طاقت کے بقدر ہی مکلف کرتا ہے"

یہ اسلامی شریعت کا ایک بنیادی اصول ہے جو اس کے تمام فروع میں جاری و ساری ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کی روشنی میں مختلف احکامات کا مطالعہ کریں۔ یہ اصول اسلام کی "وسطیت" یعنی اس کا اعتدال ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔

"وکذالک جعلنا کم امۃ وسطا "اور اس طرح ہم نے تمھیں "امت وسط" بنایا لتکونوا شھداء علی الناس" تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو"

اعتدال کا مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر قانون افراط و تفریط دونوں کے پہلوؤں سے بیچوں بیچ ہے اس کا جھکاؤ نہ دائیں طرف ہے نہ بائیں طرف۔ آپ تعدد ازواج کے بارے میں سوال کریں تو میں کہوں گا کہ اسلام نے تعدد ازواج کی قطعی ممانعت کر کے بعض اجتماعی حالات سے چشم پوشی نہیں کی۔ اکثر ایسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں جو تعدد ازواج کے متقاضی ہوں۔ اسلام نے ان کی رعایت کی ہے۔

اسلام نے عیسائیوں کی طرح یہ نہیں کہا کہ اجتماعی حالات خواہ کیسے ہی ہوں شادی بہر حال ایک ہی عورت سے کی جا سکتی ہے اور نہ ہی یہ کیا کہ لاتعداد بیویاں رکھنا قرار دے دیا ہو، جیسا کہ عرب اور کئی دوسری قوموں میں عام رواج تھا۔ کہا جاتا ہے کہ رمسیس نے سو شادیاں کیں اور عرب عام طور پر دس سے زیادہ بیویاں رکھتے تھے۔ حدیث میں ملتا ہے کہ جب کوئی شخص اسلام قبول کرتا اور اس کے پاس چار سے زیادہ عورتیں ہوتیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیتے تھے کہ "چار کو اپنے پاس رکھو اور باقی چھوڑ دو" پھر قرآن نے اسی پہ بس نہیں کی بلکہ تعدد کی صورت میں شرط لگائی اور مطالبہ کیا کہ بیویوں کے درمیان عدل ضروری ہے۔ ارشاد ہوا۔

"فان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ او ما ملکت ایمانکم" "پھر اگر تمھیں ڈر ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی (بیوی رکھو) یا پھر تمھاری لونڈیاں ہیں"

اسلام نے خواہ مخواہ ہی یہ حکم نہیں دیا۔ بلکہ معاشرے کی حالت کا جائزہ لے کر اور مفصل حالات پر غور و فکر کے بعد بیماری کی ایسی دوا تجویز کی جو ہر دور کے لئے کارگر ہے۔

جنگوں میں جب بے شمار نوجوان ہلاک ہو گئے اور عورتوں کی واضح اکثریت ہو گئی۔ تو جرمنی میں یہ خواہش عام ہو گئی کہ تعدد ازدواج کا قانون بنایا جائے۔ کیوں؟ جرمن عورت کہتی تھی۔ میرے حصہ میں نصف آدمی ہونا اس سے بہتر ہے کہ میں مردوں سے محروم اور دنیا کی لذات سے بے بہرہ رہوں۔

اعتدال کے بیان کے سلسلہ میں طول میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ہر کوئی خود ہی تمام فروعات میں اس کی کارفرمائی دیکھ سکتا ہے۔ فقہ کا کوئی فروعی حکم یا قرآن اور حدیث میں آیا ہوا کوئی فرمان اٹھا کر دیکھئے اور ذرا غور کیجئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہی درمیانی سیدھا راستہ ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وانك لتهدی الی صراط مستقیم، صراط الله الذی له ما فی السموت وما فی الارض	"اور بیشک آپ صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ اس اللہ کی راہ کی طرف جو زمین و آسمان کی ہر چیز کا مالک ہے"
"ان ربی علی صراط مستقیم"	"بے شک میرا رب صراط مستقیم پر ہے"

ہمارا رب خود اپنے بارے میں بتاتا ہے کہ وہ صراط مستقیم پر ہے۔ دائیں بائیں کسی طرف کوئی جھکاؤ نہیں ہے۔ اس کی صنعت مستحکم ہے۔ تمام احکام اور مبادی صراط مستقیم پر گامزن ہیں۔

"اهدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیهم غیر المغضوب علیهم ولا الضالین	"ہمیں سیدھا راستہ دکھا ان لوگوں کا راستہ جن پر تونے انعام کیا۔ ان کا نہیں جو تیرے مغضوب ہیں اور نہ گمراہوں کا"

——— یہ ہے صراط مستقیم یا درمیانی راستہ یا اسلام کی وسطیت۔

یہ بقدر طاقت تکلیف اور تشریعات میں لوگوں سے دفع حرج اسلامی قانون سازی کا تیسرا اہم ستون ہے۔ اسلام کا اصول ہے "ضرورت ممنوعات کو مباح کر دیتی ہے" اور "مشقت سے آسانی کی راہ کھل جاتی ہے" اسلام وضو کا حکم دیتا ہے۔ پھر وضو کے ساتھ تیمم کا ضابطہ بھی دیتا ہے۔ اس لئے کہ اسے اندازہ ہے کہ ایسے حالات بھی ہو سکتے ہیں کہ کسی شخص کے لئے وضو کرنا ممکن نہ ہو۔ ہو سکتا ہے پانی ختم ہو جائے یا پانی موجود ہو لیکن وہ اسے استعمال نہ کر سکتا ہو تو اس صورت میں اس کے لئے تیمم کی اجازت ہے۔ مالکیہ کہتے ہیں کہ فرض کیجئے کہ ایک شخص صحیح سالم ہے لیکن وہ جانتا ہے کہ پانی کے استعمال سے اسے نقصان پہنچے گا تو اس کے لئے جائز ہے کہ وضو چھوڑ کر تیمم کرے۔ یا ایک شخص کو پانی کے بہت زیادہ ٹھنڈے ہونے کا

احساس ہوتا ہے۔ صبح کا وقت ہے اور وہ یہ پانی استعمال کرنے کی طاقت نہیں رکھتا نہ اسے گرم کر سکتا ہے تو اس کے لئے تیمم ہے۔ یہ سب اللہ کی عطا کردہ وسعتیں ہیں۔ معاملہ اسی حد پر نہیں رکتا بلکہ بعض اوقات واجبات ضروری واجبات ہوتے ہیں جن کو ادا نہ کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ مثلاً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اسلام کے خواص میں سے ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ

"والمومنون والمؤمنات بعضھم اولیاء بعض یأمرون بالمعروف وینھون عن المنکر"

"مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔"

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایسی قومی رائے عامہ کی موجودگی میں ہے جو باطل کو باطل اور خیر کو خیر کہہ سکے۔ کمزور، خائف اور ڈری سہمی رائے عامہ کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا۔ اسی لئے مومن معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال میں سے ہے "یأمرھم بالمعروف وینھاھم عن المنکر" اس کے ساتھ ہی بعض حالات میں ہم دیکھتے ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں رخصت عطا کی گئی ہے۔ ابن قیم اپنی کتاب "اعلام الموقعین عن رب العالمین" میں لکھتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر مکہ میں بہت منکرات پر ہوتا تھا لیکن آپ ان کو بدلنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ ان پر نکیر کرتے یہاں تک کہ آپ نے مکہ فتح کر لیا۔ اس وقت آپ کا ارادہ ہوا کہ خانہ کعبہ کو قواعد ابراہیم پر تعمیر کریں۔ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ آپ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا: "اگر تمہاری قوم کا کفر سے باز آنا تازہ بات نہ ہوتی تو میں کعبہ کی تعمیر نئے سرے سے قواعد ابراہیم پر کرتا۔" یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ رسول اللہ حکمت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے معاملہ پر غور کرتے تھے اور جس برائی کو روکنے سے کسی بڑی برائی کا خدشہ ہوتا تھا تو نہی عن المنکر سے باز رہتے تھے۔ ابن تیمیہ فرماتے ہیں: ایک دن میرا گذر بغداد پر قابض تاتار کے ایک گروہ کے قریب سے ہوا میں نے اُن کی محفل میں شراب کے دور چلتے دیکھے۔ اسی وقت ایک عالم نے ارادہ کیا کہ کھڑے ہو کر شراب پینے سے روکے میں نے اس سے کہا ان کو نہ روکو، اللہ نے شراب اور جوئے کو اس لئے حرام کیا ہے کہ وہ ذکر اللہ اور نماز سے روکتے ہیں۔ ان لوگوں کو شراب نے خون بہانے اور قتل وغارت گری سے روک رکھا ہے۔ تم ان کو چھوڑ دو۔ نشہ اترنے کی صورت میں یہ جن حرکتوں کا ارتکاب کریں گے۔

یہ ان سے کمتر درجہ کی برائی ہے۔" امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایسا فرض ہے جس کی ادائگی کے لئے خاص صلاحیت کی ضرورت ہے۔ جن میں یہ صلاحیت نہ ہو ان اشخاص کو تمام لوگوں کے درمیان اپنے ذمہ یہ کام لینے کا حق نہیں ہے۔ یہ کام حکمت، بصیرت اور تفقہ کا محتاج ہے؛

کسی وقت اللہ کے حکم سے اس کا واجب کردہ حکم مباح ہو جاتا ہے اور آپ اس کے مکلف نہیں رہتے۔ مثالیں اس کی یہ ہیں: کہ اللہ کی نافرمانی کرنے کی نذر مان لی جائے تو اُسے پورا نہیں کیا جائے گا۔ یا کچھ نہ کھانے کی نذر مان لی جائے تو اس نذر کو پورا کرنا جائز نہیں۔ یا نذر مانی کہ مکہ تک پیدل جاؤں گا اور پیدل جانے کی استطاعت نہیں تو یہ نذر پوری کرنا واجب نہیں۔ (جو کوئی قسم کھائے اور اس کے بعد اس سے بہتر چیز دیکھے تو قسم توڑ دے اور بہتر چیز پر عمل کرے)

آپ غور کیجئے تو واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم کی تشریع حکمت، رحمت استطاعت اور ذہنی کیفیات کا لحاظ رکھنے کی مظہر ہے۔

ہر قوم میں اللہ کی طرف بلانے والے بھی ہوتے ہیں اور خواہشات کی پیروی اور فسق و فجور کی طرف پکارنے والے بھی ایک دعوتِ فساد ہے اور ایک دعوتِ اصلاح۔ ہر دور میں ہر معاشرے میں ان دونوں دعوتوں کا وجود ہوتا ہے اور قرآن اعلان کرتا ہے کہ وہ گمراہیوں کی دعوت کی پیروی نہیں کرتا۔

"ولو اتبع الحق اهواءهم لفسدت السمٰوٰتِ والارض" — اگر حق ان کی خواہشات کا اتباع کرتا تو زمین و آسمان میں فساد برپا ہو جاتا۔

"واعلموا ان فیکم رسول اللہ لو یطیعکم فی کثیر من الامر لعنتم" — اور جان لو کہ تمھارے درمیان اللہ کا رسول ہے اگر وہ اکثر معاملوں میں تمھاری اطاعت کرتا تو تم مشقت میں پڑ جاتے۔

پھر اس رحمت، اس حکمت اور ان معتدل تشریعات کے ذریعہ (جو خود رحمت کا ثبوت ہیں) ایمان اور اسلام کی عظمت ہمارے سامنے واضح کی جاتی ہے۔

"ولکن اللہ حبب الیکم الایمان وزینہ فی قلوبکم وکرہ الیکم الکفر والفسوق والعصیان، اولئک ھم الراشدون فضلا من اللہ ونعمۃ واللہ علیم حکیم" — لیکن اللہ نے ایمان کو تمھارے لئے محبوب بنایا اور اسے تمھارے دلوں میں جاگزیں کیا اور کفر و فسق اور نافرمانی کو تمھارے لئے ناپسندیدہ بنایا یہی لوگ اللہ کی مہربانی اور نعمت سے صحیح راہ پر ہیں اور اللہ علیم و حکیم ہے

(بشکریہ چراغ راہ کراچی)

درس قرآن

۲۳ جولائی ۱۹۶۶ء

شرک ناقابل مغفرت گناہ

(حمد و صلوٰۃ، اور "اعوذ باللہ" اور "بسم اللہ" کے بعد)

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ...... وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيلًا ○

(سورۃ النساء آیت ۱۱۶ تا ۱۲۲)

(ترجمہ) بے شک اللہ تعالیٰ اس جرم کو کبھی نہ بخشے گا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے۔ اور اس کے نیچے کے گناہ بخش دے گا جس کے لیے چاہے گا۔ اور جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا وہ بہت دُور کی گمراہی میں جا پڑا۔ (۱۱۶) یہ مشرک اپنی حاجتوں کے لیے پکارتے ہیں بس زنانیوں کو (یعنی دیویوں کو) اور (فی الحقیقت) پکارتے ہیں صرف سرکش شیطان کو (۱۱۷) —— اس پر خدا کی پھٹکار ہے —— اور اس (سرکش ملعون) نے (خدا سے) کہا تھا کہ میں تیرے بندوں میں سے ایک مقررہ حصّہ لے کر رہونگا، اور ان کو (تیری راہ سے) گمراہ کر کے چھوڑوں گا، اور میں ضرور انھیں (غلط اور جھوٹی) آرزوؤں میں مبتلا کرتا رہوں گا اور انھیں سکھلاؤں گا تو وہ چوپایوں کے کان چیرا اور کاٹا کریں گے اور ان کو سمجھاؤں گا تو وہ خدا کی بنائی ہوئی ساخت میں تبدیلی کریں گے —— اور جس نے خدا کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا آقا

بنایا تو وہ یقیناً کھلی ہوئی نامرادی میں جا پڑا۔ شیطان ان کو وعدوں کے بہلاوے دیتا ہے اور آرزوؤں کے سبز باغ دکھاتا ہے[۱۲۰] اور شیطان کے وعدے فریب اور دھوکے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ان سب کا ٹھکانا دوزخ ہے اور یہ آتشِ دوزخ سے فرار کی کوئی جگہ نہ پا سکیں گے[۱۲۱] —— اور (اس کے برعکس) جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے ان کو ہم بہشتی باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہیں وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے۔ وعدہ ہے اللہ کا بالکل حق۔ اور اللہ سے زیادہ بات کا سچا کون ہو سکتا ہے۔[۱۲۲]

تفسیر و تشریح

یہ سورۂ نساء کا اٹھارواں رکوع ہے اس میں بڑی صراحت اور وضاحت کے ساتھ شرک کی شناعت، خباثت اور نامعقولیت بیان کی گئی ہے اور دانشگاف طور پر اعلان فرمایا گیا ہے کہ شرک ناقابلِ مغفرت گناہ ہے اور اس کا مجرم ہرگز نہیں بخشا جائیگا۔ آگے بیان فرمایا گیا ہے کہ شرک کرنے والے خواہ کچھ سمجھتے ہوں لیکن در اصل وہ شیطان کے پرستار ہیں اور اس کی انگلیوں پر ناچ رہے ہیں۔ اور شیطان چونکہ بنی آدم کا ازلی دشمن ہے اس لئے وہ ان کو شرک کے راستہ پر ڈال کر بس جہنم میں پہنچا دینا چاہتا ہے۔

آیتوں کی تشریح سے پہلے میں دو باتوں کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں ایک یہ کہ شرک کی حقیقت کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ کی نگاہ میں وہ کیوں اتنا خبیث، شنیع اور مبغوض ہے کہ سارے گناہوں کی تو بخشش ہو سکتی ہے لیکن اس کی بخشش نہیں ہو سکتی —— جو لوگ شرک میں مبتلا ہیں اور اس کو اپنا دین دھرم بنائے ہوئے ہیں وہ تو اُس کو مقدس چیز جانتے ہیں۔ اور اُسی میں اپنی بھلائی اور نجات سمجھتے ہیں، لیکن ان کے علاوہ بہت سے لوگ جو خود شرک میں مبتلا نہیں ہیں۔ ان کی بھی نگاہ میں شرک کی اتنی شناعت نہیں ہے جتنی چوری، ڈاکہ زنی خونِ ناحق، اور زنا جیسی اُن بدفعلیوں کی ہے جن کا تعلق انسانوں سے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں انسانی فطرت سے تو واقفیت ہے لیکن اللہ کی معرفت حاصل نہیں۔ بس زنا اور چوری

جیسے گناہوں کو ایک عامی بلکہ کافر و مشرک بھی اس لئے قابل نفرت سمجھتا ہے کہ ان گناہوں میں انسان کی سخت حق تلفی اور توہین ہے۔ جس کی برائی کو ہر انسان آسانی سے محسوس کر لیتا ہے، لیکن شرک دراصل اللہ تعالیٰ کے ساتھ برائی اور بہت بڑی برائی ہے مگر اس کو وہی محسوس کر سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو اور پھر وہ اس کو بھی سمجھ سکتا ہے کہ شرک کیوں ناقابل مغفرت گناہ ہے ـــــــ ایک بُردبار اور شریف شوہر عورت کی ہر غلطی اور نافرمانی کو نظر انداز کر سکتا ہے لیکن اگر اسے معلوم ہو جائے کہ جس نگاہ سے وہ مجھ کو دیکھتی ہے وہ کسی دوسرے اپنے آشنا کو بھی دیکھتی ہے تو یہ بات اس کے لئے قابل برداشت نہ ہوگی ــــــ اللہ تعالیٰ کی کوئی مثال نہیں، لیکن شرک باللہ کی شناعت اور خباثت کو کسی حد تک بیوی اور شوہر کی اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔

اب شرک کی حقیقت کے بارے میں سنئے! شرک کا انکار اور اللہ تعالیٰ کو وحدہٗ لاشریک ماننا اسلام کی پہلی اور بنیادی شرط ہے۔ کلمہ "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کا یہی مطلب ہے، اس لئے ضروری ہے کہ شرک کے بارہ میں ہر مسلمان کا ذہن بالکل صاف ہو، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ بہت سے مسلمان شرک و توحید کے معاملہ میں بھی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں۔

ایسے مشرک تو غالباً ہماری اس دنیا میں کہیں بھی موجود نہیں ہیں جو کہتے ہوں کہ اللہ کے برابر کا یا اس کے درجہ کا خالق و پروردگار کوئی اور بھی ہے، عرب کے مشرک بھی یہ نہیں کہتے تھے، خود قرآن مجید میں جابجا اُن کے بارے میں یہ موجود ہے کہ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ صرف اللہ ہی سب کا خالق ہے اور وہی کائنات کے اس کارخانے کو چلا رہا ہے۔ اور کوئی دوسری ہستی اس کے برابر نہیں ہے۔ اُن کا شرک بس یہ تھا کہ وہ کچھ روحانی ہستیوں، دیویوں اور دیوتاؤں کو خدا کا ایسا مقرب اور لاڈلا سمجھتے تھے جن کو اس تقرب ہی کی وجہ سے اختیارات حاصل تھے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ یہ ہمیں نفع اور نقصان پہنچا سکتے ہیں، ہمارے کام بنا اور بگاڑ سکتے ہیں، ہماری فلاں فلاں قسم کی حاجتیں پوری کر سکتے ہیں اس لئے وہ ان سے دعائیں کرتے تھے، اپنی حاجتیں مانگتے تھے۔ اُن کی رضامندی اور عنایت حاصل کرنے کے لئے اُن کی پوجا پاٹ کرتے تھے، نذر و نیاز اور چڑھاوے چڑھاتے تھے۔

اس کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک تو وہ اللہ تعالیٰ کی بعض صفات اور اُس کے

افعال میں اپنے ان دیوتاؤں اور معبودوں کو شریک مانتے تھے اور اس کے علاوہ ان کی عبادت، اور ان سے دعا و استعانت کرتے تھے۔ حالانکہ یہ صرف اللہ ہی کا حق ہے ———

عرب کے مشرکوں کے علاوہ بھی دنیا میں یہی شرک زیادہ تر رائج رہا ہے اور قرآن مجید نے خاص طور سے اسی شرک کو اپنا نشانہ بنایا ہے ——— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ آخری نبی تھے اور آپ کے بعد قیامت تک کوئی نبی آنے والا نہیں تھا اس لئے آپ نے توحید و شرک کے مسئلہ کو اتنا صاف کیا اور ایسا نکھارا ہے جس کے بعد کسی کے لئے گمراہ ہونے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی، جن چیزوں سے شرک کا شبہ ہو سکتا تھا۔ آپ نے ان کو بھی ممنوع قرار دے دیا اور جن دروازوں سے شرک چوری چھپے بھی آسکتا تھا ان کو بھی آپ نے بند کر دیا ———

مثلاً نماز اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے لیکن طلوع آفتاب کے وقت، غروب آفتاب کے وقت اور جس وقت آفتاب نصف النہار پر ہو، نماز سے منع فرما دیا گیا۔ صرف اس لیے کہ کسی دیکھنے والے کو بھی آفتاب پرستی کا شبہ نہ ہو۔ آپ کا معمول تھا کہ جب مہینے کا نیا چاند دیکھتے تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے۔ "اَللّٰهُمَّ أَهِلَّهُ عَلَيْنَا بِالْأَمْنِ وَالْإِيْمَانِ وَالسَّلَامَةِ وَالْإِسْلَامِ" جس کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ یہ چاند امن اور ایمان کا اور سلامتی اور اسلام کا چاند ہو ——— اس کے بعد چاند کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے فرماتے کہ "رَبِّيْ وَرَبُّكَ اللّٰهُ" (میرا اور تیرا رب اللہ ہے) اس دعا میں آپ کبھی اس طرح ہاتھ نہ پھیلاتے جس طرح ہاتھ پھیلا کے دعا کی جاتی ہے، بلکہ چاند کی طرف کلمہ والی انگلی سے صرف اشارہ کرتے، یہ اس لئے کہ کسی ناواقف اور کم عقل آدمی کو یہ شبہ نہ ہو جائے کہ آپ چاند سے کچھ مانگ رہے ہیں۔ جس طرح چاند، سورج وغیرہ کے پجاری مانگتے ہیں۔ آپ کے اس طرز عمل سے سمجھا جا سکتا ہے کہ آپ اس معاملہ میں کتنے محتاط تھے۔

شرک سے متعلق سب سے بڑا خطرہ آپ کی اُمت کے لئے یہ ہو سکتا تھا کہ جس طرح عیسائیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو ان کے خاص معجزات کی وجہ سے خدا کا بیٹا اور خدائی میں شریک بنا لیا۔ اسی طرح آپ کے اُن سے بھی بڑے کمالات اور معجزات کی بنیاد پر آپ کو بھی ایک خدا اور خدائی میں شریک بنا لیا جاتا، اس کے سد باب کے لئے آپ نے صراحت کے ساتھ اپنی

اُمت کو وصیت اور تاکید فرمائی۔

لَا تُطْرُوْنِیْ کَمَا أَطْرَتِ النَّصَارٰی عِیْسَی بْنَ مَرْیَمَ فَإِنَّمَا أَنَا عَبْدُ اللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ فَقُوْلُوْا عَبْدُ اللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ۔

تم میرے بارے میں اس طرح کے غلو سے کام ولینا اور میرا درجہ اس طرح حد سے نہ بڑھانا جس طرح نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم کے معاملہ میں کیا، خوب سمجھ لو میں بس اللہ کا بندہ اور اُس کا پیغمبر ہوں لہٰذا مجھے بس اللہ کا بندہ اور پیغمبر ہی کہو۔

بعض پیغمبروں کے اُمتیوں نے ایسا بھی کیا تھا کہ ان کی وفات کے بعد ان کی قبروں پر سجدے کرنے لگے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارہ میں بھی اُمت کو سخت آگاہی دی اور فرمایا ——— کہ تم سے پہلی بعض اُمتوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا تھا خبردار تم ہرگز ایسا نہ کرنا، ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ایسا کرنے والوں پر خدا کی لعنت ہے ——— اور اپنے آخری مرض میں اللہ تعالیٰ سے خاص طور پر یہ دعا فرمائی۔

اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِیْ وَثَنًا یُّعْبَدُ۔

اے اللہ میری قبر کو بُت نہ بنانا جس کی پوجا کی جائے۔

اسی طرح پکی اور شاندار قبریں بنانے اور ان پر عمارتیں بنانے اور چراغاں کرنے سے بھی آپ نے اسی لئے ممانعت فرمائی کہ یہی چیزیں جاہلوں اور شرک پسند طبیعتوں کے لیے قبر پرستی کا وسیلہ بن جاتی ہیں ——— الغرض آپ نے شرک کا دروازہ بند کرنے کے لئے ان باتوں سے بھی ممانعت فرما دی جو بذاتِ خود شرک نہیں ہیں لیکن اُن سے شرک کا شبہ ہو سکتا ہے یا جو کسی درجہ میں شرک کا وسیلہ اور ذریعہ بن سکتی ہیں ——— اس معاملہ میں آپ لفظی بے احتیاطی کو بھی برداشت نہیں فرماتے تھے ——— ایک مرتبہ کسی موقع پر ایک صحابی کی زبان سے نکل گیا "مَاشَاءَ اللّٰہُ وَشِئْتَ" (یعنی جو اللہ چاہے گا اور آپ چاہیں گے وہی ہو گا) آپ نے برہم ہو کر فرمایا۔

جَعَلْتَنِیْ لِلّٰہِ نِدًّا بَلْ مَاشَاءَ اللّٰہُ وَحْدَہٗ

تو نے مجھے اللہ کا ہمسر بنا دیا (اس طرح مت کہو) یوں کہو "جو تنہا اللہ چاہے گا وہ ہو گا"

الغرض شرک کے معاملہ میں آپ نے کسی کے لئے گمراہی اور غلط فہمی کی ذرہ برابر گنجائش

بھی نہیں چھوڑی ـــــــ آپ کی ان ہدایات اور آپ کے اسی طرزِ عمل کا نتیجہ یہ تھا کہ صحابہ کرام کا ذہن توحید و شرک کے مسئلے میں اتنا صاف تھا جس کی نظیر دوسری اُمتوں میں نہیں مل سکتی حضورؐ کے وصال پر صدیق اکبرؓ نے مسجد نبوی میں صحابہ کرام کے سامنے جو پہلا خطبہ دیا وہ توحید کا شاہکار ہے، اور اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت نے صحابہؓ کو توحید کے کیسے گہرے رنگ میں رنگا تھا ــــــ فضا یہ تھی کہ حضورؐ کی وفات کے صدمہ سے صحابہ حواس باختہ تھے، فاروق اعظمؓ جیسے دل گردے والے جلیل القدر صحابی کا یہ حال تھا کہ وہ وصال کی بات سننا نہیں چاہتے تھے اور ان کا اصرار تھا کہ ہرگز حضورؐ کا وصال نہیں ہوا ہے، ابھی تو آپ اس دُنیا میں بہت سے کام انجام دیں گے ــــــ اس فضا میں صدیق اکبرؓ کھڑے ہوئے اور آپ نے حمد و صلوٰۃ کے بعد فرمایا:۔

مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَإِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَمَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللّٰهَ فَإِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ ۔ الخ	تم میں سے جو محمدؐ کی پرستش کرتا ہو اور اسی کو اپنا دین و ایمان سمجھتا ہو اسے معلوم ہو جانا چاہیے کہ آپ وفات پا گئے اور جو اللہ کا پرستار ہو وہ مطمئن رہے کہ اللہ زندہ اور باقی ہے اس کے لئے کبھی فنا نہیں۔

اس کے بعد صدیق اکبرؓ نے قرآن مجید کی وہ آیات تلاوت فرمائیں جن میں حضورؐ کی وفات کی پہلے ہی اطلاع دے دی گئی تھی ــــــ اس نازک وقت اور ایسی جذباتی فضا میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا یہ موحدانہ خطبہ ان کی صدیقیت اور تمام صحابہ میں ان کی امتیازی عظمت کی دلیل ہے۔ اسی نقطہ نظر سے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اس مشہور واقعہ پر غور کیجیے کہ ایک دفعہ حج کے موقع پر جب حرم تک حجاج سے بھرا ہوا تھا آپ نے قاعدہ کے مطابق حجر اسود کا استلام کیا یعنی اس کو ادب کے ساتھ چوما۔ لیکن سب کو سنانے کے لئے اس کی طرف اشارہ کر کے بلند آواز سے فرمایا:۔

وَايْمُ اللّٰهِ أَنَّكَ حَجَرٌ لَا تَنْفَعُ وَلَا تَضُرُّ وَلَوْلَا أَنِّي رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُقَبِّلُكَ مَا قَبَّلْتُكَ	خدا کی قسم تو ایک پتھر ہے نہ کسی کو نفع پہونچا سکتا ہو نہ ضرر، اگر میں نے رسول اللہؐ کو تجھے چومتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو ہرگز تجھے نہ چومتا۔

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم توحید ہی کا اثر تھا کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حجر اسود جیسی مبارک اور مقدس چیز کے بارہ میں اتنی صفائی اور بے باکی سے حجاج کے بھرے مجمع میں اعلان فرمایا کہ تو اپنی اصلیت کے لحاظ سے صرف ایک پتھر ہے نہ کسی کی بگڑی بنا سکتا ہے اور نہ بنی کو بگاڑ سکتا ہے، چونکہ رسول اللہ تجھے چومتے تھے اور حج کے ایک عمل کے طور پر تجھے چومنے کا حکم ہے صرف اس لیے ہم تجھے چومتے ہیں۔

اللہ کی پناہ! جس پیغمبر کی تعلیم نے یہ نمونے تیار کیے تھے اس کی اُمت پر شیطان کی کوششوں سے وہ شرک گھس آیا جس کو دنیا سے مٹانا آپ کی بعثت کا اولین مقصد تھا۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ مشرکین عرب جس شرک میں مبتلا تھے وہ یہ تھا کہ وہ کچھ روحانی ہستیوں کو جن کے انھوں نے بُت بنا رکھے تھے خدا کا مقرب اور لاڈلا سمجھتے ہوئے ان کے لئے کچھ تصرفات کا اختیار مانتے تھے اور اسی بنا پر اُن سے اپنی حاجتیں اور مرادیں مانگتے تھے نذریں اور چڑھاوے چڑھاتے تھے اور ان کی پوجا کرتے تھے ــــــ آج مسلمانوں کے بعض حلقوں کا حال قریب قریب یہی ہو چکا ہے، وہاں جو کچھ بتوں کے سامنے کیا جاتا تھا وہ یہاں بزرگانِ دین کے مزارات پر کیا جاتا ہے۔ اگر تعالیٰ صدیق اکبرؓ یا فاروق اعظمؓ کو یا کسی بھی صحابی کو یا ان کے کسی فیض یافتہ تابعی کو دوبارہ زندگی دے کر اس دُنیا میں بھیج دے اور وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ یا خواجہ علاء الدین صابر کلیریؒ یا ایسے ہی کسی اور بزرگ کے مزار پر "مسلمانوں" کے مشرکانہ اعمال کو دیکھیں تو وہ کبھی باور نہ کر سکیں گے کہ یہ لوگ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی اور ان کا لایا ہوا کلمہ پڑھنے والے اور قرآن پاک کو خدا کی کتاب ماننے والے ہیں ــــــ یوں تو اُمت میں اعمال و اخلاق کی لائن کی بڑی سے بڑی معصیتیں اور گندگیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ لیکن یہ شرک والی گمراہی اس امت کا سب سے بڑا جرم ہے ــــــ اس کے بارے میں قرآن پاک کی انہی آیتوں میں صاف صاف اعلان فرما دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں یہ گناہ ناقابل معافی ہے، اس جرم کے مجرموں کو اللہ تعالیٰ ہرگز نہیں بخشے گا۔ فرمایا گیا ہے:

"إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا (۱۱۶)

یہ اس رکوع کی سب سے پہلی آیت ہے اس میں شرک اور مشرکوں کا انجام بیان فرمایا گیا ہے، کہ وہ رب غفار کی مغفرت سے قطعاً محروم رہیں گے اس کے بعد شرک کی شناعت اور اس کے خلاف عقل ہونے پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ ان مشرکوں کا اصل معبود اور مرشد فی الحقیقت شیطان ملعون ہے وہی انکو اپنی انگلیوں پر نچا رہا ہے اس نے تخلیق آدم کے وقت ہی اپنے اس منصوبہ کا اظہار کر دیا تھا کہ میں اولاد آدم سے طرح طرح کے شرک کراؤں گا اور ان کو اپنے ساتھ لے لوں گا۔ ارشاد ہے :-

إِن يَدْعُونَ مِن دُونِهِ إِلَّا إِنَاثًا وَإِن يَدْعُونَ إِلَّا شَيْطَانًا مَّرِيدًا ﴿۱۱۷﴾ لَّعَنَهُ اللَّهُ وَقَالَ لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ﴿۱۱۸﴾ وَلَأُضِلَّنَّهُمْ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ آذَانَ الْأَنْعَامِ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللَّهِ وَمَن يَتَّخِذِ الشَّيْطَانَ وَلِيًّا مِّن دُونِ اللَّهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِينًا ﴿۱۱۹﴾ يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا ﴿۱۲۰﴾ أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَلَا يَجِدُونَ عَنْهَا مَحِيصًا ﴿۱۲۱﴾

عرب کے مشرک عام طور سے دیویوں کی پوجا کرتے تھے، اسی لئے ان کے زیادہ تر بتوں کے نام عورتوں کے سے تھے، مثلاً لات، منات، نائلہ، عزیٰ وغیرہ وہ ان کو خدا کی لاڈلیاں سمجھتے تھے۔ یہ انکی انتہائی حماقت اور سفاہت تھی کہ خدا کے ساتھ شریک کرنے کے لئے انھوں نے ان مؤنثوں کو منتخب کیا تھا۔ انہی سے مرادیں مانگتے تھے اور انہی کی پوجا کرتے تھے۔ اسی بناء پر فرمایا گیا ہے:" إِن يَدْعُونَ مِن دُونِهِ إِلَّا إِنَاثًا "

یعنی یہ مشرک اپنی حاجتوں کے لئے زنانی دیویوں کو پکارتے ہیں اور انہی کی پوجا کرتے ہیں آگے فرمایا گیا ہے کہ اگرچہ مشرک اپنے خیال میں ان دیویوں کی پرستش کرتے ہیں اور اپنی حاجتوں میں اُن کو پکارتے ہیں اور ان کی دہائی دیتے ہیں لیکن فی الحقیقت ان کا معبود شیطان ہے جس کی سرشت میں سرکشی اور تمرد ہے، ان دیویوں سے اگر کوئی کرشمہ اور اعجوبہ ظاہر ہوتا ہے تو وہ دراصل شیطان کا تصرف ہوتا ہے، اس بناء پر دیویوں کے ساتھ یہ جو کچھ کرتے ہیں دراصل وہ شیطان کراتا ہے اس لئے فی الحقیقت ان کا سارا شرک شیطان ہی کے حساب

میں ہے "اِنْ یَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اِنٰثًا ۚ وَاِنْ یَّدْعُوْنَ اِلَّا شَیْطٰنًا مَّرِیْدًا" آگے فرمایا کہ یہ وہی شیطان ہے جس پر خدا کی لعنت ہے "لَعَنَهُ اللّٰهُ" اس میں اشارہ ہے کہ ان مشرکوں کی بدبختی کی یہ انتہا ہے کہ انھوں نے شیطان کو اپنا معبود اور مرشد بنا لیا ہے جس پر خدا کی لعنت اور پھٹکار ہے ——— آگے فرمایا کہ یہ شیطان جس وقت خدا کے مقابلے میں تمرد اور سرکشی کی وجہ سے مردودِ بارگاہ اور ملعون ہوا تھا اسی وقت اس نے اپنا یہ شیطانی منصوبہ ظاہر کر دیا تھا اور اللہ تعالیٰ سے برملا کہا تھا کہ میں تیرے بندوں میں سے ایک حصہ کو ضرور ہتھیا لوں گا۔ یعنی تیری بندگی سے ہٹا کر اپنے راستہ پر لگا لوں گا "وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِیْبًا مَّفْرُوْضًا" اور میں ان کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا اور ان کو طرح طرح کی غلط آرزوؤں میں پھنساؤں گا اور ان کو تعلیم دوں گا جس کے نتیجہ میں وہ مشرکانہ توہم پرستی کے تحت جانوروں کو بتوں کے ناموں پر چھوڑا کریں گے اور نشانی کے طور پر ان کے کان چیرا اور کاٹا کریں گے۔ اور اللہ کی بنائی ہوئی ساخت میں تبدیلی کیا کریں گے (وَلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّیَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَیُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ) مطلب یہ ہے کہ یہ مشرکین آج جن تمام خیالیوں میں مبتلا ہیں اور جن غلط آرزوؤں میں پھنسے ہوئے ہیں اور جانوروں کے کان کاٹ کے بتوں کے نام پر چھوڑنے کی جیسی جو مشرکانہ حرکتیں کر رہے ہیں یہ سب ان سے شیطان کرا رہا ہے، وہی سارے مشرکانہ اوہام و خیالات اور شرکیہ اعمال کا سرچشمہ ہے، اس نے تخلیق آدم کے وقت ہی کہا تھا کہ میں تو لعنتی ہو ہی گیا ہوں اس آدم کی اولاد کے بھی کم از کم ایک حصہ کو میں لعنتی بنا کے چھوڑوں گا، ان سے اس اس طرح کے مشرکانہ لعنتی کام کراؤں گا، بس اب جو لوگ اس طرح کے مشرکانہ اوہام و خیالات یا اعمال و افعال میں مبتلا ہیں وہ دراصل شیطان کے جال میں پھنس چکے ہیں اور اگرچہ بظاہر وہ بتوں کے پجاری ہیں لیکن فی الحقیقت ان کا معبود اور آقا شیطان ہے اور یہ اسی کے چیلے ہیں ——— آگے ارشاد فرمایا گیا ہے :۔

"وَمَنْ یَّتَّخِذِ الشَّیْطٰنَ وَلِیًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِیْنًا" یعنی جو کوئی اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا آقا بنائے وہ بڑی نامرادی میں جا پڑے گا اور رہ جائے

کچھ حاصل کرنے کے اپنا سب کچھ کھو دے گا۔ آگے ارشاد فرمایا گیا ہے: "يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا" یعنی شیطان اپنے ان متبعین کو جھوٹی آرزوؤں کے سبز باغ دکھاتا ہے اور وعدوں سے بہلاوے دیتا ہے اور یہ انھی پر یقین کرکے یہ سارے مشرکانہ کام کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ شیطان کے سارے بہلاوے اور اس کے دکھائے ہوئے سبز باغ صرف فریب ہیں اس کے سوا کچھ نہیں۔ آگے واضح الفاظ میں ان کا انجام بتایا گیا ہے: "أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَلَا يَجِدُونَ عَنْهَا مَحِيصًا" یعنی شیطان کی راہ پر چلنے والے ان سب بدبختوں کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور یہ آتشِ دوزخ سے فرار کی کوئی جگہ نہ پاسکیں گے ——— پھر آگے ان خوش نصیب بندوں کا انجام بیان فرمایا گیا ہے جو شیطان کی بتائی ہوئی شرک و کفر کی راہ سے ہٹ کر اللہ اور اس کے رسولوں کی بتائی ہوئی ایمان و عمل صالح کی شاہ راہِ ہدایت پر چلیں۔ ——— ارشاد ہے "وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا" اور جو بندے ایمان لائیں اور نیک اعمال کریں یعنی اللہ و رسول کی باتوں کو حق مانیں اور عملی زندگی میں ان کی ہدایت کی پیروی کریں ——— (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ) ہم ان کو ان بہشتی باغوں میں پہنچائیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ہمیشہ ابدالآباد تک ان باغوں میں رہیں گے
آگے ارشاد ہے کہ یہ اللہ کا وعدہ ہے بالکل حق اور اٹل، جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اور اللہ سے زیادہ بات کا سچا کون ہو سکتا ہے۔

اوپر کی آیتوں میں شرک پر اور مشرکین کے طرزِ عمل پر جو تبصرہ کیا گیا ہے اُس کا حاصل یہ ہوا کہ اوّل تو یہ بات نہایت احمقانہ اور مضحکہ خیز ہے کہ اُنھوں نے خدا کا شریک بنانے کے لئے کچھ زنانیوں کو منتخب کیا ہے۔
اُس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ ان زنانیوں یعنی دیویوں کا تو صرف نام ہے دراصل

یہ شیطان کے پرستار ہیں، اسی ملعون نے ان کو اس راہ پر لگایا ہے۔

تخلیق آدم کے وقت جب وہ اپنی سرکشی اور شیطنت کی وجہ سے مردود بارگاہ ٹھہرایا گیا تھا تو اُسی وقت اُس نے کہا تھا کہ میں لعنتی ہوا ہی ہوں اس آدم کی اولاد کو بھی میں لعنتی بنانے کی کوشش میں کوئی کسر اُٹھانہ رکھوں گا۔ میں ان سے معبودانِ باطل کے ناموں پر چوپایوں کی نذریں چڑھواؤں گا، یہ ان چوپایوں کو نشانی کے طور پر کان کاٹ کر بتوں کے ناموں پر چھوڑا کریں گے۔ اور میں ان کو "خَلْقَ اللّٰهِ" کی تبدیلی کے راستہ پر لگاؤں گا وہ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت کو بدل ڈالیں گے۔ مفسرین نے "تغیر خلق اللہ" کی بہت سی قسموں اور شکلوں کا ذکر کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس لفظ میں بہت وسعت ہے اور اُس کی سب سے زیادہ سنگین اور اللہ کے نزدیک مبغوض ترین قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی جو فطرت بنائی ہے جس کی بنیاد پر آدمی کو موحد اور مومن و مسلم اور خدا کا فرمانبردار ہی ہونا چاہیئے اُس کو بدل ڈالا جائے ——

دوسری جگہ قرآن پاک ہی میں فرمایا گیا ہے۔ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ

اس آیت میں توحید اور دین حق کو "فطرۃ اللہ" فرمایا گیا ہے۔ اور اسی کے بارہ میں ارشاد فرمایا گیا "لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ" تو خلق اللہ کی تبدیل و تغییر کی سب سے زیادہ سنگین قسم یہ ہے کہ خدا کی بنائی ہوئی انسانی فطرت اور ساخت کے لحاظ سے انسان کی زندگی کا جو خدا پرستانہ رُخ اور رویہ ہونا چاہیئے اس کو بدل ڈالا جائے اور اس کے بجائے شرک و کفر کی راہ اختیار کی جائے شیطان نے جو یہ کہا تھا کہ "وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ" تو اس کا اولین مطلب یہی تھا کہ میں اولاد آدم کو ایسی گمراہانہ تعلیم دوں گا جس کے نتیجہ میں وہ اپنی فطری راہ صراط مستقیم کو چھوڑ کر دوسری غلط شرک و کفر کی راہوں پر چلیں گے۔

الغرض مشرکین کے بارے میں پہلی بات تو ان آیتوں میں یہ کہی گئی کہ ان احمقوں اور عقل کے دشمنوں نے خدا کا شریک بنانے کے لئے یہی زنانیوں کو منتخب کیا ہے —— اس کے بعد بتایا گیا کہ اس شرک کا اصل موسس اور بانی دراصل شیطان لعین ہے، اس نے شروع ہی میں اپنے اس منصوبہ کا اعلان کر دیا تھا۔ اب جو لوگ شرک کے راستہ پر چل رہے ہیں انہوں نے دراصل شیطان کو اپنا پیشوا

اور مرشد بنا لیا ہے ــــ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ جو کوئی شیطان کو اپنا سرپرست اور مرشد بنائے اس کا انجام صرف نامرادی ہوگا اور ایسی کھلی نامرادی جیسے ہر آنکھ دیکھے گی۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ دراصل شیطان نے جو انسانوں کا ازلی دشمن ہے انھیں بے وقوف بنایا ہے انھیں کچھ سبز باغ دکھائے ہیں اور وعدوں کے کچھ بہلاوے دیئے ہیں جو سراسر فریب ہیں اور انجام کار جہنم کی آگ کے سوا ان کے ہاتھ کچھ بھی نہ آئے گا۔ اور وہ کبھی اس سے رہائی نہیں پا سکیں گے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ اس کے برعکس جن لوگوں نے شیطان کی پیروی چھوڑ کے اللہ کی بندگی اور ایمان وعمل صالح والی زندگی کو اپنایا ان کو اللہ تعالیٰ اپنے دار رحمت بہشتی باغوں میں بسائے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔

قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر جنت کے بارہ میں بس اتنا ہی کہا گیا ہے جتنا اس آیت میں ہے، اور بعض مقامات پر وہاں کی بعض نعمتوں کی کچھ مزید تفصیل بھی بیان فرمائی گئی ہے ــــ ایک جگہ فرمایا گیا ہے "فِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ" جنت میں وہ سب کچھ ہے جس کو تمہارا جی چاہے اور جس کو دیکھ کر آنکھوں کو سرور و لذت حاصل ہو ــــ ایک دوسرے موقع پر فرمایا گیا ہے "فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ" مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے جنتی بندوں کے لئے جنت میں جو بیش بہا نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جو سب کی نظروں سے مخفی ہیں ان کا یہاں کسی کو پتہ ہی نہیں ہے ــــ یہ جنت کی نعمتوں کی دراصل صحیح تعریف ہے۔ اگر اس دنیا میں ان نعمتوں کے بارہ میں تفصیل سے بتایا بھی جائے تو کوئی کچھ سمجھ ہی نہیں سکتا۔ ایک حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "فِيهَا مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ" یعنی جنت میں وہ نعمتیں اور لطف و سرور کے وہ سامان ہیں جنھیں کبھی کسی آنکھ نے نہیں دیکھا، کسی کان نے ان کا ذکر نہیں سنا اور نہ کسی آدمی کے دل میں اس کا خیال ہی آیا۔

اللہ تعالیٰ نصیب فرمائے جنت میں جو کچھ ہے وہ ان شاء اللہ وہاں جاکر ہی دیکھا

جا سکے گا اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو بندے ایمان و عمل صالح کا سرمایہ لیکر اللہ کے حضور میں پہونچیں گے ان کو اللہ تعالیٰ اس جنت کا مکین بنادے گا اور اُن کے لئے ابدی زندگی کا فیصلہ فرما دیا جائے گا نہ وہ کبھی فنا ہوں گے، نہ جنت فنا ہوگی اور وہ ہمیشہ اس جنت میں رہیں گے اور وہاں کی نعمتوں اور لذتوں سے اور اللہ تعالیٰ کی خاص الخاص عنایتوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے۔

موجودہ قیمت 3/75

Regd. No. L-353

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow

VOL. 36 No. 7 OCTOBER 1968

الفرقان لکھنؤ

[شعبان ۱۳۸۸ھ]

NOVEMBER 1968

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۵۰/۷
پاکستان سے ۵۰/۷
ششماہی
ہندوستان سے ۴/-
پاکستان سے ۴/-

فی کاپی .... ۷۰ پیسے

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

جلد ۳۶ | بابتہ ماہ شعبان المعظم ۱۳۸۸ھ مطابق نومبر ۱۹۶۸ء | شمارہ ۸

اگر اس دائرہ میں سرخ نشان ہو تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہو۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۸ر دسمبر تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں ڈاک خانہ کی رسید بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہو، اگر ۱۵ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اسکی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

گزشتہ مہینے سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا ہے کہ مسلمانوں کو یہ مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے کہ غیر مسلم مسجدوں کے سامنے باجہ بجاتے ہوئے نہ گزریں۔

ذبیحہ گاؤ اور مسجد کے سامنے باجہ یہ ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کے خاص جھگڑے رہے ہیں۔ ذبیحہ گاؤ کی بندش کے بعد باجہ کی آزادی کا یہ فیصلہ مسلمانوں کو جیسا کچھ معلوم ہوا ہوگا وہ ظاہر ہے لیکن مسئلہ کے آئینی، قانونی اور جذباتی پہلو سے قطع نظر ایک اور رُخ بھی ہے جس سے سوچنا شاید مسلمانوں کے لیے زیادہ مفید ہوگا۔ وہ رُخ یہ ہے کہ خود مسلمانوں میں اپنے دینی شعائر کا کتنا احترام باقی رہ گیا ہے؟ اور وہ جو غیر مسلموں سے یہ چاہتے ہیں کہ مسجدوں کے سامنے باجہ بجاتے ہوئے نہ گزریں تو اس کے پیچھے مسجدوں کی عظمت و حرمت کا جذبہ ہوتا ہے یا کچھ اور؟

شریعت نے نہ مساجد کا کوئی حق غیر مسلموں پر ٹھہرایا ہے اور نہ کسی مسلمان کو ذمہ دار بنایا ہے کہ اُن سے مسجدوں کی تعظیم کرائے۔ البتہ ہر عاقل بالغ مسلمان پر مسجد کا یہ حق ہے کہ وہ اگر مسجد کے جوار میں رہتا ہے یا جماعت کے وقت مسجد کے سامنے سے گزر رہا ہے اور نہ ابھی نماز ادا کی ہے نہ کوئی عذرِ شرعی ہے تو جماعت میں شرکت کرے۔ لیکن آج کتنے مسلمان ہیں جو مساجد کے اس حق کو پامال نہیں کر رہے ہیں اور نہایت بے پروائی کے ساتھ مسجدوں کے آس پاس رہتے یا برابر سے گزر جاتے ہیں۔ کیا یہ مسجد کی توہین نہیں ہے، اُس کی بے توقیری نہیں ہے؟ یعنی ہمارے ذمہ جو صریح دینی احکام اور ہمارے اپنے عقائد کی رو سے مسجد کا حق ہے اُسے پامال کرنے میں ہم

نہایت بے باک، لیکن غیر مسلم کے ذمہ جو حق ہم نے اپنے طور پر مسجد کا سمجھ رکھا ہے اُس کے لیے جان دینے جان لینے کو تیار!

یہ رمضان کا مہینہ ہے، اس کا حق یہ ہے کہ کوئی عاقل بالغ مسلمان بلا عذر شرعی روزہ ترک نہ کرے۔ اور احترام یہ ہو کہ عذر شرعی کے ساتھ بھی حتی الامکان کسی کے سامنے نہ کھائے پیئے۔ لیکن اس حق کو ادا کرنے یا اس احترام کو ملحوظ رکھنے میں ہمارا کیا حال ہے؟ شہروں میں تو پتہ تک نہیں چلتا کہ رمضان آیا ہے۔ مسلمان کہلانے والوں کی اکثریت نہ صرف ترک صوم ہی بے تکلف کرتی ہے بلکہ احترام تک سے بے نیاز رہتی ہے۔

بہرحال یہ بہت عجیب سی بات ہو کہ غیر مسلموں سے تو ہم اپنے شعائر کا احترام چاہیں اور خود ان کے حقوق کو پامال کرنے میں ذرا نہ سوچیں کہ اصل اہانت تو یہ ہے!

واقعہ یہ ہے کہ کسی دین و ملت کے افراد پہلے خود اپنے شعائر کو ہلکا کرتے ہیں اور اُس کے نتیجہ میں دوسرے لوگوں کی نظر میں یہ چیزیں بے وقعت ہوتی ہیں۔ اس کی ایک موٹی سی مثال داڑھی ہے۔ وہی داڑھی جب ایک سکھ کے چہرے پر ہوتی ہے تو اُسے دیکھ کر نہ کوئی ہنستا ہے نہ اشاروں سے اُس کا استخفاف کرتا ہے۔ کیونکہ خود سکھ قوم میں داڑھی معزز ہے، اس قوم کے اندر اس کا استخفاف کرنے والے ابھی پیدا نہیں ہوئے لیکن یہی داڑھی مسلمان کے چہرہ پر ہو تو وہ ایک مضحکہ انگیز چیز بن جاتی ہے۔ اس لیے کہ خود مسلمانوں نے زبان حال اور زبان قال دونوں سے اس کا یہی درجہ بنا دیا ہے۔

کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ پرسنل لا کا مسئلہ بھی کچھ اسی نوعیت کا ہو۔ مسلمان حکومت سے تو کہتے ہیں کہ خبردار اس کو ہاتھ نہ لگانا یہ ہمارا دین و ایمان ہے لیکن اپنے گھر اور اپنے معاشرہ کے اندر ان قوانین الٰہی کے ساتھ جو کچھ کرتے ہیں وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ ہمارا یہ تضاد بے شک کوئی آئینی کمزوری ہمارے موقف میں پیدا نہیں کرتا۔ لیکن یہ تضاد خود ایسی کمزوری ہے کہ آئینی مضبوطی اس کی تلافی نہیں کر سکتی۔ اگر ہم صرف حکومت سے لڑتے رہے اور اپنی اس کمزوری کو دور کرنے کی کوشش نہ کی تو وہ وقت آ سکتا ہے کہ ہم یہ لڑائی بھی ہار جائیں۔ کتنی سچی بات کہی تھی اخوان المسلمین کے مرشد عام شیخ حسن البنا شہید نے اپنے پیر ... کہ

اقیموا دولۃ الاسلام فی صدورکم تقم فی ارضکم	اسلام کی حکومت اپنے دلوں میں قائم کرو تمہارے ملک پر بھی یہ حکومت قائم ہو جائے گی۔

اسلام کی جس فرمانبرداری میں ہم آزاد ہیں اس سے تو بے نیاز رہیں البتہ حکومت کہیں ہاتھ ڈالے تو غازی بن جائیں، یہ خصلت ہمیں مسلسل پسپا کرا رہی ہے۔ دوسری بات بڑی مبارک ہے مگر پہلی بات کے ساتھ نہیں۔

میقات کے مسئلہ پر ایک ضروری وضاحت:-

ناظرین کرام کو یاد ہوگا، اب سے ایک سال پہلے شعبان ۱۳۷۹ھ کے شمارہ میں "ہندوستانی حجاج کے لیے میقات" کے زیر عنوان اس عاجز کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں حضرت مولانا شیر محمد سندھی مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی اس تحقیق کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا تھا کہ ہندوستان و پاکستان کے حجاج کو جدہ پہونچنے سے پہلے سمندر میں کسی جگہ احرام باندھنا ضروری نہیں ہے بلکہ وہ جدہ پہونچ کر بھی احرام باندھ سکتے ہیں، کیونکہ پانچوں میقات اور ان کے محاذی خطوط سب کے سب خشکی میں ہیں اسلئے سمندر میں سفر کرنے والوں کا کسی جگہ بھی میقات یا خطوط محاذات سے تجاوز نہیں ہوتا۔

اس سلسلہ میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مولانا سندھی مرحوم کی اس تحقیق کا تعلق صرف بحری مسافروں سے ہے اور اس کی بنیاد اس پر ہے کہ تمام مواقیت اور ان کے خطوطِ محاذات ہر سمت میں خشکی ہی پر ہیں کہیں بھی سمندر میں نہیں ہیں ____ لیکن جو لوگ ہوائی جہاز سے حج کو جائیں انھیں جدہ سے پہلے ہی کسی اسٹیشن پر احرام باندھ لینا چاہیے کیونکہ معلوم ہوا ہے کہ عموماً ہوائی جہاز ایسے علاقہ سے گزر کر جدہ اُترتے ہیں جس میں داخلہ سے پہلے احرام باندھ لینا ضروری ہے۔

____ محمد منظور نعمانی

کتاب الدعوات

معارف الحدیث

(مسلسل)

عام مومنین کے لیے استغفار:-

قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ اپنے لیے اور عام مومنین و مومنات کے لیے استغفار یعنی اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت کی استدعا کیا کریں۔ (وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ) یہی حکم ہم امتیوں کے لیے بھی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بڑی ترغیب دی اور بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ اس سلسلے کی دو حدیثیں ذیل میں پڑھیے!

عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اسْتَغْفَرَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ كُتِبَ لَهٗ بِكُلِّ مُؤْمِنٍ وَمُؤْمِنَةٍ حَسَنَةٌ۔

——— رواه الطبرانی فی الکبیر

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو بندہ عام ایمان والوں اور ایمان والیوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگے گا اس کے لیے ہر مومن مرد و عورت کے حساب سے ایک ایک نیکی لکھی جائے گی۔ (معجم کبیر للطبرانی)

(تشریح) کسی صاحب ایمان بندے یا بندی کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور

بخشش کی دعا کرنا، ظاہر ہے کہ اس کے ساتھ بہت بڑا احسان اور اس کی بہت بڑی خدمت ہے اس لیے جب کسی بندہ نے عام اہل ایمان (مومنین و مومنات) کے لیے استغفار کیا اور ان کے لیے اللہ سے بخشش کی دعا کی تو فی الحقیقت اس نے اولین و آخرین، زندہ اور مردہ سب ہی اہل ایمان کی خدمت اور ان کے ساتھ نیکی کی، اس لیے ہر ایک کے حساب میں اس کی یہ نیکی لکھی جائے گی ــــ سبحان اللہ ہمارے لیے لاتعداد نیکیوں کے کمانے کا کیسا راستہ کھولا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے فائدہ اٹھانے کی توفیق دے ــــ جمیع مومنین و مومنات کے لیے دعائے مغفرت کے بہترین الفاظ وہ ہیں جو قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے نقل کئے گئے ہیں۔

"رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ"

(اے میرے رب مجھے بخش دے اور میرے ماں باپ کو بخش دے اور تمام ہی ایمان والوں کی مغفرت فرما دے قیامت کے دن)

عَنْ اَبِیْ الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنِ اسْتَغْفَرَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ کُلَّ یَوْمٍ سَبْعًا وَّعِشْرِیْنَ مَرَّۃً کَانَ مِنَ الَّذِیْنَ یُسْتَجَابُ لَھُمْ وَیُرْزَقُ بِھِمْ اَھْلُ الْاَرْضِ ــــ رواہ الطبرانی فی الکبیر

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو بندہ عام مومنین و مومنات کے لیے ہر روز ۲۷ دفعہ اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت کی دعا کرے گا وہ اللہ کے اُن مقبول بندوں میں سے ہو جائے گا جن کی دعائیں قبول ہوتی ہیں اور جن کی برکت سے دنیا والوں کو رزق ملتا ہے (معجم کبیر طبرانی)

(تشریح) اللہ تعالیٰ کو یہ بات بہت ہی محبوب ہے کہ اُس کے بندوں کی خدمت و خیر خواہی اور اُن کو نفع پہونچانے کی کوشش کی جائے ــــ ایک حدیث میں ہے۔

اَلْخَلْقُ عِیَالُ اللّٰہِ فَاَحَبُّ النَّاسِ اِلَی اللّٰہِ اَنْفَعُھُمْ	سب مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ اس لیے لوگوں میں اللہ کو زیادہ محبوب وہ بندے ہیں

لِعَيَالِهٖ۔　(کنز العمال)　جو اُس کی مخلوق کو زیادہ نفع پہونچائیں۔

پھر جس طرح مخلوق کے لیے کھانے کپڑے کے قسم کی زندگی کی ضروریات فراہم کرنا اور انکو راحت و آرام پہونچانا وغیرہ اس دُنیا میں اُن کی خدمت اور نفع رسانی کی صورتیں ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ سے بندوں کے لیے مغفرت اور بخشش کی دُعا کرنا بھی اخروی زندگی کے لحاظ سے اُن کی بہت بڑی خدمت اور اُن کے ساتھ بہت بڑی نیکی ہے اور اس کی قدر و قیمت آخرت میں اس وقت معلوم ہوگی جب یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی کہ کسی کے استغفار نے کسی کو کیا دلوایا اور کتنا نفع پہونچایا ____ پس جو مخلص بندے اخلاص اور دل کی گہرائی سے ایمان والے بندوں اور بندیوں کے لیے مغفرت اور بخشش کی دعائیں کرتے ہیں اور دن رات میں بار بار کرتے ہیں (جس کا کورس اس حدیث میں ۲۷ بتایا گیا ہے) وہ تمام مومنین و مومنات کے خاص الخاص محسن اور گویا آخرت کے لحاظ سے "اصحاب خدمت" ہیں اور اپنے اس عمل سے اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ ایسے مقرب اور مقبول ہو جاتے ہیں کہ انکی دعائیں سنی جاتی ہیں اور اُن کی اور اُن کی دُعاؤں کی برکت سے دُنیا والوں کو اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے۔

لیکن یہ بات یہاں قابل لحاظ ہے کہ اس دُنیا میں تو ہر انسان بلکہ ہر جاندار کی خدمت اور اس کو ضروری درجہ کا آرام پہونچانے کی کوشش نیکی اور کار ثواب ہے، حدیث پاک میں فرمایا گیا ہے "فِي كُلِّ ذَاتِ كَبِدٍ رَطْبٍ صَدَقَةٌ" لیکن اللہ سے مغفرت اور جنت کی دعا صرف اہل ایمان ہی کے لیے کی جا سکتی ہے، کفر و شرک والے جب تک اس سے توبہ نہ کریں مغفرت اور جنت کے قابل نہیں ہیں، اس لیے اُن کے واسطے مغفرت اور جنت کی دُعا بھی نہیں کی جا سکتی۔ ہاں اُن کے واسطے ہدایت اور توبہ کی توفیق کی دُعا کرنی چاہیئے جس کے بعد اُن کے لیے مغفرت اور جنت کا دروازہ کھل سکے ____ ان کے حق میں یہی دُعا کرنا اُن کے ساتھ بہت بڑی نیکی اور خیر خواہی ہے۔

توبہ و استغفار سے اللہ کتنا خوش ہوتا ہے:۔

توبہ و استغفار سے متعلق احادیث و روایات کے سلسلہ کو مندرجہ ذیل حدیث پر ختم کیا

جاتا ہے جو صحیحین میں بھی متعدد صحابہ کرام سے مروی ہے اور جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توبہ کرنے والے گناہگاروں کو وہ بشارت سنائی ہو جو کسی دوسرے بڑے سے بڑے عمل پر بھی نہیں سنائی گئی۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی شان رحمت کو سمجھنے کے لیے صرف یہی ایک حدیث ہوتی تو کافی تھی۔ حق یہ ہے کہ اس چند سطری حدیث میں معرفت کا ایک دفتر ہے، اللہ تعالیٰ فہم اور یقین نصیب فرمائے۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ لَلّٰہُ اَفْرَحُ بِتَوْبَۃِ عَبْدِہِ الْمُؤْمِنِ مِنْ رَجُلٍ نَزَلَ فِیْ اَرْضٍ دَوِیَّۃٍ مُھْلِکَۃٍ مَعَہٗ رَاحِلَتُہٗ عَلَیْھَا طَعَامُہٗ وَشَرَابُہٗ فَوَضَعَ رَأْسَہٗ فَنَامَ نَوْمَۃً فَاسْتَیْقَظَ وَقَدْ ذَھَبَتْ رَاحِلَتُہٗ فَطَلَبَھَا حَتّٰی اِذَا اشْتَدَّ عَلَیْہِ الْحَرُّ وَالْعَطَشُ اَوْ مَاشَاءَ اللّٰہُ قَالَ اَرْجِعُ اِلٰی مَکَانِیَ الَّذِیْ کُنْتُ فِیْہِ فَأَنَامُ حَتّٰی أَمُوْتَ فَوَضَعَ رَأْسَہٗ عَلٰی سَاعِدِہٖ لِیَمُوْتَ فَاسْتَیْقَظَ فَاِذَا رَاحِلَتُہٗ عِنْدَہٗ عَلَیْھَا زَادُہٗ وَشَرَابُہٗ فَاللّٰہُ اَشَدُّ فَرَحًا بِتَوْبَۃِ الْعَبْدِ الْمُؤْمِنِ مِنْ ھٰذَا بِرَاحِلَتِہٖ وَزَادِہٖ۔

——— رواہ البخاری و مسلم

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ انھوں نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔ آپ ارشاد فرماتے تھے ’خدا کی قسم اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن بندہ کی توبہ سے اس مسافر آدمی سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جو دوران سفر میں، کسی ایسی غیر آباد اور سنسان زمین پر اتر گیا ہو جو سامان حیات سے خالی اور اسباب ہلاکت سے بھرپور ہو اور اس کے ساتھ بس اس کی سواری کی اونٹنی ہو اسی پر اس کے کھانے پینے کا سامان ہو پھر وہ آرام لینے کے لیے، سر رکھ کے لیٹ جائے

پھر اسے نیند آجائے پھر اسکی آنکھ کھلے تو دیکھے کہ اسکی اونٹنی (پورے سامان سمیت) غائب ہو۔ پھر وہ اس کی تلاش میں سرگرداں ہو۔ یہاں تک کہ گرمی اور پیاس وغیرہ کی شدت سے جب اس کی جان پربن آئے تو وہ سوچنے لگے کہ (میرے لیے اب یہی بہتر ہے) کہ میں اُسی جگہ جا کر پڑ جاؤں (جہاں سویا تھا) یہاں تک کہ مجھے موت آجائے پھر وہ (اسی ارادہ سے وہاں آکر) اپنے بازو پر سر رکھ کے مرنے کے لیے لیٹ جائے پھر اس کی آنکھ کھلے تو وہ دیکھے کہ اس کی اونٹنی اس کے پاس موجود ہے اور اس پر کھانے پینے کا پورا سامان (جوں کا توں محفوظ) ہے تو جتنا خوش یہ مسافر اپنی اونٹنی کے ملنے سے ہوگا خدا کی قسم مؤمن بندہ کے توبہ کرنے سے خدا اس سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

تشریح) ذرا تصور کیجئے اس بدو مسافر کا جو اکیلا اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر اور راستہ بھر کے لیے کھانے پینے کا سامان اُسی پر لاد کر دور دراز کے سفر پر کسی ایسے راستہ سے چلا جس میں کہیں دانہ پانی ملنے کی اُمید نہیں پھر اثنائے سفر میں وہ کسی دن دوپہر میں کہیں سایہ دیکھ کر اترا اور آرام کرنے کے ارادہ سے لیٹ گیا، اُس تھکے ماندے مسافر کی آنکھ لگ گئی، کچھ دیر کے بعد جب آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ اونٹنی اپنے سارے سازوسامان کے ساتھ غائب ہے، وہ بیچارہ حیران و سراسیمہ ہو کر اُس کی تلاش میں دوڑا بھاگا، یہاں تک کہ گرمی اور پیاس کی شدت نے اس کو لبِ دم کر دیا، اب اس نے سوچا کہ شاید میری موت اسی طرح اس جنگل بیابان میں لکھی تھی اور اب بھوک پیاس میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کے یہاں مرنا ہی میرے لیے مقدر ہے اس لیے وہ اُسی سایہ کی جگہ میں مرنے کے لیے آکے پڑھ گیا اور موت کا انتظار کرنے لگا، اسی حالت میں اس کی آنکھ پھر جھپکی، اس کے بعد جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اونٹنی اپنے پورے سازوسامان کے ساتھ اپنی جگہ کھڑی ہے ———

ذرا اندازہ کیجئے کہ بھاگی ہوئی اور گم شدہ اونٹنی کو اس طرح اپنے پاس کھڑا دیکھ کے اُس بدو کو جو مایوس ہو کر مرنے کے لیے پڑ گیا تھا کس قدر خوشی ہوگی ——— صادق مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث پاک میں قسم کھا کے فرمایا کہ خدا کی قسم بندہ جب جرم و گناہ کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا اور سچے دل سے توبہ کر کے اس کی طرف آتا ہے،

تو اُس رحیم و کریم رب کو اس سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے جتنی کہ اس بندے کو اپنی بھاگی ہوئی اونٹنی کے ملنے سے ہوگی۔

قریب قریب یہی مضمون صحیحین میں حضرت ابن مسعودؓ کے علاوہ حضرت انسؓ کی روایت سے بھی مروی ہے اور صحیح مسلم میں ان دونوں بزرگوں کے علاوہ حضرت ابوہریرہؓ، حضرت نعمان بن بشیر اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہم سے بھی یہی مضمون مروی ہے بلکہ حضرت انسؓ کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بندہ مسافر کی فرطِ مسرت کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اونٹنی کے اس طرح مل جانے سے وہ اتنا خوش ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی اس بے انتہا عنایت اور بندہ نوازی کے اعتراف کے طور پر وہ کہنا چاہتا تھا کہ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّيْ وَاَنَا عَبْدُكَ (خداوندا بس تو ہی میرا رب ہے اور میں تیرا بندہ) لیکن خوشی کی سرمستی میں اس کی زبان بہک گئی اور اس نے کہا اَللّٰهُمَّ اَنْتَ عَبْدِيْ وَاَنَا رَبُّكَ (میرے اللہ! بس تو میرا بندہ اور میں تیرا خدا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی اس غلطی کی معذرت کرتے ہوئے فرمایا اَخْطَأَ مِنْ شِدَّةِ الْفَرَحِ (فرطِ مسرت اور بیحد خوشی کی وجہ سے اس بیچارے بندے کی زبان بہک گئی)[1]

بلاشبہ اس حدیث میں توبہ کرنے والے گنہگاروں کو اللہ تعالیٰ کی اس خوشنودی کی بشارت سنائی گئی ہے وہ جنت اور اس کی ساری نعمتوں سے بھی فائق ہے

شیخ ابن القیم "مدارج السالکین" میں توبہ و استغفار ہی کے بیان میں اسی حدیث پر کلام کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی اس خوشنودی کی وضاحت میں ایک عجیب و غریب مضمون لکھا ہے جس کو پڑھ کر ایمانی روح وجد میں آجاتی ہے، ذیل میں اس کا صرف حاصل و خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

"اللہ تعالیٰ نے اپنی پیدا کی ہوئی ساری کائنات میں انسان کو خاص شرف بخشا ہے۔

---

[1] علماء و فقہاء نے حضور کے اس ارشاد سے سمجھا ہے کہ اگر اس طرح کسی کی زبان بہک جائے اور اس سے کفر کا کلمہ نکل جائے تو وہ کافر نہ ہوگا فقہ اور فتاویٰ کی کتابوں میں اس کی تصریح ہے۔

دنیا کی ساری چیزیں اس کے لیے پیدا کی گئی ہیں اور اس کو اپنی معرفت اور اطاعت و عبادت کے لیے پیدا فرمایا ہے، ساری مخلوقات کو اس کے لیے مسخر کیا اور اپنے فرشتوں تک کو اس کا خادم اور محافظ بنایا، پھر اس کی ہدایت و رہنمائی کے لیے کتابیں نازل فرمائیں اور نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری فرمایا، پھر ان ہی میں سے کسی کو اپنا خلیل بنایا اور کسی کو شرف ہم کلامی بخشا اور بہت بڑی تعداد کو اپنی ولائیت اور قرب خصوصی کی دولت سے نوازا ـــــ اور انسانوں ہی کے لیے دراصل جنت و دوزخ کو بنایا ـــــ الغرض دنیا و آخرت میں اور عالم خلق و امر میں جو کچھ ہے اور ہوگا اُس سب کا اصل مرکز و محور بنی نوعِ انسان ہی ہے، اُسی نے امانت کا بوجھ اٹھایا، اُسی کے لیے شریعت کا نزول ہوا، اور ثواب و عذاب دراصل اُسی کے لیے ہے ـــــ بس اس پورے کارخانۂ عالم میں انسان ہی اصل مقصود ہے، اللہ نے اس کو اپنے خاص دستِ قدرت سے بنایا، اُس میں اپنی روح ڈالی، اپنی فرشتوں سے اس کو سجدہ کرایا اور ابلیس اُس کو سجدہ نہ کرنے کے جرم میں مردود بارگاہ ہوا اور اللہ نے اس کو اپنا دشمن قرار دیا۔

یہ سب اس لیے کہ اُس خالق نے انسان ہی میں اس کی صلاحیت رکھی ہے کہ وہ ایک زمینی اور مادّی مخلوق ہونے کے باوجود اپنے خالق و پروردگار کی (جو وراء الوراء اور غیب الغیب ہے) اعلیٰ درجہ کی معرفت حاصل کرے، ممکن حد تک اُس کے اسرار اور اُسکی حکمتوں سے آشنا ہو، اُس سے محبت اور اُس کی اطاعت کرے، اُس کے لیے اپنے نفسانی مرغوبات اور اپنی ہر چیز کو قربان کرے اور اس دنیا میں اُس کی خلافت کی ذمہ داریوں کو ادا کرے اور پھر اُس کی خاص الخاص عنایتوں اور بے حساب بخششوں کا مستحق ہو کر اُس کی رحمت و رافت، اُس کے پیار و محبت اور اُس کے بے انتہا لطف و کرم کا مورد بنے اور چونکہ وہ رب کریم اپنی ذات سے رحیم ہے اور لطف و کرم اُس کی ذاتی صفت ہے (جس طرح بلا تشبیہ ماں کی ذاتی صفت ہے) اس لیے اپنے وفادار اور نیک کردار بندوں کو انعامات و احسانات سے نوازنا اور اپنے عطیات سے ان کی جھولیوں کو بھر دینا اُس کے لیے بلا تشبیہ اسی طرح بے انتہا خوشی کا باعث ہوتا ہے جس طرح اپنے بچہ کو دودھ

پلانا اور نہلا دُھلا کر اچھے کپڑے پہنانا مامتا والی ماں کے لیے انتہائی خوشی کا باعث ہوتا ہے۔

اب اگر بندے نے بدبختی سے اپنے اُس خالق و پروردگار کی وفاداری اور فرمانبرداری کا راستہ چھوڑ کے بغاوت و نافرمانی کا طریقہ اختیار کر لیا اور اُس کے دشمن اور باغی شیطان کے لشکر اور اس کے متبعین میں شامل ہو گیا اور رب کریم کی ذاتی صفت رحمت و رأفت اور لطف و کرم کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے بجائے وہ اُس کے قہر و غضب کو بھڑکانے لگا تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ میں (بلا تشبیہ بلا تشبیہ) اُس غصہ اور ناراضی کی سی کیفیت پیدا ہو گی جو نالائق اور ناخلف بیٹے کی نافرمانی اور بدکرداری دیکھ کر مامتا والی ماں کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔

پھر اگر اس بندہ کو کبھی اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اور وہ محسوس کرے کہ میں نے اپنے مالک اور پروردگار کو ناراض کر کے اپنے کو اور اپنے مستقبل کو برباد کر لیا اور اُس کے دامن رحم و کرم کے سوا میرے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے، پھر وہ اپنے کیے پر نادم و پشیمان ہو اور مغفرت و رحمت کا سائل بن کر اُس کی بارگاہِ کرم کی طرف رجوع کرے، سچے دل سے توبہ کرے، روئے اور گڑگڑائے اور معافی مانگے اور آئندہ کے لیے وفاداری اور فرمانبرداری کا عہد و ارادہ کرے تو سمجھا جا سکتا ہے کہ اُس کے اُس کریم رب کو جس کی ذاتی صفت رحمت و رأفت اور جس کا پیار ماں کے پیار سے بھی ہزاروں گنا زیادہ ہے اور جو بندوں پر نعمتوں کی بارش برسا کے اتنا خوش ہوتا ہے جتنا نعمتوں کو پا کر محتاج بندے خوش نہیں ہوتے، تو سمجھا جا سکتا ہے کہ ایسے کریم پروردگار کو اپنے اس بندہ کی اس توبہ و انابت سے کتنی خوشی ہو گی۔

شیخ ابن القیم نے اس سے بہت زیادہ وضاحت اور بسط کے ساتھ یہ مضمون لکھنے کے بعد آخر میں کسی عارف کا ایک واقعہ لکھا ہے جو شیطان یا نفس امّارہ کے اغواء سے غلط راستے پر پڑ گئے تھے اور سرکشی و نافرمانی کے جراثیم اُن کی روح میں پیدا ہونے لگے تھے ــــــ وہ لکھتے ہیں کہ

> وہ عارف ایک گلی سے گزر رہے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک گھر کا دروازہ کھلا اور ایک بچہ روتا چلاتا ہوا اُس میں سے نکلا، اُس کی ماں اس کو گھر سے دھکّے دے دے کر نکال

رہی تھی، جب وہ دروازہ سے باہر ہو گیا تو ماں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا، بچہ اسی طرح روتا چلا گیا، بھٹکتا بڑا تا کچھ دور تک گیا۔ پھر ایک جگہ پہونچ کر کھڑا ہو گیا اور سوچنے لگا کہ میں اپنے ماں باپ کے گھر کے سوا کہاں جا سکتا ہوں اور کون مجھے اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔ یہ سوچ کر ٹوٹے دل کے ساتھ وہ اپنے گھر کی طرف لوٹ پڑا، دروازہ پر پہونچ کر اس نے دیکھا کہ دروازہ اندر سے بند ہے تو وہ وہیں چوکھٹ پر سر رکھ کے پڑ گیا اور اسی حالت میں سو گیا۔ ماں آئی۔ اس نے دروازہ کھولا اور اپنے بچے کو اس طرح چوکھٹ پر سر رکھے پڑا دیکھ کے اس کا دل بھر آیا اور ماتا کا جذبہ ابھر آیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، بچہ کو اٹھا کر سینے سے لگایا اور اس کو پیار کرنے لگی اور کہہ رہی تھی۔ بیٹے تو نے دیکھا تیرے لیے میرے سوا کون ہے، تو نے نالائقی، نادانی اور نافرمانی کا راستہ اختیار کر کے اور میرا دل دکھا کے مجھے وہ غصہ دلایا جو تیرے لیے میری فطرت نہیں ہے۔ میری فطرت اور ممتا کا تقاضا تو یہی ہے میں تجھ پر پیار کروں اور تجھے راحت و آرام پہونچانے کی کوشش کروں تیرے لیے ہر خیر اور بھلائی چاہوں۔ میرے پاس جو کچھ ہے تیرے ہی لیے ہے ——— اُن عارف نے یہ سارا ماجرا دیکھا اور اس میں اُن کے لیے جو سبق تھا وہ لیا۔

اس قصہ پر غور کرتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سامنے رکھیے "للہ ارحم بعبادہ من ھذہ بولدھا"[1] (خدا کی قسم اللہ تعالیٰ کی ذات میں اپنے بندوں کے لیے اُس سے زیادہ پیار اور رحم ہے جتنا کہ اس ماں میں اپنے بچہ کے لیے ہے)

---

[1] یہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی ایک حدیث کا ٹکڑا ہے۔ ایک عورت تھی جو بڑے والہانہ انداز میں اپنے بچہ کو بار بار اُٹھا کے سینے سے لگاتی اور دودھ پلاتی تھی۔ دیکھنے والوں کو محسوس ہوتا تھا کہ ممتا کے جذبہ سے اس کا سینہ بھرا ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف اشارہ کر کے فرمایا تھا ——— "خدا کی قسم اللہ کی ذات میں اپنے بندوں کے لیے اُس سے زیادہ پیار اور ترحم ہے جتنا کہ اس ماں میں اپنے بچہ کے لیے ہے۔"

کیسے بدبخت اور محروم ہیں وہ بندے جنھوں نے نافرمانی کی راہ اپنا کے ایسے رحیم و کریم پروردگار کی رحمت سے اپنے کو محروم کر لیا ہے اور اُس کے قہر و غضب کو بھڑکا رہے ہیں، حالانکہ توبہ کا دروازہ اُن کے لیے کھلا ہوا ہے اور وہ اُس کی طرف قدم بڑھا کے اللہ تعالیٰ کا وہ پیار حاصل کر سکتے ہیں جس کے سامنے ماں کا پیار کچھ بھی نہیں ــــــ اللہ تعالیٰ ان ہی حقائق کا فہم اور یقین نصیب فرمائے۔

یَا غَفَّارُ اغْفِرْ لِیْ یَا تَوَّابُ تُبْ عَلَیَّ یَا رَحْمٰنُ ارْحَمْنِیْ
یَا رَؤُفُ ارْأُفْ بِیْ یَا عَفُوُّ اعْفُ عَنِّیْ یَا رَبِّ اَوْزِعْنِیْ
اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَطَوِّقْنِیْ حُسْنَ عِبَادَتِکَ

یک دو ساعت صحبتے با اہلِ دل

مجلس حضرت شاہ محمد یعقوب مدظلہ

(دسویں مجلس)

(مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

۲۹ر شوال ۱۳۸۵ھ مطابق ۳۰ر جنوری ۱۹۶۶ء

مہمان خانہ مسجد شکور خاں

راقم سطور کی تمنا تھی کہ دسویں مجلس سے بھی استفادہ کا موقع ملے کہ ثلاث عشرۃ کاملۃ لیکن حضرت کے یہاں جمعہ کو مجلس کا معمول نہیں۔ قیام بھوپال کا ایک دن (جمعہ) ناغہ گیا۔ شنبہ ۲۹ر شوال صبح حیدر آباد کے لیے روانگی تھی۔ گاڑی صبح ۹ بجے سے پہلے روانہ ہو جاتی تھی اس لیے مجلس کا کوئی امکان نہ تھا۔ حضرت نے باوجود درخواست کے رخصت کے لیے اسٹیشن تشریف لانے کا عزم فرما لیا تھا۔ لیکن صبح اطلاع ملی کہ گاڑی ایک گھنٹہ لیٹ ہے حضرت آٹھ بجے صبح ہماری قیام گاہ مسجد شکور خاں ہی میں تشریف لے آئے اور مجلس شروع ہو گئی۔ کچھ دیر تشریف رکھنے کے بعد اسٹیشن تشریف لے گئے وہاں گاڑی کی آمد تک یہ ارشادات و ملفوظات کا سلسلہ جاری رہا۔ جگہ کی تبدیلی کے علاوہ کسی چیز میں کوئی تبدیلی نہ تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس طرح دسویں مجلس کا بھی موقع مل گیا۔ خاص خاص ارشادات درج ذیل ہیں۔

فرمایا منھ اور معدہ کا صاف ہونا پہلی شرط ہے اس کے بغیر کسی چیز کا ذائقہ اور اس کا حقیقی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ انبیاء علیہم السلام منھ اور معدہ کی اصلاح فرماتے ہیں پھر

ہر نصیحت اور ہر ایک ہدایت نافع و موثر ہوتی ہے۔ اس حقیقت کو اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے جس میں فرمایا گیا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ دنیا کی قومیں مسلمانوں پر اس طرح نرغہ کریں گی جس طرح کھانے والے کھانے کی لگن پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور ایک دوسرے کو بلاتے ہیں، صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا یہ ہماری تعداد کی کمی کی وجہ سے ہوگا، فرمایا نہیں تم اس زمانہ میں بہت ہوگے لیکن تمہارے دلوں میں "وہن" پیدا کر دیا جائے گا۔ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ "وہن" سے کیا مراد ہے فرمایا مال سے محبت اور موت سے وحشت، بس یہ دونوں چیزیں مال کی محبت اور موت سے وحشت جب تک دور نہ ہو دین کی کسی نصیحت و تلقین سے پورا نفع نہیں ہوتا اور دینی حقائق کا پورا ذائقہ نصیب نہیں ہوتا، انھیں دونوں کا دور کرنا منھ اور معدہ کی اصلاح ہے، میرا ایک بچہ بیمار ہوا، اس کے منھ کا ذائقہ خراب تھا، ہر چیز اس کو کڑوی معلوم ہوتی تھی، اس کی والدہ اس کے لیے بڑے اہتمام سے بٹیر کا سالن تیار کرتیں کہ وہ کچھ کھائے مگر اس کو وہ بھی کڑوا معلوم ہوتا تھا، میں نے کہا کہ منھ کڑوا ہے اس کو ہر چیز کڑوی اور بدمزہ معلوم ہوگی جب تک اس کے منھ کا ذائقہ تبدیل نہ ہو، اس کو کوئی چیز اچھی معلوم نہیں ہو سکتی۔ یہی معنوی دہن اور معدہ کا حال ہے کہ جب تک اُن کی اصلاح نہ ہو، کسی چیز کا اصل مزہ معلوم نہیں ہو سکتا۔

راقم سطور نے اپنی ایک عربی تصنیف ربانیۃ لا رھبانیۃ پیش کی اور عرض کیا کہ نجد کے علماء اور بہت سے تعلیم یافتہ عرب حضرات کو تصوف سے بڑی وحشت ہے۔ مدینہ طیبہ میں ایک فاضل نجدی دوست نے مجھ سے کہا کہ اگر تصوف پر آپ کوئی کتاب لکھیں تو ہمارے علماء اور یہاں کے تعلیم یافتہ حضرات پڑھ لیں گے۔ اس موضوع پر کسی اور کی کتاب کا پڑھنا لوگوں کیلیے دشوار ہے۔ یہ کتاب اسی ضرورت کے احساس کے ماتحت لکھی گئی کہ اور کچھ نہ ہو سکا تو کم سے کم ان لوگوں کی اسی اصلاح و تربیت کے طریقہ سے وحشت کم ہو اور اس کی ضرورت کا کسی درجہ میں احساس پیدا ہو فرمایا کہ بہت اچھا کیا اللہ کے مخلص اور مقبول بندوں سے وحشت کے کم ہونے کی ضرورت تھی لیکن وہ بے چارے کبھی معذور ہیں کہ عرفی تصوف میں بہت سی ایسی چیزیں داخل ہو گئی ہیں جن سے اہل علم کا متوحش ہونا ضروری اور قدرتی ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی کہے کہ گلاب جامن تو بہت اچھی ہے اور کھانے کو بھی جی چاہتا ہے مگر اس پر مکھیاں بہت

بیٹھی ہوئی ہیں۔ طبیعت کو کراہیت پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح بعض لوگوں کو کسی اصطلاحی نام اور لفظ سے چڑ ہوتی ہے، مثلاً بعض لوگ کسی مٹھائی کے نام سے چڑنے لگتے ہیں۔ ایسے موقع پر اس نام کے لینے کی ضرورت نہیں، اس کا مصداق اور اصل شے ان کے سامنے رکھ دی جائے، وہ قبول کرلیں گے، حضرت نے اس کتاب کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا، فرمایا کہ اب علوم وحقائق کی اشاعت کتنی آسان ہوگئی ہے، ہمارے زمانہ میں کیسی اچھی کتابیں چھپنے لگی ہیں جن کو دیکھنے کو پہلے آنکھیں ترستی تھیں پھر یہ شعر پڑھا ؎

سچ جو پوچھو ہم ہیں لاکھوں سے زیادہ جوش یعیب ٭ فصل گل میں جس طرح رہتی ہو شاداں عندلیب

فرمایا ایک شیخ طریقت کا واقعہ لکھا ہے کہ جب نماز کھڑی ہونے لگتی تو ایک ایک مقتدی پر ہاتھ رکھتے اور فرماتے جاتے کہ تمہارے دل میں خطرات و وساوس ہیں تم الگ ہو جاؤ اس طرح اہل خطرات کو چھانٹ دیتے اور صرف وہ لوگ رہ جاتے جن میں حضور قلب ہوتا اور خطرات نہ ہوتے بیشک یہ انکی قوت کشفیہ تھی لیکن یہ طریقہ تو اسوۂ نبوی کے خلاف ہے۔ اس وقت تو نماز میں منافقین بھی آتے تھے آپ اُن کو بھی علیحدہ نہیں کرتے تھے تصوف کی روح تو یہ ہے کہ جو آج بُرے ہیں وہ کل اچھے ہوسکتے ہیں اور جو آج اچھے ہیں کل برے ہوسکتے ہیں جن کو آج بہت خطرات آتے ہیں ہوسکتا ہے کہ ان کو حضوری حاصل ہوجائے اور خطرات سے محفوظ ہوجائیں بہت سے لوگوں نے شیخ کو بالکل بے خطا، معصوم سمجھ لیا ہے ان کے نزدیک اس کی ہر بات کی قرآن وحدیث کی طرح پیروی کرنی ضروری ہے اور کبھی اس سے کسی بات میں اختلاف ہو ہی نہیں سکتا، حالانکہ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ نماز میں امام کو سہو ہو تو مقتدی کا لقمہ دینا اور اس کو تنبیہ کرنا کہ آپ قعدہ اولیٰ میں نہیں بیٹھے اس بات کی دلیل ہے کہ ہر وقت پیروی و تقلید ضروری نہیں مقتدی گویا زبان حال سے کہتا ہے کہ آپ سے سہو ہوگیا، اس وقت آپ پیر ہم مرید نہیں بلکہ اس وقت ہم پیر اور آپ مرید ہیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک نابینا (عبداللہ ابن ام مکتوم) آتے ہیں اور آپ سے کچھ دریافت کرنا چاہتے ہیں آپ سرداران قریش سے گفتگو میں مصروف ہیں۔ آپ انکی طرف کوئی توجہ نہیں فرماتے اور آپ کو ان کی مداخلت پسند نہیں آتی۔ اس پر سورہ عبس

دتولی نازل ہوتی ہے اور آپ کو متنبہ فرمایا جاتا ہے، اس سے زیادہ کوئی شیخ اور پیر کیا ہو سکتا ہے آپ ایک باغ میں تشریف رکھتے تھے۔ آپ نے حضرت ابوہریرہؓ کو نعلین مبارک دیکر بھیجا اور فرمایا کہ جو بھی کلمہ شہادت پڑھتا ہو، اسکو جنت کی بشارت دیدو۔ حضرت عمرؓ راستہ میں ملتے ہیں۔ وہ حضرت ابوہریرہ کی پیٹھ پر ایک ہاتھ مارتے ہیں۔ وہ شکایت کے لیے حاضر خدمت ہوتے ہیں آپ بھی اُن کے پیچھے پیچھے پہونچتے ہیں اور حاضر ہو کر عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ ایسا نہ کریے ورنہ لوگ بھروسہ کرلیں گے، آپ کو ان کی اس مداخلت اور جرأت پر کوئی غصہ نہیں آتا، آپ ان کے مشورہ کو قبول فرما لیتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کو ایک بدوی بھری مجلس اور خطبہ کے دوران ٹوک دیتا ہے اور آپ ناراض نہیں ہوتے۔

میں نے دریافت کیا کہ حیدرآباد کا سفر کس مقصد سے ہوا تھا؟ فرمایا کہ میرے منجھلے بھائی محمد اسمٰعیل حجاز چلے گئے تھے مجھے ان سے محبت نہیں عشق تھا ان کی مفارقت مجھے گوارا نہیں تھی۔ میں نے ان کو خط لکھا کہ آپ نے مجھے بلانے کا وعدہ کیا تھا، آپ نے جن پیغمبر کا نام پایا، ان کی تعریف قرآن مجید میں اس طرح کی گئی ہے کہ "انہ کان صادق الوعد" تو انھوں نے فرمایا کہ کسی طرح جدہ پہونچ جاؤ آگے کا میں انتظام کرلوں گا۔ مجھے معلوم ہوا کہ حیدرآباد سے ہر سال لوگوں کو حج کے لیے بھیجا جاتا ہے اور انکو زادراہ دیا جاتا ہے۔ میں اس شوق میں حیدرآباد پہونچا۔ یہ ۱۳۲۲ھ تھا۔ میرا شروع سے اصول رہا ہے کہ جہاں جاتا تھا اور جہاں بھی ہوتا تھا کسی معمر اور بزرگ کی سرپرستی میں اپنے کو دیدیتا تھا اور کہدیتا تھا کہ میں کم سمجھ آدمی ہوں، میرے حرکات وسکنات نشست و برخاست پر نظر رکھیئے اور میری اصلاح فرماتے رہیئے، وہاں ہمارے خاندان کے ایک بزرگ تھے میں نے اپنے کو انکی سرپرستی اور نگرانی میں دے دیا، میں بھوپال سے گیا تھا، بہاں کے طریقہ کے مطابق السلام علیکم کہتا تھا وہ فرمانے لگے کہ تم دہابی ہو یہاں آداب عرض کہنے کا طریقہ ہے، انھوں نے فرمایا کہ تم یہاں آئے ہو تو خالی ہاتھ نہ جاؤ، کوشش کی جائے گی کہ تمہارا وظیفہ ہو جائے میں نے اس کو قبول کیا مگر سال بھر پڑا رہا کچھ نہ ہوا۔ اسی اثناء میں بھائی صاحب کا مدینہ طیبہ میں انتقال ہو گیا مجھے خوابوں سے بہت کم مناسبت ہے شاذو نادر ہی کوئی خاص خواب دیکھتا ہوں لیکن ان کے انتقال کے بعد ان کو دیکھا کہ مجھ سے فرماتے ہیں ع بجنازہ گر نیائی بمزار خواہی آمد۔

یہ خواب دیکھ کر مجھ پر وہاں پہونچنے کا ایسا شدید تقاضہ ہوا کہ بیچین ہوگیا جو صاحب اس امدادی شعبہ سے تعلق رکھتے تھے ان کے پاس گیا۔ میں نے کہا کہ آپ جو کچھ میرے لیے کر سکتے ہوں کیجئے کہنے لگے میرے اختیار میں تو صرف سو روپے کی رقم ہے۔ میں نے کہا کہ آپ دس آنہ پیسے ہی مجھے دیدیں تو میں اس کو بھی غنیمت سمجھوں گا۔ انھوں نے سو روپے میرے حوالہ کیے جس کے ۸۳ کلدار بنے۔ غرض میں بمبئی پہونچا اور وہاں سے جدہ اور وہاں سے مدینہ طیبہ حاضر ہوا وہاں میرے خاندان کے بعض بزرگ اور بعض شناسا تھے ان میں سے ایک صاحب نے اصرار کیا تم اپنے یہاں ٹھہرا لیا۔ میں نے مدینہ طیبہ کے قیام میں عزم کر لیا کہ چاہے مجھے بکریاں چرانی پڑیں میں یہاں سے نہ جاؤں گا لیکن جن عزیز کے یہاں میں ٹھہرا تھا ان کے یہاں ایک ایسے صاحب ٹھہرے تھے جو کسی فرضی ادارہ یا مقصد کے لیے چندہ جمع کرتے تھے اور پولیس کو ان کی تلاش تھی، بالآخر وہ گرفتار ہوئے اور صاحب خانہ بھی نظر بند کر دیے گئے۔ اندیشہ ہوا کہ میں بھی گواہوں میں پکڑا جاؤں اور پریشانی بھی لاحق ہو گی میرے عزیز نے چار بدوؤں کو بلایا اور میں ان کے ساتھ عام راستہ کو چھوڑ کر احد شریف کے پیچھے سے پاپیادہ مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہو گیا، راستہ میں میں نے عجیب عجیب چیزیں دیکھیں پھر مکہ معظمہ پہونچا حج سے فراغت کی وہاں سے حیدر آباد ہی واپس آ گیا۔ حیدر آباد میں سترہ برس رہا۔ بہت سے بزرگوں اور مشائخ کی خدمت میں وقت گزارا اس زمانہ میں وہاں وحدۃ الوجود کا بڑا زور تھا بہت سے مشائخ جن کی خدمت میں رہا، اس کے بڑے داعی اور مبلغ تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ یہی راستہ ہے، ایک بزرگ نے مجھ سے کہا کہ کبھی اپنے بزرگوں[1] کا لٹریچر بھی دیکھیے۔

اسی زمانہ میں مکتوبات پر نظر پڑی۔ سمجھنے کی استعداد تھی نہیں مگر آنکھیں کھل گئیں۔

مسکین شاہ صاحبؒ کا تذکرہ فرمانے لگے جو حضرت شاہ سعد اللہ صاحبؒ کے خلیفہ اور اور وہ حضرت شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے، فرمایا کہ زاہد و تارک الدنیا حقیقی معنی میں مسکین شاہ صاحب تھے۔ نظام دکن میر محبوب علیخاں بڑے رعب اور وقار

---

[1] یعنی حضرت مجدد علیہ الرحمۃ اور ان کے اخلاف کا،

گئے آدمی تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جرمنی کا شاہزادہ ان کے پہلو میں بیٹھا ہوا چوگڑہ(۱) میں سوار تھے اور شہزادہ اتنا مرعوب تھا کہ سمٹتا چلا جاتا تھا، اس خاندان میں عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے وقت سے کچھ اعمال و اشغال چلے آ رہے ہیں جن کی وجہ سے میر محبوب علیخاں مرحوم میں ایسی کیفیات تھیں، میں نے تو ان سے بعض کرامتوں کا ظہور بھی دیکھا ہے غرض میر محبوب علیخاں بہ این حشمت و وقار مسکین شاہ صاحب کے یہاں حاضر ہوتے وہ حجرہ میں مشغول ہوتے۔ نظام صحن میں ٹہلتے رہتے۔ جب وہ فارغ ہوتے اور عرض کیا جاتا کہ اعلیٰ حضرت تشریف لائے ہیں تو اندر آنے کی اجازت ہوتی۔ تھوڑی دیر کے بعد فرما دیتے کہ اب جائیے آپ کا حرج ہوگا۔ ایک دن وہ جاگیر کا پروانہ لے کر آئے، دیکھ کر فرمایا کم ہے کچھ اضافہ کیجئے پھر فرمانے لگے کہ سورج جہاں سے نکلتا ہے وہاں سے لے کر اس جگہ تک جہاں ڈوبتا ہے میری جاگیر ہے، وہاں سے مجھے رزق ملتا ہے۔ اب اس سے زیادہ آپ دے سکیں تو دے دیجئے۔ اسی طرح طالب الدولہ نے ایک باغ نذر کرنا چاہا، انکار فرما دیا اور کہا کہ اس مسجد کے پیچھے جو تھوڑی سی زمین ہے، وہ کافی ہو رہیں مسجد الماس کے پہلو میں مزار مبارک ہے۔ میرے دریافت کرنے پر فرمایا کہ میں نے ان کی زیارت نہیں کی، انھوں نے ۱۳۱۴ھ ہجری میں ارتحال فرمایا۔ میں ۱۳۲۲ھ میں حیدرآباد گیا ہوں، اس وقت ان کے جانشین تسکین شاہ صاحب تھے۔

فرمایا میں کسی طبقہ سے بھی خواہ اس کے کیسے ہی عقائد و خیالات اور اخلاق و عادات ہوں، اس طرح خطاب نہیں کرتا کہ وہ متوحش ہو پہلے اس سے اس طرح بات کرتا ہوں کہ وہ مانوس اور سننے کے لیے آمادہ ہو جائے میں اس سے کہتا ہوں کہ آپ کے اعمال و اخلاق اور آپ کے عادات غلط نہیں جو کچھ اختلاف ہے وہ محل اور غیر محل کا ہے یہ سب چیزیں صحیح ہیں مگر انکا ایک محل اور وقت ہے۔ اگر اپنے محل اور وقت پر ہو تو بالکل ٹھیک ہے اور اگر محل اور وقت سے پہلے ہو تو غلط ہی جیسے میں نے اس سے پہلے نسبت کے بعد جھانکنے اور دیکھنے کی مثال دی تھی کہ اس وقت جھانکنا اور دیکھنا غلط ہے اور شادی ہو جانے کے بعد نہ دیکھنا اور نہ جانا غلط

(۱) شاہی بگھی جس میں چار گھوڑے جڑتے تھے،

ہے۔ نفس کے تقاضہ اور لذائذ اپنی جگہ پر صحیح ہیں اور فطری و شرعی بھی ہیں۔ لیکن محل اور وقت کی شرط ہے جن کو لوگ دنیا دار اور نفس پرست کہتے ہیں۔ ان کو تقرب الی اللہ کا جو موقع ہے وہ بزرگوں اور مشائخ ہر وقت ذکر و تسبیح کرنے والوں کو نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنی خواہشات اور مالوفات کی قربانی کرکے وہ درجہ حاصل کر سکتے ہیں جو ایک خاص ماحول میں رہنے والے اور خاص وضع و طریق کے پابند نہیں کر سکتے جتنے فربہ اور تر و تازہ جانور قربانی کے لیے ان کے پاس ہیں دیندار اور مشائخ کے پاس نہیں۔ حدیث میں آتا ہے، سمنوا ضحایاکم فانھا علی الصراط مطایاکم اپنی قربانی کے جانوروں کو خوب کھلا پلا کر موٹا کرو۔ اس لیے کہ یہی پل صراط پر تمہاری سواریاں ہونگی یہی حال ان حضرات کے مالوفات و مرغوبات کا ہے کہ جس قدر زیادہ تعداد میں اور زیادہ دلکش اور دلآویز اور طاقتور ہوں گی۔ اس قدر یہاں ان کو راہ خدا میں ذبح و پامال کرنے سے آخرت میں درجے ملیں گے اور دنیا و آخرت میں مراتب ہوں گے، اسی لیے یہ اچھی بری سب خواہشات عطیہ خداوندی ہی ہیں اپنے محل استعمال سے ان کے اچھے برے ہونے کا حکم لگایا جاتا ہے فالھمہا فجورھا وتقوٰھا اب اگر کوئی انکو صحیح محل پر استعمال کرے تو اس کی ترقی اور کامیابی کا کوئی ٹھکانا نہیں قد افلح من زکٰھا اور اگر کوئی ان کو بے محل استعمال کرے اور اپنے نفس کو پستی میں اتار کر اپنی طاقت کو خاک میں ملا دے تو اس کی ناکامی کا بھی کوئی ٹھکانا نہیں وقد خاب من دسٰھا اس کے لیے سب حجابات اور موانع مرتفع ہو جائیں اور پھر وہ اللہ کے یقین اور اس کے خوف سے اپنی خواہش اور نفس کے تقاضہ پر عمل نہ کرے، اس کے درجات کو کوئی نہیں پہونچ سکتا۔ یہ حضرت یوسفؑ کا مقام تھا۔ لقد ھمت بہ وھم بھا لولا أن رأی برھان ربہ ... الآیۃ

فطرتِ انسانی قرآن اور حدیث کی روشنی میں

(جناب غلام حسین اظہر لیکچرار گورنمنٹ کالج راولا کوٹ، آزاد کشمیر)

تاریخ انسانی کے صدیوں پر محیط واقعات اور آئے دن رونما ہونے والے حوادث پر ہم جب نگاہ ڈالتے ہیں تو انسان کی شخصیت کے ایسے عجیب و غریب اور متضاد پہلو سامنے آتے ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ انسان کی فطرت کی افتاد کیا ہے؟ آگ اور خون کے دریا سے گزر کر انسان کو بچانے والا انسان دوسرے لمحے اپنے ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتارتا نظر آتا ہے۔ چنگیز کی خون آشام تلوار ہزاروں انسانوں کو تباہ و برباد کر دیتی ہے تو سقراط ہنسی خوشی انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے زہر کا پیالہ نوش کر جاتا ہے۔ ان عجیب و غریب واقعات کو پڑھ کر انسان کے دل میں فطرتِ انسانی کو جاننے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے انسان کیا محض بد یا محض نیک ہے یا نیکی اور بدی کا مجموعہ۔ وہ حالات کے ہاتھوں مجبور ہے یا اپنی تقدیر کا خود خالق ہے۔ ذہن میں ایسے سوالات بار بار ابھرتے ہیں اور روزِ ازل سے اب تک انسان اس گتھی کو سلجھانے میں مصروف ہے۔

فطرتِ انسان کے بارے میں ان اہم ترین سوالات کا جواب دریافت کرنے کی ہر دور میں کوشش کی گئی ہے۔ مختلف مفکرین نے اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات اور روحِ عصر کی روشنی میں مختلف نظریات پیش کیے ہیں۔ مفکرین کا وہ گروہ جس کی نگاہ تاریخِ انسانی

کے بھیانک اور روح فرسا پہلوؤں تک محدود رہی ہے، اُس نے انسان کو سراپا شر قرار دیا ہے۔ اور اس شر کی مختلف وجوہ اور اس کے مختلف حل تجویز کیے ہیں۔ بدھ مت کے نزدیک خواہشات کی نفی سے اس شر سے نجات ممکن ہے، ہندومت کے نزدیک تناسخ کے ذریعہ اس شر کے اثر سے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے۔ وام مارگیوں کی دانست میں نیک اور بد کی تمیز ختم کر دینی چاہیے۔ چنانچہ وہ نجاست تک سے پرہیز نہیں کرتے۔ عیسائیت اس شر کی وجہ موروثی گناہ کو قرار دیتی ہے۔ اور اس گناہ کا کفارہ حضرت مسیحؑ نے ادا کیا ہے فلسفیوں اور ماہرینِ نفسیات کی بھاری اکثریت انسان کو مجبورِ محض گردانتی ہے۔ ان کے نظریات کے مطابق انسان کی حیثیت سمندر میں ایک تنکے کی سی ہے جو بے دست و پا دھارے کے رُخ پر بہتا چلا جاتا ہے۔ اور سمندر کے تھپیڑے اس کی منزل کو متعین کرتے ہیں۔ اس کے بس کی کوئی بات نہیں۔ بہت سی بحثوں کے بعد یہ حضرات انسان کو ماحول کے سامنے سرنگوں کر دیتے ہیں۔ اور انسان کو طبعاً مجرم تصور کرنے کے بعد یہ مزمن مرض کے علاج کے نسخے تجویز کرتے ہیں۔ اس بہت بڑے گروہ کے مقابلے میں ایک محدود گروہ ان مفکرین کا ہے جس نے انسان کی اچھائیوں پر توجہ دی ہے۔ لیکن یوں کہ اس کی کمزوریاں اس کی نظر سے اوجھل ہو گئی ہیں۔ ان تمام مفکرین کے نظریات میں کسی نہ کسی حد تک صداقت موجود ہے لیکن یک رُخا مطالعہ کی کرشمہ سازی نے انھیں متوازن رائے قائم کرنے نہیں دی۔ اسلام نے ان تمام نظریات کے برعکس انسان کے اچھے اور بُرے دونوں پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر انسانی فطرت کے بارے میں معتدل اور متوازن نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ اُس نے انسان کو فرشتہ قرار دیا ہے نہ محض حیوان۔ بلکہ ان دونوں نظریات کے برعکس یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ انسان میں نیکی اور بدی کی صلاحتیں موجود ہیں۔ اور ان میں اسے امتیاز کرنے کی صلاحیت بھی بخشی گئی ہے۔ لیکن ان کو بروئے کار لانے میں انسان ہزارہا دقتوں اور مجبوریوں کے باوجود آزاد ہے۔ اسلام انسان کو ایک درندہ قرار نہیں دیتا، جو نیکی اور بدی کے امتیاز سے بے بہرہ ہے اور اسے یونہی دنیا میں بغیر رہنمائی کے پھینک دیا گیا ہے۔ انسانی فطرت کے بارے میں قرآن مجید نے قطعی واضح الفاظ میں یہ رائے[ع] پیش کی ہے۔

ع قرآن مجید کیلئے "رائے" کا لفظ صحیح نہیں ہے۔ رائے میں غلطی کا احتمال ہوتا ہے (الفرقان)

۱۔ ونفس وما سوٰھا فالھمھا فجورھا وتقوٰھا قد افلح من زکھا وقد خاب من دسھا۔

۲۔ الذی خلق فسوٰی والذی قدر فھدٰی

۳۔ بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ والوالقی معاذیرہ

ان مذکورہ آیات میں قرآن نے بالوضاحت یہ بیان کیا ہے کہ انسان کے نفس میں نیکی اور بدی الہام کردی گئی ہے۔ خداوندتعالیٰ نے اس میں صلاحیتوں کے ودیعت کرنے کے ساتھ نیکی اور بدی میں تمیز کی صلاحیت بھی بخشی ہے اور انسان خواہ کتنے ہی بہانے تراشے، اس کا ضمیر اسے نیکی اور بدی سے ہمیشہ آگاہ کرتا رہتا ہے۔ اس نظریہ سے قرآن نے ان تمام نظریات کو باطل قرار دیا ہے جو ایسے نظریۂ ارتقاء کے قائل ہیں جو انسان کو حالات کی گونگی اور بہری قوتوں کے سامنے ہیچ قرار دیتا ہے جس کے نزدیک انسان روشنی کی تلاش میں اندھیرے میں ہاتھ ٹوئیاں مار رہا ہے۔ روشنی کی تلاش میں کاروانِ زندگی اب تک بھٹکتا آرہا ہے اور کئی پُرخطر گھاٹیوں میں انسانیت بار بار لہو لہان ہوئی ہے۔ قرآن اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ روشنی کی شمع قلب انسان میں روزِ ازل سے روشن ہے۔

نظریۂ ارتقاء کے غلط تصوّر کی تردید اور خیر و شر کے بارے میں متوازن نقطۂ نظر پیش کرنے کے بعد قرآن نے جبر و قدر اور فرد اور سماج کے اس متنازعہ فیہ مسئلہ پر بھی روشنی ڈالی ہے جو خرد کی گتھیاں سلجھانے سے بتدریج الجھتا گیا ہے۔ قرآن کا نقطۂ نظر یہ ہے:۔

انا ھدینٰہ السبیل اما شاکرا واما کفورا۔ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا قرآن نے اس عذر لنگ کو ختم کردیا ہے جس کی بنیاد پر اپنے گناہوں کا پھندہ معاشرے کے گلے میں لٹکانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

قرآن نے انسانی فطرت کے بنیادی خدوخال کو بیان کرنے اور جبر و اختیار کی حدود کے تعین کے علاوہ اس اہم مسئلہ کو بھی سلجھایا ہے کہ انسان میں نیکی اور بدی کی یہ قوتیں انسان کو گرداب میں الجھانے کے بجائے اس کے لیے کیسے پتوار کا کام دیتی ہیں۔

اس مسئلہ پر بیشتر مفکرین نے ٹھوکر کھائی ہے۔ انھیں انسان نیکی اور بدی کی قوتوں کے ہاتھوں میں کھلونا نظر آیا ہے اور انھوں نے اس آب و گل کے ہنگاموں کو ایک کھلنڈرے کا کھیل تصور کیا ہے، جو انسان کو مختلف مصائب میں الجھا کر تماشہ دیکھ رہا ہے' یونانی المیہ کی بنیاد ہی اس تصور پر استوار ہے، قرآن کا نقطۂ نظر اس نظریہ کے بالکل برعکس ہے قرآن کے نزدیک انسانی فطرت میں تمام ودیعت کردہ صلاحیتیں، جو سطحی نظر میں برسرپیکار نظر آتی ہیں، ایک دوسرے کے ممد و معاون اور لازم و ملزوم ہیں اور انسانی شخصیت کی تکمیل کے لیے ان کا وجود ناگزیر ہے۔ قرآن نے "احسن تقویم" "تسویہ" اور "عدل" کے جو الفاظ بار بار دہرائے ہیں ان کا مقصد اس حقیقت کی نقاب کشائی ہے کہ انسانی فطرت میں ہی اس کی خرابی مضمر نہیں بلکہ ان کا غلط استعمال تباہی و بربادی کا سبب بنتا ہے۔ اس حقیقت کا اظہار ہی ان آیاتِ کریمہ کا اصل مدعا ہے۔

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ ثم رددناہ اسفل سافلین۔

اسفل سافلین کی منزل انسان کی اپنی کوتاہ اندیشیوں اور بداعمالیوں کا نتیجہ ہے، ورنہ انسان میں ودیعت کردہ تمام جبلتیں انسان کے انفرادی وجود اور اس کے نوعی وجود کی بقا کے لیے اشد ضروری ہیں۔ اور انسان کی بقا کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے ان میں سے ہر ایک خواہش اور اس کے حصول کی استعداد انسان کی سرشت میں رکھی گئی ہے۔ اصل مقصد ان صلاحیتوں کا متوازن استعمال ہے۔ اسلام ان صلاحیتوں میں کسی صلاحیت کے دبانے یا مٹانے کا ہرگز قائل نہیں۔ اصل قابلِ اعتراض چیز ان کا بے محابا اظہار اور افراط و تفریط کی راہ ہے۔ انسان میں ودیعت کردہ جبلتیں انسان کی راہ میں رکاوٹ بننے کے بجائے اسے کیسے ترقی کی راہ پر لے جاتی ہیں، شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس موضوع پر بڑی فکر انگیز اور سیر حاصل بحث کی ہے۔ شاہ صاحبؒ نے ہر کمزوری پر قابو پاتے والی صلاحیت کی نشان دہی کی ہے مثلاً "وہ ملکہ جس سے حرص و آز کے دواعی کی مدافعت کی جاتی ہے اسے "قناعت" کہا جاتا ہے اور وہ ملکہ جس سے عجلت اور جلد بازی کے دواعی کی مدافعت کی جائے، اسے "تانی" کہا جاتا ہے۔ اور وہ ملکہ جس

سے "غیظ و غضب کی مدافعت کی جائے، اس کا نام حلم ہے"۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے جن چند پہلوؤں کی نشان دہی کی ہے، اس زاویۂ نظر سے اور انسانی جبلتوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر وہ جبلت جو بظاہر ہمیں ضرر رساں نظر آتی ہے وہ در اصل بہت سے ایسے نقصان دہ امور کا تدارک کرتی ہے جو انسانیت کی بقا کے لیے زہر ہلاہل ہیں۔

انسانی جبلتوں کی اہمیت اور افادیت اور ان کے بظاہر متناقض پہلوؤں میں ربط باہم کی نشاندہی کے علاوہ قرآن کے غائر مطالعہ سے ان قوتوں کا بھی ادراک ہوتا ہے جو بدی کی راہ میں روک بنتی ہیں۔ فرائڈ کی نظروں سے چونکہ یہ پہلو اوجھل تھا اس لیے وہ CATHEXES اور ANTI CATHEXES کا نام تو لیتا رہا لیکن وہ اس کے اس مدعا تک نہ پہونچ سکا۔ یہ CATHEXES اور ANTI CATHEXES کی کھینچا تانی در حقیقت نفسِ امارہ، نفسِ لوامہ اور نفس مطمئنہ کی کش مکش ہے۔ انہی تین حالتوں کو جدید نفسیات کی اصطلاح میں ہم " اڈ (ID) ایغو اور سُپر ایغو" بھی کہہ سکتے ہیں۔ پہلی حیوانی حالت ہے، جو انسانی خواہشات اور نفسانی میلانات کا بے محابا اظہار چاہتی ہے۔ ایغو نفس لوامہ کا کام دیتی ہے۔ ایغو، سپر ایغو اور اڈ کے درمیان سمجھوتے اور ان میں کلی یگانگت سے نفس مطمئنہ کی کیفیات جنم لیتی ہیں۔ نیکی اور بدی میں امتیاز کی صلاحیت کے اظہار کی صورت کو قرآن نے نفسِ انسانی کی ان تین حالتوں سے واضح کیا ہے۔ نفسِ لوامہ کے کام کو واضح کرنے کے لیے قرآن نے "حیا، منکر اور معروف" کی اصطلاحیں بھی پیش کی ہیں۔ ان اصطلاحوں کا بنیادی مقصد بھی اس حقیقت کا اظہار ہے کہ انسان بعض اوقات حیوانی سرشتوں سے مغلوب ہوجاتا ہے۔ لیکن یہ "حس" جسے مذکورۂ بالا اصطلاحوں سے واضح کیا گیا ہے۔ انسان کو سرزنش کرتی ہے۔ یہ حس انسان سے گناہ سرزد ہونے کے بعد اس کے دل میں چٹکیاں بھی لیتی رہتی ہے۔ اسلامی تعلیم و تربیت کا اصل مقصود انسان میں چھپے ہوئے اس مادّے کو فہم و شعور کی غذا مہیا کرنا ہے۔ اس صلاحیت کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "جب تجھ میں حیا نہیں جو جی چاہے کر" اور اسی وجہ سے حضور ہر کام کے بارے میں یہ فرمایا کرتے تھے

کہ تو اپنے دل سے پوچھ، دل کی کسک اور کھٹک اسی حس کا مظہر ہے۔ جوں جوں یہ حس کند ہوتی جاتی ہے، انسان گناہوں میں دلیر ہوتا جاتا ہے۔ حضور اکرمؐ نے چند احادیث میں اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے :-

۱۔ "نیکی طمانیتِ قلب ہے، اور شر وسوسہ اور دل کی کھٹک۔"

۲۔ نیکی حسنِ خلق ہے اور بدی وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے۔"

انسان میں نیکی اور بدی کے امتیاز کی یہ صلاحیت کیسے جنم لیتی ہے۔ اور کیسے آہستہ آہستہ بعض انسانوں اور معاشروں میں یہ صلاحیت مردہ ہو جاتی ہے۔ اس پہلو پر قرآن و حدیث نے تفصیل سے بحث کی ہے۔ قرآنِ حکیم میں "نفس لوامہ" اور حیا کی کھٹک کی واضح مثالیں سورۂ یوسف اور سورۂ مائدہ میں موجود ہیں۔ برادران یوسف جب یوسف علیہ السلام کو کنویں میں پھینکتے ہیں تو نفسِ لوامہ کی کسک کو یوں دور کرتے ہیں کہ آئندہ وہ توبہ کر لیں گے۔ سورۂ مائدہ میں قابیل اور ہابیل کے قصہ میں بھی اسی نفسیاتی کیفیت کو پیش کیا گیا ہے۔ ہبوطِ آدم میں بھی اسی نفسیاتی کیفیت کی طرف بار بار توجہ دلائی گئی ہے۔ نفسِ لوامہ کی کیفیات اور مجرموں کی نفسیات کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے سادہ اور دل نشیں انداز میں یوں پیش کیا ہے:-
جب کوئی بندہ گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ ڈال دیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بدی کی رغبت اس کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن جب وہ توبہ کرتا ہے، یہ داغ مٹ جاتا ہے اور اس کا دل صاف ہو جاتا ہے۔ لیکن جب وہ بار بار گناہ کرتا ہے تو اس کا دل پوری طرح سیاہ ہو جاتا ہے۔ اس کا نام رین ہے۔ رین کی کیفیت کو قرآن نے انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ قرار دیا ہے ران علیٰ قلوبھم ما کانو یکسبون۔ رین۔ طبع۔ قفل" کے متعلق مفسرین نے جو بحثیں کی ہیں، ان سے بھی فطرت انسانی کے بہت سے گوشے سامنے آتے ہیں۔ ان کی بحثوں کا لب لباب یہ ہے۔

"رین": ایسا تغیر جو بیرونی اثرات سے پیدا ہو جاتا ہے۔ رین کے معنی زنگ کے ہیں۔ یہ لفظ اس مفہوم پر دلالت کرتا ہے کہ کسی چیز کے اندر تغیر پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے اور وہ اپنی ماہیت کھو بیٹھی ہے۔ اس تغیر کے اظہار کے لیے رین کا لفظ بولا جاتا ہے۔

"طبع" اس نے دوسرے کے نقش کو قبول کرنا شروع کر دیا ہے۔
"اقفال" اب یہ چیز خود نہیں کھل سکتی۔ خدا ہی اسے کھول سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ رین سے مراد بیرونی گناہوں کا اس قدر اثر ہے کہ قلب جو نیکی کا منبع تھا، اسکی ماہیئت ہی بدل گئی ہے اور اب وہ بدی میں دلیر ہو گیا ہے۔ لیکن طبع میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان کے دلوں پر گناہوں کا ٹھپہ لگ گیا ہے۔ اقفال ان کی اصلاح اپنے اختیار سے باہر ہو گئی ہے۔

اس موضوع پر قرآن و حدیث میں اور صوفیاء اور مفسرین کے ہاں جو مواد موجود ہے اس کی روشنی میں فرد اور معاشرہ کے ربط باہم کا مسئلہ بھی سلجھ جاتا ہے۔ اسلام کے نظریہ کے مطابق انسان معاشرتی تقاضوں کے ہاتھوں مجبور محض نہیں ہے۔ لیکن وہ ان اثرات سے دامن بھی نہیں بچا سکتا۔ اسی وجہ سے قرآن و حدیث میں انفرادی اصلاح کے علاوہ اجتماعی اصلاح پر زور دیا گیا ہے۔ اور اسی لیے اقامت دین امت مسلمہ کا اولین فرض ہے۔ جب کسی معاشرے پر اس کے گناہوں کی وجہ سے عذاب نازل ہوتا ہے تو اس کی لپیٹ میں وہ صلحاء بھی آجاتے ہیں جو گوشہ گزیں ہو کر اللہ کا نام لے رہے ہیں۔ فرد اور سماج کے ربط باہم سے انسانی کردار کیسے متاثر ہوتا ہے، اس کو نبی اکرمؐ نے مختصر سے الفاظ میں واضح کر دیا ہے: "ہر بچہ فطرت سلیم لے کر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے والدین اسے مجوسی، یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں۔" معاشرے کے ہمہ گیر اثرات کو واضح کرنے کے لیے ہی قرآن نے بدی کی راہ کو اسفل سافلین کہا ہے۔ یعنی انسان لڑھکتا چلا جاتا ہے۔ دھیرے دھیرے خود بخود معاشرے کا رنگ اپنا لیتا ہے۔ نیکی کی راہ کو سورۂ بلد میں "اقتحام عقبۃ" دشوار گذار گھاٹی کو سر کرنے کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کی دعوت کا آغاز ملوک اور ان کے حواریوں "ملاءھم" سے ہوتا ہے۔

قرآن و احادیث کی روشنی میں انسانی فطرت کے ان پہلوؤں کی نشاندہی کے بعد چند اور سوالات بھی توضیح طلب ہیں۔ ان میں اولیں سوال ان آیات کی توجیہہ و توضیح ہے جن میں فطرت انسانی کے چند تاریک پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً انسان چھچھورا ہے۔

انسان ناشکرا ہے۔ انسان حریص ہے۔ انسان ظالم اور جاہل ہے۔ ان آیات کے سطحی مطالعہ سے اکثر حضرات کو یہ گمان گزرتا ہے کہ یہ آیات ان آیات کی تردید کرتی ہیں۔ جن میں انسانی فطرت کے ارفع پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے۔ ان آیات کے پس منظر اور اصل مدعا کو نظر میں نہ رکھنے کی وجہ سے دبی زبان میں ان میں تناقض کا اعتراض بھی اٹھایا جاتا ہے۔ بظاہر یہ اعتراض بہت وزنی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ اعتراض دقتِ نظر سے کام لینے اور ان آیات کے اصل مدعا پر غور کرنے سے از خود دور ہو جاتا ہے۔ اولاً یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ان آیات میں جن صفات کی جانب اشارہ کیا گیا ہے وہ تمام انسانوں پر لاگو نہیں ہوتیں بلکہ ان کا مقصد چند انسانوں کی گمراہیوں پر گرفت کرنا ہے۔ دوسرے یہ امر بھی غور طلب ہے کہ یہ سلبی صفات ہیں ان کی موجودگی کے لیے ایجابی صفات کا موجود ہونا ضروری ہے۔ ہم ناشکرا اسے قرار دیتے ہیں کہ جو شکر پر قادر ہو۔ اور جاہل اور ظالم اسے کہیں گے جو علم اور عدل کی قدرت رکھنے کے باوجود اس سے کام نہ لے۔ اس سے اس بات کی بھی تائید ہوتی ہے کہ ان آیات کا بنیادی مقصد ان ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلانا ہے، جن سے انسان انحراف برت رہا ہے۔ ان پہلوؤں کی طرف توجہ دلانے کا مدعا یہ بھی ہے کہ انسان اپنی فطرت کے کمزور پہلوؤں سے متنبہ رہے اور اچھے پہلوؤں کا تحفظ کر سکے۔ یہ چیزیں نہ بطور چارج شیٹ پیش کی گئی ہیں اور نہ جبریت کا تصور دینے کے لیے۔ بلکہ ان سے ایسے پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو ایک طرف ضروری بھی ہیں لیکن انھیں کا حد سے تجاوز کرنا خرابیاں بھی پیدا کرتا ہے۔

اس شبہ کے ازالہ کے بعد یہ اہم سوال بھی قابلِ غور ہے کہ انسان اگر طبعاً سلیم الفطرت ہے تو کیا وجہ ہے کہ طاغوتی طاقتیں اکثر و بیشتر غالب رہی ہیں اور دنیا میں ہر دور میں جبر و تشدد اور ظلم و تعدی کا ہنگامہ بپا رہا ہے۔ ایسے سعید ادوار شاذ ہی آئے ہیں، جب انسانیت نے چین اور سکھ کا سانس لیا ہو۔ یہ سوال بہت اہم ہے اور اس سوال پر غلط انداز سے سوچنے کی وجہ سے اکثر فلسفیوں اور ماہر نفسیات نے انسان کو سراپا شر قرار دیا ہے۔ اور مایوسی اور قنوطیت کا شکار ہو کر جبریت کے تصور کی حمایت کی ہے۔ تاریخ انسانی کے دلدوز

اور جابجا واقعات پر نگاہ ڈالنے سے کئی بار یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ دنیا ہنگامۂ شر کا دوسرا نام ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی صرف نظر ممکن نہیں کہ انسان نے کسی دور میں بھی باطل کو باطل جان کر قبول نہیں کیا۔ باطل کو ہمیشہ حق کے لبادے میں پیش کیا گیا ہے۔ باطل کے ان جھوٹے لبادوں سے چند دنوں کے لیے آنکھیں ضرور خیرہ ہوتی رہی ہیں لیکن بالآخر ہر دور میں طلسم سامری کو توڑنے کے لیے کوئی نہ کوئی موسیٰ بھی جنم لیتا رہا ہے۔ چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی کی پیہم پیکار اس حقیقت کی غماز ہے کہ نیکی اور اچھائی کی طلب ہر دور میں موجود رہی ہے۔ لیکن چونکہ عنانِ اقتدار خود غرض لوگوں کے ہاتھ میں رہی ہے۔ اس لیے نیکی کی قوتیں مجتمع نہیں ہو سکیں۔ انسان نے عجلت میں بعض اوقات بدی کو نیکی سمجھ لیا ہے۔ لیکن اس کا مقصود بدی اور شر کبھی نہیں رہا۔ اس حقیقت کی طرف قرآن نے یوں توجہ دلائی ہے "ویدع الانسان بالشر دعاءہ بالخیر وکان الانسان عجولا" اسی کیفیت کو قرآن نے سولت لہ نفسہ کے الفاظ میں بھی ظاہر کیا ہے یعنی اسکے نفس نے اس کیلئے برائی کو دلفریب بنا کر پیش کیا۔ غلط ماحول، غلط تربیت اور غلط معاشرے کی وجہ سے مختلف ادوار میں ضمیر کی روشنی ماند ضرور پڑ جاتی رہی ہے لیکن کوئی دور بھی ایسا نہیں جب یہ روشنی بالکل بجھ گئی ہو۔ فطرتِ انسانی میں نیکی اور اچھائی کی طلب کا داعیہ اور اس کے حصول کے لیے انسان کی ان گنت قربانیاں انسانیت کے روشن اور تابناک مستقبل کی ضامن ہیں۔ فطرت انسانی کے اس داعیہ کو سامنے رکھ کر جب مختلف واقعات کا جائزہ لیا جائے تو مایوسی کی وہ تمام گھٹائیں چھٹ جاتی ہیں، جو وقتی طور پر تاریخ انسانی اور فطرتِ انسانی کے یک رخا مطالعہ سے دل و دماغ پر چھا جاتی ہیں اور انسان کو مایوسی اور قنوطیت کے تعر میں گرا دیتی ہیں۔

اسلام کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے انسان کو نہ تو اندھی اور بہری خارجی قوتوں کا تابع مہمل قرار دیا نہ جبلتوں کے ہاتھوں میں کھلونا۔ بلکہ ان قوتوں اور جبلتوں کا صحیح رُخ متعین کرنے میں مدد دی ہے۔ اسلام نے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ فطرتِ الٰہی کا منشا انسانی خواہشات پر پہرہ بٹھانا ہے نہ انسانی جبلتوں کو فنا کرنا۔ فطرت حق صرف یہ چاہتی ہے کہ انسان اپنی ان خواہشات کو پورا کرنے اور ان استعدادات سے کام لینے میں نرا حیوان نہ بن جائے۔ اسلام نے انسانی جبلتوں کی افادیت کو واضح کرنے کے علاوہ ان کے اظہار کی متوازن

راہیں بھی متعین کیں ــــ افسوس یہ ہے کہ جدید علم نفسیات کا ارتقاء ایسے دور میں ہوا ہے جب مغرب میں خود غرضی اور نفسا نفسی اپنے عروج پر تھی اور تنازع للبقاء کے نظریہ کے سہارے انسان انسان کا گلا کاٹ رہا تھا۔ ایسے حالات میں جنم لینے کی وجہ سے فرائڈ جیسے نابغۂ روزگار کی نظروں سے بھی وہ پہلو اوجھل رہے جو ایثار، بے نفسی اور بے لوثی کے مظہر ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ حقیقت روشن ہوتی جا رہی ہے کہ انسان کے بارے میں یہ تصور غلط ہے اور یورپ میں فرائڈ کی فکر کے خلاف بغاوت جاری ہے۔ اور یہ بغاوت خود اس حقیقت کی شاہد ہے کہ انسان ہزار بار بھٹکنے کے باوجود اچھائی کا جویا ضرور رہتا ہے۔ اور اس کی کوتاہیاں، جذبات کے ہیجانات میں آجانے یا مبینہ اور ان الہامی ہدایات کو نظر انداز کرنے کی صورت میں سرزد ہوتی ہیں۔ ورنہ انسان طبعاً سلیم الفطرت ہے اور نیکی اور بدی میں امتیاز کی صلاحیتوں سے پوری طرح بہرہ ور بھی۔

(بشکریہ فکر و نظر اسلام آباد)

خدا کی ہستی

عقل سلیم اور قرآن کی روشنی میں

(از مولانا محمد منظور نعمانی)

[رابطۂ عالم اسلامی کے سالانہ اجلاس (منعقدہ رجب) میں شرکت کے موقع پر سعودی ریڈیو نے مولانا سے چند تقریریں ریکارڈ کرانے کی فرمائش کی تھی۔ خدا کی ہستی اور آخرت کے موضوع پر کی گئی دو تقریریں یہاں درج کی جا رہی ہیں۔] ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خدا کی ہستی کا مسئلہ دین و مذہب کا پہلا بنیادی مسئلہ ہے، اور چونکہ انسان کی عقل سلیم کے لیے خود اپنے وجود کی طرح خدا کا وجود بھی ایک بالکل بدیہی حقیقت ہے جس کے لیے کسی منطقی بحث و استدلال کی قطعاً ضرورت نہیں، اس لیے قرآن کریم نے جہاں بھی اس مسئلہ پر گفتگو فرمائی ہے وہاں اس نے انسانوں کی صحیح اور سلیم عقل سے صرف یہ اپیل کی ہے کہ کائنات کا یہ سارا نظام جس کو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو بلکہ تم خود اس کا ایک جزو ہو، اس میں ذرا غور و فکر کرو تو خدا کی قدرت اور اس کی کارفرمائی کی کھلی نشانیاں تم خود اس میں پا لوگے۔ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ

وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○ (البقرہ ۱۶۴)

اس آیت میں قرآن مجید نے زمین و آسمان کی ساخت، رات دن کی آمد و رفت کے مقررہ نظام، سمندروں میں کشتیوں اور جہازوں کی چلت پھرت، بارش اور اسکے آثار و نتائج، ہواؤں کے تغیرات اور آسمان و زمین کے درمیان ایک خاص نظام کے تحت رہنے والے بادلوں کی طرف اشارہ کر کے انسانوں سے کہا ہے کہ ان چیزوں میں غور کرو، اگر تم عقل سلیم سے کام لوگے تو ان میں کی ہر چیز تمہیں زبان حالی سے صاف صاف بتلائے گی کہ وہ جو کچھ ہے اور جس حال میں ہے آپ سے آپ ایسی نہیں بنی ہے بلکہ کسی حکیم و خبیر اور کامل قدرت والی ہستی نے اسے ایسا بنا دیا ہے۔

پھر سورۂ انعام میں ارشاد ہے

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ○

یقیناً اللہ ہی ہے پھاڑنے والا دانے اور گٹھلی کا وہی نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالنے والا ہے مردہ کو زندہ سے یہ سب کچھ کرنے والا اللہ ہی ہے۔ پھر تم کدھر بہکے چلے جا رہے ہو۔

مطلب یہ ہے کہ انسان برابر دیکھتے ہیں اور تجربہ کرتے ہیں کہ غلہ کے کسی ننھے سے دانے کو یا کسی پھل کی گٹھلی کو زمین میں دبا دیا جاتا ہے پھر وہ دانہ اور گٹھلی اندر ہی اندر پھٹتے ہیں اور ان میں سے ایک نہایت نرم و نازک ریشہ نکلتا ہے اور وہ زمین کو چیرتا ہوا اوپر نکل آتا ہے تو غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس دانے کو یا گٹھلی کو زمین کے اندر کس نے قاعدہ سے شگافتہ دیا اور کس نے اس بے جان اور سوکھے ہوئے دانے یا گٹھلی میں سے وہ ہرا جاندار ریشہ یعنی اکھوا نکالا، پھر وہ ریشہ جو ریشم کے دھاگے سے بھی زیادہ نرم ہوتا ہے

کس کی کارفرمائی سے زمین کی تہوں کو چیرتا ہوا اوپر نکل آیا؟ ــــــ تو قرآن پاک کی اس آیت میں بتلایا گیا کہ یہ سب کچھ اللہ کی قدرت سے اور اسی کی کارفرمائی سے ہوا۔ اِنَّ اللّٰہَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی۔

آگے فرمایا، اسی طرح تم دیکھتے ہو کہ ایک بالکل بے جان چیز میں سے جاندار چیز پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً بے جان انڈے میں سے بولنے چہکنے والی اور آسمان کی فضاؤں میں اڑنے والی چڑیا نکل آتی ہے۔ اور بعض جاندار چیزیں بجائے جاندار بچہ جننے کے بے جان انڈا دیتی ہیں اور پھر اسی بے جان انڈے سے جاندار بچہ نکل آتا ہے ــــــ قرآن مجید انسان کے اس روزمرہ کے تجربہ اور مشاہدہ کو سامنے رکھ کر کہتا ہے کہ یہ سب کرشمے اللہ ہی کی قدرت کے ہیں اور یہ سب کچھ کرنے والا اللہ ہی ہے۔ اور سورۂ ذاریات میں ارشاد فرمایا ــــــ

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝

اور یقین لانے والوں کے لیے زمین میں ہماری نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں، اور خود تمہارے اندر بھی ہیں تو کیا تم کو دکھلائی نہیں دیتا!

مطلب یہ ہے کہ انسان اگر اپنی بصیرت سے کام لے اور دیکھنا چاہے تو زمین کے طول و عرض میں ہماری ہستی اور ہماری قدرت کی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں اور خود انسانوں کے وجود میں بھی ہماری کچھ نشانیاں موجود ہیں، وہ اپنے ہی بارے میں ذرا غور کرے کہ ماں کے رحم میں اس کی یہ حسین و موزوں صورت کس نے بنائی، کس نے دیکھنے والی آنکھ بنائی؟ کس نے سننے والے کان بنائے؟ کس نے ذائقہ لینے والی زبان اور سونگھنے والی ناک بنائی؟ کس نے اس کی زبان کو گویائی دی؟ کس نے ماں کے پستانوں میں اس کے لیے دودھ کی نہر جاری کی؟ کس کے قبضہ میں اس کی زندگی اور موت ہے؟ ــــــ انسان اگر خود اپنے بارہ میں ان سوالوں پر غور کرے تو ہر سوال کا جواب اس کی عقل یہی دے گی کہ یہ سب کچھ نظر نہ آنے والی ایک حکمت و قدرت والی ہستی نے کیا، اور وہی اللہ ہے۔

اور سورۂ نحل میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَاِنَّ لَکُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَۃً ؕ نُسْقِیْکُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِہٖ مِنْۢ بَیْنِ

فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ ○

اور تمہارے لیے تمہارے مویشیوں میں بھی غور و عبرت کا بڑا سامان ہے، ہم تم کو اُن کے پیٹ میں سے خون اور غلیظ فضلہ کے درمیان سے پاک صاف دودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کیلئے بڑا خوشگوار ہوتا ہے

قرآن کہتا ہے کہ جن مویشیوں کا تم دودھ پیتے ہو۔ ذرا اُن ہی میں تم غور کرو، اُن کے پیٹ میں خون کی نالیاں ہیں جن میں ہر وقت خون دوڑتا رہتا ہے۔ اسی طرح غلیظ فضلہ کا ایک خزانہ ہے اور اس کے راستے ہیں، اور کوئی لمحہ ایسا نہیں ہوتا کہ ان مویشیوں کے جسم میں سرخ رنگ کے ناپاک خون اور بدبودار غلیظ فضلہ کی کافی مقدار بھری نہ رہتی ہو لیکن ان مویشیوں کے جسم کے جن حصوں میں خون اور غلاظت بھری رہتی ہے اُسی کے قریب سے لطیف اور صاف سفید دودھ نکلتا ہے جس میں نہ خون کے رنگ کی کوئی آمیزش ہوتی ہے اور نہ غلیظ فضلہ کی بدبو کا کوئی اثر دہ پینے والوں کے لیے کیا خوشگوار، خوش ذائقہ اور نفیس مشروب ہے ——— تو ذرا سوچو کہ یہ کس کی کاریگری ہے، کیا جس بیچاری گائے یا بھینس، یا بکری میں سے دودھ نکلتا ہے یہ اُس کا فعل ہے، کیا کسی انسان نے دودھ کی یہ عجیب و غریب زندہ مشین بنائی ہو ——— نہیں ہرگز نہیں ——— یہ صرف اس حکیم و خبیر ہستی کی قدرت کا کرشمہ ہے جس نے اس ساری دنیا کو اور تم کو بھی پیدا کیا ہے۔

اور سورہ ابراہیم میں خدا کی ہستی ہی کے متعلق نہایت مختصر لفظوں میں اور ایسے ایسے انداز میں کتنی بلیغ اور کیسی تشفی بخش بات کہی گئی ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے

اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ

کیا تمہیں اس اللہ کی ہستی میں شک ہے جو تمام آسمان، زمین اور ان کے اندر کی ساری کائنات کا بنانے والا ہے۔

قرآن کریم نے اس مختصر سوالیہ جملے کے ذریعہ انسانوں کے سامنے غور و فکر کے لیے زمین و آسمان کی ساری وسعتیں رکھ دی ہیں۔

آنکھوں والا انسان آسمان کو دیکھتا ہے، چاند سورج اور ستاروں کو دیکھتا ہے ان کی روشنی اور ان کی گرمی یا خنکی کو دیکھتا ہے، زمین کو اپنے نیچے پاتا ہے۔ اس میں دریا اور پہاڑ

دیکھتا ہے، باغات دیکھتا ہے، لہلہاتے ہوئے کھیت دیکھتا ہے، اُن سے پیدا ہونے والا غلہ اور میوے اور پھل کھاتا ہے، اُس کے خوش رنگ پھول دیکھتا ہے اور اُن کی خوشبو سونگھتا ہے، اس سے پیدا ہونے والی بے شمار چیزوں کو استعمال کرتا ہے اور ان کے عجیب و غریب خواص و اثرات سے فائدہ اٹھاتا ہے ___ پھر جب تک کہ اُس کی عقل بالکل مسخ نہ ہو جائے وہ یہ نہیں سوچ سکتا کہ یہ سب چیزیں خود اپنے ارادہ اور فیصلہ سے ایسی بن گئی ہیں، وہ یہ بھی نہیں سوچ سکتا کہ کسی نقّاش یا صناع انسان کی صناعی کے یہ سب کرشمے ہیں، اُس کی سلیم عقل و بصیرت اس کے سوا کسی توجیہ کو قبول نہیں کر سکتی کہ یہ سب کسی حکیم و خبیر ہستی کی قدرت اور صنعت کا کرشمہ ہے۔ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ۔

ایک دفعہ ایک صاحب نے جو خدا کی ہستی کے قائل نہیں تھے، اس عاجز سے اس موضوع پر گفتگو کرنی چاہی، میں نے کاغذ کا ایک پرزہ اپنی جیب سے نکال کے اُن کے سامنے رکھا، اور کہا کہ اگر میں آپ سے کہوں کہ اس کاغذ پر جو حروف لکھے ہوئے ہیں وہ کسی لکھنے والے نے نہیں لکھے ہیں بلکہ آپ سے آپ لکھے گئے ہیں۔ تو کیا آپ میری اس بات کو مان لیں گے، اور اسی طرح اگر میں ابھی اس گھڑی کے متعلق کہوں کہ یہ کسی بنانے والے نے نہیں بنائی بلکہ آپ سے آپ بن گئی ہے یا اگر کسی دوڑتی ہوئی موٹر کے متعلق آپ سے کہوں کہ یہ کسی کارخانہ میں نہیں بنی ہے بلکہ یہ آپ سے آپ بن گئی ہے۔ اور کوئی ڈرائیور اس کو چلا نہیں رہا ہے بلکہ یہ آپ سے آپ دوڑ رہی ہے اور ہر موڑ پر خود ہی قاعدہ کے مطابق مڑ جاتی ہے، تو کیا آپ میری ان باتوں کو باور کر سکیں گے؟ یا ان کا امکان بھی تسلیم کر سکیں گے ___ اُن صاحب نے جواب دیا کہ ان میں سے تو کسی بات کو بھی عقل تسلیم نہیں کر سکتی ___ میں نے اُن سے کہا میرے بھائی! گھڑی اور موٹر جیسی چیزوں کے متعلق تو آپ کی عقل تسلیم نہیں کر سکتی کہ یہ آپ سے آپ بن گئی ہیں اور کاغذ کے اس پرزہ پر جو ٹیڑھے ترچھے چند حروف لکھے ہوئے ہیں ان کے متعلق بھی آپ کی عقل نہیں مان سکتی کہ یہ آپ سے لکھے گئے ہیں، لیکن زمین و آسمان اور چاند سورج، جو ایک حیرت انگیز نظام کے ساتھ چل رہے ہیں، اور اُن سے بھی زیادہ عجیب انسان کی ہستی، اُس کا دل و دماغ، اُس کی لاکھوں کروڑوں رگوں کا نظام، اس کی آنکھیں

اُس کے کان اور اُس کی ذائقہ لینے والی اور بولنے والی زبان، ان سب کے متعلق آپ کی عقل یہ مان سکتی ہے کہ یہ بغیر کسی کے بنائے آپ سے آپ بن گئے ہیں ـــــ پھر میں نے اُن سے کہا کہ جس طرح آپ کے نزدیک یہ بات بالکل بدیہی اور ناقابل بحث ہے کہ کاغذ کے اس پرزہ پر جو حروف لکھے ہوئے ہیں ان کو کسی لکھنے والے نے لکھا ہے اور اس گھڑی کو کسی نے بنایا ہے اور یہ موٹر بھی یقیناً کسی کارخانہ میں بنی ہے اور اگر وہ چل رہی ہے تو یقیناً کسی چلانے والے کے چلانے سے چل رہی ہے، اسی طرح یہ بات بھی بدیہی اور قطعاً ناقابل بحث ہے کہ زمین و آسمان، چاند سورج اور انسان و حیوانات، اور یہ ساری کائنات کسی حکیم و خبیر اور کسی کامل قدرت والی ہستی کی بنائی ہوئی ہے۔ میری یہ گفتگو اور میرا یہ استدلال قرآن ہی کی روشنی میں تھا اور خدا کی ہستی کے بارہ میں یقین و اطمینان پیدا کرنے کا یہی سب سے بہتر طریقہ ہے۔

ہاں توحید اور اللہ تعالیٰ کی صفات کا مسئلہ ایسا ہے کہ اگر وحی کی رہنمائی نہ ہو تو انسانی عقل اس میں بہت ٹھوکریں کھا سکتی ہے، اور گمراہ قومیں زیادہ تر اسی وادی میں بھٹکی ہیں، اسی لیے قرآن کریم میں اس کے ہر پہلو پر بہت زیادہ روشنی ڈالی گئی ہے، اور یہ گویا اس کا خاص موضوع ہے۔

آخرت کا عقیدہ

عقل سلیم اور قرآن کریم کی روشنی میں

(مولانا محمد منظور نعمانی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آخرت کا عقیدہ بھی خدا کی ہستی کے عقیدہ کی طرح دین و مذہب کی اہم بنیاد ہے، اگر یہ مان لیا جائے کہ انسان کی زندگی بس یہی دنیوی زندگی ہے اور اس کے بعد اعمال کی جزا اور سزا کا کوئی عالم نہیں ہے، تو پھر انسان کو کسی دین اور کسی مذہبی تعلیم کی مطلق ضرورت نہیں پھر تو اس کا مذہب بس یہ ہونا چاہیے کہ "بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔"

عقیدۂ آخرت کی اسی اہمیت کی وجہ سے قرآن پاک میں جا بجا "ایمان باللہ" اور "ایمان بالیوم الآخر" کا ذکر ساتھ ساتھ کیا گیا ہے ــــ کہیں ارشاد فرمایا گیا "یؤمنون باللہ وَبِالْیَوْمِ الْآخِرْ" اور کہیں فرمایا گیا مَنْ اٰمن باللہ والیوم الآخر۔

آخرت کے عقیدہ کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کا یقین کیا جائے کہ اس دنیا کی زندگی کے بعد ایک اور زندگی اور ایک اور عالم آنے والا ہے اور وہاں انسان کو اس دنیا میں کیے ہوئے اس کے اچھے اور برے اعمال کی جزا اور سزا ملے گی ــــ آخرت کی اجمالی حقیقت اتنی ہی ہے اور اس کو عقل سلیم بھی ضروری سمجھتی ہے ــــ انسان اگر غور و فکر سے کام لے

تو یہاں تک اُس کی عقل بھی پہونچا دیتی ہے کہ اس دنیوی زندگی کے بعد ایک اور ایسا عالم ہونا چاہیے، جہاں انسانوں کو اُن کے اچھے اور برے اعمال کی جزا اور سزا ملے، کیونکہ اس دنیا میں برائی اور بھلائی تو موجود ہے لیکن اس کی سزا اور جزا جو اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل کا لازمی تقاضا ہے یہاں نہیں ملتی، اس لیے کسی اور ایسی زندگی کا ہونا ضروری ہے جس میں نیک بختوں کو اُن کی نیکوکاریوں کی جزا اور مجرموں کو اُن کی مجرمانہ بدکرداریوں کی سزا ملے ـــــ اس کو ذرا اور تفصیل سے یوں سمجھیے کہ اس دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے پیشہ ور مجرم عمر بھر بڑے ظلم اور پاپ کرتے ہیں، لوگوں کی جان و مال پر ڈاکے ڈالتے ہیں، بندگانِ خدا کے حق مارتے ہیں، کمزوروں اور غریبوں کو ستاتے ہیں، رشوتیں لیتے اور خیانتیں کرتے ہیں اور عمر بھر عیش کرتے ہوئے بلکہ اولاد کے لیے بھی عیش و عشرت کا بہت کچھ سامان چھوڑ کے اس دنیا سے چلے جاتے ہیں ـــــ اور اس کے برعکس اللہ کے بہت سے بندوں کو اس حال میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ وہ بیچارے بڑی پرہیزگاری اور پارسائی کی زندگی گزارتے ہیں، کسی پر ظلم نہیں کرتے، کسی کے ساتھ دغا اور دھوکا نہیں کرتے، کسی کا حق نہیں مارتے، اللہ کی عبادت بھی کرتے ہیں، اس کی مخلوق کی خدمت بھی کرتے ہیں، اس کے باوجود طرح طرح کی تکلیفوں اور پریشانیوں میں مبتلا رہتے ہیں، غربت و افلاس اور بیماریوں کا سلسلہ رہتا ہے اور اسی حال میں زندگی کے دن پورے کرکے بیچارے اس دنیا سے چلے بھی جاتے ہیں، اور نہیں دیکھا جاتا کہ اُن کی اس نیکی اور پارسائی کا کوئی بھی صلہ اس دنیا میں اُن کو ملا ـــــ تو اگر اس دنیوی زندگی کے بعد بھی کوئی اور ایسا عالم اور ایسی زندگی نہ ہو جہاں ان نیکوکاروں اور بدکرداروں کو اچھے اور برے کیے کی جزا اور سزا ملے تو یقیناً خدا پر الزام آئے گا کہ اُس کے یہاں دنیا کی بے انصاف حکومتوں سے بھی زیادہ اندھیر ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی سلیم عقل اس کو قبول نہیں کر سکتی۔

اللہ کی ہستی تو بہت بلند ہے وہ تو مالک الملک اور احکم الحاکمین ہے۔ یہ طرزِ عمل تو کسی بھلے آدمی کے بھی شایانِ شان نہیں کہ وہ شریفوں اور شریروں اور پرہیزگاروں اور پیشہ ور مجرموں کو ایک نظر سے دیکھے اور سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرے ـــــ قرآن مجید نے اسی بات

کو اپنے بلیغ معجزانہ انداز اور نہایت مختصر الفاظ میں اس طرح کہا ہے

افنجعل المسلمین کالمجرمین ۞ ما لکم کیف تحکمون ۞ (القلم ع ۲)

کیا ہم اپنے فرمانبردار بندوں کو مجرموں نافرمانوں کی طرح کر دیں گے، اور دونوں گروہوں کے ساتھ یکساں معاملہ کریں گے؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسی بات کرتے ہو۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے۔

ام نجعل الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت کالمفسدین فی الارض ۞ ام نجعل المتقین کالفجار ۞ (ص ع ۲)

کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک اعمال کیے، اُن لوگوں کے برابر کر دیں گے جو دنیا میں فساد برپا کرتے پھرتے ہیں، کیا ہم پرہیزگاروں اور بدکاروں کے ساتھ یکساں برتاؤ کریں گے (ایسا ہرگز نہیں ہوگا)

ایک تیسری جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

ام حسب الذین اجترحوا السیئات ان نجعلھم کالذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت سواء محیاھم ومماتھم ساء ما یحکمون ۞ (الجاثیۃ-ع۲)

یہ مجرمین جنھوں نے بدکاریوں کو اپنا پیشہ بنا لیا ہو گیا وہ گمان کرتے ہیں کہ ہم اُن کو اپنے ان نیک بندوں کی طرح کر دیں گے جو ایمان لائے اور جنھوں نے اعمال صالحہ کیے اور دونوں گروہوں کا انجام اور جینا مرنا یکساں ہوگا، (اور اپنے اپنے اعمال کا ان کو کوئی بدلہ نہیں ملیگا) بالکل غلط اور بیہودہ ہے اُن کا یہ خیال (ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا)

بہرحال عقل سلیم بھی کہتی ہے اور قرآن حکیم کا بھی ارشاد ہے کہ نیکوکاروں، پرہیزگاروں

کو ان کی نیکوکاری اور پرہیزگاری کی اور مجرموں بدکاروں کو اُن کی بدکرداری کی جزا اور سزا ملنی ضروری ہے اور جب وہ اس دنیا میں نہیں مل رہی ہے تو اس دنیوی زندگی کے بعد کوئی اور زندگی اور کوئی اور عالم ہونا چاہیے جہاں یہ جزا اور سزا ملے اور اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل کا تقاضا پورا ہو۔ بس وہی عالم آخرت ہے۔

ہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اچھے اور برے اعمال کی جزا اور سزا کو یعنی ثواب اور عذاب کو عالم آخرت کے لیے کیوں مؤخر کیا گیا، اور کیوں نہ اسی دنیا میں اس کا بھی حساب بیباق کر دیا گیا؟ —— اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فرمانبردار اور نیکوکار بندوں کا حوصلہ اور انعام دینا چاہتا ہے اور جیسی لذت اور مسرت سے بھرپور غیر فانی زندگی ان کو بخشنا چاہتا ہے جو اس کی شانِ رحمت اور صفتِ کریمی کا تقاضا ہے اُس کا اس دنیا میں کوئی امکان ہی نہیں ہے اور اسی طرح نافرمان اور باغی و سرکش مجرموں کو وہ سخت سزا اور لرزہ خیز عذاب دینا چاہتا ہے جو اس کی شانِ جلالی اور صفتِ قہاری کا تقاضا ہے، اس کی برداشت کی بھی ہماری اس دنیا میں طاقت نہیں ہے، یعنی وہ ایسا سخت اور المناک ہے کہ اگر اس دنیا میں اُس کا ظہور ہو جائے تو یہاں کا سارا چین و آرام ختم ہو جائے۔ یہ پوری دنیا سوختہ ہو کر رہ جائے گی۔ ہماری یہ دنیا تو بہت ہی کمزور اور ناپائیدار دنیا ہے۔

آخرت کے مقابلہ میں ہماری اس دنیا کی حیثیت بالکل وہ ہے جو ہماری اس دنیا اور اس زندگی کے مقابلہ میں ماں کے پیٹ والی زندگی کی تھی۔ اس دنیا میں آنے سے پہلے ہر آدمی چند مہینے اپنی ماں کے پیٹ میں رہ کے آیا ہے۔ وہ اس کی سب سے پہلی دنیا تھی اور بڑی محدود دنیا تھی، اللہ تعالیٰ اولاد آدم کو جو کچھ عطا فرمانا چاہتا تھا اور جہاں تک پہونچانا چاہتا تھا، وہ ماں کے پیٹ والی اُس پہلی دنیا میں ممکن نہیں تھا، اسی لیے انسان کو اس دنیا میں لایا گیا، بالکل اسی طرح سمجھنا چاہیے کہ اس دنیوی زندگی کی نیک کرداری کے صلہ میں اللہ تعالیٰ اپنے فرمانبردار اور پرہیزگار بندوں کو جن انعامات سے نوازنا چاہتا ہے اور لذت و مسرت سے بھرپور جو غیر فانی زندگی اُن کو بخشنا چاہتا ہے

اور علیٰ ہذا سرکش مجرموں اور نافرمانوں کو جو سخت سزا اور ابدی عذاب دینا چاہتا ہے، وہ ہماری اس فانی دنیا میں ممکن ہی نہیں، اس دنیا کے خاتمہ کے بعد عالم آخرت کا برپا ہونا اور جنت و دوزخ کا وجود میں آنا ضروری ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمال عدل و انصاف، انعام و احسان، رحمت و رأفت اور قہاریت و جباریت کا بھرپور ظہور ہو۔

آخرت کے بارہ میں ہماری عقل کی پرواز بس یہیں تک ہے۔ آگے قیامت، حشر، جنت و دوزخ اور وہاں کے ثواب و عذاب کی تفصیلات بس وحی کے ذریعہ ہی معلوم ہوسکتی ہیں۔ اور قرآن مجید اور احادیث میں اُن کا تفصیلی بیان ہے۔

بعض لوگ اپنی عقل کی خامی و نارسائی کی وجہ سے آخرت اور جنت و دوزخ اور وہاں کے ثواب و عذاب کی اُن تفصیلات کے بارہ میں جو قرآن و حدیث میں وارد ہوئی ہیں شکوک کا اظہار کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ باتیں سمجھ میں نہیں آتیں، میں ایسے لوگوں سے کہا کرتا ہوں کہ اگر ایسے بچہ سے جو ابھی اپنے ماں کے پیٹ میں ہے کسی آلہ کے ذریعہ یہ بات کہی جائے کہ اے بچے تو چند روز کے بعد ایک ایسی دنیا میں آنے والا ہے جہاں لاکھوں میل کی لمبی چوڑی زمین ہے، اور اُس سے بھی بڑے سمندر ہیں اور آسمان ہے، اور چاند، سورج اور لاکھوں ستارے ہیں، اور وہاں ریلیں دوڑتی ہیں، اور ہوائی جہاز اُڑتے ہیں اور لڑائیاں ہوتی ہیں جن میں توپیں گرجتی ہیں اور ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم پھٹتے ہیں، تو وہ بچہ اگر کسی طرح ان باتوں کو سمجھ بھی لے تو ظاہر ہے کہ اُس کے لیے ان باتوں کا یقین کرنا بڑا مشکل ہوگا کیونکہ وہ جس دنیا میں ہے اور جس کو دیکھتا اور جانتا ہے وہ تو اُس کے ماں کے پیٹ کی صرف ایک بالشت بھر کی اندھیری دنیا ہے جس میں خون اور غلاظت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے ——— لیکن چند دن کے بعد جب وہ بچہ اللہ کے حکم سے اس دنیا میں آئے گا اور کچھ دیکھنے سمجھنے کے قابل ہوگا تو وہ سب کچھ دیکھے گا اور یقین کرے گا جو ماں کے پیٹ والی دنیا میں اُس کے لیے ناقابلِ فہم اور اس کی سمجھ سے بالاتر تھا ——— بالکل ایسا ہی معاملہ آخرت کے بارہ میں اس دنیا کے انسانوں کا ہے ——— آخرت کے عالم میں پہونچ کر سب انسان وہ سب کچھ دیکھ لیں گے جو اللہ کی کتابوں نے اور اس کے پیغمبروں نے آخرت کے بارہ میں بتایا

ہے اور جس کا نہایت مستند واضح اور مفصل بیان قرآن مجید اور احادیث نبویہ میں محفوظ ہے۔
آخرت کے عقیدہ کے سلسلہ میں آخری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ انسان کو برائیوں اور بداخلاقیوں سے بچانے کی جتنی طاقت آخرت کے یقین میں ہے اتنی کسی دوسری چیز میں نہیں ہے۔ بے شک حکومت کا قانون اور تہذیبی ترقی یا برائی بھلائی کا فطری احساس اور نفس کی شرافت بھی انسان کو برائیوں اور بداخلاقیوں سے بچانے والی چیزیں ہیں، لیکن یہ اتنی موثر اور کارگر نہیں ہوتیں جتنا کہ مرنے کے بعد کی جزا و سزا کا یقین اور آخرت پر ایمان بشرطیکہ نرا یقین اور حقیقی ایمان ہو صرف نام کا ایمان اور بے جان عقیدہ نہ ہو۔
یہ کوئی خالی منطق کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ برائیوں اور بداخلاقیوں کی گنجائش اس معاشرہ میں ہوتی ہے جو آخرت اور مرنے کے بعد خدا کے سامنے پیشی اور جزا و سزا کے یقین سے خالی ہو، ورنہ جن کے دلوں میں یقین و ایمان کا نور موجود ہو، اُن کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ وہ برے خیالات اور گناہ کے وسوسوں سے بھی گھبراتے ہیں اور اللہ سے پناہ مانگتے ہیں ——— تاریخ عالم گواہ ہے کہ اس دنیا میں سب سے زیادہ پاکیزہ صاف ستھری اور مہذب و مبارک زندگی ان ہی بندگان خدا کی رہی ہے جو مرنے کے بعد کی پیشی اور آخرت کی جزا و سزا پر یقین رکھتے تھے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ یقین آدمی کو برائی کے ارادہ سے وہاں بھی روکتا ہے جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو اور دنیا میں کسی قانونی پکڑ اور سزا کا خطرہ نہ ہو۔
الغرض اس دنیا کے خاتمہ کے بعد عالم آخرت کا برپا ہونا اللہ کے پیغمبروں اور اس کی کتابوں کی بتائی ہوئی ایک حقیقت بھی ہے اور خود ہماری عقل سلیم کا تقاضا بھی ہے اور اس پر ایمان و عقیدہ انسانی دنیا کی ایک بڑی مصلحت بھی ہے۔

حافظ امام ابوحاتم رازی

(از مولانا تقی الدین ندوی مظاہری استاذ حدیث
دارالعلوم فلاح دارین - ترکیسر - گجرات)

نام ونسب محمد نام کنیت ابوحاتم تھی، پورا نسب نامہ یہ ہے، محمد بن ادریس بن منذر بن داؤد بن مہران حنظلی، [۱]

مولد امام موصوف ۱۹۵ھ میں رَے میں پیدا ہوئے، اس لیے اس کی طرف منسوب ہو کر رازی کہلاتے ہیں، رَے عراق عجم کا صدر مقام تھا طہران جو ایران کا دارالسلطنت ہے، اس سے چند میل کے فاصلہ پر آباد تھا، یہ اب بالکل ویران پڑا ہے، لیکن اس زمانے میں اصمعی جو لغت عربیت کے امام ہیں، اس کی دلفریبی کی بنا پر "عروس البلاد" کہا کرتے تھے [۲] چنانچہ ابو اسحٰق اصطخری نے لکھا ہے،

الرّیّ مدینة لیس بعد بغداد	رَے وہ شہر ہے کہ مشرق میں بغداد کے بعد
فی المشرق اعمر منها وان كانت	اس سے زیادہ آباد کوئی شہر نہیں تھا،
نیسابور اکبر عرصة منها [۳]	اگرچہ نیساپور کا رقبہ اس سے زیادہ ہو۔

علم حدیث کے لیے رحلت رحلت وہ مقدس سفر ہے جو علم دین کے لیے کیا جاتا تھا، یہ

---

[۱] تہذیب التہذیب ص ۳۱ ج ۹ و طبقات الشافعیة الکبری ص ۲۱۱ ج ۲ [۲] و [۳] معجم البلدان ص ۱۱۷ ج ۴
تذکرة الحفاظ ص ۱۳۲ ج ۲

وہ مبارک زمانہ تھا کہ علم نبوی کے لیے گھر بار چھوڑنا اور دور دراز کا سفر اختیار کرنا مسلمانوں کا خصوصی شعار تھا، ملکوں ملکوں پھرنا، سیکڑوں میل پیادہ پا طے کر لینا اس زمانے کے علماء کے لیے معمولی بات تھی، علمائے سلف کو اس سفر کے ساتھ جو غیر معمولی تعلق تھا، اس کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی نے رحلت کا یہ ضابطہ بیان کیا ہے۔

وصفة الرحلة حيث يبتداء بحديث	رحلت کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے اہل شہر کی حدیثوں
اهل بلده فيستوعبه ثم يرحل	سے ابتدا کرے، اور جب وہ پورے طور پر
فيحصل في الرحلة ما ليس	حاصل کر چکے تو پھر اور سفر کرے، اور اس سفر
عنده ۱	میں ان روایات کو حاصل کرے جو اس کے
	پاس نہ ہوں۔

امام ابو حاتم رح کی زندگی کے ابتدائی حالات بہت کم ملتے ہیں، لیکن جس زمانے میں انھوں نے آنکھیں کھولیں اس وقت علم حدیث کا حلقہ بہت وسیع ہو چکا تھا۔

امام ابو حاتم رازی نے ۲۰۹ھ سے مشائخ وقت سے حدیثیں لکھنی شروع کیں، رحلت کے ضابطے کے مطابق سب سے پہلے اپنے شہر کے شیوخ سے استفادہ کے بعد ۱۴ سال کی عمر میں کہ ابھی سبزہ آغاز نہیں ہوا تھا، طلب حدیث میں سفر اختیار کیا، اور ایک زمانہ دراز اسی رحلت میں بسر کیا، امام صاحب کا بیان ہے کہ سب سے پہلے جب میں نے سفر اختیار کیا، تو سات سال تک اپنی پیادہ روی کا حساب لگاتا رہا، اس مدت میں ایک ہزار فرسخ سے زیادہ سفر طے کر چکا تھا، لیکن یہ ان کے سفر کی انتہا نہیں ہے، بلکہ اسی کے بعد فرماتے ہیں کہ میں نے فرسخ کا حساب چھوڑ دیا، امام موصوف کا بیان ہے کہ میں نے بحرین سے مصر، مصر سے رملہ، رملہ سے دمشق، اور وہاں سے طرسوس تک پیدل سفر کیا، پھر حمص کو لوٹتا ہوا رقہ آیا، اور وہاں سے سوار ہو کر عراق پہونچا، اور سارا سفر جس وقت میں نے کیا، میری عمر بیس سال کی تھی، عراق پہونچنے کے بعد آٹھ ماہ بصرہ میں قیام کیا، یہ واقعہ ۲۱۴ھ کا ہے ۲

---

۱ شرح نخبہ ۲ تذکرۃ الحفاظ صـ ۱۳۳ ج ۲ طبقات الشافعیہ صـ ۲۰۸/۲۹۰

فرماتے ہیں، کہ طلب حدیث میں مجھے کوفہ سے بغداد اتنی بار جانا ہوا کہ شمار نہیں کر سکتا۔[1]

طلب حدیث کے لیے فاقے امام موصوف فرماتے ہیں، کہ ۲۱۴ھ میں جب کہ میرا قیام بصرہ میں تھا، اسی زمانہ میں ایک ایسا وقت آیا کہ (فاضل) کپڑے تک بیچ کھائے، جب کپڑے بھی نہ رہے، تو دو روز تک فاقے کیے تاہم شوقِ طلب کا یہ عالم تھا، کہ اسی فاقہ کی حالت میں اٹھ کر اپنے رفیق کے ساتھ شیوخ کے حلقۂ درس میں حاضری دیتا رہا، رات ہوئی تو رفیق اپنا شام کا کھانا کھانے کے لیے قیام گاہ پر واپس آیا، اور میں نے بھوک کی بیتابی میں پانی سے پیٹ بھرنا شروع کیا، صبح ہوتی تو کل کی طرح آج بھی اپنے رفیق کے ساتھ بھوک کی شدت کے باوجود تمام اسباق میں شرکت کی، اور اسی طرح بھوکا واپس چلا آیا، آخر اسی حالت میں تیسرا دن ہوا، اور میرا ساتھی حسب دستور علی الصباح پہونچا، اب طاقت جواب دے چکی تھی، مجبوراً اس سے کہنا پڑا کہ آج تو میں بہت ہی ناتواں ہوں، تمہارے ساتھ چل نہ سکوں گا، اس نے دریافت کیا کہ خیر ہے؟ میں نے کہا، تم سے کیا چھپاؤں دو دن سے کچھ کھانے کو نہ مل سکا، ہمدرد ساتھی نے کہا، میرے پاس ایک دینار ہے، نصف تم لے لو اور باقی نصف کو ہم کرایہ میں خرچ کریں، اس کے بعد بصرہ سے واپس ہوئے۔[2]

اسی طرح کا ایک اور واقعہ امام موصوف کا ایک دفعہ ایک بحری سفر کے سلسلہ میں پیش آیا تھا، جہاز سے اترے تو زاد راہ ختم ہو چکا تھا، دو ساتھی اور بھی تھے، مگر سب کا مضمون واحد تھا، تین دن تک پیادہ پا چلتے رہے اور کھانے کو کچھ نہ مل سکا، آخر تھک کر گر پڑے، ساتھیوں میں ایک بیچارہ بوڑھا شخص تھا، وہ تو گرتے ہی بے ہوش ہو گیا، مجبوراً اس کو اسی حال میں چھوڑ کر آگے کی راہ لی، کوئی ایک فرسخ طے کیا ہوگا کہ ابو حاتم بھی غش کھا کر گر پڑے، رفیق نے بوڑھے کی طرح ان کو بھی یہیں چھوڑا، اور خود ہمت کر کے آگے بڑھا، خوش قسمتی سے ذرا دور پر اس کو ایک کشتی نظر آئی، جس سے ساحل پر کچھ لوگ اتر رہے تھے، یہ دیکھ کر اس نے اظہار مصیبت کے لیے اپنی چادر ہوا میں اڑائی، مسافروں کی نظر پڑی، تو اس کی طرف متوجہ

---

[1] حوالہ مذکور صفحہ ۲۱۰ و ۲۱۱　[2] تذکرۃ الحفاظ صفحہ ۱۳۳ ج ۲

ہوتے، اور اس کے پاس آکر پانی پلایا، تب اس نے انھیں بتایا کہ میرے دو ساتھی جو بیہوش ہو کر پیچھے گر چکے ہیں، پہلے ان کی خبر لو، مہربان مسافر یہ سنتے ہی ان کی تلاش میں دوڑے، ابو حاتم فرماتے ہیں کہ میں نے آنکھ کھولی، تو کیا دیکھتا ہوں، کہ ایک شخص میرے منہ پر پانی کے چھینٹے دے رہا ہے، جب مجھ کو ہوش آیا، تو اس نے مجھے پانی پلایا، اس کے بعد اس بوڑھے کے پاس پہونچے، اور اس کی خبر گیری کی، پھر ایک مقام پر ٹھہر کر ہم نے چند روز آرام کیا، تب کہیں جا کر ہماری جان میں جان آئی [1]

شیوخ اور اساتذہ ان کے شیوخ و اساتذہ کا دائرہ بہت وسیع ہے، عبداللہ بن موسیٰ محمد بن عبداللہ انصاری اصمعی، ابو نعیم، ہوذہ بن خلیفہ، عفان، ابن مسہر، اور ان کے علاوہ بھی بہت سے حضرات ہیں، نفیلی سے چودہ ہزار حدیثیں لکھیں [2] امام بخاری سے بھی سماع حاصل ہے [3]

تلامذہ ان کے تلامذہ کی تعداد بھی بے شمار ہے، محمد بن مصفّیٰ، یونس بن عبدالاعلیٰ، محمد بن عوف طائی، امام ابوداؤد، امام نسائی، ابوعوانہ اسفرائینی، ابوالحسن علی بن ابراہیم قطان، ابوعمرو احمد بن محمد بن حکیم، عبدالرحمٰن بن حمدون، عبدالمؤمن بن خلف نسفی، بقول حافظ ذہبی "دخلق کثیر" اور ایک بڑی مخلوق ان کے تلامذہ میں داخل ہے [4]

نیز امام بخاری و ابن ماجہ کو بھی امام موصوف سے شرفِ تلمذ حاصل ہے، اگرچہ طبقاتِ الشافعیہ میں علامہ تاج الدین سبکی نے اس سے انکار کیا ہے، لیکن فی الواقع علامہ موصوف سے یہ تسامح ہے، حافظ ابوالحجاج مزّی نے تہذیب الکمال میں اس کی صراحت کی ہے کہ امام ابن ماجہ نے اپنی کتاب التفسیر میں اُن سے روایت کی ہے، نیز سنن ابن ماجہ میں بھی امام ابوحاتم سے روایت موجود ہے۔

اسی طرح حافظ ابن حجر عسقلانی امام بخاری کے شیوخ کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۱۳۲ و تاریخ بغداد ج ۲ ص ۷۳ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۳۳
[3] کتاب الجرح والتعدیل ج ۳ ص ۱۹۱ [4] تذکرۃ الحفاظ حوالہ مذکور

والطبقۃ الرابعۃ رفقاءہ فی الطلب ومن سمع قبلہ قلیلا کمحمد بن یحیی الذھلی وابو حاتم رازی[۱]

چوتھا طبقہ امام بخاری کے شیوخ کا ان لوگوں کا ہے، جو طلب حدیث میں امام صاحب کے رفیق رہ چکے ہیں، اور ان میں وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے حدیث کا سماع امام بخاری سے کچھ پہلے کیا جیسے محمد بن یحیی ذہلی، و ابوحاتم رازی۔

قوت حافظہ ایک مرتبہ ابوحاتم نے ابوالولید طیالسی کے دروازہ پر جو اس زمانہ میں فن حدیث کے مشہور اساتذہ میں شمار کیے جاتے تھے، اعلان کیا کہ جو شخص بھی مجھے کوئی ایسی غریب مسند صحیح حدیث بتائے گا، جس کو میں نے مشائخ سے ابھی نہیں سنا ہے، تو اس کو ہر حدیث کے عوض میری طرف سے ایک درہم بطور انعام ملے گا، ابوحاتم کا بیان ہے کہ اس وقت ابوالولید کے آستانے پر مخلوق جوق در جوق جمع تھی، اور ابوزرعہ رازی اور ان کے علاوہ لوگ موجود تھے، تاہم کوئی شخص ایک حدیث ایسی پیش نہ کر سکا، میرا مقصود یہ تھا کہ اس طرح کوئی اللہ کا بندہ شاید کوئی ایسی روایت میرے سامنے پیش کرے، جو میں نے ابتک نہ سنی ہو، اور یہ بتادے کہ وہ فلاں محدث کے پاس ہے، تو میں اسے جاکر سن لوں،[۲]

ابن ابی حاتم فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد بزرگوار سے سنا کہ جب محمد بن یحیی نیشاپوری رے تشریف لائے، تو میں نے ان کے سامنے امام زہری کی تیرہ[۱۳] حدیثیں پیش کیں، جن میں سے صرف تین کے متعلق ان کو معلومات حاصل تھیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی اس واقعہ کو نقل کر کے لکھتے ہیں،

وھذا ایدل علی حفظ عظیم فان الذھلی شھد لہ مشائخہ واھل عصرہ

اس بات سے اللہ کے حفظ عظیم کا پتہ چلتا ہے کیونکہ امام ذہلی (محمد بن یحیی نیشاپوری) کے متعلق ان کے مشائخ و معاصرین نے

---

[۱] مقدمہ فتح الباری ص۴۷۸ [۲] تہذیب التہذیب ص۳۲ ج۹

بالتبحر فی معرفة حدیث	امام زہری کی احادیث میں معرفت کی شہادت
الزھری و مع ذلک اعزب علیہ	دی ہے اس کے باوجود ابوحاتم نے ان کے سامنے
ابوحاتم[۱]	اور نادر حدیثیں بیان کیں۔

امام موصوف کے کمال کا اعتراف حافظ ابن کثیر نے ابوحاتم کا تذکرہ ان الفاظ میں شروع کیا ہے

احد الائمة الحفاظ الاثبات	یہ ان ائمہ حفاظ اور ثقات میں سے ایک
العارفین بعلل الحدیث والجرح	ہیں جو علل حدیث و جرح و تعدیل کے عارف
والتعدیل[۲]	گزرے ہیں۔

حافظ ذہبی ان کے متعلق لکھتے ہیں' الامام الحافظ الکبیر احد الاعلام 'قاضی موسیٰ بن اسحٰق انصاری فرماتے ہیں' میں نے ابوحاتم سے بڑھ کر حافظ حدیث نہیں دیکھا' حافظ احمد بن سلمہ کا بیان ہے کہ اسحٰق بن راہویہ اور محمد بن یحییٰ کے بعد ابوحاتم سے بڑھ کر حافظ حدیث اور اس کے معانی کا عالم میں نے نہیں دیکھا'

حافظ ابن عماد حنبلی نے لکھا ہے کہ امام موصوف ثقہ ہیں اور امام بخاری اور ابوزرعہ رازی کے ہم پلہ تھے[۴]

یونس بن عبدالاعلیٰ نے امام ابوزرعہ اور ابوحاتم کے حق میں دعا کی' اور فرمانے لگے کہ یہ دونوں خراسان کے امام ہیں اور ان کی بقا میں مسلمانوں کی فلاح ہے۔

امام طحاوی فرماتے ہیں کہ ابوحاتم' ابوزرعہ اور ابن دارہ یہ تینوں شخص رَئے میں ایسے تھے کہ جن کی نظیر اس وقت روئے زمین پر موجود نہ تھی[۵]۔

امام ابوحاتم اور فن جرح و تعدیل امام موصوف کا خصوصیت سے فن جرح و تعدیل میں بہت مقام تھا' حافظ ابن تیمیہ کتاب الاستغاثہ میں جو بکری کی تردید میں لکھی ہے' تحریر فرماتے ہیں۔

---

[۱] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۲ [۲] البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۹ [۳] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۳۳
[۴] شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۷۱ [۵] تذکرہ ترجمہ ابن دارہ

وکلام یحییٰ بن معین والبخاری ومسلم وابی حاتم وابی زرعہ والنسائی وابی احمد بن عدی والدارقطنی وامثالہ فی الرجال وصحیح الحدیث وضعیفہ ھو مثل کلام مالک والثوری والاوزاعی والشافعی وامثالھم فی الاحکام ومعرفۃ الحلال والحرام[1]

امام یحییٰ بن معین، بخاری، مسلم، ابو حاتم، ابو زرعہ، نسائی، ابو احمد بن عدی، دارقطنی اور ان جیسے حضرات کے کلام کی حیثیت رجال اور صحیح وضعیف احادیث کے بارے میں وہی ہے، جو امام، سفیان ثوری، اوزاعی اور شافعی اور ان جیسے حضرات کے کلام کی احکام اور حلال وحرام کی معرفت کے باب میں ہے۔

لیکن ابو حاتم رازی کو امام بخاری سے زیادہ محتاط اور سخت خیال کیا جاتا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی "النکت علی ابن صلاح" میں لکھتے ہیں۔

ومن الرابعۃ ابو حاتم والبخاری وابو حاتم اشد من البخاری[2]

ناقدین فن کے چوتھے طبقے میں ابو حاتم اور بخاری ہیں، اور ابو حاتم بخاری سے تنقید میں زیادہ سخت ہیں۔

فن جرح وتعدیل میں امام موصوف کو جو رسوخ واتقان حاصل تھا، اس کے بارے میں حافظ ذہبی فرماتے ہیں،

قلت کتابہ فی الجرح والتعدیل یقضی لہٗ بالرتبۃ المتقنۃ فی الحفظ[3]

میں کہتا ہوں کہ ان کی کتاب "الجرح والتعدیل" حفظ حدیث میں جو ان کا مرتبہ حاصل ہے، اس کو ثابت کرتی ہے،

جس طرح امام موصوف سے امام بخاری کو شرف تلمذ حاصل ہے، اسی طرح امام موصوف

---

[1] کتاب الاستغاثہ ص۱۳ [2] حافظ سیوطی نے مقدمہ زہر الربی میں اور حافظ سخاوی نے الاعلان بالتوبیخ کے آخر میں اس عبارت کو نقل کیا ہے۔ [3] تذکرۃ الحفاظ ص۱۳۴ ج۲

نے بھی امام بخاری سے استفادہ کیا ہے اور بعض جگہوں پر اختلاف بھی ظاہر کیا ہے۔ چناں چہ محدث حاکم نیشاپوری صاحب مستدرک علی الصحیحین حاکم کبیر سے ناقل ہیں،

"میں نے ان سے سنا کہتے تھے، میں رے میں تھا، ایک دن میں نے دیکھا کہ لوگ ابو محمد بن ابی حاتم کے سامنے 'کتاب الجرح والتعدیل' پڑھ رہے تھے، پھر وہ جب پڑھنے سے فارغ ہوئے تو میں نے ابن عبدویہ وراق سے کہا کہ یہ کیا ہنسی ہے؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ محمد بن اسماعیل بخاری کی کتاب التاریخ کو اس کتاب کی شکل میں اپنے استاد کے سامنے پڑھ رہے ہو، حالانکہ تم اسے ابو زرعہ اور ابو حاتم کی بتاتے ہو، اس پر وراق نے کہا کہ اے ابو احمد! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جس وقت ابو زرعہ اور ابو حاتم کے پاس یہ کتاب (تاریخ بخاری) لائی گئی، تو ان حضرات نے فرمایا کہ خوب علم ہے، اس سے بے نیاز نہیں رہا جا سکتا، اور ہم لوگوں کے لیے یہ زیبا نہیں کہ ہم اسے دوسرے سے نقل کریں، اس لیے ان دونوں حضرات نے ابو محمد عبد الرحمٰن رازی کو بٹھایا، اور یکے بعد دیگرے، ایک ایک راوی کے متعلق ان سے پوچھتے گئے، اور پھر یہ حضرات کہیں اس کتاب سے زیادہ اور کہیں اس سے کم بیان کرتے چلے گئے؎۱

اس سے امام موصوف کے فن جرح و تعدیل میں رسوخ و اتقان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، نیز امام موصوف کے صاحبزادے ابو محمد عبد الرحمٰن کی "کتاب الجرح والتعدیل" عرصہ ہوا دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن سے طبع ہو کر منصۂ شہود پر آچکی، جس میں اپنے والد کے افادات کو کثرت سے نقل کیا ہے۔

تصانیف | کتاب الجرح والتعدیل،؎۲ طبقات التابعین، کتاب الزینۃ؎۳

وفات | امام ابو حاتم رازی کی وفات ماہ شعبان ۲۷۷ھ میں ہوئی، اس وقت ان کی عمر بیاسی سال کی تھی۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

؎۱ معجم البلدان ص۱۱۷ ج۳ ؎۲ رسالۃ المستطرفہ ص۱۴۲ ؎۳ الاعلام للزرکلی ص۱۶۹ ج۲

رمضان مبارک کا آخری عشرہ

اعتکاف اور لیلۃ القدر

محمد منظور نعمانی

اللہ تعالیٰ نے جس طرح رمضان مبارک کو سال کے دوسرے مہینوں کے مقابلے میں فضیلت بخشی ہے۔ اسی طرح اس کے آخری عشرہ کو پہلے اور دوسرے عشرہ کے مقابلہ میں خاص عظمت عطا فرمائی ہے۔ اس آخری عشرہ کی راتوں اور اس کے دنوں میں اللہ تعالیٰ کا دریائے رحمت موجزن ہوتا ہے اور اس کے لطف و کرم کی گھٹائیں عالم کو گھیر لیتی ہیں ایک ایک رات میں صادق طالبین کی برسوں کی منزلیں طے ہو جاتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ ان حقائق کو سب سے زیادہ محسوس فرماتے تھے۔ گویا آنکھوں سے دیکھتے تھے اسلئے رمضان مبارک کے آخری عشرہ میں آپ کی عبادت اور مجاہدہ کی مقدار بہت بڑھ جاتی تھی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ:-

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يجتهد فى العشر الاواخر ما لا يجتهد فى غيره (صحیح مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں عبادت وغیرہ میں وہ مجاہدہ کرتے اور وہ مشقت اٹھاتے جو دوسرے دنوں میں نہیں کرتے تھے۔ (صحیح مسلم)

حضرت صدیقہ رضہی کی ایک دوسری روایت ہے کہ:-

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا دخل العشر شد مئزره و أحيا ليله و ايقظ اهله۔
(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

جب رمضان کا آخری عشرہ شروع ہوتا۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کمر کس لیتے اور شب بیداری کرتے (یعنی پوری رات عبادت اور ذکر و دعا میں مشغول رہتے) اور اپنے گھر کے لوگوں یعنی ازواج مطہرات اور دوسرے متعلقین کو بھی جگا دیتے (تاکہ وہ بھی ان راتوں کی برکتوں اور سعادتوں میں حصہ لیں)

آخری عشرہ ہی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اعتکاف بھی فرماتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ ہی کا بیان ہے۔

ان النبي صلى الله عليه وسلم كان يعتكف العشر الاواخر من رمضان حتى توفاه الله۔
(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرماتے تھے۔ وفات تک برابر آپ کا یہ معمول رہا۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص حضرت انسؓ کا بیان ہے۔

كان النبي صلى الله عليه وسلم يعتكف العشر الاواخر من رمضان فلم يعتكف عاماً فلما كان العام المقبل اعتكف العشرين۔
(جامع ترمذی)

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں ہمیشہ اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔ ایک سال آپ اعتکاف نہ کر سکے تو اگلے سال بیس دن کا اعتکاف فرمایا۔

حضرت انسؓ کی اس روایت میں یہ مذکور نہیں ہے کہ آپ کس وجہ سے ایک سال اعتکاف نہیں فرما سکے تھے، لیکن سنن ابی داؤد میں حضرت اُبیّ بن کعبؓ کی ایک روایت سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ ایک دفعہ رمضان مبارک کا آخری عشرہ آپ کا سفر میں گزرا تھا، اس وجہ سے آپ اس سال اعتکاف نہیں فرما سکے تھے، اسی کے تدارک اور تلافی کے لئے

اگلے سال آپ نے بجائے دس دن کے بیس دن کا اعتکاف فرمایا تھا۔

اعتکاف کیا ہے؟

سب سے منقطع اور ہر طرف سے یکسو ہو کر بس اللہ سے لو لگا کے اس کے در پر یعنی کسی مسجد کے گوشہ میں جا پڑنا۔ اور بس اس کی عبادت، اور اس کے ذکر و فکر میں مشغول رہنا، یہ خواص کی عبادت ہے اور اس کے لئے بہترین زمانہ رمضان مبارک کا آخری عشرہ ہی ہو سکتا ہے، یہ روحانی تزکیہ کے لئے اکسیر اور کیمیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف ۴۰ تک پہنچنے کے قریب کسی جاذبۂ غیبی کے تقاضے سے آپ کی طبع مبارک میں سب سے یکسو اور الگ ہو کر اور آبادی سے کبھی دور جا کر تنہائی میں اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے ذکر و فکر کا جو بیتابانہ جذبہ پیدا ہوا تھا۔ جس کے نتیجہ میں آپ کئی مہینے مسلسل غار حرا میں خلوت گزینی کرتے رہے۔ یہ گویا آپ کا پہلا اعتکاف تھا، اور اس اعتکاف ہی میں آپ کی روحانی استعداد اس درجہ تک پہونچ گئی تھی۔ کہ آپ نزول قرآن کا تحمل کر سکیں، اور وحی متلو کا بوجھ اٹھا سکیں۔ چنانچہ غار حرا کے اس اعتکاف کے آخری دنوں ہی میں روح الامین جبرئیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے سورۂ اقرأ کی ابتدائی آیتیں لے کر نازل ہوئے اور اسی وقت سے نزول قرآن کا سلسلہ شروع ہوا۔ اگرچہ مشہور یہ ہے کہ غار حرا میں سورۂ اقرأ کا نزول ربیع الاول میں ہوا تھا لیکن محققین کی تحقیق یہ ہے کہ ربیع الاول سے رویائے صادقہ کی شکل میں وحی ربانی کا سلسلہ شروع ہوا تھا، جو قریباً چھ مہینہ تک یعنی رمضان مبارک تک جاری رہا۔ اور رمضان مبارک کے آخری عشرہ کی ایک رات میں حضرت جبرئیل سورۂ اقرأ کی ابتدائی آیتیں لے کر آئے، یہی رات لیلۃ القدر تھی۔ انا انزلناہ فی لیلۃ القدر۔

دراصل رمضان مبارک کا پورا مہینہ روح کی تربیت اور روحانی ترقیوں کا مہینہ ہے۔ اس مقصد کے لئے پورے مہینے کے روزے تو تمام ایمان والوں پر فرض کئے گئے اور اپنے باطن میں ملکوتیت کو غالب اور بہیمیت کو مغلوب کرنے کے لئے اتنا مجاہدہ اور نفسانی خواہشات کی یہ قربانی ہر مسلمان کے لئے لازم کر دی گئی کہ وہ اس پورے مبارک مہینہ میں

اللہ کے حکم کی تعمیل اور اس کی عبادت کی نیت سے صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک نہ کچھ کھائے، نہ کچھ پئے، نہ بیوی سے متمتع ہو، اور اسی کے ساتھ ہر قسم کے گناہوں، بلکہ فضول باتوں سے بھی پرہیز کرے اور یہ پورا مہینہ ان پابندیوں کے ساتھ گذارے۔ اس سے آگے تعلق باللہ میں ترقی اور ملکوتی لطائف کے تزکیہ اور ملار اعلیٰ سے خصوصی مناسبت پیدا کرنے کے لئے اعتکاف مشروع کیا گیا۔ جس میں روزہ کی مذکورہ بالا عام پابندیوں کے علاوہ اللہ کا بندہ سب سے کٹ کر اور سب سے ہٹ کر اپنے مالک و مولیٰ ہی کے آستانہ پر اور گویا اسی کے قدموں میں جا پڑتا ہے۔ اسی کو یاد کرتا ہے، اسی کے دھیان میں رہتا ہے اس کی تسبیح و تقدیس کرتا ہے اس کے قہر و جلال اور اس کے لطف و کرم کے تصورات میں ڈوبا رہتا ہے۔ اپنے گناہوں اور اپنی کوتاہیوں پر روتا ہے، اور رحیم و کریم مالک سے رحمت و مغفرت مانگتا ہے، اس کی رضا اور اس کا قرب چاہتا ہے، اسی حال میں اس کے دن گذرتے ہیں اور اسی حال میں اس کی راتیں، گویا ان دنوں اور راتوں میں وہ اپنے آپ کو دنیا و مافیہا سے بے تعلق کر کے ایک دوسرے عالم میں پہونچ جاتا ہے۔ جہاں بس وہ سر افگندہ بندہ ہوتا ہے اور اس کا وہ رب کریم جس کے بحر کرم کی موجوں کو اس کے سوا کوئی گن بھی نہیں سکتا۔ پھر کون اندازہ کرسکتا ہے لطف و کرم کی اس بارش کا جو اس خاص عالم میں اس بندہ پر ہوتی ہے۔

فی الحقیقت اعتکاف اگر شعور اور اخلاص کے ساتھ ہو تو آخرت کے بے حساب اجر و ثواب کے علاوہ روح کی تربیت اور تزکیۂ لطائف کے لئے اکسیر اور نسخۂ کیمیا اور خزائن رحمت خداوندی کی کلید ہے۔

لیلۃ القدر

رمضان مبارک کے آخری عشرہ کی ایک خاص فضیلت اور اعتکاف کے لئے اس کے تعین کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ لیلۃ القدر (جیسا کہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے) عموماً اسی عشرہ میں ہوتی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کرام سے ارشاد فرمایا:-

تحروا الیلۃ القدر فی الوتر من العشر الاواخر من رمضان۔
شب قدر کو تلاش کرو رمضان کی آخری دس راتوں میں سے طاق راتوں میں۔

(صحیح بخاری)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شب قدر زیادہ تر آخری عشرہ کی طاق راتوں میں سے کوئی ایک رات ہوتی ہے۔ یعنی اکیسویں، یا تیئیسویں، یا پچیسویں، یا ستائیسویں، یا انتیسویں،

اس مضمون کی حدیثیں حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کے علاوہ متعدد دوسرے صحابہ کرام سے بھی مروی ہیں۔ ان سب حدیثوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ "شب قدر" کی کوئی خاص تاریخ مقرر نہیں ہے۔ لیکن وہ عام طور سے رمضان ہی میں اور اکثر و بیشتر اس کی آخری دس راتوں میں اور ان میں سے بھی خاص کر طاق راتوں میں ہوتی ہے۔

شب قدر کی عظمت و اہمیت احادیث کے علاوہ قرآن مجید میں بھی خاص اہتمام سے بیان فرمائی گئی ہے۔ بلکہ اس کی پوری ایک سورہ میں اسی کا بیان ہے۔ اور اسی وجہ سے اس کا نام ہی، سورۃ القدر، ہے۔ اس سورۃ میں جس طرح اس مبارک رات کی عظمت بیان فرمائی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عظمتیں ہمارے فہم و ادراک کے حدود سے بھی باہر ہیں

یہ بیان فرمانے کے بعد کہ "قرآن کا نزول شب قدر میں ہوا ہے" ارشاد فرمایا گیا ہے وما ادراک ما لیلۃ القدر "یعنی تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے یعنی اس کی عظمتیں اور برکتیں تمہارے فہم و ادراک سے بالاتر ہیں "لیلۃ القدر خیر من الف شہر" یعنی شب قدر ہزار مہینوں سے بھی بہتر اور افضل ہے جس کا مطلب یہ سمجھا گیا ہے کہ اللہ کے قرب و رضا کی جو منزلیں ایک ہزار مہینوں کے دنوں اور راتوں میں طے نہیں ہو سکتیں وہ اس ایک رات میں طے ہو جاتی ہیں۔ اور اس ایک رات کی عبادت و مجاہدہ پر اللہ تعالیٰ سے جو کچھ پانے کی توقع ہے وہ اس سے زیادہ ہے جتنی امید ایک ہزار مہینوں کی عبادت و مجاہدہ پر کی جا سکتی ہے، اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ مسجد حرام کی ایک نماز کا ثواب دوسری عام مسجدوں کی ایک لاکھ نمازوں کے ثواب کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ حاکم مطلق اور احکم الحاکمین ہے اس کو حق ہے کہ جس جگہ اور جس وقت کے کسی عمل کا جو چاہے اجر و ثواب مقرر فرمائے۔

واللہ ذوالفضل العظیم

موجودہ قیمت 3/75

Regd. No. L-353

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow

VOL. 36 — No. 8

صرف ٹامبل پرنٹرس اینڈ پرنٹرس قطب الدین روڈ، لکھنؤ ۳۔ میں چھپا۔

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

سالانہ چندہ
ہندستان سے ۷/۵۰
پاکستان سے ۷/۵۰
ششماہی
ہندوستان سے ۴/-
پاکستان سے ۴/-

الفرقان
ماہنامہ — لکھنؤ

فی کاپی ایک روپیہ (صرف اس اشاعت کیلئے)

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے
مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

جلد ۳۶ | بابت ماہ رمضان و شوال ۱۳۸۸ھ مطابق دسمبر ۱۹۶۸ء و جنوری ۱۹۶۹ء | شمارہ ۹-۱۰

اگر اس دائرہ میں سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ فروری ۱۹۶۹ء تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:- اپنا چندہ ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں، ڈاکخانہ کی رسید بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:- براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت:- الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آ جانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

محمد منظور نعمانی ____________

کسی مہلک مرض میں مبتلا اُس بیمار کی شفایابی کی آپ کیا توقع کر سکتے ہیں جس کو اُس کے انتہائی شفیق اور بڑے حاذق طبیب نے بتایا ہو کہ کوئی دوا اور علاجی تدبیر تمہارے لیے اُسی صورت میں نفع مند ہو سکتی ہے جب تم فلاں مضر چیز سے مکمل پرہیز کرو اور اپنی فلاں بری عادت جو دراصل تمہاری اس بیماری کا بنیادی سبب ہے اُس کو بالکل ہی چھوڑ دو اور اُس کے پاس نہ جاؤ۔

لیکن وہ مریض اور سب کچھ کرنے کے لیے تو تیار ہو مگر اپنے معالج طبیب کی اس ہدایت کی پابندی کرنے پر آمادہ نہ ہو حالانکہ وہ خود بھی بار بار اس کا تجربہ کر چکا ہو کہ جب کبھی اُس نے اس ہدایت کی خلاف ورزی کی ہے اُس کی بیماری تیزی سے بڑھی ہے، اور اُس فائدہ پر بھی پانی پھر گیا ہے جو اُس وقت تک کے دوا علاج سے ہوا تھا ____ بلاشبہ یہی وہ مریض ہے جس کا علاج "لقمان" کے پاس بھی نہیں ہے۔

خدا کے لیے سوچیے کیا ہم مسلمانوں کا بالکل یہی حال نہیں ہے۔

قرآن پاک میں جا بجا فرمایا گیا ہے کہ اس دنیوی زندگی میں مسلمانوں کی برتری اور بالاتری کے لیے (دوسری کوششوں و تدبیروں کے علاوہ) بنیادی شرط یہ ہے کہ ان کی اجتماعی حالت یہ ہو کہ اُن میں ایمان ہو اور زندگی ایمان والی ہو یعنی عقیدہ اور عمل کے لحاظ سے وہ سچے پکے مؤمن ہوں۔

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (آل عمران ع ۱۴)	تم ہی بالاتر ہو کے رہو گے بشرطیکہ تم سچے اور پورے مومن ہو جاؤ۔

إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ ۝

(مومن - ع ۵)

ہمارا فیصلہ ہے کہ ہم اپنے رسولوں کی اور اہل ایمان کی حمایت اور مدد کرتے ہیں (اور انکے دشمنوں پر ان کو غالب کرتے ہیں) اس دنیاوی زندگی میں اور قیامت کے دن بھی ہماری سرپرستی اور رحمت ان کو حاصل ہوگی۔

قرآن مجید میں یہ حقیقت مختلف پیرایوں میں بیسیوں جگہ بیان فرمائی گئی ہے۔ اسی طرح اگلی امتوں خاص کر بنی اسرائیل کی یہ سرگزشت بھی ہماری سبق آموزی کے لیے مختلف صورتوں میں بار بار سنائی گئی ہے کہ وہ جب تک ایمانی عہد و میثاق پر قائم رہے اور اپنے نبیوں کی لائی ہوئی شریعت کی پیروی کرتے رہے، ان کو اللہ تعالیٰ کی خاص حمایت و نصرت اور اس کے نتیجہ میں عزت اور برتری حاصل رہی۔ فرعون جیسے ان کے جابر و قاہر دشمنوں کو جنھوں نے اُن کو دردناک مظالم کا نشانہ بنا رکھا تھا، ان کی آنکھوں کے سامنے تباہ و برباد کر دیا گیا اور ان بنی اسرائیل کو جو مدتوں سے ذلت و نکبت اور غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے، زمین کا وارث بنا دیا گیا ــــ لیکن جب انھوں نے اپنی عملی زندگی میں خدا سے کیا ہوا عہد و میثاق توڑ دیا اور خدا پرستی اور پیغمبروں کے طریقہ کی پیروی کا راستہ چھوڑ کے نفس پرستی اور باغیانہ بے راہ روی اختیار کر لی تو اللہ نے نصرت اور سرپرستی کا اپنا ہاتھ اُن پر سے اُٹھا لیا، پھر وہی بنی اسرائیل (جو نبیوں کی اولاد بھی تھے) ذلیل و خوار ہوئے اور دنیا کے لیے سامانِ عبرت بن گئے۔

قرآن پاک ہی میں جا بجا یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ازلی و ابدی قانون و دستور ہے اور غیر مبدّل سنت اللہ ہے۔ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيلًا ۝

اس کے علاوہ قرآن پاک میں یہ بھی صاف صاف بیان فرما دیا گیا ہے کہ کسی قوم کے حالات اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُسی وقت بگاڑے جاتے ہیں جب وہ خود اپنی حالت بگاڑ لیتی ہے اور اللہ کی بندگی اور اس کی شریعت کی پیروی کے بجائے نفس پرستی اور نافرمانی کا راستہ اختیار کر لیتی ہے۔

ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ (انفال ع ۷)	اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو نعمت سے نوازتا ہے اور اُس پر اپنا فضل فرماتا ہے تو جب تک کہ خود وہ قوم اپنے کو بگاڑ کر محرومی کے قابل نہ بنائے، اللہ تعالیٰ اس کو محروم نہیں کرتا اور اپنی بخشی ہوئی نعمت نہیں چھینتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے ارشادات میں بار بار اس سنت اللہ کو بیان فرمایا ہے اور اُمت کو اس بارہ میں واضح آگاہی دی ہے۔ "الفرقان" کے ناظرین اس سلسلہ کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اُس کے صفحات میں بار بار پڑھ چکے ہیں۔

پھر دورِ نبوت سے کر اِس وقت تک کی اُمت مسلمہ کی پوری تاریخ اس سنت اللہ کی ایسی شہادت دے رہی ہے جس سے زیادہ جلی اور کھلی شہادت کا تصور نہیں کیا جا سکتا ـــــ عہد صدیقی اور عہد فاروقی میں شام، عراق، ایران اور مصر کے میدانوں میں جن دشمنوں سے مسلمانوں کے معرکے ہوئے، اُن کو فوجوں کی تعداد، اسلحہ، دوسرے سامانِ جنگ اور سارے مادی وسائل کے لحاظ سے مسلمانوں کے مقابلہ میں اتنی برتری حاصل تھی کہ دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں تھی لیکن نتیجہ وہ ہوا جو معلوم ہے۔ اور اس کی کوئی توجیہ اس کے سوا نہیں کی جا سکتی کہ وہ اصحاب ایمان اللہ کے وفادار اور اطاعت شعار تھے اور اللہ کی غیبی مدد اُن کے ساتھ تھی۔

ہماری فاتحانہ تصویر کا یہ رُخ تاریخ میں پوری طرح محفوظ ہے ـــــ اور دوسرا عبرتناک رُخ وہ ہے جو پورے عالم اسلام اور خاص کر عرب علاقوں میں ادھر مدتوں سے دیکھا جا رہا ہے۔ اور جس کا انتہائی رسوا کن اور دلفگار منظر اسرائیل اور عربوں کے جون ۱۹۶۷ء کے تصادم کے موقع پر چشم فلک نے دیکھا ـــــ پھر ادھر چند ہفتوں سے یعنی جب سے کہ لبنان کے ہوائی اڈہ پر حملہ کرکے اسرائیل نے اپنے جنگجویانہ عزائم اور اپنی تیاریوں کا اشارہ دیا ہے، اس وقت سے تو ایسا محسوس کیا جا رہا ہے کہ عربوں نے گویا اپنی بے بسی اور بیچارگی تسلیم کر لی ہے اور اپنی بقا اور تحفظ کے لیے بھی ان کی نگاہیں اب بس روس اور فرانس پر لگی ہوئی ہیں

اس صورت حال پر غور کرتے ہوئے، اسرائیل کی کل تعداد، اُس کا رقبہ اور عرب ممالک

(باقی صفحہ ۹ پر)

کتابُ الاَذکار والدَّعوات

معارفُ الحدیث

(مُسَلسَل)

صلوٰۃ وسلام :-

"صلاۃ وسلام" دراصل اللہ تعالیٰ کے حضور میں کی جانے والی بہت اعلیٰ اور اشرف درجہ کی ایک دعا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک نے اپنی ایمانی وابستگی اور وفاکیشی کے اظہار کے لیے آپ کے حق میں کی جاتی ہے، اور اس کا حکم ہم بندوں کو خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن پاک میں دیا گیا اور بڑے پیارے اور مؤثر انداز میں دیا گیا ہے، ارشاد فرمایا گیا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ۝ (الاحزاب - ع ۷)

اس آیت میں اہل ایمان کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ وہ اللہ کے نبی پر صلوٰۃ وسلام بھیجا کریں (اور یہی آیت کا اصل موضوع و مدعا ہے) لیکن اس خطاب بلکہ حکم میں خاص اہمیت اور جذب پیدا کرنے کے لیے پہلے بطور تمہید فرمایا گیا ہے "اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ" یعنی نبی پر صلوٰۃ (جس کا تمھیں حکم دیا جا رہا ہے) خداوند قدوس اور اس کے پاک فرشتوں کا معمول و دستور ہے، تم بھی اس کو اپنا معمول بنا کے اِس محبوب و مبارک عمل میں اُن کے شریک ہو جاؤ۔

حکم اور خطاب کا یہ انداز قرآن پاک میں صرف صلوٰۃ و سلام کے اس حکم ہی کے لیے اختیار کیا گیا ہے دوسرے کسی اعلیٰ سے اعلیٰ عمل کے لیے بھی نہیں کہا گیا کہ خدا اور اس کے فرشتے یہ کام کرتے ہیں تم بھی کرو۔ — بلاشبہ درود و سلام کا یہ بہت بڑا امتیاز ہے اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام محبوبیت کے خصائص میں سے ہے۔

صلوٰۃ علی النبی کا مطلب اور ایک اشکال کا حل

سورۂ احزاب کی اس آیت میں بہت سے لوگوں کو یہ اشکال محسوس ہوتا ہے کہ اس میں اللہ اور فرشتوں کی نسبت سے بھی صلوٰۃ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور مومن بندوں کی نسبت سے بھی وہی لفظ استعمال فرمایا گیا ہے۔ حالانکہ حقیقت کے لحاظ سے ان میں سے ہر ایک کا عمل دوسرے سے یقیناً مختلف ہے — اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ کا جو عمل ہوتا ہے (جس کو اس آیت میں فرشتوں کے عمل کے ساتھ جوڑ کر "یُصَلُّوْنَ" کے لفظ سے ذکر کیا گیا ہے) وہ ہرگز فرشتوں اور مومنین کا عمل نہیں ہو سکتا۔ اور اسی طرح ایمان والے بندوں سے جس عملِ صلوٰۃ کا مطالبہ "صَلُّوْا" کے لفظ سے کیا گیا ہے وہ ہرگز خدا کا فعل نہیں ہو سکتا۔

اس کو حل کرنے کے لیے اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ نسبت کے بدلنے سے صلوٰۃ کے معنیٰ بدل جاتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت ہو تو اس کا مطلب ہوتا ہے رحمت نازل کرنا اور جب ملائکہ یا مومنین کی طرف نسبت ہو تو اس کا مطلب ہوتا ہے اللہ سے رحمت کی دعا کرنا — لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ صلوٰۃ کے معنی میں بہت وسعت ہے تکریم و تشریف، مدح و ثناء، رفعِ مراتب، محبت و عطوفت، برکت و رحمت، پیار دلار، ارادۂ خیر و دعائے خیر، ان سب کو صلوٰۃ کا مفہوم حاوی ہے۔ اس لیے اس کی نسبت اللہ اور اس کے فرشتوں کی طرف اور ایمان والے بندوں کی طرف یکساں طور پر کی جا سکتی ہے — البتہ یہ فرق ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کی صلوٰۃ اس کی شانِ عالی کے مطابق ہوگی اور فرشتوں کی طرف سے ان کے مرتبہ کے مطابق، اور مومنین کی طرف سے اُن کی حیثیت کے مطابق۔

اس بنا پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی اپنے نبی پر خاص الخاص عنایت و نوازش اور بڑا پیار دلار ہے اور وہ ان کی مدح و ستائش کرتا اور عظمت و شرف کے بلند ترین مقام تک ان کو پہونچانا چاہتا ہے، اور فرشتے بھی ان کی تکریم و تعظیم اور مدح و ثنا کرتے ہیں اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے بیش از بیش الطاف و عنایات اور رفع درجات کی دعائیں کرتے ہیں۔ اے ایمان والو تم بھی ایسا ہی کرو اور آپ کے لیے اللہ تعالیٰ سے خاص الخاص لطف و عنایت، محبت و عطوفت، مراتب اور درجات کی رفعت، پورے عالم کی سیادت و امامت اور مقام محمود و قبولیتِ شفاعت کی دعا کیا کرو اور آپ پر سلام بھیجا کرو۔

صلوٰۃ و سلام کی عظمت و اہمیت

اس آیت میں جیسی شاندار تمہید اور جس اہتمام کے ساتھ اہلِ ایمان کو صلوٰۃ و سلام کا حکم دیا گیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی کتنی اہمیت و عظمت ہے اور وہ کیسا محبوب عمل ہے ـــ آگے درج ہونے والی حدیثوں سے معلوم ہوگا کہ اس میں اہلِ ایمان کے لیے کس قدر خیر، کتنی رحمت اور کیسی برکات ہیں۔

صلوٰۃ و سلام کے بارہ میں فقہا کے مسالک

اُمت کے فقہا اس پر تقریباً متفق ہیں کہ سورۂ احزاب کی اس آیت کی رو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجنا ہر فردِ امت پر فرض ہے، پھر ائمہ امت میں امام شافعیؒ اور ایک روایت کے مطابق امام احمدؒ بھی اس کے قائل ہیں کہ خاصکر ہر نماز کے قعدۂ اخیرہ میں تشہد کے بعد درود شریف پڑھنا واجباتِ نماز میں سے ہے۔ اگر نہ پڑھی تو ان ائمہ کے نزدیک نماز ہی نہ ہوگی ـــ لیکن امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ اور اکثر دوسرے فقہا کا مسلک یہ ہے کہ قعدہ میں تشہد تو بیشک واجب ہے جس کے ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام بھی آجاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد مستقلاً درود شریف پڑھنا فرض یا واجب نہیں بلکہ ایک اہم اور مبارک سنت ہے جس کے چھوٹ جانے سے نماز میں بڑا نقص رہ جاتا ہے ـــ مگر اس اختلاف کے باوجود اس پر تقریباً اتفاق ہے کہ اس آیت کے حکم کی تعمیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

پر صلوٰۃ وسلام بھیجنا ہر مسلمان پر اسی طرح فرض عین ہے جس طرح مثلاً آپ کی رسالت کی شہادت دینا جس کے لیے کسی وقت اور تعداد کا تعین نہیں کیا گیا ہے، اور اس کا ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ ایک دفعہ پڑھ لے اور پھر اس پر قائم رہے۔

آگے بعض وہ حدیثیں آئیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ جب جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آئے آپ پر لازماً درود بھیجا جائے۔ اور اس میں کوتاہی کرنے والوں کے لیے سخت وعیدیں بھی آئیں گی ـــــ ان احادیث کی بنا پر بہت سے فقہاء اس کے بھی قائل ہیں کہ جب کوئی آپ کا ذکر کرے یا دوسرے سے سنے تو اس وقت آپ پر درود بھیجنا واجب ہے پھر ایک رائے یہ ہے کہ اگر ایک ہی نشست اور ایک ہی سلسلۂ کلام میں بار بار آپ کا ذکر آئے تو ہر دفعہ درود پڑھنا واجب ہوگا۔ اور دوسری رائے یہ ہے کہ اس صورت میں ایک دفعہ تو پڑھنا واجب ہوگا اور ہر دفعہ پڑھنا مستحب ہے اور محققین نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

درود شریف کی امتیازی خاصیت

اللہ تعالیٰ نے جس طرح ہماری اس مادّی دنیا میں پھلوں اور پھولوں کو الگ الگ رنگتیں دی ہیں اور اُن میں مختلف قسم کی خوشبوئیں رکھی ہیں (ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر ست) اسی طرح مختلف عبادات اور اذکار و دعوات کے الگ الگ خواص اور برکات ہیں۔ درود شریف کی امتیازی خاصیت یہ ہے کہ خلوصِ دل سے اُس کی کثرت، اللہ تعالیٰ کی خاص نظر رحمت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روحانی قرب اور آپ کی خصوصی شفقت و عنایت حاصل ہونے کا خاص الخاص وسیلہ ہے۔ آگے درج ہونے والی بعض حدیثوں سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ ہر اُمتی کا درود و سلام اُس کے نام کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچایا جاتا ہے اور اس کے لیے فرشتوں کا پورا عملہ ہے۔

ذرا غور کریں! اگر آپ کو معلوم ہو جائے کہ اللہ کا فلاں بندہ آپ کے لیے اور آپ کے گھر والوں اور سب متعلقین کے لیے اچھی سے اچھی دعائیں برابر کرتا رہتا ہے۔ اپنے لیے اللہ تعالیٰ سے اُتنا نہیں مانگتا جتنا آپ کے لیے مانگتا ہے اور یہ اُس کا محبوب ترین مشغلہ ہے، تو آپ کے دل میں اُس کی کیسی قدر و محبت اور خیر خواہی کا کیسا جذبہ پیدا ہوگا، پھر جب کبھی اللہ کا وہ بندہ آپ کے سامنے آئیگا اور آپ سے ملیگا تو آپ کس طرح اُس سے ملینگے ـــــ اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ اللہ کا جو بندہ

ایمان اور اخلاص کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کثرت سے درود و سلام پڑھے اُس پر آپ کی کیسی نظرِ عنایت ہوگی اور قیامت و آخرت میں اُس کے ساتھ آپ کا معاملہ کیا ہوگا ——

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی محبوبیت کا جو مقام حاصل ہے اس کو پیش نظر رکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُس بندہ سے اللہ تعالیٰ کتنا خوش ہوگا اور اُس پر اُس کا کیسا کرم ہوگا۔

درود و سلام کا مقصد

یہاں ایک بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ درود و سلام اگرچہ بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اللہ تعالیٰ سے ایک دعا ہے لیکن جس طرح کسی دوسرے کے لیے دعا کرنے کا اصل مقصد اُس کو نفع پہونچانا ہوتا ہے اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجنے کا مقصد آپ کی ذاتِ پاک کو نفع پہونچانا نہیں ہوتا۔ ہماری دعاؤں کی آپ کو قطعاً کوئی احتیاج نہیں۔ بادشاہوں کو فقیروں مسکینوں کے تحفوں اور ہدیوں کی کیا ضرورت! —— بلکہ جس طرح اللہ تعالیٰ کا ہم بندوں پر حق ہے کہ اُس کی عبادت اور حمد و تسبیح کے ذریعہ اپنی عبدیت اور عبودیت کا نذرانہ اُس کے حضور میں پیش کریں اور اُس سے اللہ تعالیٰ کو کوئی نفع نہیں پہونچتا بلکہ وہ خود ہماری ضرورت ہے اور اُس کا نفع ہم ہی کو پہونچتا ہے اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محاسن و کمالات آپ کی پیغمبرانہ خدمات اور اُمت پر آپ کے عظیم احسانات کا یہ حق ہے کہ اُمتی آپ کے حضور میں عقیدت و محبت اور وفاداری و نیاز مندی کا ہدیہ اور ممنونیت اور سپاسگزاری کا نذرانہ پیش کریں۔ اسی کے لیے درود و سلام کا یہ طریقہ مقرر کیا گیا ہے اور جیسا کہ عرض کیا گیا اُس کا مقصد آپ کو کوئی نفع پہونچانا نہیں ہوتا بلکہ اپنے ہی نفع کے لیے یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا و ثوابِ آخرت اور اُس کے رسولِ پاک کا مزید قرب اور اُن کی خاص نظرِ عنایت حاصل کرنے کے لیے درود و سلام پڑھا جاتا ہے اور پڑھنے والے کا اصل مقصد بس یہی ہوتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ کا یہ خاص کرم ہے کہ وہ ہمارا درود و سلام کا یہ ہدیہ اپنے رسولِ پاک تک فرشتوں کے ذریعہ پہونچواتا ہے اور بہت سوں کا آپ کو قبر مبارک میں براہِ راست بھی سنوا دیتا ہے جیسا کہ آگے درج ہونے والی احادیث سے معلوم ہوگا نیز ہمارے اس درود و سلام کے حساب میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے الطاف و عنایات اور تکریم و تشریف میں اضافہ فرماتا ہے۔

درود و سلام کی خاص حکمت | انبیاء علیہم السلام اور خاص کر سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عقیدت و محبت اور وفاداری و نیاز مندی کا ہدیہ اور ممنونیت و سپاسگزاری کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے درود و سلام کا طریقہ مقرر کرنے کی سب سے بڑی حکمت یہ ہے کہ اس سے شرک کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے مقدس اور محترم ہستیاں انبیاء علیہم السلام کی ہیں اور ان میں سب سے اکرم و افضل خاتم النبیین سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ جب ان کے بارے میں بھی یہی حکم دیا گیا کہ ان کے لیے درود و سلام بھیجا جائے (یعنی اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے خاص الخاص عنایت و رحمت اور سلامتی کی دعا کی جائے) تو معلوم ہوا کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت و عنایت اور نظر کرم کے محتاج ہیں اور ان کا حق اور مقام عالی یہی ہے کہ ان کے واسطے اللہ تعالیٰ سے اعلیٰ سے اعلیٰ دعائیں کی جائیں۔ اس کے بعد شرک کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ کتنا بڑا کرم ہے اس کریم کا کہ اس کے اس حکم نے ہم بندوں اور امتیوں کو نبیوں اور رسولوں کا اور خاص کر سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا دعاگو بنا دیا۔ جو بندہ ان مقدس ہستیوں کا دعاگو ہو وہ کسی مخلوق کا پرستار کیسے ہو سکتا ہے۔

احادیث میں درود و سلام کی ترغیبات اور فضائل و برکات | اس تمہید کے بعد وہ حدیثیں پڑھیے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام کی ترغیب دی گئی ہے اور اس کی فضیلت اور برکات کا بیان فرمایا گیا ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلّٰى عَلَیَّ مَرَّةً وَّاحِدَةً صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ عَشْرًا ــــــ رواہ مسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو بندہ مجھ پر ایک دفعہ صلوٰۃ بھیجے اللہ تعالیٰ اس پر دس بار صلوٰۃ بھیجتا ہے (صحیح مسلم)

(تشریح) اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ صلوٰۃ کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو تکریم و تشریف اور آپ پر جو خاص الخاص عنایت و نوازش ہوتی ہے اس کو بھی صلوٰۃ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور عام ایمان والے بندوں کے ساتھ رحمت و کرم کا جو معاملہ ہوتا ہے اس کے لیے بھی صلوٰۃ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اسی لیے اس حدیث میں

اُس رحمت و عنایت کے لیے بھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے والے بندہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے، صلوٰۃ ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ فرمایا گیا ہے "صلی اللہ علیہ عشرا" یعنی حضور پر ایک دفعہ صلوٰۃ بھیجنے والے بندہ پر اللہ تعالیٰ دس دفعہ صلوٰۃ بھیجتا ہے) مگر ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کی صلوٰۃ میں اور دوسرے کسی ایمان والے بندہ پر اس کی صلوٰۃ میں وہی فرق ہوگا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقامِ عالی اور اُس ایمان والے بندہ کے درجہ میں ہوگا۔

آگے درج ہونے والی بعض حدیثوں سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہم بندوں کے صلوٰۃ بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے آپ پر صلوٰۃ بھیجنے کی استدعا کریں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اس حدیث کا مقصد و مدعا صرف ایک حقیقت اور واقعہ کی اطلاع دینا نہیں ہے بلکہ اُس مبارک عمل (الصلوٰۃ علی النبی) کی ترغیب دینا ہے جو اللہ تعالیٰ کی صلوات یعنی خصوصی رحمتوں اور عنایتوں کے حاصل کرنے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب روحانی کی برکات سے بہرہ ور ہونے کا خاص الخاص وسیلہ ہے ــــــ اسی طرح آگے درج ہونے والی حدیثوں کا مقصد و مدعا بھی یہی ہے۔

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ صَلٰوۃً وَّاحِدَۃً صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ عَشْرَ صَلَوَاتٍ وَّحُطَّتْ عَنْہُ عَشْرُ خَطِیْئَاتٍ وَّرُفِعَتْ لَہٗ عَشْرُ دَرَجَاتٍ ــــــ رواہ النسائی

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو بندہ مجھ پر ایک صلوٰۃ بھیجے اللہ تعالیٰ اُس پر دس صلوٰتیں بھیجتا ہے اور اُس کی دس خطائیں معاف کر دی جاتی ہیں اور اُس کے دس درجے بلند کر دیے جاتے ہیں۔ (سنن نسائی)

عَنْ اَبِیْ بُرْدَۃَ بْنِ نِیَارٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ مِنْ اُمَّتِیْ صَلٰوۃً مُّخْلِصًا مِّنْ قَلْبِہٖ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ بِھَا عَشْرَ صَلَوَاتٍ وَّرَفَعَہٗ بِھَا عَشْرَ دَرَجَاتٍ وَّکَتَبَ لَہٗ بِھَا عَشْرَ حَسَنَاتٍ وَّمَحٰی عَنْہُ عَشْرَ سَیِّئَاتٍ ــــــ رواہ النسائی

ابوبردہ بن نیار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرا جو امتی خلوصِ دل سے مجھ پر صلوٰۃ بھیجے۔ اللہ تعالیٰ اُس پر دس صلوٰتیں بھیجتا ہے اور اُس کے صلہ میں اُس کے دس درجے بلند کرتا ہے اور اس کے حساب میں دس نیکیاں لکھتا ہے اور اُس کے دس گناہ محو فرمادیتا ہے۔ (سنن نسائی)

(تشریح) حضرت ابوہریرہ والی پہلی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک دفعہ صلوٰۃ بھیجنے والے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف دس صلوٰتوں کے بھیجے جانے کا ذکر تھا۔ اس کے بعد حضرت انس والی دوسری حدیث میں دس صلوٰتوں کے علاوہ دس درجوں کی بلندی اور دس گناہوں کی معافی کا بھی ذکر فرمایا گیا اور ابوبردہ بن نیار والی اس تیسری حدیث میں ان سب کے علاوہ اس بندہ کے نامۂ اعمال میں مزید دس نیکیوں کے لکھے جانے کی بشارت بھی سنائی گئی۔

اس عاجز کے نزدیک یہ صرف اجمال اور تفصیل کا فرق ہے۔ یعنی دوسری اور تیسری حدیث میں جو کچھ فرمایا گیا ہے وہ پہلی حدیث کے اجمال کی تفصیل ہے۔ واللہ اعلم تیسری حدیث سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ صلہ پانے کے لیے شرط ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ "اخلاص قلب" سے بھیجی جائے

عَنْ اَبِیْ طَلْحَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَاءَ ذَاتَ يَوْمٍ وَالْبِشْرُ فِیْ وَجْهِهٖ فَقَالَ اِنَّهٗ جَاءَنِیْ جِبْرَئِيْلُ فَقَالَ اِنَّ رَبَّكَ يَقُوْلُ اَمَا يُرْضِيْكَ يَا مُحَمَّدُ اَنْ لَا يُصَلِّیَ عَلَيْكَ اَحَدٌ مِنْ اُمَّتِكَ اِلَّا صَلَّيْتُ عَلَيْهِ عَشْرًا وَلَا يُسَلِّمُ عَلَيْكَ اَحَدٌ مِنْ اُمَّتِكَ اِلَّا سَلَّمْتُ عَلَيْهِ عَشْرًا ——— رواہ النسائی والدارمی

حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن تشریف لائے اور آپ کے چہرۂ انور میں خوشی اور بشاشت کے آثار نمایاں تھے۔ (اس کا سبب بیان کرتے ہوئے) آپ نے فرمایا کہ آج جبرئیل امین آئے اور انھوں نے بتایا کہ تمہارا رب فرماتا ہے کہ اے محمد کیا یہ بات تمہیں راضی اور خوش نہیں کردے گی کہ تمہارا جو امتی تم پر صلوٰۃ بھیجے میں اُس پر دس صلوٰتیں بھیجوں اور جو تم پر سلام بھیجے میں اس

پر دس سلام بھیجوں اور جو تم پر سلام بھیجے میں اُس پر دس سلام بھیجوں

(سنن نسائی، مسند دارمی)

(تشریح) قرآن پاک میں ارشاد فرمایا گیا ہے "وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ" (اے نبی تمہارا رب تم کو اتنا عطا فرمائے گا کہ تم راضی ہو جاؤ گے) اس وعدہ کا پورا ظہور تو آخرت میں ہوگا لیکن یہ بھی اُس کی ایک قسط ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کا اتنا اکرام فرمایا اور محبوبیتِ کُبریٰ کا وہ مقامِ عالی آپ کو عطا فرمایا کہ جو بندہ آپ کی محبت اور آپ کے احترام میں خالصاً للہ آپ پر صلوٰۃ و سلام بھیجے اللہ تعالیٰ نے اس پر دس صلوٰتیں اور دس سلام بھیجنے کا دستور اپنے لیے مقرر فرمایا۔۔۔ اور جبرئیل امین کے ذریعہ آپ کو اس کی اطلاع دی اور اس پیارے انداز میں دی " ان ربك يقول اما يرضيك يا محمد" تمہارا رب فرماتا ہے۔ اے محمد کیا تمہیں ہمارا یہ فیصلہ راضی اور خوش نہیں کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ نصیب فرمائے تو ان احادیث سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام محبوبیت کو کچھ سمجھا جا سکتا ہے۔

عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى دَخَلَ نَخْلًا فَسَجَدَ فَاَطَالَ السُّجُوْدَ حَتّٰى خَشِيْتُ اَنْ يَّكُوْنَ اللّٰهُ قَدْ تَوَفَّاهُ قَالَ فَجِئْتُ اَنْظُرُ فَرَفَعَ رَاْسَهٗ فَقَالَ مَالَكَ؟ فَذَكَرْتُ لَهٗ ذٰلِكَ قَالَ فَقَالَ اِنَّ جِبْرَئِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ لِيْ اَلَا اُبَشِّرُكَ اَنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يَقُوْلُ لَكَ مَنْ صَلّٰى عَلَيْكَ صَلٰوةً صَلَّيْتُ عَلَيْهِ وَمَنْ سَلَّمَ عَلَيْكَ سَلَّمْتُ عَلَيْهِ۔

رواہ احمد

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آبادی سے نکل کر کھجوروں کے ایک باغ میں پہنچے اور سجدہ میں گر گئے اور بہت دیر تک اسی طرح سجدہ میں پڑے رہے یہاں تک کہ مجھے خطرہ ہوا کہ آپ وفات تو نہیں پاگئے، میں آپ کے پاس آیا اور غور سے دیکھنے لگا۔ آپ نے سر مبارک سجدہ سے اٹھایا اور مجھ سے فرمایا: کیا بات ہے اور تمہیں کیا فکر ہے؟ میں نے عرض کیا کہ (آپ کے دیر تک سجدہ سے سر نہ

اٹھانے کی وجہ سے مجھے ایسا شبہ ہوا تھا اس لیے میں آپ کو دیکھ رہا تھا ـــــ تو آپ نے فرمایا کہ اصل واقعہ یہ ہے کہ جبرئیل نے آکر مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہیں بشارت سناتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ جو بندہ تم پر صلوٰۃ بھیجے میں اُس پر صلوٰۃ بھیجوں گا اور جو تم پر سلام بھیجے میں اس پر سلام بھیجوں گا۔ (مسند احمد)

(تشریح) اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ و سلام بھیجنے والے کے لیے اللہ کی طرف سے صلوٰۃ وسلام بھیجے جانے کا ذکر ہے لیکن دس کا عدد اس روایت میں مذکور نہیں ہے، مگر اس سے پہلی حضرت ابو طلحہ والی روایت سے معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت جبرئیل نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دس دفعہ صلوٰۃ وسلام بھیجے جانے کی بشارت دی تھی ـــــ پھر یا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کو بتاتے وقت دس کے عدد کا ذکر ضروری نہیں سمجھا یا بعد کے کسی راوی کے بیان کرنے سے رہ گیا۔

اسی حدیث کی مسند احمد کی ایک روایت میں یہ لفظ بھی ہے کہ فَسَجَدتُ لِلّٰهِ شُكْرًا (یعنی میں نے اس بشارت کے شکر میں یہ سجدہ کیا تھا) امام بیہقی نے اس حدیث کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سجدۂ شکر کے ثبوت میں میری نظر میں یہ سب سے زیادہ صحیح حدیث ہے۔ واللہ اعلم۔

قریب قریب اسی مضمون کی ایک حدیث طبرانی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کی ہے، اُس میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک غیر معمولی قسم کے سجدہ کا ذکر ہے، اس کے آخر میں ہے کہ آپ نے سجدہ سے اُٹھ کر مجھے بتایا کہ

اِنَّ جِبْرَئِيْلَ اَتَانِىْ فَقَالَ مَنْ	جبرئیل میرے پاس آئے اور انھوں نے یہ
صَلّٰى عَلَيْكَ مِنْ اُمَّتِكَ	پیغام پہنچایا کہ تمہارا جو اُمتی تم پر ایک
وَاحِدَةً صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ عَشْرًا	صلوٰۃ بھیجے گا، اللہ تعالیٰ اس پر دس
وَرَفَعَهُ بِهَا عَشْرَ دَرَجَاتٍ.	صلوٰتیں بھیجے گا اور اس کے دس درجے
	بلند فرمائے گا۔

ان سب حدیثوں کا مقصد در اصل امتیوں کو یہی بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صلوٰۃ وسلام کا تحفہ اور اس کی بے انتہا عنایتیں اور رحمتیں حاصل کرنے کا ایک کامیاب

اور بہترین ذریعہ خلوص قلب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام بھیجنا ہے' اللہ تعالیٰ ایک دفعہ کے صلوٰۃ وسلام کے صلہ میں دس دفعہ صلوٰۃ وسلام بھیجتا ہے' دس درجے بلند فرماتا ہے۔ نامۂ اعمال میں سے دس گناہ محو کر دیے اور مٹا دیے جاتے ہیں۔ اور دس نیکیاں لکھ دی جاتی ہیں ـــــ مثلاً اگر کوئی بندہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر روزانہ صرف سو دفعہ درود پاک پڑھتا ہے تو ان احادیث کی بشارت کے مطابق (جو ایک دو نہیں بلکہ بہت سے صحابۂ کرام سے صحاح اور سنن ومسانید کی تقریباً سب ہی کتابوں میں قابل اعتماد سندوں کیساتھ مروی ہیں) اس پر اللہ تعالیٰ ایک ہزار صلوٰتیں بھیجتا ہے یعنی رحمتیں اور نوازشیں فرماتا ہے' اس کے مرتبہ میں ایک ہزار درجے ترقی دی جاتی ہے۔ اس کے اعمال نامہ سے ایک ہزار گناہ محو کیے جاتے ہیں اور ایک ہزار نیکیاں لکھی جاتی ہیں ـــــ اللہ اکبر ـــــ کتنا ارزاں اور نفع بخش سودا ہے ـــــ اور کتنے خاسر اور بے نصیب ہیں وہ لوگ جنھوں نے اس سعادت اور کمائی سے اپنے کو محروم کر رکھا ہے ـــــ اللہ تعالیٰ یقین نصیب فرمائے اور عمل کی توفیق دے۔

آپ کے ذکر کے وقت بھی درود سے غفلت کرنے والوں کی محرومی اور ہلاکت :-

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَغِمَ اَنْفُ رَجُلٍ ذُكِرْتُ عِنْدَهٗ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَیَّ وَرَغِمَ اَنْفُ رَجُلٍ دَخَلَ عَلَيْهِ رَمَضَانُ ثُمَّ انْسَلَخَ قَبْلَ اَنْ يُّغْفَرَ لَهٗ وَرَغِمَ اَنْفُ رَجُلٍ اَدْرَكَ عِنْدَهٗ اَبَوَاهُ الْكِبَرَ اَوْ اَحَدُهُمَا فَلَمْ يُدْخِلَاهُ الْجَنَّةَ ـــــ رواہ الترمذی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا!

---

۵ حضرت ابو ہریرہ' حضرت انس' حضرت ابو بردہ بن نیار' حضرت عبدالرحمٰن بن عوف' حضرت ابو طلحہ انصاری اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی احادیث تو یہاں درج کی جا چکی ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت ابی بن کعب' حضرت عبداللہ بن عمر انصاری اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کی روایت سے بھی یہ مضمون مختلف کتب حدیث میں مروی ہے۔ گویا یہ مضمون "قدر مشترک" کے لحاظ سے متواتر ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ثبوت (تواتر) کے لحاظ سے یقینی اور قطعی ہے۔

ذلیل و خوار ہو وہ آدمی جس کے سامنے میرا ذکر آئے اور وہ اس وقت بھی مجھ پر صلوٰۃ یعنی درود نہ بھیجے، اور اسی طرح ذلیل و خوار ہو وہ آدمی جس کے لیے رمضان کا (رحمت و مغفرت والا) مہینہ آئے اور اُس کے گزرنے سے پہلے اس کی مغفرت کا فیصلہ نہ ہو جائے (یعنی رمضان کا مبارک مہینہ بھی وہ غفلت و خدا فراموشی میں گزار دے اور توبہ و استغفار کر کے اپنی مغفرت کا فیصلہ نہ کرا لے) اور ذلیل و خوار ہو وہ آدمی جس کے ماں باپ یا دونوں میں سے کوئی ایک اُس کے سامنے بڑھاپے کو پہونچیں اور وہ (ان کی خدمت کر کے) جنت کا استحقاق حاصل نہ کرے۔

(جامع ترمذی)

(تشریح) اس حدیث میں تین قسم کے جن آدمیوں کے لیے ذلت و خواری کی بد دعا ہے ان کا مشترک سنگین جرم یہ ہے کہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص عنایت سے اور رحمت و مغفرت حاصل کرنے کے بہترین مواقع فراہم کیے لیکن انھوں نے خدا کی رحمت و مغفرت کو حاصل کرنا ہی نہیں چاہا اور اس سے محروم رہنا ہی اپنے لیے پسند کیا، بے شک وہ بدبخت ایسی ہی بد دعا کے مستحق ہیں۔
اور آگے درج ہونے والی حدیث سے معلوم ہوگا کہ ایسے محروموں کے لیے اللہ کے مقرب ترین فرشتے حضرت جبرئیل امین نے بھی بڑی سخت بد دعا کی ہے۔ اللہ کی پناہ!

عَنْ كَعْبِ بْنِ عُجْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُحْضُرُوْا فَحَضَرْنَا فَلَمَّا ارْتَقَى الدَّرَجَةَ قَالَ اٰمِيْن ثُمَّ ارْتَقَى الدَّرَجَةَ الثَّانِيَةَ فَقَالَ اٰمِيْن ثُمَّ ارْتَقَى الدَّرَجَةَ الثَّالِثَةَ فَقَالَ اٰمِيْن فَلَمَّا فَرَغَ نَزَلَ عَنِ الْمِنْبَرِ فَقُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ سَمِعْنَا مِنْكَ الْيَوْمَ شَيْئًا مَا كُنَّا نَسْمَعُهُ فَقَالَ اِنَّ جِبْرَئِيْلَ عَرَضَ لِيْ فَقَالَ بَعُدَ مَنْ اَدْرَكَ رَمَضَانَ فَلَمْ يُغْفَرْ لَهُ فَقُلْتُ اٰمِيْن فَلَمَّا رَقِيْتُ الثَّانِيَةَ قَالَ بَعُدَ مَنْ ذُكِرْتَ عِنْدَهُ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيْكَ فَقُلْتُ اٰمِيْن فَلَمَّا رَقِيْتُ الثَّالِثَةَ قَالَ بَعُدَ مَنْ اَدْرَكَ اَبَوَيْهِ الْكِبَرُ اَوْ اَحَدَهُمَا فَلَمْ يُدْخِلَاهُ الْجَنَّةَ فَقُلْتُ اٰمِيْن۔

رواہ الحاکم فی المستدرک وقال صحیح الاسناد

حضرت کعب بن عجرہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم لوگوں کو فرمایا منبر کے پاس آ جاؤ، ہم لوگ حاضر ہو گئے آپ کو جو کچھ ارشاد فرمانا تھا اس کے لیے آپ منبر پر جانے لگے، جب منبر کے پہلے درجہ پر آپ نے قدم رکھا تو فرمایا آمین، پھر جب دوسرے درجہ پر قدم رکھا تو پھر فرمایا آمین، اسی طرح جب تیسرے درجہ پر قدم رکھا تو پھر فرمایا آمین، پھر جو کچھ آپ کو فرمانا تھا جب اس سے فارغ ہو کر آپ منبر سے نیچے اتر آئے تو ہم لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ آج ہم نے آپ سے ایک ایسی چیز سنی جو ہم پہلے نہیں سنتے تھے (یعنی منبر کے درجوں پر قدم رکھتے وقت آج آپ آمین کہتے تھے، یہ نئی بات تھی) آپ نے بتایا کہ جب میں منبر پر چڑھنے لگا تو جبرئیل امین آ گئے انھوں نے کہا کہ "بَعُدَ مَنْ اَدْرَكَ رَمَضَانَ فَلَمْ يُغْفَرْ لَهٗ" (تباہ و برباد ہو وہ محروم جو رمضان مبارک پائے اور اس میں بھی اس کی مغفرت کا فیصلہ نہ ہو) تو میں نے کہا آمین، پھر جب میں نے منبر کے دوسرے درجہ پر قدم رکھا تو انھوں نے کہا "بَعُدَ مَنْ ذُكِرْتَ عِنْدَهٗ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيْكَ" (تباہ و برباد ہو وہ بے توفیق اور بے نصیب جس کے سامنے آپ کا ذکر آئے اور وہ اس وقت بھی آپ پر درود نہ بھیجے) تو میں نے اس پر بھی کہا آمین، پھر جب میں نے منبر کے تیسرے درجہ پر قدم رکھا تو انھوں نے کہا "بَعُدَ مَنْ اَدْرَكَ اَبَوَيْهِ الْكِبَرُ اَوْ اَحَدَهُمَا فَلَمْ يُدْخِلَاهُ الْجَنَّةَ" (تباہ و برباد ہو وہ بدبخت آدمی جس کے ماں باپ یا اُن دونوں میں سے کوئی ایک اس کے سامنے بوڑھے ہو جائیں اور وہ (ان کی خدمت کر کے اور انکو راضی خوش کر کے) جنت کا مستحق نہ ہو جائے) اس پر بھی میں نے کہا آمین (مستدرک حاکم)

(تشریح) اس حدیث کا مضمون بھی قریب قریب وہی ہے جو اس سے پہلی حضرت ابوہریرہ والی حدیث کا تھا، فرق اتنا ہے کہ اس میں اصل بد دعا کرنے والے حضرت جبرئیل ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ہر بد دعا پر آمین کہا ہے۔

حضرت جبرئیل کی بد دعا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آمین کہنے کا یہی واقعہ الفاظ کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ حضرت کعب بن عجرہ انصاری کے علاوہ حضرت ابن عباس

حضرت انسؓ، حضرت جابر بن سمرہ، مالک بن الحویرث اور عبداللہ بن الحارث رضی اللہ عنہم سے بھی حدیث کی مختلف کتابوں میں روایت کیا گیا ہے ——— ان میں سے بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ حضرت جبرئیلؑ بددعا کرتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کرتے تھے کہ آپ آمین کہیے تو آپ آمین کہتے تھے۔ ان سب حدیثوں میں مذکورہ بالا تینوں قسم کے محروموں کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبرئیل کی طرف سے سخت ترین بددعا کے انداز میں جس طرح انتہائی ناراضی اور بیزاری کا اظہار کیا گیا ہے یہ دراصل ان تینوں کوتاہیوں کے بارہ میں سخت ترین انتباہ ہے نیز اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی محبوبیت کی وجہ سے فرشتوں کی دنیا اور ملاء اعلیٰ میں عظمت و محبوبیت کا وہ بلند ترین مقام حاصل ہے کہ جو شخص آپ کے حق کی ادائیگی کے معاملہ میں صرف اتنی کوتاہی اور غفلت کرے کہ آپ کے ذکر کے وقت آپ پر درود نہ بھیجے تو اس کے لیے سارے ملاء اعلیٰ کے امام اور نمائندے حضرت جبرئیل کے دل سے ایسی سخت بددعا نکلتی ہے اور وہ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی آمین کہلواتے ہیں ——— اللہ تعالیٰ اس قسم کی ہر تقصیر اور کوتاہی سے محفوظ رکھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حق شناسی اور حق کی ادائیگی کی توفیق دے۔

انہی احادیث کی بنا پر فقہاء نے یہ رائے قائم کی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آئے تو آپ پر درود بھیجنا ذکر کرنے والے پر بھی اور سننے والوں پر بھی واجب ہے، جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔

عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
اَلْبَخِيْلُ الَّذِيْ مَنْ ذُكِرْتُ عِنْدَهٗ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيَّ ——— رواہ الترمذی

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اصلی بخیل اور کنجوس وہ آدمی ہے جس کے سامنے میرا ذکر آئے اور وہ (ذرا سی زبان ہلا کے) مجھ پر درود بھی نہ بھیجے (جامع ترمذی)

تشریح) مطلب یہ ہے کہ عام طور سے بخیل ایسے آدمی کو سمجھا جاتا ہے جو دولت کے خرچ کرنے میں بخل کرے لیکن اس سے بھی بڑا بخیل اور بہت بڑا بخیل وہ آدمی ہے جس کے سامنے میرا ذکر

درود شریف کی کثرت قیامت میں حضور کے خصوصی قرب کا وسیلہ :-

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوْلَى النَّاسِ بِيْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَكْثَرُهُمْ عَلَيَّ صَلٰوةً ـــــــ رواہ الترمذی

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قیامت کے دن مجھ سے قریب تر ین اور مجھ پر زیادہ حق . یعنی میرا وہ امتی ہوگا جو مجھ پر زیادہ صلوٰۃ بھیجنے والا ہوگا۔

(جامع ترمذی)

تشریح . مطلب یہ ہے کہ ایمان اور ایمان والی زندگی کی بنیادی شرط کے ساتھ میرا جو امتی مجھ پر زیادہ سے زیادہ صلوٰۃ وسلام بھیجے گا۔ اس کو قیامت میں میرا خصوصی قرب اور خاص تعلق نصیب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ یہ دولت وسعادت حاصل کرنے کی توفیق دے۔

عَنْ رُوَيْفِعِ بْنِ ثَابِتٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ صَلّٰى عَلٰى مُحَمَّدٍ وَقَالَ اَللّٰهُمَّ اَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَجَبَتْ لَهُ شَفَاعَتِيْ ـــــــ رواہ احمد

حضرت رُوَیفع بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرا جو امتی مجھ پر صلوٰۃ بھیجے اور ساتھ ہی یہ دعا کرے کہ "اَللّٰهُمَّ اَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ" اے اللہ انکو (یعنی اپنے نبی حضرت محمد کو) قیامت کے دن اپنے قریب کی نشستگاہ اور کرسی عطا فرما اسکے لیے میری شفاعت واجب ہوگی (مسند احمد)

تشریح اس حدیث کو طبرانی نے بھی معجم کبیر میں روایت کیا ہے اور اس کے یہ الفاظ ہیں "مَنْ قَالَ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَاَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَجَبَتْ لَهُ شَفَاعَتِيْ" اس میں صلوٰۃ اور دعا کے پورے الفاظ آگئے ہیں اور بہت مختصر ہیں ـــــ یوں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سب ہی امتیوں کی انشاء اللہ شفاعت فرمائیں گے لیکن جو اہل ایمان آپ پر ان الفاظ میں درود بھیجیں اور اللہ تعالیٰ سے آپ کے لیے یہ دعا کریں۔ انکی شفاعت کا آپ اپنے پر خصوصی حق سمجھیں گے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کی سفارش امید ہے کہ

اگر تم ایسا کرو گے تو تمہاری ساری فکروں اور ضرورتوں کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کفایت کی جائے گی (یعنی تمہارے سارے دینی و دنیاوی مہمات غیب سے انجام پائیں گے)
اور تمہارے گناہ قصور ختم کر دیے جائیں گے (جامع ترمذی)

تشریح ۔ حدیث کا مطلب سمجھنے کے لیے جتنی تشریح کی ضرورت تھی وہ ترجمہ میں کر دی گئی ہے ۔ عام طور سے شارحین نے لکھا ہے کہ اس حدیث میں "صلوٰۃ" دعا کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو اس کے اصل معنی ہیں۔

حضرت اُبیّ بن کعب کثیر الدعوات تھے، اللہ تعالیٰ سے بہت دعائیں مانگا کرتے تھے، ان کے دل میں آیا کہ میں اللہ تعالیٰ سے جو دعائیں مانگتا ہوں اور جتنا وقت اس میں صرف کرتا ہوں اس میں سے کچھ وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ کے لیے (یعنی اللہ تعالیٰ سے آپ کے واسطے مانگنے کے لیے) مخصوص کر دوں، اس بارے میں انھوں نے خود حضور سے دریافت کیا کہ میں کتنا وقت اس کے لیے مخصوص کر دوں، آپ نے اپنی طرف سے وقت کی کوئی تحدید و تعیین مناسب نہیں سمجھی بلکہ ان ہی کی رائے پر چھوڑ دیا اور یہ اشارہ فرما دیا کہ اس کے لیے جتنا بھی زیادہ وقت دو گے تمہارے لیے بہتر ہی ہوگا۔ آخر میں انھوں نے طے کیا کہ میں وہ سارا وقت جس میں اپنے لیے اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتا ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ بھیجنے ہی میں یعنی اللہ تعالیٰ سے آپ کے لیے مانگنے میں صرف کروں گا۔ ان کے اس فیصلہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت سنائی کہ اگر تم ایسا کرو گے تو تمہارے وہ سارے مسائل و مہمات جن کے لیے تم دعائیں کرتے اللہ تعالیٰ کے کرم سے آپ سے آپ حل ہوں گے، اور تم سے جو گناہ قصور ہوئے ہوں گے وہ بھی ختم کر دیے جائیں گے، ان پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔

اسی سلسلہ "معارف الحدیث" میں تلاوت قرآن مجید کے فضائل کے بیان میں وہ حدیث قدسی گزر چکی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے۔

"مَنْ شَغَلَهُ الْقُرْآنُ عَنْ ذِكْرِيْ وَمَسْئَلَتِيْ اَعْطَيْتُهُ اَفْضَلَ مَا اُعْطِي السَّائِلِيْنَ" جس کا مطلب یہ ہے کہ جو بندہ تلاوت قرآن میں اتنا مشغول رہے کہ ۔۔۔

اللہ کے ذکر کے لیے اور اپنے مقاصد کے واسطے دعا کرنے کے لیے اُسے وقت ہی نہ ملے تو اللہ تعالیٰ
اس کو اپنی طرف سے اُس سے بھی زیادہ اور بہتر دے گا جتنا دعا کرنے والوں اور مانگنے والوں کو
دیتا ہے۔

جس طرح اس حدیث میں اُن بندوں کے لیے جو تلاوت قرآن میں اپنا سارا وقت صرف
کردیں، اور بس اسی کو اپنا وظیفہ بنالیں، اللہ تعالیٰ کی اس خاص عنایت و نوازش کا ذکر فرمایا
گیا ہے کہ وہ ان کو دعائیں کرنے والوں اور مانگنے والوں سے بھی زیادہ اور بہتر عطا فرمائے گا، اسی
طرح حضرت ابی بن کعب والی اس زیر تشریح حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن
محبین و مخلصین کے بارہ میں جو اپنی دعائیں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وقف کردیں
اور اپنے ذاتی مسائل و مقاصد کے لیے دعاؤں کی جگہ بھی بس آپ پر صلوٰۃ بھیجیں، یہ بتلایا ہے کہ اُن پر
اللہ تعالیٰ کا یہ خاص انعام و کرم ہوگا کہ اُن کے مسائل و مہمات غیب سے حل کیے جائیں گے اور اُن کے
گناہ دھو ڈالے جائیں گے۔

اس کا راز یہ ہے کہ جس طرح قرآن مجید کی تلاوت سے خاص شغف اور بس اسی کو اپنا وظیفہ
بنا لینا اللہ کی مقدس کتاب پر ایمان اور اس سے محبت و تعلق کی خاص نشانی ہے اور اس لیے ایسے
لوگ اللہ تعالیٰ کے خاص انعام و فضل کے مستحق ہیں، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر
صلوٰۃ وسلام سے ایسا شغف کہ اپنے ذاتی مقاصد و مسائل کے لیے دعا کی جگہ بھی بس آپ پر
صلوٰۃ بھیجی جائے اور اپنے لیے کچھ مانگنے کی جگہ بس آپ ہی کے لیے مولیٰ سے مانگا جائے —
اللہ کے محبوب رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر صادق ایمان اور سچے ایمانی تعلق و قلبی محبت کی
علامت ہے اور ایسے مخلص بندے بھی اس کے مستحق ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے سارے مسائل اپنی
رحمت سے بلا اُن کے مانگے حل فرمائے۔

علاوہ ازیں وہ احادیث ابھی گزر چکی ہیں جن میں بیان فرمایا گیا ہے کہ جو بندہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک صلوٰۃ بھیجتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر دس صلوتیں بھیجی جاتی
ہیں، اس کے اعمالنامہ میں دس نیکیاں درج کی جاتی ہیں، دس گناہ مٹا دیے جاتے ہیں اور
دس درجے بلند کر دیے جاتے ہیں —— ذرا غور کیا جائے، جس بندہ کا حال یہ ہو کہ وہ

اپنی ذاتی دعاؤں کی جگہ بھی بس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ بھیجے، اللہ سے اپنے لیے کچھ بھی نہ مانگے صرف حضور کے لیے صلوٰۃ کی استدعا کرے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے صلوات و برکات اور رحمتوں عنایتوں کی کیسی موسلادھار بارش ہوگی، جس کا لازمی اثر اور انجام یہی ہوگا کہ اللہ کی رحمت بن مانگے اس کی حاجتیں اور ضرورتیں پوری کرے گی اور گناہوں کے اثرات سے وہ بالکل پاک صاف کر دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ان حقائق کا یقین اور عمل نصیب فرمائے۔

دنیا میں کہیں بھی درود بھیجا جائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہونچتا ہے:-

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا تَجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قُبُوْرًا وَلَا تَجْعَلُوْا قَبْرِيْ عِيْدًا وَصَلُّوْا عَلَيَّ فَإِنَّ صَلٰوتَكُمْ تَبْلُغُنِيْ حَيْثُ كُنْتُمْ ——— رواہ النسائی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا، آپ نے ارشاد فرمایا تم اپنے گھروں کو قبریں نہ بنالو اور میری قبر کو میلہ نہ بنالینا، ہاں مجھ پر صلوٰۃ بھیجا کرو تم جہاں کہیں بھی ہوگے مجھے تمہاری صلوٰۃ پہونچے گی۔

(سنن نسائی)

تشریح: اس حدیث میں دو ہدایتیں فرمائی گئی ہیں، پہلی یہ کہ "اپنے گھروں کو قبریں نہ بنالو" اس کا مطلب عام طور سے شارحین نے یہ بیان کیا ہے کہ جس طرح قبروں میں مُردے ذکر و عبادت نہیں کرتے اور قبریں ذکر و عبادت سے خالی رہتی ہیں، تم اپنے گھروں کو ایسا نہ بنالو کہ وہ ذکر و عبادت سے خالی رہیں بلکہ ان کو ذکر و عبادت سے معمور رکھو ——— اس سے معلوم ہوا کہ جن گھروں میں اللہ کا ذکر اور اس کی عبادت نہ ہو وہ زندوں کے گھر نہیں بلکہ مُردوں کے قبرستان ہیں۔

دوسری ہدایت یہ فرمائی گئی ہے کہ "میری قبر کو میلہ نہ بنالینا" یعنی جس طرح سال کے کسی معین دن میں میلوں میں لوگ جمع ہوتے ہیں اس طرح میری قبر پر کوئی میلہ نہ لگایا جائے ——— بزرگان دین کی قبروں پر عرسوں کے نام سے جو میلے ہوتے ہیں اُن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر خدا نخواستہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف پر کوئی میلہ اس

طرح کا ہوتا تو اس سے روح پاک کو کتنی شدید اذیت پہونچتی۔

تیسری ہدایت یہ فرمائی گئی ہے کہ تم مشرق یا مغرب میں خشکی یا تری میں، جہاں بھی ہو مجھ پر صلوٰۃ بھیجو وہ مجھے پہونچے گی۔ —— یہی مضمون قریب قریب ان ہی الفاظ میں طبرانی نے اپنی مسند سے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کیا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں حَیْثُمَا کُنْتُمْ فَصَلُّوا عَلَیَّ فَاِنَّ صَلٰوتَکُمْ تَبْلُغُنِیْ" اللہ تعالیٰ نے جن بندوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قلبی تعلق کا کچھ حصہ عطا فرمایا ہو اُن کے لیے یہ کتنی بڑی بشارت اور تسلی کی بات ہے کہ خواہ وہ ہزاروں میل دور ہوں، اُن کا صلوٰۃ و سلام آپ کو پہونچتا ہے ؎

قرب جانی چو بود بعد مکانی سہل است

عَنْ اِبْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِلّٰهِ مَلٰٓئِكَةً سَيَّاحِيْنَ فِي الْاَرْضِ يُبَلِّغُوْنِيْ مِنْ اُمَّتِيَ السَّلَامَ۔ —————— رواہ النسائی والدارمی

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے کچھ فرشتے ہیں جو دنیا میں چکر لگاتے رہتے ہیں اور میرے امتیوں کا سلام و صلوٰۃ مجھے پہونچاتے ہیں۔ (سنن نسائی، مسند دارمی)

(تشریح) ایک دوسری حدیث میں جس کو طبرانی وغیرہ نے حضرت عمار بن یاسر سے روایت کیا ہے۔ یہ بھی تفصیل ہے کہ صلوٰۃ و سلام پہونچانے والا فرشتہ بھیجنے والے امتی کے نام کے ساتھ صلوٰۃ و سلام پہونچاتا ہے۔ کہتا ہے "یا محمد صلّیٰ علیک فلان کذا وکذا" (اے محمد تمہارے فلاں امتی نے تم پر اس طرح صلوٰۃ و سلام بھیجا ہے) —— اور حضرت عمار بن یاسر کی اسی حدیث کی بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ وہ فرشتہ صلوٰۃ و سلام بھیجنے والے اُمتی کا نام اُس کی ولدیت کے ساتھ ذکر کرتا ہے یعنی حضور کی خدمت میں عرض کرتا ہے " یا محمد صلّیٰ علیک فلان بن فلان " —— کتنی خوش قسمتی ہے اور کتنا ارزاں سودا ہے کہ جو امتی اخلاص کیساتھ صلوٰۃ و سلام عرض کرتا ہے وہ حضور کی خدمت میں اس کے نام اور ولدیت کے ساتھ فرشتے کے ذریعہ پہونچتا ہے اور اس طرح آپ کی بارگاہ عالی میں اُس بے چارے مسکین امتی اور اُس

کے باپ کا ذکر بھی آجاتا ہے۔

جاں میدہم در آرزو اے قاصد آخر باز گو
در مجلس آں نازنیں حرفے کہ از ما میرود

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَامِنْ اَحَدٍ یُّسَلِّمُ عَلَیَّ اِلَّا رَدَّ اللّٰہُ عَلَیَّ رُوْحِیْ حَتّٰی اَرُدَّ عَلَیْہِ السَّلَامَ۔

——— رواہ ابوداؤد والبیہقی فی الدعوات الکبیر

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی مجھ پر سلام بھیجے گا تو اللہ تعالیٰ میری روح مجھ پر واپس فرمائے گا تاکہ میں اُس کے سلام کا جواب دیدوں۔ (سنن ابی داؤد، دعوات کبیر للبیہقی)

(تشریح) حدیث کے ظاہری الفاظ "اِلَّا رَدَّ اللّٰہُ عَلَیَّ رُوْحِیْ" سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ آپ کی روح مبارک جسد اطہر سے الگ رہتی ہے، جب کوئی سلام عرض کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ آپ کے جسد اطہر میں روح مبارک کو لوٹا دیتا ہے تاکہ آپ سلام کا جواب دے سکیں——— ظاہر ہے کہ یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی۔ اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ ایک ایک دن میں لاکھوں، کروڑوں دفعہ آپ کی روح مبارک جسم اقدس میں ڈالی اور نکالی جاتی ہے، کیونکہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا کہ آپ کے لاکھوں، کروڑوں امتی آپ پر صلوٰۃ وسلام نہ بھیجتے ہوں، روضہ اقدس پر حاضر ہو کر سلام عرض کرنے والوں کا بھی ہر وقت تانتا بندھا رہتا ہے اور عالم دنیا میں بھی ان کی تعداد ہزاروں سے کم نہیں ہوتی——— علاوہ ازیں انبیاء علیہم السلام کا اپنی قبور میں زندہ ہونا ایک مسلّم حقیقت ہے۔ اگرچہ اس حیات کی نوعیت کے بارے میں علماء امت کی رائیں مختلف ہیں لیکن اتنی بات سب کے نزدیک مسلّم اور دلائل شرعیہ سے ثابت ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور خاص کر سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قبور میں حیات حاصل ہے اس لیے حدیث کا یہ مطلب کسی طرح نہیں ہو سکتا ہے کہ آپ کا جسد اطہر روح سے خالی رہتا ہے اور جب کوئی سلام عرض کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ جواب دلوانے کے لیے اُس میں روح ڈالدیتا ہے

—— اس بنا پر اکثر شارحین نے "ردّ روح" کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ قبر مبارک میں آپ کی روح پاک کی تمام تر توجہ دوسرے عالم کی طرف اور اللہ تعالیٰ کی جمالی و جلالی تجلیات کے مشاہدہ میں مصروف رہتی ہے (اور یہ بات بالکل قرین قیاس ہے) پھر جب کوئی امتی سلام عرض کرتا ہے اور وہ فرشتہ کے ذریعہ یا براہ راست آپ تک پہونچتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے اذن سے آپ کی روح اس طرف بھی متوجہ ہوتی ہے اور آپ سلام کا جواب دیتے ہیں، بس اس لمحاتی توجہ والتفات کو "ردّ روح" سے تعبیر فرمایا گیا ہے

عاجز راقم سطور عرض کرتا ہے کہ اس بات کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو عالم برزخ کے معاملات واحوال سے کچھ مناسبت رکھتے ہوں، اللہ تعالیٰ ان حقائق کی معرفت نصیب فرمائے۔

اس حدیث کا خاص پیغام یہ ہے کہ جو امتی بھی اخلاص قلب سے آپ پر سلام بھیجتا ہے آپ عادی اور سرسری طور پر صرف زبان سے نہیں بلکہ روح اور قلب سے متوجہ ہوکر اس کے سلام کا جواب عنایت فرماتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر عمر بھر کے صلوٰۃ وسلام کا کچھ بھی اجر و ثواب نہ ملے صرف آپ کا جواب مل جائے تو سب کچھ مل گیا —— اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ،

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلّٰى عَلَيَّ عِنْدَ قَبْرِيْ سَمِعْتُهُ وَمَنْ صَلّٰى عَلَيَّ نَائِيًا اُبْلِغْتُهُ —— رواہ البیہقی فی شعب الایمان

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو آدمی میری قبر کے پاس مجھ پر درود بھیجے گا (یا سلام عرض کرے گا) وہ میں خود سنوں گا اور جو کہیں دور سے بھیجے گا تو وہ مجھے پہونچایا جائے گا۔

(شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) اس حدیث سے یہ تفصیل معلوم ہو گئی کہ فرشتوں کے ذریعہ آپ کو صرف وہی درود وسلام پہونچتا ہے جو کوئی دور سے بھیجے لیکن اللہ تعالیٰ جن کو قبر مبارک کے پاس پہونچا دے اور وہ وہاں حاضر ہو کر صلوٰۃ وسلام عرض کریں تو آپ اس کو بنفس نفیس سنتے ہیں

اور جیسا کہ ابھی معلوم ہو چکا ہے ہر ایک کو جواب بھی عنایت فرماتے ہیں۔

کتنے خوش نصیب ہیں وہ بندے جو روزانہ سیکڑوں یا ہزاروں بار صلوٰۃ و سلام عرض کرتے ہیں اور آپ کا جواب پاتے ہیں ــــــ حق یہ ہے کہ اگر ساری عمر کے صلوٰۃ و سلام کا ایک ہی دفعہ جواب مل جائے تو جن کو محبت کا کوئی ذرہ نصیب ہے اُن کے لیے تو یہ دو جہاں کی دولت سے زیادہ ہے، کسی محب نے کہا ہے

بہر سلام مکن رنجہ در جواب آں لب
کہ صد سلام مرا بس یکے جواب از تو

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ وَاٰلِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ كَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى عَدَدَ مَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى۔

یک دو ساعت صحبتے با اہل دل

مجلس حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی مدظلہ

(گیارھویں مجلس)

(مرتبہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی)

یکم جمادی الآخرہ ۱۳۸۶ھ مطابق ۲۶ اگست ۱۹۶۶ء خانقاہ شریف

لکھنؤ سے بھی ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی اور عزیزی علی آدم ندوی کی معیت میں حاضر ہوا۔ حضرت کو کچھ عرصہ پہلے کولہے کی ہڈی پر ضرب آگئی تھی۔ بہا مدظلہ صاحب فراش رہے نقل و حرکت سے بالکل معذوری رہی۔ اس کے بعد آدمیوں کے سہارے سے باہر تشریف لانے لگے۔ اب الحمد للہ خانقاہ میں تشریف لاتے ہیں اور مجلس بدستور ہوتی ہے۔ راقم السطور نے مزاج پرسی کی۔ حضرت نے چوٹ لگنے اور ہڈی پر ضرب آنے کا واقعہ بیان فرمایا۔ معلوم ہوا کہ ایک روز عشاء کی نماز کی تیاری فرما رہے تھے، کھڑے کھڑے ایک عزیز بچے کے پاؤں میں کیل چبھ جانے اور اس کے نکالنے کا واقعہ بیان فرما رہے تھے۔ ہاتھ سے اشارہ فرمایا، دفعتہً جھٹکے سے زمین پر گر گئے اور کولہے کی ہڈی پر ضرب آگئی۔ پہلے تو چوٹ کا زیادہ احساس نہیں ہوا۔ کھڑے ہو کر نماز پڑھی لیکن سجدہ میں جانے اور قعدہ میں بیٹھنے کے وقت معلوم ہوا کہ اٹھنا مشکل ہے۔ بقیہ نمازیں بیٹھ کر پڑھیں،

پھر کئی روز لیٹے لیٹے نمازیں ادا کرنی پڑیں۔ الحمدللہ دیسی طریقہ پر علاج کرنے سے درد میں تدریجی تخفیف ہوتی چلی گئی اور اب سہارے سے نقل و حرکت فرمانے لگے ہیں کھڑے ہونے میں کچھ تکلیف ہوتی ہے، بیٹھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ سلسلہ گفتگو بدستور جاری تھا، راقم کی حاضری ہوئی تو حسب معمول نہایت شفقت اور مسرت کا اظہار فرمایا، ارشاد ہوا کہ بہت مرتبہ ارادہ ہوا کہ لکھنؤ حاضر ہو جاؤں لیکن بعض عوارض کی وجہ سے توقف کیا۔ کلکتہ سے آئے ہوئے ایک خط کا تذکرہ فرمایا جس میں یہ سوال کیا گیا تھا کہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے مکتوبات میں کئی جگہ طریقہ نقشبندیہ کو تمام طرق کے مقابلہ میں کھلی ترجیح دی ہے۔ مکتوب نمبر ۲۵۰/۱ میں تحریر فرماتے ہیں کہ وہ طریقہ جو اقرب، اسبق، اوفق، اسلم، احکم، اصدق، اور اولیٰ، اعلیٰ، اجل، ارفع و اکمل ہے وہ طریقہ نقشبندیہ ہے۔ خط میں اس کا مطلب پوچھا گیا تھا حضرت نے اس خط کا جواب تفصیل سے تحریر فرمایا[1] خلاصہ یہ تھا کہ بزرگان دین اور شعراء و عارفین کے اقوال و اشعار میں بہت سے الفاظ ایسے استعمال ہوتے ہیں کہ جن کو سمجھنے کے لیے ان کی اصطلاحات کلام کے سیاق و سباق اور ان کے طرز ادا کو سمجھنے کی ضرورت ہے، اگر ان کے خاص لفظوں کو لے کر معانی و اصطلاح پر غور نہ کیا جائے تو مقصود متکلم سے دور ہٹ جائیں گے، بزرگان دین کا ہر کلام موقع، وقت، کیفیت اور حال کے لحاظ سے اپنی جگہ ٹھیک ہوتا ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ ایک ہی کلام کے مختلف ترجمے، وقت، حال، جگہ اور کیفیات کے لحاظ سے ہوتے ہیں، کسی نے کہا کہ پانی لاؤ، تو پانی لے جانے والے کو دیکھنا چاہیے کہ کہاں سے پانی مانگ رہے ہیں، اگر کھانا کھاتے میں پانی مانگا ہے تو اس کا ترجمہ گلاس میں پانی لے جانا ہے اور اگر غسل خانے سے پانی مانگا ہے تو اس کا ترجمہ بالٹی میں پانی لے جانا ہوگا اور اگر بیت الخلاء میں سے پانی مانگا ہے تو اس کا ترجمہ لوٹے میں پانی لے جانا ہوگا، دیکھیے ایک ہی لفظ کے وقت، کیفیت اور موقع کے بدل جانے سے کتنے ترجمے ہو گئے۔ اسی طرح غور کرنا پڑے گا کہ یہ الفاظ ان حضرات سے کس

[1] یہ جوابی خط ہفت روزہ ندیم بھوپال کے خاص نمبر اگست ۱۹۶۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔

مرتبہ میں صادر ہوئے ہیں اور کہاں کھڑے ہو کر یہ کلام فرمایا، بزرگانِ دین کے کلام کی انکی احوال وکیفیات ہی سے شرح ہو سکتی ہے۔ اب اگر حضرت کے الفاظ کو جو طریقہ نقشبندیہ کے بارے میں ارشاد ہوئے ہیں حضرت کے حالات وخیالات اور ان کی زندگی مبارک سے الگ کر کے سمجھنے کی کوشش کی جائے گی اور اس کا اپنے فہم وعلم کے مطابق ظاہری مطلب لیا جائے گا جو مجرد الفاظ سے نکلتا ہے تو اس سے تمام دوسرے طرق کا ناقص وادنیٰ ہونا ثابت ہوگا اور ان کی تحقیر لازم آئے گی، بعض حضرات فرما دیتے ہیں کہ طریقہ نقشبندیہ کو اس لیے فضیلت حاصل ہے کہ اس میں اتباع سنت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دوسرے طرق میں اتباع سنت نہیں اور یہ مسلّم ہے کہ جس طریقہ کی بنیاد اتباعِ سنت پر نہیں ہوگی وہ موصل الی اللہ نہیں ہوگا، اس لیے یہ کہنا بھی صحیح نہیں، سب طرق کی بنیاد اتباع سنت پر ہے۔

اب اس کو حضرت مجدد صاحب کی زندگی، ان کی سیرت اور ان کی جامعیت کے آئینہ میں دیکھیے تو بات بالکل صاف ہو جاتی ہے، حضرت مجدد صاحب سلسلہ قادریہ کے بانی حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانی کا بڑے بلند الفاظ میں تذکرہ کرتے ہیں اور انکے علوِ شان کا بہت کھلے طریقہ پر اظہار فرماتے ہیں۔ حضرت مجدد صاحب کو حضرت موصوف سے فیض حاصل ہوا اور اس پر ان کو فخر ہے۔ یہی معاملہ حضرت خواجہ خواجگان مرہم دل ہائے دردمنداں خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ کا ہے۔ مجدد صاحب کو ان سے بھی بہت فیوض حاصل ہوئے۔ یہی معاملہ حضرت علاؤالدین علی احمد صابر رحمتہ اللہ علیہ کا ہے۔ حضرت مجدد کے والد ماجد حضرت مخدوم عبدالاحد ان کے سلسلہ میں داخل ہیں بعد اُن کے ذریعہ سے مجدد صاحب انکے سلسلہ سے مستفیض ہوئے ہیں، یہی بات حضرت خواجہ نظام الدین اولیا اور انکے سلسلہ کے مشائخ کی ہے۔ اس سب کو سامنے رکھ کر اب مجدد صاحب کے کلام کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ یہ طریقہ تمام بزرگان دین اور اصحاب سلاسل کے فیوض سے مستفیض ہو کر ایک جامع اور عالی طریقہ ہو گیا ہے اور وہ اس طرح دوسرے طریقوں پر ایک نوع کی فوقیت رکھتا ہے، اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی معجون کی تعریف کی جائے کہ وہ

بہت قوی، سریع التاثیر اور مختلف مزاجوں کے مطابق ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ایسے اجزاء کا مجموعہ ہے جو سب اپنی جگہ پر نہایت مفید اور ضروری ہیں اور ان کے بغیر یہ معجون تیار نہیں ہو سکتا، لیکن ان کے اتحاد و امتزاج سے اس معجون کا ایک نیا مزاج پیدا ہو گیا ہے اور یہ مرکب ان تمام اجزاء کا رہین منت ہے۔

فرمایا کہ ہمارے مناسب حال یہی ہے کہ تمام اکابر اولیاء اللہ سے محبت اور سب سے خلوص و اعتقاد رکھیں اور ترجیح و تفضیل کو اللہ پر چھوڑ دیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

فَلَا تُزَكُّوٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى[1] ، اور فرمایا

اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِى الْقُبُوْرِ وَحُصِّلَ مَا فِى الصُّدُوْرِ[2]

یہ علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے کہ کس کو کیا درجہ عطا فرمایا ہے اور قیامت کو کس کو کیا درجہ عطا فرمائیں گے؟ ہماری کوشش اسی پر مرکوز ہونی چاہیے کہ ہم مسلم کامل بن جائیں۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ[3]

مجھے تو حضرت شاہ احمد سعید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اربعہ انہار کی مثال بہت پسند ہے[4]

فرمایا کہ بعض مرتبہ اپنے طریقہ کو ترجیح دینے میں مخفی طور پر انانیت اور حب جاہ کا جذبہ کام کرتا ہے کہ اپنے طریقہ کی تعریف سے اپنی تعریف نکلتی ہے کہ جب وہ طریقہ افضل و ارجح ہوا تو ہم دوسروں کے مقابلہ میں افضل و ارجح ثابت ہوئے، میرا تو جواب وہی ہے جو پہلے عرض کیا تھا کہ ہمارا طریقہ زیادہ کھانا، زیادہ بولنا، زیادہ سونا ہے، ہم جس طریقہ کی طرف بھی اپنی نسبت کریں گے، اس کو بدنام کریں گے۔[5]

---

[1] بس مت پاکی جتاؤ اپنی، وہ خوب جانتا ہے اہل تقویٰ کو۔
[2] کیا انسان نہیں جانتا وہ وقت جب اٹھایا جائے گا قبروں سے اور نکال باہر کیا جائے گا جو کچھ سینوں میں ہے۔
[3] ۔ یہ ملفوظ تفصیل کے ساتھ ایک پچھلی مجلس میں گزر چکا ہے۔
[4] ۔ اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے جو حق ہے اس کے ڈرنے کا اور نہ مرو تم مگر اس حال میں کہ فرمانبردار ہو۔
[5] ۔ ایک گزشتہ مجلس میں یہ بات تفصیل کے ساتھ آچکی ہے

فرمایا کہ لوگ شجرہ مانگتے ہیں۔ ہمارا شجرہ تو یہ ہے کہ پہلے عقائد کو ٹھیک کیجئے۔ پھر اعمال و اخلاق کی اصلاح کیجئے۔ لوگ کثرت سے شجرہ طلب کرتے ہیں۔ میں نے شجرہ کے سلسلہ میں لکھوانا شروع کیا ہے، تقریباً پچھتر صفحات ہو گئے ہیں۔

فرمایا انبیاء علیہم السلام تمام کمالات روحانی و علمی اور تمام مراتب ولایت کو تقسیم کر دیتے ہیں۔ وہ ان تمام کمالات کے تخم عطا کرتے ہیں۔ اب ان تخموں کو صحیح طریقہ پر بار آور کرنا ان کو نشو و نما دینا اور ان کو درختوں کی شکل میں لانا یہ امت کے افراد کا کام ہے۔ مکتوبات میں جب آدمی مقامات و کمالات اور دوائر ظلال اور ولایت و قیومیت وغیرہ کا تذکرہ پڑھتا ہے تو سوچنے لگتا ہے کہ یہ کس عالم کی باتیں ہیں اور یہ کمالات و مقامات کن کو حاصل ہوتے ہیں، اس کی مثال یوں سمجھیے کہ ایک شخص کے پاس امریکہ سے تین لاکھ کا ایک چیک آتا ہے وہ ایک چھوٹا سا کاغذ کا ٹکڑا ہوتا ہے وہ اس کو ہاتھ میں لیتا ہے اس کو اسکے اندر شاندار کوٹھیاں، سینکڑوں ایکڑ زمین، انواع و اقسام کے کھانے اور طرح طرح کے عیش کے سامان نظر آتے ہیں، وہ کاغذ کے اس چھوٹے سے ٹکڑے میں اپنے کو ہوائی جہازوں پر اڑتا ہوا اور بڑے آرام کے ساتھ ریلوں پر سفر کرتا ہوا دیکھتا ہے، یہ سب مناظر اس کو اس چند انچ کے کاغذ میں نظر آتے ہیں اور وہ اپنے دل سے باتیں کرتا ہے کہ میں ان کوٹھیوں میں رہوں گا، اتنے طویل رقبہ میں کاشت کروں گا، باغ لگاؤں گا، ہوائی جہاز پر سفر کروں گا، دیکھنے والوں کو جن کو معلوم نہیں کہ اس چیک میں کیا طاقت ہے یہ سب شیخ چلی کی باتیں معلوم ہوتی ہیں لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اس چھوٹے سے کاغذ میں ان تمام چیزوں کے تخم موجود ہیں۔ اب یہ اس شخص کا کام ہے کہ ان تخموں کو زمین میں ڈالے، پانی، دھوپ اور کھاد مہیا کرے اور ان کو بار آور بنائے۔

فرمایا کہ اگر چیک جب تک کسی صحیح بینک میں بھیج کر تڑوایا اور بھنوایا نہ جائے اور پھر اس رقم کو خرچ کیا اور بڑھایا نہ جائے اس سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا، اگر اس کو ویسا کا ویسا ہی اپنے پاس ڈال رکھا جائے تو وہ کاغذ کا ایک بے کار پرزہ ہے۔ اب حضرت مجدد اور ہمارا فرق یہ ہے کہ انھوں نے اس چیک کو تڑوایا اور بھنایا اور اس

سے فائدہ اٹھایا' ہر چیک بھی ہر بینک میں نہیں ٹوٹ سکتا' میرے پاس لندن سے ایک لفافہ آیا اس میں ایک کاغذ تھا جس میں انگریزی میں کچھ لکھا ہوا تھا میں نے معشوق میاں کو پڑھنے کو دیا۔ انھوں نے کہا کہ لندن سے کسی صاحب نے آپ کو سو روپے کی مالیت کا ایک چیک بھیجا ہے مگر وہ یہاں کے بینک میں نہیں بھن سکتا اس کو باہر بھیجنا ہوگا' چنانچہ وہ باہر بھیجا گیا لمبی کارروائی ہوئی' کچھ حساب کٹا اور بالآخر مجھے اس کی رقم وصول ہوگئی' حضرت مجدد بھی فرماتے ہیں کہ بغیر شیخ کے رہبری نہیں ہوسکتی سوائے اس بینک کے نہیں ٹوٹ سکتا۔

حضرت نے مکتوبات میں اسی چیک کو سامنے رکھا ہے اور جو چیزیں امکان میں ہیں (ولایتِ صغریٰ ولایتِ کبریٰ وغیرہ) سب بیان کی ہیں' کاش کہ ہم قرآن پاک کا چیک سامنے رکھیں اور اس میں دیکھیں کہ کیا کیا ترقیات وکمالات انسان کے امکان میں ہیں حضرت امام ربانی نے اس چیک کو توڑا یا اور اس کی رقم کو ٹھکانے لگایا' ہم اس کو سینہ سے لگائے بیٹھے ہیں۔ حضرت لکھتے ہیں کہ یہ فنا ہے اور یہ بقا ہے۔ درحقیقت یہی فنا اور بقا ہے۔ جب تک ایک کو فنا نہ کیا جائے گا' دوسرے کو بقا حاصل نہیں ہوگی جب تک رقم کو مٹایا اور نفس کو خاک میں ملایا نہیں جائے گا۔ اس کے ثمرات حاصل نہیں ہوں گے' سابقین کو جو درجات حاصل ہوئے وہ ان ہی اعضاء وقویٰ سے حاصل ہوئے جو ہمارے اندر موجود ہیں' فرق یہ ہے کہ انھوں نے ان سے کام لیا اور ہم کام نہیں لے رہے ہیں' ایک شخص کے پاس کاشت کے لیے بہت بڑی زمین ہے۔ پانی کی نہریں کی نہریں جاری ہیں لیکن وہ ان سے کام نہیں لیتا تو کس کا قصور ہے۔

فرمایا کہ مادیت کی بڑی تیز وتند آندھیاں چل رہی ہیں اس میں ہماری یہ تقریریں اور کوششیں کیا اثر انداز ہوسکتی ہیں' لیکن ہماری مثال ایسی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو جب آگ میں ڈالا گیا تو ایک مینڈکی پانی لے کر آگ بجھانے کو چلی اس سے آگ تو نہیں بجھی مگر اس کا خلوص ثابت ہوگیا' جب دو ضرورتیں ایک وقت میں پیش آئیں تو ان میں سے ایک کو ترجیح دینی پڑتی ہے۔ ایک شخص کے گھر مہمان آئے' گھر میں ان کی

ضیافت کے لیے کچھ سامان نہ تھا نہ گوشت نہ مصالحہ، نہ آٹا نہ دال، بیوی نے کہا کہ گھر میں کچھ نہیں ہے، مہمانوں کے سامنے ذلیل ہونا پڑے گا اور بدنامی ہوگی، اسی وقت عدالت میں پیشی بھی تھی اگر عدالت میں حاضر نہ ہوئے تو مقدمہ خلاف فیصل ہو جائے گا اور سزا اور ہزاروں کا نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اب ان دونوں ضرورتوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا، بازار جاکر سامان لائے اور مہمانوں کی تواضع کرے، یا تھوڑی سے خفت کی پرواہ نہ کرے اور عدالت میں حاضری دے، یہی دنیا و آخرت کا معاملہ ہے، یہاں مہمان سے شرمندہ ہو جانا آسان ہے لیکن اس عدالت کی پیشی ضروری ہے جس کی اپیل نہیں ہے۔

فرمایا کہ معصیت ترک کر دینے کے بعد بھی اس کی کثافت و ظلمت رہتی ہے ہمارے خسر صاحب نے مظفر نگر میں ایک مکان لینے کا ارادہ کیا۔ مجھے اس کے اندر لے گئے میں نے کہا کہ اس میں وحشت پائی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ میرے شیخ اس مکان میں آئے تھے تو انھوں نے فرمایا کہ میں نے (خواب میں یا واقعہ میں) دیکھا کہ ایک انگریز اور اس کی میم ہے۔ انگریز نے پستول دکھایا، میم نے اس کو روکا پھر دونوں چلے گئے۔ جس طرح ان کے چلے جانے کے بعد بھی مکان میں وحشت رہی اسی طرح معصیت کے ختم ہو جانے کے بعد بھی اس کی کثافت رہتی ہے۔ نجاستِ رقیقہ تخیل ہے اور عمل نجاستِ غلیظہ ہے، نجاست کے نکلنے کے بعد بھی اس کا اثر باقی رہتا ہے، اسی لیے قرآن شریف کے پڑھنے سے پہلے استعاذہ کی تلقین ہے فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللهِ۔ یوں بھی ایک آدمی دو حکومتوں سے یکساں وفاداری نہیں رکھ سکتا۔ آپ خدا سے بھی تعلق رکھیں اور اس کے دشمنوں سے بھی یہ نہیں ہو سکتا اسی لیے قرآن مجید کی تلاوت شروع کرنے سے پہلے أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ کہنے کا حکم ہے، اسلامی زندگی اور اسلامی سیرت کے لیے دشمنانِ خدا کی زندگی اور سیرت چھوڑنے کی ضرورت ہے۔ ایک صاحب نے لکھا ہے کہ بیعت کرنے آتا ہوں مجھے آپ سے عقیدت ہے، وہ آئے تو صورت شکل سب مخالف شرع، میں نے ان کو سمجھایا کہ برتن ٹوٹا ہو تو دودھ اس میں ٹھہر نہیں سکتا، کہنے لگے کہ برتن بھی آپ ہی دیں، میں نے کہا کہ حضرت نوحؑ نے ساڑھے نو سو برس کی تبلیغ کی لیکن

انھوں نے دودھ پیش کیا، برتن نہیں دیا۔

لکھنؤ کے ایک صاحب کا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ میری اسّی سال کی عمر ہے اور میں فلاں فلاں بزرگوں سے بیعت ہوا، انھوں نے اپنے اذکار و اوراد اور معمولات تفصیل سے لکھے تھے۔ اشراق چاشت اور تہجد وغیرہ نوافل کا ذکر تھا اور اس سب کے ذکر کرنے کے بعد لکھا تھا کہ یہ سب پڑھتا اور کرتا رہتا ہوں لیکن کورا کا کورا ہوں اور خسر الدنیا والآخرۃ کا مصداق، میں نے اس کے جواب میں لکھا کہ تواضع اور کسر نفسی بہت اچھی چیز ہے مگر اس کا ایک محل اور مقدار ہے اگر وہ اپنے محل اور مقدار سے تجاوز کرے گی تو مضر اور وبال بن جائیگی عبادات کے وقت شکر کا جذبہ ہونا چاہیے اور قرآن شریف کا ایک لفظ بھی زبان سے ادا ہونے پر ہزار بار خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس کی توفیق ہوئی، ایک سجدہ کر کے ہزار بار شکر کا سجدہ کرے کہ سجدہ کی توفیق ہوئی، عبادت و ذکر کے وقت انشراح ہونا چاہیے اور شکر کا جذبہ غالب، اس وقت انقباض بے محل اور مضر ہے۔ انشراح اور انقباض قلب کی دو حالتیں ہیں، ذکر کے وقت انشراح ہونا چاہیے اور معصیت کے وقت انقباض، اگر ذکر کے وقت انقباض رہا تو فائدہ نہیں ہوگا اس وقت انشراح اور شکر مطلوب ہے اور اسی سے ترقی ہے ارشاد ہے۔ وَلَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ [1]

---

[1] اور اگر تم شکر کروگے تو میں زیادہ دوں گا تم کو۔

ذہنوں کے موڑ

(از جناب انعام الرحمٰن خاں)

[جماعتِ اسلامی کے حلقہ سے آسان زبان میں ایک دینی ماہنامہ "الحسنات" بہت عرصہ سے نکلتا ہے۔ اور مقصدی اعتبار سے بڑے کامیاب پرچوں میں ہے۔ دسمبر میں اس کا ایک خاص نمبر "غیر مسلموں میں اسلام کا تعارف کیسے ہو؟" کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس کے متعدد قابلِ قدر مضامین میں سے ایک یہ ہے جو یہاں درج کیا جا رہا ہے ـــــ ادارہ]

آج کل عام طور پر ذہن اس طرح کام کرتے ہیں کہ دوسرے مذاہب کا تصور آپ سے آپ حریف بلکہ دشمن کی شکل میں آتا ہے۔ اور سیکولرزم یعنی دنیا دیت کا خیال ایک حلیف بلکہ سب مذاہب کے نعم البدل کی شکل میں آتا ہے۔ ذہنی فضا کچھ ایسی بن گئی ہے کہ ایک مذہبی آدمی بھی جب کسی ازم کو ماننے والے سیکولر آدمی سے ملے گا تو اس سے ایک طرح کی یگانگت محسوس کرے گا۔ اور جب کسی دوسرے مذہب کے ماننے والے سے ملے گا تو بلا ارادہ اس کو غیر سمجھے گا۔ مذاہب والوں کے باہمی اختلافات محض تنگ دلی کا نتیجہ اور قابل نفرت سمجھے جاتے ہیں۔ اور سیکولر ذہن چونکہ مذاہب کے سلسلہ میں خود کو غیر جانبدار کہتا ہے اس لیے وہ رودار اور عالی ظرف نظر آتا ہے چاہے اس نے خالص دنیوی مفادات کی خاطر پچیس سال کے مختصر عرصہ میں دو بار پوری دنیا کو خون کا غسل دیا ہو۔ "خدا کو مانا جائے یا نہیں اور اگر مانا جائے تو کس طرح۔" اس بات پر لوگوں کا کٹنا اور جھگڑنا اس زمانے میں رجعت پسندی اور تاریک خیالی ہے لیکن مادی مفادات پر متحد ہونا اور لڑنا ترقی پسندی اور روشن خیالی۔ آدمی کو اگر لڑنا ہے ـــــ اور اگر لڑنا ہے کیا معنی لڑنا چاہیے ـــــ تو

کسی عقیدہ پر نہیں بلکہ روٹی پر لڑنا چاہیے یعنی وہ بات جو کسی زمانے میں معیوب سمجھی جاتی تھی اور دنیا پرست آدمی کو دنیا کا کتا کہا جایا کرتا تھا۔ اب مختلف نظریات کا سہارا لے کر خوشنما ناموں کے ساتھ انسان کا آئیڈیل بن گئی ہے اور معاملہ ایسا پلٹ گیا ہے کہ پہلے اگر کوئی شخص دنیا کا ہی پرستار ہوتا تو بھی اسے مذہب و اخلاق کا جامہ پہنا پڑتا تھا اور اب اگر کسی کو مذہب و اخلاق کی تلقین بھی کرنا ہو تو کوئی نہ کوئی دینوی یا مادی مفاد سامنے لانا پڑتا ہے۔

یہ نقطۂ نظر چونکہ حکمراں کی ساحری کے زور سے عام طور پر ذہنوں پر چھا گیا ہے اسلیے اسلام کا داعی بھی مجبور ہو جاتا ہے کہ جب غیر مذہب والوں سے قریب ہونے کی بات سوچے تو دنیوی مفادات اور افادی اخلاق ہی کو کلمۂ سوا یعنی نقطۂ اشتراک بنائے اور ان سے کہے کہ میں جو تعلیمات پیش کر رہا ہوں۔ اس طرح تمہاری دنیا بنا دیں گی۔ اور وہ بھائی چارہ، خوش حالی و سربلندی جو تم چاہتے ہو کسی اور تعلیم سے نہیں بلکہ اسی تعلیم سے حاصل ہو سکتی ہے۔ حالانکہ اگر غور کیا جائے تو ایک خدا پرست کے لیے خالص دنیا دیت چاہے وہ کسی بھی ازم کا لباس پہنے ہو زیادہ غیر ہے اور مذہب چاہے وہ کوئی بھی مذہب ہو دنیا دیت کے مقابلے میں نسبتاً قریب ہے۔ کیونکہ دونوں کے ابتدائی نظریات بنیادی طور پر مختلف ہیں اس لیے دونوں کے مقاصد بھی الگ الگ ہیں اور دونوں کے مزاج بھی ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے۔ دنیا کے مشہور مذاہب خدا کو کسی نہ کسی شکل میں ملتے ہیں کسی نہ کسی رنگ میں مکافاتِ عمل کو تسلیم کرتے ہیں اور کسی نہ کسی شکل میں ہدایت کی ضرورت کے قائل ہیں۔ اسی وجہ سے مذہبی انسانوں کے سوچنے کا انداز اور رد و قبول کا معیار اکثر معاملات میں مل جاتا ہے۔ بخلاف اس کے تمام سیکولر ذہن رکھنے والے ہر چیز کو ایک ہی رنگ میں دیکھتے ہیں اور ہر مسئلہ کو ایک ہی زاویہ سے سوچتے ہیں۔ اس کا تازہ ثبوت برتھ کنٹرول کے سلسلے میں ملا ہے۔ ساری دنیا کے سیکولر ٹائپ کے دانشور اس اندیشہ سے کانپ رہے ہیں کہ آنے والی نسل ان کے حصے کی روٹی کھائے گی۔ اور اگر کسی خطہ میں افزائشِ نسل کو پسند بھی کیا جا رہا ہے تو اس لیے نہیں کہ نسل کشی اخلاقاً معیوب ہے بلکہ اس لیے کہ انھیں دوسروں کو دبانے کے لیے زیادہ آدمیوں کی ضرورت ہے۔

لیکن اسی مسئلہ پر پوپ پال کے فتوے میں جو دلائل ہیں وہ تقریباً وہی ہیں جو مسلمان علماء اس مسئلہ میں دے رہے ہیں۔ دونوں جگہ ردّ و قبول کا معیار ایک ہے۔ دونوں مادّی ضرورت کے لیے روحانی اور اخلاقی قدروں کو قربان کر دینے کو تیار نہیں۔ دونوں کی نظروں میں بس وہی اخلاق قابل قدر نہیں ہے، جس سے مادّی منفعت حاصل ہوتی ہو بلکہ وہ مادی منفعت قابل قدر ہے جس سے انسان کا اخلاق بلند ہو۔

یہ صرف ایک مثال ہے، ورنہ انفرادی اخلاق سے لے کر اجتماعی معاملات تک ایسے بہت سے نمونے سامنے آتے رہتے ہیں۔ جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ ایک خدا پرست انسان کا نقطۂ نظر چاہے وہ عیسائی ہو یا مسلمان عام طور پر ایک طرح کا ہوتا ہے، اور ایک سیکولر ذہن کا نقطۂ نظر چاہے وہ جمہوریت پسند ہو یا کمیونسٹ بالکل دوسرا۔ مخاطب کو اشتراک عمل پر آمادہ کرنے کے لیے قرآن نے بھی جس نقطۂ اشتراک کی تعلیم دی ہے وہ ہے أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ کیونکہ انسان کے فکر و عمل کا رُخ متعین کرنے والی اصل چیز خدا کو ماننا یا نہ ماننا ہی ہے۔ خدا کے منکر ہوں یا خدا کے وجود کو قابل بحث نہ سمجھنے والے یا خدا کو مانتے یا پوجتے ہوئے دنیا کے معاملات میں انسانی عقل و تجربہ کو رہنما بنانے والے۔ ان سب کے فکر و عمل کا رخ ایک ہوگا چاہے ان کے درمیان کتنے ہی اختلافات ہوں اور وہ سب علیحدہ علیحدہ قسموں سے منسوب ہوں اور خدا کو مان کر چلنے والوں کے فکر و عمل کا رخ بالکل دوسرا ہوگا چاہے وہ باہم کتنے ہی مختلف ہوں اور مذہب کے علیحدہ علیحدہ ناموں سے پکارے جاتے ہوں۔

اگر ایک مسلمان اسلام کا ترجمان بن کر داعی کی حیثیت اختیار کرے اور ایمان کے اس احساس کو بیدار کر دے کہ خدا کے ہر بندے کو دوزخ کے عذاب سے بچانے کی کوشش کرنا اس کی ذمہ داری ہے تو اُسے اس بات کو ماننا پڑے گا کہ جو لوگ خدا کو کسی نہ کسی شکل میں مانتے ہیں وہ ان لوگوں کے مقابلے میں اس سے زیادہ قریب ہیں جنھوں نے دنیا کی مادّی منفعت و لذت ہی کو اپنا معبود بنا لیا ہے، خدا کو ماننے کے فطری تقاضے بتانا ہی اس اسلام کو پیش کرنے کا صحیح طریقہ ہو سکتا ہے جس کی دعوت "یا قوم اعبدوا اللّٰہ" سے شروع ہوتی ہے جو لوگ لذت پرستی کا شکار ہو کر معیارِ زندگی بلند کرنے کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں انھیں

مادی منفعت کی چاٹ لگا کر معیارِ بندگی بلند کرنے پر آمادہ کرنا ایسا ہی ہوگا جیسے ذیابطیس کے مریض کا علاج شکر کے حلوے سے کیا جائے۔

بہرحال یہ ایک موضوع ہے جو اہل نظر کی توجہ کا مستحق ہے۔ مجھے تو اس وقت غیر مسلم بھائیوں سے مختلف اوقات میں ہونے والی کچھ باتیں پیش کرنا ہیں۔ شاید ان میں کوئی کام کی بات نکل آئے۔

میرا تعلق دیہات سے بھی ہے۔ جہاں زیادہ آبادی غیر مسلموں کی ہے وہاں میرے غیر مسلم پڑوسی کے لڑکے کا انتقال ہو گیا۔ ان لوگوں میں یہ طریقہ رائج ہے کہ جب کسی کے یہاں میت ہو جاتی ہے تو وہ تین روز تک نہ کسی کے یہاں جا سکتا ہے اور نہ کوئی اس کے یہاں آتا ہے۔ ان لوگوں کے خیال میں میت والا گھر اور اس میں رہنے والے تین روز تک "موت بھرے" رہتے ہیں جن سے احتیاط کرنا چاہیے۔ گویا جن دنوں میں آدمی ہمدردی کا مستحق ہوتا ہے ان ہی دنوں میں اس کا سوشل بائیکاٹ ہو جاتا ہے۔

جس روز صبح اس کے لڑکے کا انتقال ہوا اسی روز شام کے وقت شہر سے میں پہونچ گیا۔ اس حادثے کا علم ہوتے ہی میں اس کے گھر گیا۔ بیچارہ تنہا بیٹھا تھا۔ تعزیت اور صبر وغیرہ کی تلقین کرتے ہوئے میں نے اپنے ان پڑھ پڑوسی سے کہا کہ

"بھئی ایک بات تو بتاؤ! تم لوگ ایسی مصیبتیں جو آدمی کا سینہ پھاڑ ڈالیں کس طرح برداشت کر لیتے ہو۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ آخر تمہارا کلیجہ کیوں نہیں پھٹ جاتا۔ ہم کو تو یہ آسانی ہے کہ ہمارے دل میں اس بات کا یقین بیٹھا ہوا ہے کہ خدا جس کے ہاتھ میں زندگی اور موت ہے اس کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے۔ اور وہ ہم پر ماں باپ سے بھی زیادہ مہربان ہے۔ اگر میرا بیٹا مر جائے تو اس یقین سے مجھے بڑی تسکین ملے گی کہ اس میں یقیناً میرے مہربان خدا کی کوئی بڑی مصلحت ہوگی جو مجھے نظر نہیں آ رہی ہے۔ اور اگر اس مصیبت پر میں خوشی کے ساتھ اس کی رضا پر راضی ہو جاؤں گا تو مجھے اتنا بڑا انعام ملے گا جس کو میں ابھی پوری طرح سمجھ بھی نہیں سکتا۔ یہ یقین ہم لوگوں کو بڑا سہارا دیتا ہے اور اس سہارے کی طاقت سے

ہم بڑے سے بڑے غم کے پہاڑ اٹھا سکتے ہیں بلکہ اس یقین کی بدولت یہ بڑے بڑے پہاڑ ہم کو گھاس کے تنکوں سے زیادہ وزن دار نہیں معلوم ہوتے مگر تم بتاؤ کہ آخر تم کس سہارے سے غموں کے پہاڑ اٹھاتے ہو۔ ہمارا مولیٰ تو خدا ہے مگر تم تو بتاؤ تمہارا مولیٰ کون ہے۔ جو ایسے نازک موقعوں پر تمہیں سہارا دے۔"

یہی باتیں میں نے ذرا پھیلا کر مؤثر انداز میں کیں۔ جس کا اثر اس کے چہرے کیا پورے وجود سے ظاہر ہونے لگا۔ آخر میں اس نے کہا کہ یہ باتیں سن کر ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے میرے سر سے پہاڑ اتر گیا۔

پھر ایک بار میرے اس پڑوسی نے اہل ہنود کی ایک بڑی مجلس کو مخاطب کر کے کہا کہ "مجھے اپنے چھوٹے لڑکے کے بال دیو مہاراج کے استھان پر اتارنا ہے اب مجھے ان باتوں پر یقین نہیں رہا ہے میں تم سب لوگوں کے سامنے کہتا ہوں کہ اگر تم میں سے کچھ لوگ بھی میرا ساتھ دینے پر تیار ہوں تو میں لڑکے کے بال اتارنے کے لیے دیو مہاراج کے یہاں نہیں جاؤں گا۔ اگر ان سے ہو سکے تو وہ میرے لڑکے کو کل مار ڈالیں۔ اب میں دیو مہاراج سے نہیں ڈرتا۔ البتہ تم سے ڈرتا ہوں اس لیے تنہا یہ کام نہیں کر سکتا۔"

ایک غیر مسلم تعلیم یافتہ دوست سے حالاتِ حاضرہ پر گفتگو ہو رہی تھی اسی سلسلے میں وطن پرستی کا ذکر آگیا۔ انھوں نے فرمایا کہ تمام خرابیوں کی جڑ دیش بھگتی کی کمی ہے۔ انھوں نے کہا کہ لوگ دیش کے لیے نہیں اپنے لیے سوچتے ہیں اسی وجہ سے یہ خرابیاں نظر آ رہی ہیں۔ اگر سب لوگ وطن کے لیے سوچنے لگیں تو دیکھتے دیکھتے کایا پلٹ ہو جائے۔ میں نے کہا ایسا تو کبھی ہو نہیں سکے گا کیونکہ انسان کی فطرت خود غرض واقع ہوئی ہے۔ وہ سب سے پہلے اپنی ذات کا بھلا چاہتا ہے۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو اتنی دور کی بات سوچ سکیں کہ پورے دیش میں خوش حالی آئے گی تو میں بھی خوشحال ہو جاؤں گا اس لیے مجھے ایمانداری کے ساتھ ڈٹ کر محنت کرنا چاہیے ورنہ زیادہ آدمی ایسے ہی ہوتے ہیں جو اپنی ذات کو پہونچنے والے فائدوں ہی سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ خصوصاً جبکہ معیارِ زندگی بلند کرنے

کے نام سے ان کے اندر بہترین کھانے اور بہترین لباس اور دوسرے اسباب عیش کی ہوس پیدا کر دی گئی ہو اور ان کے دل میں قانون کے ڈنڈے کے علاوہ کسی اور کا خوف بھی نہ رہا ہو۔ قانون کا وہی ڈنڈا جس کا رُخ ذرا سی ترکیب سے دوسروں کی جانب موڑا جا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں ایک عام آدمی اتنا بے وقوف نہیں ہوتا کہ وطن پرستی کے مبہم سے خیال پر اپنے فائدوں کو ٹھکرا دے اور لذتوں کو قربان کر دے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ وطن پرستی ایک مصنوعی چیز ہے جس کے پاس ان مانگوں کا کوئی جواب نہیں ہے جو ہر انسان کے اندر موجود ہیں۔ نہ اس کے پاس وہ طاقت ہے جو انسان کی خواہشات پر کنٹرول کر سکے۔ مذہب البتہ یہ کام اس طرح کرتا ہے کہ ایسے خدا پر یقین اور محبت سے انسان کو گرما دیتا ہے جس کے پاس ہمیشہ رہنے والی بے حساب نعمتیں ہیں۔ وہ انسان کے خود غرضی کے فطری جذبہ کو کچلتا نہیں ہے چونکہ اسی کی گرمی انسانیت کی گاڑی کو آگے بڑھانے والا انجن چلاتی ہے۔ بلکہ وہ اس جذبہ کا رخ اس دنیا کے عیش و آرام سے موڑ کر آخرت کے ہمیشہ رہنے والے لطف و لذت کی جانب پھیر دیتا ہے ساتھ ہی وہ ایسے عذاب کا ڈر اس کے دل میں بٹھا دیتا ہے جس سے وہ خود دوچار ہوگا اور جو کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکیگا۔

میرے دوست نے یہ پوری گفتگو غور سے سنی پھر زیادہ متوجہ ہو کر بولے کہ میں اس نکتہ کو بالکل نہیں سمجھا۔ اس کی وضاحت ذرا اچھی طرح ہونی چاہیے۔

میں نے اپنا مطلب واضح کرنے کی مزید کوشش کرتے ہوئے کہا کہ آپ اس بات کو سمجھنے کے لیے پہلے ہم انسان کی کچھ بنیادی خصوصیات کو سمجھ لیں۔ دیکھیے! انسان کی فطرت کے اندر کچھ مطالبات ہیں جو پورا ہونے کے لیے زور لگاتے رہتے ہیں۔ جہاں اس کی فطرت کا تقاضہ یہ ہے کہ اُسے کھانے کے لیے غذا، پہننے کے لیے کپڑا، رہنے کے لیے مکان اور قلبی و شہوانی تسکین کے لیے جوڑا چاہیے۔ وہیں اس کی فطرت کا یہ بھی تقاضہ ہے ——— بلکہ اگر اس کی فطرت صحیح ہے تو ان تقاضوں سے زوردار تقاضہ ہے کہ وہ جس کو اپنا پالنہار سمجھتا ہے اس کے آگے شکر کے جذبہ سے گر پڑے۔ اس کی محبت کو اپنے دل میں جگہ دے اس کا گرویدہ ہو جائے اور اس کے ادنیٰ اشارے پر خود کو نثار کر دے پھر وہ خطرات کے خوف سے کسی کی پناہ میں چلا جانا چاہتا ہے جب وہ اپنے آپ کو محتاج اور بے بس پاتا ہے

تو اس کا ہاتھ خود بخود اس کی طرف اٹھ جاتا ہے جس کو وہ حاجت روا مانتا ہو۔ وہ اپنے دل میں بے شمار آرزوئیں اور تمنائیں پاتا رہتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ پوری ہوں۔ جب اس پر ظلم ہو رہا ہو اور وہ ظالم کے مقابلے میں بے بس ہو تو اس وقت اسے سہارا دینے کے لیے اس یقین کی ضرورت ہے کہ ایک دن میرا مالک اس ظالم سے سمجھ لے گا۔ مختصر الفاظ میں اس کی فطرت اندر سے تقاضا کرتی رہتی ہے کہ وہ کسی کا ہو رہے۔

ساتھ ہی انسان اتنا کمزور بھی ہے کہ جہاں وہ نفسانی خواہش کی ادنیٰ سی تحریک کا مقابلہ نہیں کر پاتا وہیں اس کو یہ فطری مطالبات بھی بسا اوقات کسی غلط جگہ کی طرف بہالے جاتے ہیں۔ امید و محبت اور خوف و خشیت کے یہ فطری تقاضے بھی اتنے طاقتور ہوتے ہیں کہ آدمی کا سر غلط جگہ بھی جھک جاتا ہے۔ جس طرح بھوکے آدمی کو جب صحیح غذا نہیں ملتی تو وہ چھالوں اور پتیوں سے پیٹ کی آگ بجھانے لگتا ہے۔ اسی طرح جب اس کے سر کو جھک جانے کے لیے صحیح جگہ نہیں ملتی تو وہ غلط جگہ پر جھک جاتا ہے۔ جب اس کے دل کو سچا من موہن نہیں ملتا تو وہ کسی غلط چیز کو من موہن بنا کر اپنے اندر بٹھا لیتا ہے۔

یہ تو ہوئی الگ الگ آدمیوں کی کیفیت۔ اب یہ دیکھیے کہ آدمی اکیلا دوسروں سے بے تعلق ہو کر نہیں رہ سکتا۔ وہ مجبور ہے کہ دوسروں سے مل جل کر رہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو بہت سی نئی ضرورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ لین دین کے۔ میل ملاپ کے۔ رشتے ناطے کے اور لڑائی جھگڑے کے بہت سے معاملات کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جن کو انسان کی اجتماعی ضرورت کہا جاتا ہے۔

انسان کی انھیں دونوں طرح کی ضروریات کو خدا کی طرف سے پورا کرنے کے انتظام کا نام مذہب ہے۔ اور اب تک انسان کی یہ دونوں ضرورتیں مذہب ہی سے پوری ہوتی رہی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس راستے میں بھی انسان دھوکے کھاتا رہا ہے اور نفسانیت کا شکار ہوتا رہا ہے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ بیشتر حالات میں پاکیزہ مذہبی جذبات ہی میں غلو کر کے وہ غلطی کا شکار ہوا ہے۔ ایسا دور بھی زمانہ بار بار دیکھ چکا ہے کہ آدمی کا رشتہ صحیح طور پر اس کے خدا سے جڑا رہا ہے۔ یعنی اس نے صرف خدا کی پوجا کی اور اسی کی ہدایات کے مطابق ایک ایک شخص نے بھی زندگی بسر کی اور سماج نے بھی اپنے آپ کو اسی کی ہدایات کے مطابق منظم کیا۔ البتہ ایسا بھی ہوتا رہا ہے کہ غلط لوگوں نے انسان سے

خدا کے نام پر دوسروں کی پوجا کرائی اور خدا ہی کے نام سے سماج پر اپنا حکم چلایا۔ بہرحال اس بات سے انکار کی گنجائش نہیں کہ موجودہ دور سے پہلے تک انسان پر اور اس کے سماج پر یا تو واقعی اس کے خدا کا حکم چلا ہے یا اگر دوسروں کا حکم چلا ہے تو خدا ہی کے نام پر۔ لیکن اب انسان نے طے کیا ہے کہ اپنے معاملات کو وہ خود اپنی عقل و خواہش سے طے کرے گا۔ اور خدا کو بیچ میں نہیں پڑنے دے گا اگر کسی کا جی چاہے تو وہ اپنے طور پر خدا کو مانتا اور پوجتا رہے لیکن اس کے خدا کو اپنے حدود میں رہتے ہوئے سماج کے اور ریاست کے معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیے۔

سائنس کی ترقی سے چوندھیائے ہوئے انسان نے یہ بات طے تو کر لی لیکن یہ سوال سامنے آیا کہ انکے بکھرے ہوئے دانوں کو کس رشتہ میں پرویا جائے وہ کون سا مرکز ہو جس سے یہ سب انسان بندھے رہیں کیونکہ ایک منظم سماج کے لیے ایک کھونٹے کی بہرحال ضرورت ہے جس سے سب بندھے رہیں خدا جسکی رسی کو وہ پکڑے رہنے سے انسانی سماج بندھا رہتا اسکو موجودہ زمانے کا انسان اس طرح ماننے پر تیار نہیں ہو کہ حکم اسی کا ہو رہے اس لیے اس نے کچھ دوسری بنیادیں انسانوں کو باندھنے کیلئے تلاش کیں انھیں میں سے ایک رسی یہ وطن ہے اور وطن سے محبت بھی چونکہ انسان کا ایک فطری جذبہ ہے اور انسان دوسرے جذبات کیطرح اس جذبہ میں بھی ڈوب سکتا ہے۔ اسلیے ایک مرکز کے متلاشی انسان نے اس شریفانہ جذبہ کو حد سے بڑھا کر وطن کو اجتماع سماج کا مرکز بنا دیا اور مرکز کے نام پر اہل وطن سے اطاعت کا مطالبہ کیا۔ لیکن اسے تھوڑے ہی دن کے تجربہ سے معلوم ہو گیا کہ پاکیزہ جذبات کی گرمی کے بغیر بنائی قانونی اطاعت بے جان اور ٹھنڈی ہوتی ہے اس میں وفاداری کا جذبہ اور ایثار و قربانی کی طاقت نہیں ہوتی اس لیے اب اس نے وطن ہی کے اندر تقدس کی شان پیدا کرنے کی کوشش کی اور خاک وطن کے ہر ذرے کو دیوتا بنا کر پیش کیا۔ اس طرح آج کے دور میں وطن کو وہ مقام دے دیا گیا جو مذہب میں خدا کا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وطن ہی کو بھاگ ودھاتا "یعنی قسمتوں کو بنانے اور بگاڑنے والا بھی بنا دیا گیا ہے۔ حالانکہ مذہب کی رو سے قسمتوں کا معاملہ صرف خدا کے اختیار میں ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ آج جب کسی کے اندر شرافت و قربانی کا جذبہ ابھرتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں وطن پر سب کچھ قربان کر دوں گا میں دیش کے لیے جان دے دوں گا لیکن اب سے پہلے خدائیت کے یہ جذبات خدا کے لیے مخصوص تھے۔

یہ طویل گفتگو میرے غیر مسلم دوست نے پوری توجہ سے سنی۔ درمیان میں سوال کر کر کے

بہت سی باتیں مانتے بھی گئے، لیکن یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ وطن آخر خدا کیسے ہوسکتا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ وطن یا کوئی اور چیز واقعتاً تو خدا نہیں ہو سکتی نہ خدا کے نام سے اسے پکارا جا سکتا ہے لیکن اس کو وہ منصب وہ مقام تو دیا جا سکتا ہے جو خدا کا ہونا چاہیے۔ اور جس کو عربی زبان میں "الٰہ" کہتے ہیں، جیسے کہ اب سے پہلے دوسری چیزوں کو یہی مقام دیا جاتا رہا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ ایک طرف تو سیکولر وطن پرستی نے خدا کو پوجنے کی اجازت دے رکھی ہے جس سے ان کا کوئی نقصان نہیں۔ دوسری طرف ہمارے [illegible] ذہن خدا پرستی کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں اس لیے یہ بات کسی طرح گلے نہیں اترتی کہ کوئی [illegible] کو بنانے یا بگاڑنے والی ہو سکتی ہے۔

غرضیکہ میں نے انھیں مختلف پہلوؤں سے سمجھانے کی کوشش کی لیکن یہ بات انکی سمجھ میں نہیں آئی۔ بالآخر میں نے ان [illegible] ہندو [illegible] جب دو آدمی ملتے ہیں تو "جے گوپال" یا "جے رام جی کی" کہتے ہیں یعنی رام یا گوپال کی بڑائی مان کر انکے نام کی جے پکارتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا، بے شک میں نے کہا پھر اب رام اور گوپال کی جگہ "ہند" نے کیسے لے لی۔ اور اب ملاقات کے وقت "جے ہند" کیوں کہا جانے لگا! بات وہی ہے کہ مذہب کا زمانہ گیا۔ اب نئے طرز کے خداؤں کا دور ہے۔ اور آج عظمت اور کبریائی کسی اور کی نہیں وطن کی مانی جاتی ہے۔ کیونکہ "ان تازہ خداؤں میں بڑا وطن ہے۔"

یہ بات سن کر وہ چونک پڑے اور انھوں نے مان لیا کہ دیش اور وطن کی معصوم سی محبت اب وطن پرستی اور دیش بھگتی بن کر خدا پرستی اور اللہ بھگتی کی حریف بن گئی ہے

اس کے بعد انھوں نے دانت پیس پیس کر وطن پرستی کے دیوتاؤں کو جو صلواتیں سنائی ہیں۔ وہ انکے اندر سے جاگ پڑنے والے انسان کی آواز تھی۔ اس ملاقات کے بعد مجھے انکو خدا کی صفات اور اس کے تقاضے بتانے تھے لیکن اتفاق کی بات کہ ان کا تبادلہ ہو گیا اور گفتگو کا یہ سلسلہ ناتمام رہ گیا۔

پندرہ سال پہلے ایک بار مَیں مہاسبھا کے لیڈروں کے ساتھ ڈھائی مہینے تک دن

رات رہنے کا موقع ملا۔ ان سے ہر موضوع پر باتیں ہوتی تھیں۔ مہاسبھا اور دوسری جماعتوں پر بھی اور ہندو مذہب اور اسلام پر بھی۔ ایک روز ان میں سے ایک صاحب نے جن کی تیزی و طراری مشہور ہے مجھ سے کہا کہ اسلام کی سچائی وغیرہ کے بارے میں آپ جو باتیں کہتے ہیں وہ ٹھیک ہی ہوں گی مگر یہ تو بتائیے کہ آپ کا قرآن آپ کو حکم دیتا ہے کہ کافروں کو جہاں پاؤ مارو، پکڑو اور قتل کردو۔ جب آپ کی الہامی کتاب آپکو یہ حکم دیتی ہے تو پھر ہم اور آپ میل جول سے کیسے رہ سکتے ہیں، آپ کو تو جب موقع ملے گا، اپنے خدا کے حکم کی تعمیل کرلیں گے۔ اور ہم کو پکڑ لیں گے، ماریں گے اور قتل کردیں گے۔

میں نے پہلے تو انکی اس صاف گوئی پر مبارکباد دی اور شکریہ ادا کیا، پھر چونکہ وقت میں کوئی کمی نہیں تھی اس لیے ان سے کہا کہ اگر آپ واقعی بات کو سمجھنا چاہتے ہیں اور آپ کا یہ اعتراض صرف اعتراض کی خاطر نہیں ہے تو کچھ ابتدائی تفصیل سننے پر تیار ہوجائیے۔ جب انھوں نے آمادگی ظاہر کی تو میں نے ان سے کہا کہ سب سے پہلے اسلام اور مسلمانوں کو سمجھ لیجیے کیونکہ آج مسلمان نے خود اپنی پوزیشن غلط کرکے رکھ دی ہے۔ اس لیے لوگوں کو ان کے بارے میں غلط فہمی ہے اور ایسے بہت سے اعتراض پیدا ہوتے ہیں۔ اگر مسلمان کی حیثیت یہی ہو کہ وہ دوسری قوموں کی طرح نسل و وطن یا رنگ و زبان سے بنی ہوئی ایک قوم ہیں اور اسلام ان کا قومی مذہب ہے جس کے پاس دوسروں کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہے تو میں تسلیم کرتا ہوں کہ آپ کا اعتراض درست ہوگا۔ اور یہی ایک کیا، بہت سے ایسے اعتراضات ہوں گے جن کے جواب معقولیت کے ساتھ دینا مشکل ہوگا۔ مگر واقعہ یہ نہیں ہے۔

وہ پوری طرح متوجہ ہوگئے۔

میں نے انھیں بتایا کہ اسلام دراصل تمام انسانوں کے سامنے کچھ حقیقتیں عقیدہ بنا کر ماننے کے لیے پیش کرتا ہے۔ پھر ان عقائد کے تقاضے پورے کرنے کا مطالبہ کرتا ہے .... ان عقائد کو منوانے کے لیے وہ کوئی زبردستی نہیں کرتا، بلکہ انسان کے تجربات اور اس کے اندرونی محرکات و احساسات کو اور کائنات کے آثار کو دلیل بنا کر انسان کی عقل اور اس کے وجدان سے اپیل کرتا ہے۔ اس کی اس اپیل میں عربی و عجمی کا شریف و رذیل کا اور کالے گورے کا کوئی فرق نہیں۔ ہر عورت مرد سے اس کی یہی ایک

ایمان ہے کہ دوسری ہر جانب سے منہ موڑ کر ایک خدا کو مانو اور اسی کے ہو رہو۔ وہ خدا جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہاری پرورش کے لیے زمین و آسمان کی چھوٹی بڑی ہر چیز کو ایک جگہ میں مصروف کر کے زمین کو تمہارے لیے دسترخوان بنا دیا۔ اور تمہارے لیے اتنی نعمتیں مہیا کر دیں جنکو تم گن بھی نہیں سکتے۔ لیکن تم اپنی نادانی سے اس کی بچھائے ہوئے دسترخوان کو خوانِ نعیما سمجھ بیٹھے ہو تمہاری شرافت کا تقاضا ہے کہ تم اس کو منعم مانو اور تمہاری خیریت بھی اسی میں ہو کہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو کیونکہ تم اس وقت بھی اس کی گرفت میں ہو اور ایکدن تم کو اسی کے سامنے کھڑے ہو کر ایک ایک چیز کا حساب دینا ہوگا لہٰذا وسی کو پوجو بھی اور اسی کی اطاعت بھی کرو۔

یہ پکار جس سچے اور شریف انسان نے لگائی (صلی اللہ علیہ وسلم) اس نے کہا کہ یہ باتیں میں اٹکل سے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ تمہارے خدا نے مجھے اپنا رسول بنا کر اسی لیے بھیجا ہے کہ میں تم تک یہ خبر اور اطلاع پہونچا دوں کہ موت کے اس پار خدا کی رحمت بھی اور اس کا عذاب بھی تمہارا منتظر ہے۔ لہٰذا میری بات مان کر اپنی موجودہ زندگی کو بھی سنوار لو اور اس مہلت کو غنیمت جان کر خدا کے عذاب سے بچنے اور اس کی رحمت کے مستحق بننے کی تیاری کر لو۔

دنیا کی ہر پکار کی طرح اس پکار کا بھی یہی نتیجہ نکلا کہ کچھ انسانوں نے اسے مانا اور کچھ نے انکار کر دیا۔ باپ نے مانا بیٹے نے نہیں مانا۔ بھتیجے نے مانا چچا نے انکار کر دیا اور یہی ماننے اور نہ ماننے والی بات لوگوں کو اپنا اور غیر بنانے والی چیز بن گئی۔ جو لوگ اس پکار کو مانتے گئے وہ سب آپ سے آپ ایک امت (پارٹی) بنتے چلے گئے۔

پھر مان لینے کے اس عمل نے انکو وہ سکون بلکہ سرور بخشا کہ یہ عقیدہ انکے لیے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ لذت بخش ہو گیا۔ اور عقیدہ کے اس سرور نے انکو ایسا سرشار کر دیا کہ وہ اسکے لیے عزیز سے عزیز چیز کو ٹھکرا دینے اور اپنے خونی عزیزوں تک سے کٹ جانے پر اور اسی کی خاطر سر بھی کٹانے پر تیار ہو گئے۔

میں نے اپنے دوست سے دریافت کیا کہ کیا کبھی آپ نے کسی عورت کو دیکھا ہے جو کسی وقت چکلے میں بیٹھ کر ہر شوقین آدمی کی نیاز مند بنی رہی لیکن بعد میں تائب ہو کر کسی ایک کی ہو

رہی ہو؟ انھوں نے کہا کہ ہاں دیکھا ہے اور اسی عورت کو پہلی زندگی کے بعد ایک ہی کی داسی بن جانے میں جو لطف وسکون ملتا ہے اس کو وہ کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتی۔ یہ بھی دیکھا ہے کہ اس تبدیلی کے بعد اس کی ماں بہنیں اور دوسرے عزیز اس کی واپسی کیلئے لڑے اور اس سے کٹ گئے لیکن اس نے ایک کی خاطر ان سب کو چھوڑ دیا۔ میں نے کہا اب آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک گندی عورت کی کایا ایک کمزور انسان کا پلہ پکڑ لینے سے ایسی پلٹ سکتی ہے تو ان لوگوں کے سرور ومستی کا کیا عالم ہوگا جنھوں نے سب سے کٹ کر اپنا رشتہ ساری کائنات کو پیدا کرنے اور پالنے والے من موہنا سے جوڑ لیا ہو۔

صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اس کیفیت سے وہ لطف لے رہے ہیں۔

پھر میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا آپ کی رائے میں یہ ممکن ہے کہ سارے انسانوں کو ایک نظر سے دیکھا جائے اور کسی بھی بنیاد پر ان کے درمیان اپنے اور غیر کا فرق نہ ہو۔ وہ سوچنے لگے مگر میں نے ذرا رک کر مزید کہا کہ یہ خیالی بات ایک نعرہ کا کام تو دے سکتی ہے۔ ورنہ جہاں تک واقعات کی دنیا کا تعلق ہے اس میں ایسا ہوتا نہیں ہے۔ انسانوں کو دو حصوں میں بانٹ کر اپنے اور پرائے کے فرق کرنے پر ہر آدمی مجبور ہے۔ کوئی یہ فرق وطن کی بنیاد پر کرتا ہے۔ کوئی نسل کی بنیاد پر، کوئی رنگ و زبان کی بنیاد پر۔ اسلام بھی یہ فرق کرتا ہے۔ لیکن وہ یہ فرق نسل و وطن جیسی کسی بنیاد پر نہیں بلکہ ایک عقیدہ اور آئیڈیالوجی کی بنیاد پر کرتا ہے۔ اسکی نظر میں ایک عقیدہ کو نہ ماننے والے سب لوگ ایک ہیں اور اس عقیدہ کو نہ ماننے والے سب غیر۔ یہ ایک قدرتی بات ہے آپ خود اپنے کو دیکھ لیجئے۔ کیا آپ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر کو مہاسبھا کے ایک ممبر کے مقابلے میں غیر نہیں سمجھتے؟ اور اس کے مقابلے میں مہاسبھا کے ممبر کو اپنا نہیں سمجھتے؟ انھوں نے کہا یہ بات تو ہے۔ میں نے کہا اب یہ اور بتائیے کہ آپ کے سامنے بھی کچھ مقاصد ہیں۔ اور کمیونسٹوں کے سامنے بھی۔ پھر یہ کہ دونوں اپنے اپنے مقصد کیلئے سرگرم ہیں۔ ایسی صورت میں کیا کبھی کشمکش اور ٹکراؤ نہیں ہوگا؟

کیا اس معاملے میں آپ کمیونسٹوں کے ساتھ اور وہ آپ کے ساتھ رواداری برتیں گے؟ اگر وہ آپ کو ماریں گے تو کیا آپ انھیں چھوڑ دیں گے؟ کہنے لگے یقیناً نہیں۔

میں نے کہا بس اسی بات سے آپ اسلام اور مسلمان کی پوزیشن سمجھ سکتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا وہ سب لوگ جنھوں نے رسول اللہ کی بات مان لی۔ وہ سب ایک امت (پارٹی) بن گئے۔ اور جنھوں نے نہیں مانا وہ ان کے درپے آزار ہو گئے۔ حتیٰ کہ رسول اللہ کے خود اپنے رشتہ دار بھی جنھوں نے اس دعوت کو نہیں مانا تھا۔ ان میں سے بھی بعض رسول اللہ کے دشمن ہو گئے ان کے ساتھیوں کو مارا۔ گھسیٹا اور طرح طرح سے ستایا۔ یہاں تک کہ ان لوگوں کو اپنے شہر اور اپنے گھروں میں رہنا مشکل ہو گیا۔ اگر یہ حضرات وہاں سے نکل کر ایک دوسری جگہ کو پارٹی کا ٹھکانہ نہ بناتے تو مخالفین تو یہ فیصلہ کر ہی چکے تھے کہ اس پورے قصے کا فیصلہ تلوار سے کر دیا جائے پھر وہاں بھی انکار کرنے والے مخالفین نے انھیں چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ ان کے چھوٹے سے قصبہ پر یہ لوگ کئی بار پوری طاقت سے چڑھ دوڑے کہ ان لوگوں کا قصہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں ان حالات میں آخر وہ کیا کرتے؟ کیا اپنے ایمان و عقیدہ سے پھر جاتے؟ یا دشمنوں کو اپنی من مانی کر لینے دیتے؟ پھر معاملہ صرف انکی ذات کا نہیں تھا بلکہ اس چراغ کے روشن رہنے یا بجھ جانے کا سوال تھا جس کو یہ لوگ روشن کیے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کو ایک دولت ملی تھی جس میں وہ دوسروں کو بھی شریک کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنی اس دولت کو مر دیکھ بھی بچا لینے پر تیار تھے۔ وہ گاندھی وادی نہیں تھے کہ دوسروں کا کام مارنا ہو اور انکا کام بس مار کھانا۔ اس لیے انھیں حکم دیا گیا کہ جو لوگ انکار پر جمے ہوئے ہیں اور تمہارا اپنے خدا سے جڑ جانا انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتا ہے اس لیے وہ تمہیں مٹا دینے کے اور اس چراغ کو جو تمہارے ایمان سے روشن ہوا ہے، بجھا دینے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ تم بھی انھیں جہاں پاؤ پکڑو اور مارو۔ اور ان کے حملوں سے اپنے آپ کو اور اپنے اس چراغ کو بچا لو۔

آخر میں میں نے کہا کہ اب آپ نے سمجھ لیا ہو گا کہ اسلام ایک عقیدہ اور ایک مقصد لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور جو بھی اس عقیدہ اور مقصد کو اپنائے وہ اس پارٹی کا ممبر اور اس پارٹی والوں کا اپنا بن جاتا ہے۔ چاہے وہ کسی اور ملک کا باشندہ ہو اور کسی دوسری نسل سے تعلق رکھتا ہو اور جو اس عقیدے کو نہ مانے وہ اس پارٹی کا غیر چاہے وہ ان میں سے کسی کا باپ یا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ اور اگر ان میں سے کسی کا بیٹا یا باپ اس عقیدہ کا دشمن ہے تو

وہ اس کا بھی دشمن ہے۔ اس طرح ایک پارٹی بننے کے ساتھ ہی اس کے ہر ممبر کی ڈیوٹی ہوتی ہے کہ خدمت دپیار سے لے کر مرنے مارنے تک جو کچھ بھی اس مقصد کی خاطر اسے کرنا پڑے کرے اور اپنی تمام محبتوں اور نفرتوں کو اپنے اس مقصد کا تابع بنادے۔

یہ پوری گفتگو انھوں نے پوری توجہ سے سنی اور آخر میں بول اٹھے کہ اب میں مانتا ہوں کہ وہ بات جس پر مجھے اعتراض تھا نہ صرف معقول ہے بلکہ یہی ایک بات معقول ہے جس سے ہٹ کر غیر فطری طرز عمل مکاری ہے۔

اتفاق سے کچھ ہی دن کے بعد ہماری ان کی یہ صحبتیں ختم ہوگئیں لیکن اب تک وہ محبت کرتے ہیں اور جب ملتے ہیں تو اکثر لپٹ جاتے ہیں۔

میرے ایک سکھ دوست ہیں، کاروباری آدمی ہیں لیکن نہایت جوشیلے ۱۹۴۷ء میں ان کا طبعی جوش مسلمانوں کے خلاف جوبن پر تھا۔ ان ہی دنوں میں ایک روز مجھ سے کہنے لگے سکھوں اور مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان عداوت کی ایسی آگ بھڑک اٹھی ہے جس کا ٹھنڈا ہونا بہت مشکل ہے میں نے کہا ایسا نہیں ہے بلکہ بات یہ ہے کہ تینوں نے مادہ پرستی کی یلغار میں آکر اپنے اپنے مذہبوں کو اپنی خواہشات اور جذبات کے حوالے کر دیا ہے۔ اس وجہ سے یہ صورت حال بن گئی ہے۔ یہ جذبات جب حقائق کی چٹانوں سے ٹکرائیں گے تو دھواں بن کر اڑ جائیں گے

پھر میں نے ان سے کہا کہ ماضی قریب میں سکھ سیاست بالکل غلط رہی جس کا نقصان خود ان ہی کو پہونچا اور نتیجہ یہ نکلا کہ پوری سکھ ملت قطروں کی شکل میں اکثریت کے سمندر میں شامل ہو جانے پر مجبور ہے۔

اس بات پر وہ چونکے۔ میں نے کہا جب میں ایک بات کو غلط کہہ رہا ہوں تو آپکو یہ دریافت کرنے کا حق ہے کہ اس غلط کے مقابلے میں صحیح کیا ہے اور میری ذمہ داری ہے کہ میں اس مطالبہ کو پورا کردوں۔

میری اس بات کے جواب میں وہ ہمہ تن گوش بن گئے۔

میں نے ان سے کہا کہ پہلے چند بنیادی باتیں صاف ہو جانا چاہئیں پھر میں نے ان سے

دریافت کیا کہ کیا یہ بات صحیح نہیں ہے کہ سکھ ملت کوئی ایسی قوم نہیں ہے جس کو نسل یا وطن وغیرہ نے قوم بنایا ہو بلکہ ان کے پاس چند اصول ہیں۔ کوئی شخص جاٹ ہو یا برہمن ہو چمار ہو جب وہ ان اصولوں کو مان لے گا سکھ بن جائے گا۔

جب انھوں نے اس بات کی تصدیق کر دی تو میں نے کہا کہ جب یہ بات صحیح ہے تو لازماً وہ اصول انسانیت کی فلاح کے دعویدار ہوں گے۔ اور انسان کی فلاح کسی روحانی یا خیالی لذت میں مگن ہو جانے کا نام نہیں بلکہ انسانیت کی فلاح اس کو کہیں گے کہ انسان کے جسم کو بھی غذا ملے اور روح کو بھی۔ اس کا تعلق خدا سے بھی درست ہو اور انسان سے بھی۔ اور اس کی زندگی کا یہ سفر اس طرح طے ہو کہ وہ اپنے مقام لائق تک پہونچ سکے۔ فرمایا بات تو ٹھیک ہے۔ میں نے کہا جب ایسا ہے تو ان اصولوں کو گردواروں میں بند کرنے کے بجائے انھیں عمل کے میدان میں لاکر دوسروں کے لیے بھی عام کرنا چاہیے۔ ان اصولوں کی طرف سے انسانیت کی فلاح کا دعوا دو حال سے خالی نہیں۔ صحیح ہوگا یا غلط۔ اگر صحیح ہے تو ویسے اصول رکھنے والی جماعت کا انکو صرف اپنے دائرے میں بند رکھنا اور انسانیت کو درندگی کے حوالے کر دینا انسانیت پر ایک ظلم ہے اور ان اصولوں پر بھی۔ اور اگر ان کا دعوا غلط ہے تو عمل کے میدان میں لانے سے ہی یہ بات واضح ہو سکے گی۔ اور سکھ جماعت ایک غلط فہمی سے نجات پاکر کسی اور جگہ ہدایت کی تلاش کر سکے گی۔

اگر سکھوں نے یہ حیثیت اختیار کی ہوتی تو انکی پوزیشن آج سے مختلف ہوتی۔ اگر ان کے پیش کیے ہوئے اصولوں میں دکھی انسانیت کے زخموں کا مرہم ہوتا تو وہ سب لوگ انکی طرف لپکتے جنکے اندر مریض ہونے کا احساس ہے۔ اس طرح سکھ قوم طاقت کا ایک ایسا سیلاب بن جاتی کہ اس کے سامنے نسلی اور وطنی قومیتوں کی دیواریں اور نسلی تعصبات تنکے کی طرح بہہ جاتے۔ اور وہ ان انسانوں کی نجات دہندہ بن جاتی جو بے چارے مختلف قومیتوں کے قید خانہ میں بند ہیں۔

میں نے کہا کہ بالکل یہی غلطی مسلم سیاست نے بھی کی۔ مسلم ملت نے بھی اپنی طاقت کو نہیں پہچانا اور اپنی قوت تسخیر سے خود دست بردار ہو کر اپنے ہاتھ سے قومیت کا زریں طوق اپنے گلے میں ڈال لیا اور اس طرح۔

وسعتِ گردوں میں تھی جن کی تڑپ نظارہ سوز
بجلیاں آسودۂ دامانِ خرمن ہو گئیں

سردار صاحب نے یہ باتیں بہت توجہ سے سنیں، اور ایک متحیر خاموشی کے بعد ان باتوں سے اتفاق کیا اور پھر ایک سوچ میں پڑ گئے۔ اس کے بعد ان کے اندر کوئی حرکت تو پیدا نہیں ہوئی لیکن پہلا جوش و خروش بھی ختم ہو گیا اور اب ملاقات ہوتی ہے تو بڑے تپاک سے ملتے ہیں۔

عید کا خطاب

(مندرجہ ذیل تقریر امسال عید الفطر کی نماز کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں کی گئی تھی اور ٹیپ ریکارڈ کر لی گئی تھی، مولانا کی نظر ثانی کے بعد پیش کی جا رہی ہے)

آپ میں سے بہت سے بھائیوں کو، بلکہ قریب قریب سب ہی بھائیوں کو عید کا یہ دن آج سے پہلے بھی بار بار آیا ہوگا، اور خدا کرے کہ اس کے بعد بھی بار بار آئے، لیکن ہم میں سے ہر ایک کے لیے ایک عید ایسی [illegible] جو آخری عید ہوگی۔ میں نے آج آپ کے ساتھ عید کی نماز پڑھی ہے مگر مجھے معلوم نہیں کہ آج کے بعد میں عید کی کوئی نماز پڑھوں گا یا نہیں۔ آپ سب نے بھی اس وقت میرے ساتھ عید کی نماز پڑھی ہے مگر آپ میں سے بھی کسی کو معلوم نہیں کہ اس [illegible] عید کی نماز پڑھنا نصیب ہوگا یا نہیں [illegible] ہمارے ہزاروں لاکھوں بھائی تھے جنھوں نے پارسال عید کی نماز ہماری طرح پڑھی تھی [illegible] ان کی آخری عید کی نماز تھی، آج کی عید آنے سے پہلے وہ اس دنیا سے اٹھا لیے گئے اور انھیں آج کی یہ نماز پڑھنا نصیب نہیں ہوا — میرے بھائیو! یقیناً میرے اور آپ کے لیے بھی کسی عید کی نماز آخری ہوگی اور اللہ ہی جانتا ہے کہ ہم میں سے کس کس کی آج آخری عید ہوئی ہے اور اس کے بعد زندگی میں کوئی عید نہیں آئے گی۔

میرے بھائیو! اتنی بات میں تو کسی کافر کو بھی شبہ نہیں ہے کہ وہ اس دنیا میں ہمیشہ نہیں رہے گا، اور ایک وقت آئے گا جب وہ اس دنیا سے اٹھا لیا جائے گا۔

میں نے اور آپ سب نے ہزاروں ہزاروں کو مرتے ہوئے اور اس دنیا سے جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ اپنے سے بڑوں کو بھی جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ اپنی عمر والوں کو بھی جاتے ہوئے دیکھا ہے اپنے سے چھوٹوں اور بہت چھوٹوں کو بھی جاتے ہوئے دیکھا ہے بلکہ اپنے ہاتھوں سے نہلایا، کفنایا اور دفنایا ہے اس لیے اس میں تو کسی کو بھی شبہ نہیں ہے کہ ہم بھی کسی دن میں یا کسی رات میں اسی طرح اس دنیا سے چلے جائیں گے ——

پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟ —— اس کو بے شک ہم میں سے کسی نے بھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا ہے کہ مرنے کے بعد مرنے والے کے ساتھ کیا ہوتا ہے، لیکن اللہ کے سب پیغمبروں نے اور سب سے آخر میں خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری وضاحت اور تفصیل سے بتایا ہے کہ مرنے کے بعد ان ان منزلوں سے گزرنا ہے۔ سب سے پہلی منزل قبر اور برزخ کی ہے۔ اس کے بعد حشر کی منزل ہے۔ اس کے بعد حساب ہے، اس کے بعد جنت یا دوزخ ہے۔ پھر ان منزلوں میں جو کچھ سامنے آنے والا ہے وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت اور تفصیل سے بتایا ہے۔ قبر کے بارے میں آپ نے فرمایا "اَلْقَبْرُ اِمَّا رَوْضَۃٌ مِنْ رِیَاضِ الْجَنَّۃِ وَاِمَّا حُفْرَۃٌ مِنْ حُفَرِ النَّارِ۔" قبر یا تو جہنم کی آگ بھری خندقوں میں سے ایک خندق ہے (اللہ کی پناہ!) اور یا جنت کے باغوں میں سے ایک باغیچہ ہے اور ایک پھلواری ہے یعنی قبر میں قبر والے کے لیے یا تو دوزخ والا عذاب ہے یا جنت کی بہاریں اور لذتیں ہیں۔ اسی طرح حشر اور پھر حساب اور جنت دوزخ کے بارے میں بھی آپ نے پوری تفصیل اور وضاحت سے بتایا ہے اور میرا آپ کا سب کا ایمان ہے کہ قبر کے بارہ میں اور اسی طرح قیامت اور جنت دوزخ کے بارہ میں جو کچھ حضور نے بتایا ہے وہ بالکل حق ہے، ہماری آنکھوں دیکھی چیزیں اتنی یقینی نہیں ہیں، جتنی یقینی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی یہ باتیں ہیں، ہم قبر میں پہونچ کے وہ سب دیکھ لیں گے جو حضور نے قبر کے بارہ میں بتایا ہے، میدان حشر میں وہ سب دیکھ لیں گے جو وہاں کے بارہ میں آپ نے بتایا ہے۔ اسی طرح مقام حساب اور جنت دوزخ کے بارہ میں جو کچھ آپ نے بتایا ہے وہ سب بھی وہاں پہونچ کے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔

اس کے بعد میں آپ حضرات سے اور سب سے پہلے خود اپنے سے پوچھتا ہوں کہ مرنے کے بعد جو یہ سخت سے سخت منزلیں آنے والی ہیں اُن کے لیے ہم نے اور آپ نے کیا تیاری کی ہے؟

——— قرآن پاک میں ہمیں آپ کو اور سارے اہل ایمان کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے۔
"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ٥" یعنی اے لوگو! جو اللہ و رسول پر اور یوم آخرت پر ایمان لاچکے ہو اللہ سے ڈرو، اور ہر شخص سوچے اور دیکھے کہ مرنے کے بعد آنے والے دن کے لیے یعنی قیامت اور آخرت کے لیے اس نے کیا تیاری کی ہے۔

دوسری جگہ قیامت کے منظر کا اور وہاں کی ہولناکیوں کا نقشہ کھینچ کے فرمایا گیا ہے۔
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا رَبَّكُمْ إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ ٥ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا أَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكَارَىٰ وَمَا هُم بِسُكَارَىٰ وَلَٰكِنَّ عَذَابَ اللَّهِ شَدِيدٌ ٥ یعنی اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، قیامت کا بھونچال بڑی عظیم چیز ہے، جب قیامت آئے گی تو حالت یہ ہوگی کہ دودھ پلانے والی مائیں اپنے دودھ پیتے بچوں کو بھول جائیں گی، حمل والیوں کے حمل ساقط ہو جائیں گے، سارے آدمی بے ہوش ہو کے گر جائیں گے کسی کو اپنی بھی خبر نہ ہوگی۔

ایک اور جگہ اسی قیامت کے دن کے بارہ میں فرمایا گیا ہے۔
يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ٥ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ ٥ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ٥ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ٥
یعنی وہ ایسا سخت اور نفسی نفسی کا دن ہوگا کہ کوئی کسی سے کسی قسم کا سروکار نہ رکھنا چاہے گا، ہر ایک کو بس اپنی اور صرف اپنی فکر ہوگی، بھائی بھائی کا ساتھ چھوڑ دے گا، اولاد ماں باپ سے دور بھاگے گی، جسے دنیا میں اپنے بیوی بچے بہت عزیز تھے، بہت پیارے تھے، ہر وقت ان ہی کی فکر میں ڈوبا رہتا تھا، وہ قیامت کے دن ان بیوی بچوں کو چھوڑ کے بھاگ جائے گا۔ انکی بالکل خبر نہ لے گا، ہر ایک کو بس اپنی ہی پڑی ہوگی۔ "لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ"
پھر جب اسی قیامت کے دن اللہ کے حضور میں پیشی ہوگی اور حساب کا وقت ہوگا تو ایک طرف تو سامنے اعمالنامہ کھلا ہوگا، جس میں فرشتوں نے ہمارا ایک ایک عمل لکھا ہوگا۔ "لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا" ـ یعنی ہمارا کیا ہوا کوئی چھوٹا بڑا عمل ایسا نہ ہوگا جو اس اعمالنامہ میں لکھا ہوا سامنے موجود نہ ہوگا ——— ہم نے

جو گناہ اپنے ماں باپ سے، اپنی رازدار بیوی سے اور اپنے دوستوں سے بھی چھپ کر کیے ہوں گے، وہ بھی اس اعمالنامہ میں موجود ہوں گے۔

اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہو گی کہ ہمارے ہر عمل اور ہر گناہ کی گواہی ہمارے وہ اعضاء اور ہمارے وہ ہاتھ پاؤں دیں گے جن کے ذریعہ ہم نے وہ گناہ کیا ہو گا۔ اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰی اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ ——— یعنی قیامت میں حساب کے وقت منھ اور زبان پر مہر لگا دی جائے گی، کوئی مجرم منھ سے ایک لفظ نہیں بول سکے گا، بجائے زبان کے ہاتھ اور پاؤں بولیں گے اور بتائیں گے کہ اس بندے نے ہمارے ذریعہ فلاں فلاں کام کیے، ہاتھ کہے گا مجھے اس نے اس گناہ میں استعمال کیا تھا، پاؤں کہے گا میرے ذریعہ یہ فلاں گناہ کے لیے چلا تھا، اسی طرح ہمارا ایک ایک عضو خدا کے سامنے گواہی دے گا۔

میرے بھائیو! میرا اور آپ کا قرآن پاک پر ایمان ہے، میں خدا کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ قیامت میں اور حساب کے وقت بالکل یہی ہو گا جو ان آیتوں میں بیان فرمایا گیا ہے ———
——— خدا کے لیے ذرا تصور کیجیے اور دھیان کیجیے اُس وقت کا جب ہم آپ سب مقام حساب میں خدا کے حضور میں اور اس کی عدالت میں کھڑے ہوں گے، ہمارا اعمالنامہ سامنے ہو گا، ہمارے ایک ایک عمل، ہمارے ہر عمل کے عینی شاہد فرشتے بھی حاضر اور موجود ہونگے اور خود ہمارے ہاتھ پاؤں اور ہمارے سارے اعضاء گواہی دیں گے ——— اس وقت میرا کیا حال ہو گا؟ آپ کا کیا حال ہو گا؟

میرے بھائیو! یہی ہمارا وہ مسئلہ ہے جو درحقیقت ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور ہم اس سے غافل ہیں۔ ایسے غافل اور بے پرواہ ہیں کہ چھوٹے سے چھوٹے مسئلوں سے اتنے غافل اور بے پرواہ نہیں ہوتے " اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۝ (حساب کی گھڑی قریب ہے، بہت دور نہیں ہے، مگر لوگ غافل ہیں)

میرے بھائیو! میں نے ابھی کہا تھا کہ ہم میں سے کسی کو معلوم نہیں کہ آج کی عید کس کس کی آخری عید ہے اور کس کس کے لیے طے ہو چکا ہے کہ انکو اگلی عید کے آنے سے پہلے اس دنیا سے اٹھا لیا جائے گا، بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ مجھے اور آپ میں سے کسی کو یہ بھی خبر نہیں کہ آج کے بعد ایک

مہینہ یا ایک ہفتہ بھی اس دنیا میں رہیں گے بلکہ ہم میں سے کوئی بھی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ میں کل تک بھی ضرور رہوں گا ــــــ اس لیے آج عید کے دن میں سب سے پہلے خود اپنے نفس سے اور اُسکے بعد آپ میں سے ہر ایک بھائی سے صرف یہی ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ خدا کے لیے اُس قبر کی تیاری کیجئے جس میں مجھے اور آپ کو یقیناً جانا ہے اور قیامت آنے تک سیکڑوں یا ہزاروں سال اسی میں رہنا ہے، اُس قیامت کے دن اور حشر کی تیاری کیجیے جس کی مدت قرآن مجید میں پچاس ہزار سال بتائی گئی ہے، اور جس میں خدا کے قہر و جلال کا ایسا ظہور ہوگا کہ انبیاء علیہم السلام بھی لرزیں گے، کانپیں گے اور نفسی نفسی پکاریں گے، اُس دوزخ سے بچنے کی تیاری کیجیے جس کے عذاب کا ایک لمحہ ہم میں سے کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا ــــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے کہ دوزخ میں سب سے ہلکے درجہ کا عذاب یہ ہوگا کہ آدمی کے پاؤں کے تلوے کے نیچے دوزخ کا انگارہ رکھ دیا جائے گا، جس کی گرمی سے سر میں اُس کا بھیجا اُس طرح پکے گا جس طرح چولہے پر ہانڈی پکتی ہے ــــــ اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا! کیا یہ عذاب ایک منٹ کے لیے بھی میں برداشت کر سکتا ہوں؟ آپ برداشت کر سکتے ہیں؟ اللہ کی پناہ! ــــ اللہ کی پناہ!!

اور جس طرح دوزخ کا عذاب وہ عذاب ہے جو ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا اسی طرح جنت میں وہ بہاریں، وہ نعمتیں اور وہ لذتیں ہیں جن کا یہاں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ــــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں کے بارہ میں فرمایا ہے "لَا عَیْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ" ـ یعنی جنت میں وہ نعمتیں اور راحت و لذت کے سامان ہیں جن کو اس دنیا میں نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے نہ کسی کان نے سنا ہے، اور نہ کسی انسان کا خیال اور تصور ہی وہاں تک پہونچا ہے ــــــ قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے "فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْیُنُ" یعنی جنت وہ سب کچھ ہے جس کو کسی سلیم الفطرت آدمی کا جی چاہے اور جس کو دیکھ کے آنکھوں کو سرور اور ٹھنڈک حاصل ہو ــــــ ان مختصر لفظوں میں جنت کے بارہ میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اُس کی تشریح گھنٹوں تک کی جا سکتی ہے اور دفتر کے دفتر لکھے جا سکتے ہیں۔

اس کے بعد میں آپ سے کہتا ہوں کہ اگر میرا اور آپ کا قرآن پاک اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر ایمان ہے (اور مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہے) تو پھر ہماری سب سے بڑی

* افسوس ہے کہ آگے کے تین صفحہ غلط جڑ گئے ہیں ہندسے صحیح کرلیں۔

کم و بیش کے کچھ فرق کے ساتھ تمام صحابہ کرام کا یہی حال تھا ـــــــ ہم اور آپ صحابہ کرام کے یہ حالات اور واقعات کتابوں میں پڑھتے ہیں یا سنتے ہیں تو ہمیں تعجب ہوتا ہے، حالانکہ تعجب اس پہ ہونا چاہیے کہ قرآن و حدیث میں قبر، آخرت اور حساب اور دوزخ جنت کے بارہ میں جو کچھ بتایا گیا ہے اُس کو صحیح ماننے اور اُس پہ ایمان لانے کے باوجود ہمارا بھی یہ حال کیوں نہیں ہے اور وہاں کی تیاری سے ہم اتنے بے فکر اور غافل کیوں ہیں ـــــــ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے دل ایمان سے بالکل خالی ہو گئے ہیں، لیکن ہماری حالت آج اُن ہی لوگوں کی سی ہے جن کو ان ایمانی حقیقتوں پر یقین نہ رہا ہو، ہم میں سے کتنے ہیں جنہیں صبح سے شام تک کبھی قبر یاد نہیں آتی، حساب کے لیے خدا کے سامنے پیش ہونا یاد نہیں آتا ـــــــ دنیا کی فکروں اور تیاریوں سے وہ کسی وقت بھی خالی اور فارغ نہیں رہتے لیکن آخرت کی طرف سے بالکل بے فکری کے ساتھ زندگیاں گزار رہے ہیں۔

ـــــــ میرے بھائیو! قیامت اور آخرت برحق ہے ـــــــ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارہ میں جو کچھ بتلایا ہے وہ بالکل برحق ہے۔ خدا کی قسم آپ نے یہ باتیں صرف ڈرانے کیلئے نہیں کہی تھیں۔ آج اس دنیا میں ہم آپ آخرت کو نہیں دیکھ سکتے! اُسی طرح نہیں دیکھ سکتے، جس طرح کہ بچہ ماں کے پیٹ میں ہماری اس دنیا کو نہیں دیکھ سکتا، لیکن جس طرح ماں کے پیٹ والی زندگی ختم کرنے کے بعد بچہ یہاں آ کر اس دنیا کو دیکھ لیتا ہے اسی طرح خدا کی قسم بالکل اسی طرح ہم اور آپ سب اس دنیا کی زندگی ختم کرنے کے بعد برزخ اور آخرت کی اُس دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے جس کا حال قرآن مجید میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں میں بیان کیا گیا ہے ـــــــ

خدا کے لیے اپنے پر رحم کیجیے، اپنی آخرت کی فکر کیجیے، اُس وقت کے لیے تیاری کیجیے جب خدا کے سامنے پیشی ہوگی، جب خود میرے اور آپ کے ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضاء ہمارے اعمال کی گواہی دیں گے، جب ہمارے اعمال کا پورا دفتر ہمارے سامنے ہوگا۔ " فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ "

میرے بھائیو! آخرت کی تیاری اور فکر کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ اس دنیا کی نعمتوں اور لذتوں سے بالکل دستبردار ہو جائیں، اور راہبوں، درویشوں کی زندگی اختیار کر لیں

ـــــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ شریعت اور وہ طریقہ لے کے آئے ہیں، جس میں ایک آدمی جائز طریقوں سے دولت کما کے لکھ پتی اور کروڑ پتی بھی بن سکتا ہے، دنیا کی ان حلال نعمتوں اور لذتوں سے لطف اندوز ہو سکتا ہے، اور اس کے ساتھ جنتی بلکہ اللہ کا ولی بھی بن سکتا ہے ــــــ بس شرط یہی ہے کہ اللہ سے ڈرے، حرام سے بچے اور اللہ کے حکموں کی پابندی کرے ـــــ یہ راستہ ہر غریب کیلیے کھلا ہوا ہے، ہر امیر کیلیے کھلا ہوا ہے، ہر پڑھے اور بے پڑھے کیلیے کھلا ہوا ہے۔ ہر جوان اور بوڑھے کے لیے کھلا ہوا ہے ــــــ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ میری زندگی بغیر حرام کے نہیں گزر سکتی۔

اگر اب تک اس طرف سے غفلت رہی تو آج فیصلہ کر لیجیے کہ اللہ و رسول کی فرمانبرداری کیساتھ زندگی گزاریں گے، جہاں تک بن پڑے گا محرمات سے اور گناہوں سے بچیں گے ــــ اگر آپ آج اور اسی وقت یہ فیصلہ کر لیں، اور اب تک غفلت اور بے فکری کی وجہ سے جو غلطیاں ہوئیں جو گناہ ہوئے، اُن پر دل میں نادم ہو کر سچے دل سے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت سنائی ہے کہ آپ بالکل بے گناہ ہو جائیں گے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے پیارے بن جائیں گے، اور آپ کے لیے اسی وقت مغفرت اور جنت کا فیصلہ ہو جائے گا، اور پھر یہ عید آپ کی بڑی ہی مبارک عید ہوگی۔

میرے بھائیو! میری عمر ۶۵ سال کی ہو چکی، میں بھی ایک گنہگار بندہ ہوں، میں بھی غفلت اور بے فکری کا مریض ہوں، قبر اور آخرت کے لیے اور حساب کے دن کے لیے جیسی تیاری ہونی چاہیئے تھی میں نے بھی نہیں کی ہے، تھوڑے بہت فرق کے ساتھ آپ سب کا بھی یہی حال ہوگا ـــــ آؤ اسی وقت اللہ کے حضور میں اپنی اس غفلت اور بے فکری والی زندگی سے اور سارے گناہوں سے توبہ کریں، معافی مانگیں، اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور اس کے رسول پاک کی تابعداری کا آج نئے سرے سے عہد کریں، یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ قبول فرمائیگا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ نَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ نَسْتَغْفِرُكَ وَنَتُوْبُ اِلَيْكَ۔

(اس کے بعد اجتماعی توبہ و استغفار اور طویل دعا پر تقریر کا سلسلہ ختم ہوا)

فکر یہی ہونی چاہیے کہ ہم قبر کے عذاب سے، اور حشر کی ناقابل برداشت تکلیفوں سے اور دوزخ کی آگ سے کسی طرح بچا دیے جائیں اور ہر منزل میں ہمارے ساتھ رحمت و مغفرت کا معاملہ ہو اور آخر میں جنت اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل ہو جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ معصوم تھے، اور آپ کو نبوت کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی محبوبیت کا مقام بھی حاصل تھا، لیکن اس کے باوجود آپ کی بھی سب سے بڑی فکر یہی تھی، آپ کا ارشاد ہے۔ اَنَا اَعْلَمُكُمْ بِاللّٰهِ وَ اَخْشَاكُمْ۔ یعنی میں اللہ کو تم سب سے زیادہ جانتا ہوں اور اس لیے مجھے اس کا خوف اور ڈر بھی تم سب سے زیادہ ہے۔

بالکل اصولی بات ہے، جس کو اللہ کی جتنی زیادہ معرفت ہو گی، وہ اُس سے اتنا ہی زیادہ ڈرے گا ——— "قربیا نرا بیش بود حیرانی۔"

اُمت میں معرفت اور یقین کے لحاظ سے سب سے اونچا مقام صدیق اکبر کا تھا، اسی لیے وہ سب سے زیادہ رونے والے اور سب سے زیادہ آخرت کی فکر کرنے والے تھے، صحیح بخاری کی ایک روایت میں اُن کے بارہ میں ہے "كَانَ رَجُلًا بَكَّاءً" یعنی وہ بہت رونے والے تھے۔ اُن کے حالات میں لکھا ہے کہ بہت زیادہ رونے ہی کی وجہ سے اُن کی آنکھوں کی پتلیوں کی سیاہی پھیکی پڑ گئی تھی ——— اُن کے بعد اُمت میں سب سے اونچا مقام فاروق اعظم کا ہے اُن کا حال یہ تھا کہ آخری وقت میں جب حضرت صہیبؓ نے انکو اطمینان دلانا چاہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے اتنے بڑے بڑے کام لیے ہیں، انشاء اللہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کا معاملہ آپ کے ساتھ بہت خاص الخاص ہو گا اور اللہ تعالیٰ بڑے بلند درجات عطا فرمائے گا، تو انھوں نے کہا میرے بھائی صہیب! اگر اللہ تعالیٰ بس میری خطائیں اور میرے قصور بخش دے اور میرے کسی عمل کا مجھے کوئی ثواب اور انعام نہ دیا جائے تو میں سمجھونگا کہ میں کامیاب ہو گیا۔

میرے بھائیو! میں نے اُمت کے سب سے بڑے دو بزرگوں کا حال بیان کیا ہے یہ وہ تھے جنہوں نے بار بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنت کی بشارت سنی تھی، اس کے باوجود اُن کے خوف اور آخرت کی فکر کا یہ حال تھا ——— بلکہ واقعہ یہ ہے کہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مواقیتِ احرام کا مسئلہ

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

امّا بعد

حق تعالیٰ جل شانہ نے تمام عالم میں سے بیت اللہ کی زمین عزت و شرف کے لئے مخصوص فرماکر اس پر اپنا بیت بنایا جو دنیا میں سب سے زیادہ معظم و مکرم ہے۔ اس کی تعظیم و شرف کے اظہار کے لئے اس کے گرد یکے بعد دیگرے کئی حلقے قائم فرمائے اور ہر ایک حلقے کے ساتھ کچھ آداب و احکام مخصوص فرمائے۔

سب سے پہلا اور بیت اللہ سے متصل حلقہ مسجد حرام کا ہے جس کے اندر بیت اللہ واقع ہے اس کے خاص آداب و احکام ہیں، جن میں کچھ تو وہ ہیں جن میں دنیا کی دوسری مساجد بھی شریک ہیں، اور کچھ اس مسجد حرام کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مثلاً اس میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ کے برابر ہوتا ہے۔ بیت اللہ کا طواف مسجد کے اندر ہوتا ہے اور مسجد حرام سے باہر کوئی سات چکر لگائے طواف ادا نہیں ہوگا۔ (غنیۃ الناسک)

دوسرا حلقہ پہلے سے زیادہ وسیع شہر مکہ مکرمہ کا ہے، اس کے بھی خاص آداب و احکام اور

پابندیاں ہیں۔ مثلاً یہ کہ پورا شہر مکہ بھی مسجد حرام کی طرح عام پناہ گاہ ہے۔ اس میں کسی مجرم کو بھی جو حرم سے باہر جرم کر کے حرم میں داخل ہو گیا وہاں قتل نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس کو مجبور کیا جائے گا کہ حرم سے نکلے، نکلنے کے بعد سزا دی جائے گی۔ اس میں کسی جانور کا شکار جائز نہیں۔ اس کے درختوں کا اور عام گھاس کا کاٹنا بھی جائز نہیں، مگر اس کی پابندیاں پہلے حلقے یعنی مسجد حرام سے کم ہیں۔

تیسرا حلقہ حرم کا ہے جو پہلے دونوں حلقوں پر مشتمل ہے، حرم شریف کے حدود مکہ مکرمہ کے چاروں طرف حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے سے معین محدود ہیں جدہ کی طرف سے جانے والوں کے لئے حد حرم حد یبیہ[1] کے قریب ہے جہاں دو ستون علامت حرم کے لئے قائم کئے ہوئے ہیں، اس تیسرے حلقے کے احکام و آداب اور شرعی پابندیاں بھی تقریباً وہی ہیں جو دوسرے حلقے کی بیان ہو چکی ہیں۔ البتہ شرف مکانی کے درجات بیت اللہ کے قرب و بعد کے اعتبار سے متفاوت ہوں گے۔

حدود حرم مکہ مکرمہ کے چاروں طرف متعین ہیں، کسی طرف کم اور کسی طرف زیادہ، سب سے قریب حدِ حرم تنعیم ہے جو مکہ مکرمہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے اور سب سے بعید نو میل پر ہے۔

چوتھا حلقہ ان سب سے وسیع تر ہے جس میں پہلے یہ تینوں حلقے سمائے ہوئے ہیں وہ حدود مواقیت ہیں، مواقیت میقات کی جمع ہے۔ حرم محترم کے تمام اطراف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ مقامات متعین فرما دیئے ہیں۔ جہاں سے مکہ مکرمہ میں آنے والے پر لازم کیا گیا ہے کہ بغیر احرام کے آگے نہ بڑھے۔ احرام خواہ حج کا ہو یا عمرہ کا۔ ان مقامات میں سے ہر ایک کو میقات کہتے ہیں۔ اور پورے حلقہ مواقیت کو فقہاء کی اصطلاح میں حِلّ کہا جاتا ہے۔ اس حلقے سے باہر تمام کو آفاق کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس حِلّ صغیر کے بھی کچھ خاص آداب و احکام ہیں مگر پہلے تینوں حلقوں سے کم ہیں۔ اس حلقے کی پابندی صرف اس قدر ہے کہ مکہ مکرمہ میں داخل ہونے والا اس حلقے میں بغیر احرام کے داخل نہیں ہو سکتا ہے، اگر کوئی بغیر احرام کے داخل ہو جائے۔ تو اس پر دم یعنی قربانی واجب ہو جاتی ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ اس مقالہ میں زیر بحث یہی چوتھا حلقہ ہے۔

اس کے احکام کی تفصیل معلوم کرنے سے پہلے کچھ اصطلاحی الفاظ کی تشریح بیان کر دینا ضروری ہے

[1] آج کل اس جگہ کو شمیسیہ کہتے ہیں۔

اصطلاحی الفاظ کی تشریح

پہلے حلقہ کا اصطلاحی نام مسجد حرام ہے۔ دوسرے کو مکہ مکرمہ کہا جاتا ہے۔ تیسرے کا اصطلاحی نام حرم ہے، چوتھا حلقہ حدود حرم سے باہر مگر حدود مواقیت کے اندر ہے۔ اس کا اصطلاحی نام حِل ہے یعنی اس میں شکار وغیرہ حلال ہے۔ حدود مواقیت سے باہر سارا عالم آفاق کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور چونکہ حرم کی پابندی شکار وغیرہ ل جیسے حِل میں نہیں ہے ایسے ہی حِل سے باہر آفاق میں بھی نہیں اس لئے حِل کے مفہوم میں آفاق بھی داخل ہے۔ اسی لئے بعض علماء حلقہ مواقیت کے اندر حرم سے باہر کے حِل کو حِل صغیر کہتے ہیں اور حدود مواقیت سے باہر آفاق کو حِل کبیر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

مواقیت حج کی تعیین

صحیح بخاری میں بروایت حضرت عبداللہ بن عباس یہ حدیث منقول ہے۔

وقّت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مدینہ کے لئے
لاھل المدینہ ذا الحلیفۃ و	ذوالحلیفہ اور اہل شام کے لئے جُحفہ اور اہل نجد
لاھل الشام الجحفۃ ولاھل نجد	کے لئے قرن المنازل اور اہل یمن کے لئے
قرن المنازل ولاھل الیمن یلملم	یلملم میقات مقرر فرمایا ہے۔

(بخاری کتاب الحج)

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار میقات مقرر فرمائے، ذوالحلیفہ، جحفہ، قرن المنازل اور یلملم ان مواقیت کی تفصیلی تحقیق آگے آجائے گی۔

اور صحیح بخاری ہی کی ایک دوسری حدیث میں بروایت ابن عمرؓ یہ بھی منقول ہے کہ جب فاروق اعظم رضؓ کے زمانے میں عراق فتح ہونے کے بعد اس کے دو شہر بصرہ اور کوفہ بسائے گئے تو اہل عراق حضرت فاروق اعظم رضؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل نجد کے لئے میقات قرن المنازل کو مقرر فرمایا ہے اور وہ ہمارے راستہ سے بہت دور ہے، اگر ہم اس راستہ کو اختیار کریں تو ہماری مسافت اور مشقت بہت بڑھ جاتی ہے اس پر حضرت فاروق اعظمؓ نے ارشاد فرمایا۔

فانظروا حذوھا من طریقکم فحدّ لھم ذات عرق ۔ (صحیح بخاری کتاب الحج)

اپنے راستے سے اس کی محاذات دیکھ لو۔ چنانچہ (اس طریقہ سے) فاروق اعظم رضؓ نے ان لوگوں کے لئے ذات عرق کو میقات مقرر فرمایا۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ پانچواں میقات ذات عرق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مقرر نہیں فرمایا تھا حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے اجتہاد سے مقرر فرمایا۔

لیکن صحیح مسلم کی روایت میں شک تردد کے ساتھ اور نسائی، ابو داؤد، ابن ماجہ وغیرہ میں بغیر شک کے یہ بھی منقول ہے کہ اہل عراق کے لئے ذات عرق کی تعیین خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دی تھی۔

یہ روایتیں قوت و صحت کے اعتبار سے اگرچہ بخاری کی روایت کی ہم پلہ نہیں ہیں مگر ان کو غیر معتبر بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اسی لئے شیخ ابن ہمامؒ نے فتح القدیر میں تطبیق اس طرح فرمائی ہے کہ کوئی بعید نہیں کہ حضرت فاروق اعظمؓ کو اس واقعہ سے پہلے وہ حدیث نہ پہنچی ہو۔ جس میں خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذات عرق کو اہل عراق کا میقات مقرر فرمانا مذکور ہے اس لئے انھوں نے اپنے اجتہاد سے کام لے کر متعین فرمایا اور یہ حضرت فاروق اعظم رضؓ کے خصوصی فضائل میں سے ہے کہ ان کا اجتہاد ٹھیک حدیث کے مطابق واقع ہوا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اہل عراق کا میقات ذات عرق قرار پایا۔ خواہ اس کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین فرمایا ہو یا حضرت فاروق اعظم رضؓ نے، اس لئے کل مواقیت پانچ ہو گئے۔ ان پانچوں مواقیت اور ان کے مقامات کی ضروری تشریح یہ ہے۔

مواقیت خمسہ کی ضروری تشریح

ذو الحلیفہ اہل مدینہ کا میقات ہے۔ مصر اور شام کے مسافر جو تبوک کے راستہ سے آتے ہیں ان کا میقات بھی یہی ہے، یہ مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ کی طرف جانے والے راستہ پر مدینہ سے چھ میل کے فاصلہ پر ایک مقام کا نام ہے۔ جس کو آبار علی یا بیر علی بھی کہا جاتا ہے اور آج کل یہی نام مشہور ہو گیا ہے۔ (حاشیہ ارشاد الساری) اس کا فاصلہ مکہ مکرمہ تک نو یا دس مرحلے ہیں۔ (البحر الرائق)

اور مخدوم محمد ہاشم سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے حیات القلوب میں اس کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے ایک سو اٹھانوے میل بتلایا ہے۔ اس مقام سے ذرا ہٹ کر ایک مسجد ہے جس کا نام مسجد شجرہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں یہاں ایک درخت تھا۔ اس کے نیچے آپ نے احرام باندھا تھا۔ پھر اس جگہ مسجد بنا دی گئی۔ افضل اور اولیٰ یہی ہے کہ سنت کے مطابق احرام اسی مسجد سے باندھا جائے، اگرچہ یہ ذوالحلیفہ کے ابتدائی حصہ کے بعد ہے اور عام مواقیت میں افضل یہ ہوتا ہے کہ میقات کے ابتدائی حصہ پر احرام باندھا جائے تاکہ پوری میقات پر اس کا گذر بحالت احرام ہو جائے۔ مگر ذوالحلیفہ بوجہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سے مستثنیٰ ہے کہ وہاں ابتداءِ ذوالحلیفہ کے بجائے مسجد شجرہ سے احرام افضل ہے۔

سید نورالدین سمہودی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ میں نے مسجد نبوی سے مسجد شجرہ تک ہاتھ سے پیمائش کی تو مسجد نبوی کے دروازے باب السلام سے مسجد شجرہ تک انیس ہزار سات سو تینتیس (۱۹۷۳۳) ہاتھ پایا۔ حاشیہ ارشاد الساری میں یہ قول نقل کر کے لکھا ہے کہ اس لحاظ سے یہ فاصلہ پانچ میل سے کچھ کم ہوا کیونکہ میل ہمارے نزدیک چار ہزار ذراع کا ہوتا ہے۔ اس لوہے کے ذراع سے جو آج کل مستعمل ہے۔ (حاشیہ ارشاد ص ۵۴)

جحفہ:- یہ رابغ کے قریب ایک گاؤں تھا جس کو مہیعہ بھی کہا جاتا ہے۔ مکہ مکرمہ سے اس کے فاصلہ میں شدید اختلاف ہے۔ ارشاد الساری میں ملا علی قاری نے بتیس میل بتلایا ہے، اور حیات القلوب میں مخدوم ہاشم سندھی رح نے بحوالہ علامہ مرشدی بیاسی میل لکھا ہے اس طرح مراحل کے اعتبار سے فتح الباری شرح البخاری میں بحوالہ شرح مہذب نووی اس کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے تین مرحلے بتلایا اور شیخ عبداللہ بن سالم نے شرح بخاری میں مکہ مکرمہ تک پانچ منزل کا فاصلہ لکھا ہے اور مدینہ منورہ تک سات منزل۔ (حیات القلوب قلمی ص ۲۱)

غالباً وجہ اس اختلاف کی یہ ہے کہ جحفہ سے مکہ مکرمہ کے لئے راستے مختلف ہیں۔ کسی راستہ سے مسافت کم ہے کسی سے زیادہ۔ یہ گاؤں جحفہ یا مہیعہ عرصہ دراز سے ویران اور بے نشان ہو گیا ہے، اس لئے اس طرف آنے والے رابغ سے احرام باندھتے ہیں کیونکہ رابغ جحفہ سے کچھ پہلے ہے یہاں سے احرام باندھنے والا گویا اصل میقات سے کچھ پہلے احرام باندھتا ہے جو سب کے نزدیک

جائز ہے اس لئے احتیاط اسی میں ہے۔

اور رابغ ساحل سمندر پر مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کی طرف جانے والوں کے راستہ پر مشہور قصبہ ہے اور آج کل تو اچھا خاصہ شہر بن گیا ہے جس میں مسافروں کے قیام کے لئے بڑے بڑے ہوٹل اور قہوہ خانے وغیرہ ہیں۔

قرن المنازل:۔ یہ اہل نجد کا میقات ہے جس میں نجدِ یمن، نجدِ حجاز و نجدِ تہامہ شامل ہیں۔ لغتِ فقہ المُغرب میں ہے کہ یہ ایک پہاڑ کا نام ہے جو میدان عرفات کے اوپر ہے۔ اور شرح مصابیح میں ہے۔ بیضہ کی مانند ایک چکنا صاف اور مدور پہاڑ ہے، عرفات کے اوپر آیا ہوا ہے، اہل مکہ اور ان اطراف کے لوگ اس پہاڑ کو کرا بفتح الکاف کہتے ہیں) اور قاموس میں ہے کہ قرن اس پہاڑ کا نام بھی ہے اور اس کے متصل وادی کو بھی قرن کہتے ہیں اور اس وادی کے اندر ایک گاؤں جو طائف کے قریب ہے اس کو بھی قرن کہا جاتا ہے۔ (حاشیہ ارشاد الساری ص ۵۵)

البحرالرائق میں ہے کہ قرن کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے دو مرحلہ ہے، اور حیات القلوب میں مخدوم ہاشم سندھی نے بھی بحوالہ نہایہ شرح ہدایہ دو مرحلہ کا فاصلہ اور باقانی شرح ملتقی الابحر کے حوالہ سے بچاس میل کا فاصلہ تبلایا ہے (حیات القلوب قلمی ص ۲۱)

یلملم:۔ اہل یمن تہامہ کا میقات ہے۔ مکہ مکرمہ سے دو مرحلہ کے فاصلہ پر ایک پہاڑ کا نام ہے۔ اس زمانہ میں اس کو سعدیہ کہا جاتا ہے۔ علامہ عینی اور حافظ ابن حجر نے شرح بخاری میں اس کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے تیس میل لکھا ہے۔ (حیات القلوب ص ۲۱)

علامہ عینی نے لکھا ہے۔

قال ابن حزم هو جنوب مكة و منه الى مكة ثلاثون ميلاً۔

ابن حزم کہتے ہیں کہ یلملم مکہ مکرمہ کے جنوب میں ہے اور اس سے مکہ مکرمہ تک تیس میل کا فاصلہ ہے

(عمدہ ص ۱۴۰ ج ۵)

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

اور شیخ عبدالرحمٰن نجدی نے اپنی کتاب مفید الانام و نور الظلام ص ۷۰ ج اول میں اس کا فاصلہ چالیس میل تبلایا ہے۔ اور قسطلانی شرح بخاری، فتح القدیر شرح ہدایہ اور معجم البلدان وغیرہ میں میلوں کا فاصلہ تبلانے کے بجائے مرحلتین یا لیلتین کہا گیا ہے۔

ذات عرق :- اہل عراق کا میقات ہے۔ ایک گاؤں کا نام ہے جو عراق کی طرف سے عقیق کے بعد مکہ مکرمہ سے دو منزل کے فاصلہ پر تھا، آج کل ویران ہوگیا ہے۔ اس لئے اب اس کے بجائے عقیق سے احرام باندھا جاتا ہے کیونکہ ذات عرق کا صحیح تعین نہ رہا۔ عقیق سے احرام باندھنے میں اصل میقات سے کچھ پہلے احرام ہوگا۔ اسی میں احتیاط ہے۔

علامہ عابد مالکیؒ نے ہدایۃ الناسک میں فرمایا کہ ذات عرق مکہ مکرمہ سے دو مرحلے کے فاصلے پر طائف کے راستہ میں ایک گاؤں تھا جو اب ویران ہوگیا ہے، اس کا محل وقوع اس مقام کے قریب تھا جس کو آج کل سیل کہا جاتا ہے۔ (حاشیہ ارشاد الساری ص ۵۵)

قسطلانی نے شرح بخاری میں اس کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے بیالیس میل بتلایا ہے، اسی طرح فتح الباری شرح بخاری میں بیالیس میل کا فاصلہ لکھا ہے، ابن حجر مکی نے فرمایا کہ اس کا فاصلہ بھی مکہ مکرمہ سے دو مرحلہ کا ہے جیسا کہ قرن اور یلملم کا فاصلہ دو مرحلے ہیں۔

(حیات القلوب ومثلہ فی البحر)

مواقیت خمسہ کے احکام جو لوگ آفاق یعنی اطراف عالم سے آنے والے ان میقاتوں کے راستے سے گذرتے ہیں اگر وہ مکہ مکرمہ میں جانے کے مقصد سے ان مواقیت سے آگے حل صغیر کی طرف جائیں جو مواقیت کے اندر اور حرم سے باہر کے علاقے کا نام ہے تو ان پر لازم ہے کہ ان میقات سے حج یا عمرہ کا احرام باندھ کر آگے بڑھیں۔ بغیر احرام کے آگے بڑھنا گناہ ہے۔ جو ایسا کرے گا۔ اس کے ذمہ دم (قربانی) دینا واجب ہوگا۔ (ہدایہ۔ ارشاد الساری)

امام اعظم ابو حنیفہ رح کے نزدیک آفاق یعنی حل کبیر سے آنے والا جو شخص مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کا ارادہ کرے خواہ یہ ارادہ کسی دنیوی غرض تجارت یا عزیزوں سے ملاقات وغیرہ کی نیت سے کیا ہو۔ مگر بیت اللہ کی تعظیم کا تقاضہ یہ ہے کہ جب بھی وہ مکہ مکرمہ میں داخل ہو میقات سے حج یا عمرہ کا احرام باندھ کر داخل ہو اور بیت اللہ کا یہ حق ادا کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی شخص میقات سے آگے مکہ کی طرف بغیر احرام کے نہ بڑھے (ہدایہ)

امام شافعی رح کے نزدیک یہ پابندی صرف اس شخص کے لئے ہے جو عبادت حج یا عمرہ کے قصد سے مکہ مکرمہ کا ارادہ کر رہا ہے، کسی تجارتی غرض یا عزیزوں سے ملاقات یا تفریحی طور سے جانے والے پر احرام باندھ کر جانے اور کم از کم عمرہ ادا کرنے کی پابندی نہیں ہے۔

(فتح القدیر شرح ہدایہ)

یہ حکم توان لوگوں کے لئے ہے جو آفاق کے کسی علاقے سے آتے ہیں۔ مگر کسی میقات کے راستہ سے مکہ مکرمہ جانے کے لئے حل صغیر میں داخل ہوتے ہیں۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ جو لوگ ان پانچ میقاتوں میں سے کسی میقات پر نہیں گذرتے دوسرے راستوں سے حل صغیر پھر حرم میں داخل ہوتے ہیں ان کا کیا حکم ہے، کیا وہ اس پابندی ہی سے آزاد ہیں اور بغیر احرام کے حرم میں داخل ہو سکتے ہیں، اور اگر ان پر بھی یہ پابندی ہے تو ان کو کس جگہ سے احرام باندھنا واجب ہو گا۔ ملا علی قاری نے اپنے شرح مناسک میں اس کے متعلق فرمایا ہے۔

وتعيين هذه المواقيت ليست بشرط واما هو لمنع الاحرام قبلها الى الواجب عينها او حذوها اى محاذاتها ومقابلتها فمن سلك غير ميقات اى طريقا ليس فيه ميقات معين برا او بحرا اجتهد واحرم اذا حاذى ميقاتا منها اى من المواقيت المعروفة ومن حذو الابعد اولى فان الافضل ان يحرم من اول الميقات وهو الطرف الابعد عن مكة حتى لا يمر بشئ مما يقال ميقاتا غير محرم ولو احرم من الطرف الاقرب إلى مكة جاز باتفاق الا ربعة وإن لم يعلم المحاذاة فانه لا يتصور عدم المحاذاة فعلى مرحلتين من مكة كجدة المحروسة من طرف البحر (ارشاد الساری ص۵۶)

وقال فى حاشية قوله كجدة فانها على مرحلتين عرفيتين من مكة و ثلاث مراحل شرعية ووجهه ان المرحلتين اوسط المسافات والا فالاحتياط الزيادة كذا فى شرح نظم الكنز واقول لعل وجهه ايضا ان اقرب المواقيت الى مكة على مرحلتين عرفيتين من مكة فقدر بذلك۔

(الارشاد الساری ص ۵۶)

یہی مضمون دوسری تمام کتب فقہ میں مختصراً یا مفصلاً مذکور ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ کسی میقات معین کے اوپر سے نہیں گذرتے بلکہ درمیانی راستوں میں سے کسی راستہ سے مکہ مکرمہ کی طرف آتے ہیں، احرام کی پابندی ان پر بھی لازم ہے اور طریقہ ان کے لئے یہ ہے کہ وہ جس راستے سے حلِّ صغیر کے اندر داخل ہو رہے ہیں۔ اس راستہ کا جو حصّہ کسی میقات کی محاذات میں ہو اسی جگہ سے احرام باندھ لیں۔ اگر راستہ ایسا ہے کہ ایک سے زائد میقاتوں کی محاذات راستہ میں آتی ہے تو افضل یہ ہے کہ میقات ابعد کی محاذات سے احرام باندھیں۔ اور اگر اس سے آگے بڑھ کر قریبی میقات کی محاذات سے احرام باندھ لیا تو یہ بھی جائز ہے اور اصل بنیاد اس حکم کی صحیح بخاری کی وہ حدیث مذکورہ ہے جس میں اہل عراق نے یہی سوال حضرت فاروق اعظم رضؓ کے سامنے پیش کیا اور آپ نے ان کے جواب میں فرمایا۔

انظروا حذوها من طريقكم ثم حدّ لهم ذات عرق (بخاری)

اپنے راستہ سے ان کے محاذات دیکھو، پھر فاروق اعظم رضؓ نے (اس طریقے سے) ان کیلئے ذات عرق کو میقات مقرر فرمایا

اس میں حضرت فاروق اعظم رضؓ نے دوسرے راستوں سے گذرنے والوں کے لئے ایک ضابطہ بنا دیا کہ ان کا راستہ جو حلِّ صغیر میں داخل ہونے کا ہے۔ اس راستے پر جہاں کسی میقات کی محاذات آجائے وہی ان لوگوں کے لئے میقات کے حکم میں ہے۔ یہاں سے مکہ کی طرف آگے بڑھنا بغیر احرام کے جائز نہیں۔

پھر اس ضابطہ کی رو سے اہل عراق کے لئے ان کے راستہ کے اس حصہ کو میقات قرار دیا جو قرن المنازل کے محاذات میں ہے یعنی ذات عرق۔

محاذات میقات کس طرح معلوم کی جائے محاذات کے لغوی معنی مسامتت کے ہیں جس کی تشریح شیخ ابن حجر ہیثمی مکی نے تحفۃ المحتاج شرح منہاج میں بالفاظ ذیل کی ہے۔

(ومن سلك طريقاً لا ينتهي الى ميقات فان حاذى) بالمعجمة (ميقاتاً) اى سامته بان كان على يمينه او يساره

محاذات کا مطلب یہ ہے کہ میقات اس کے دائیں یا بائیں آجائے، سامنے اور پیچھے ہونے کا کوئی اعتبار نہیں۔

ولا عبرة بما امامه او خلفه ا ذ احرم

من محاذاته)

(تحفہ علی ہامش الحواشی الشروانیہ ص۴۲ ج ۴)

مطلب ظاہر ہے کہ محاذات سے مراد یہ ہے کہ میقات مکہ مکرمہ کی طرف جانے والے مسافر کی دائیں یا بائیں جانب آجائے۔ اور جب تک میقات اس کے آگے رہے تو محاذات نہیں ہوئی اور جب اس کے پیچھے پڑجائے تو محاذات سے تجاوز ہو گیا، مسائل نماز میں بھی محاذات کا یہی مطلب ہوتا ہے، اسی کتاب میں اس کے بعد فرمایا ہے۔

لم تجز مجاوزته) الی جهة الحرام (بغیر احرام) وخرج بقولنا الی جهة الحرم ما لو جاوزه یمنة او یسرة فله ان یؤخر احرامه لکن بشرط ان یحرم من محل مسافة ذلك المیقات کما قاله الماوردی وجزم به غیره وبه یعلم ان الجائی من الیمن فی البحر له ان یؤخر احرامه الی جدة لان مسافتها الی مکة کمسافة یلملم انتهی۔

عبارات مرقومہ سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ مسافر جب راستہ میں کسی میقات کی محاذات پر پہونچا مگر اس کو کسی وجہ سے اس میقات کے راستے سے مکہ مکرمہ کی طرف جانا نہیں ہے بلکہ اس کا راستہ کسی دوسری سمت سے ہے تو اس کے لئے اس محاذات پر احرام باندھنا واجب نہیں ہے بلکہ جس راستہ سے اس کو مکہ مکرمہ کی طرف جانا ہے اس راستے پر محاذات کو دیکھا جائے گا کیونکہ محاذات میقات سے بغیر احرام تجاوز کرنا جو شرعاً ممنوع ہے اس تجاوز سے مراد تجاوز الی جہۃ الحرم ہے دوسری کسی سمت میں تجاوز ممنوع ہونے کی کوئی وجہ نہیں جیسا کہ تحفہ کی عبارت مذکورہ سے واضح ہو گیا۔

اور غنیۃ الناسک میں مواقیت کی تعریف ہی اس طرح کی ہے۔

هی المواضع التی لا یجوز ان یتجاوزها الی مکة والحرم ولو لحاجة الا محرما۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ بلا احرام تجاوز ممنوع وہ ہے جو تجاوز الی الحرم ہو۔ دوسری کسی جہت کی طرف تجاوز ممنوع نہیں۔

دوسری بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ اس دوسری محاذات میں یہ ضروری ہے کہ اس محاذات سے مکہ مکرمہ کا فاصلہ کم سے کم اتنا ہی ہو جتنا اصل میقات سے فاصلہ ہے۔ مثلاً کوئی شخص یلملم کی محاذات سے جدّہ کی طرف بڑھا اور جدّہ کے راستے سے مکہ مکرمہ کی طرف جانے کا قصد کیا تو اس کو احرام اس جگہ باندھنا چاہیئے جہاں سے مکہ مکرمہ کا فاصلہ یلملم کے فاصلہ کے برابر ہو۔ اور حسب تصریح فقہاء یلملم کا فاصلہ بھی مکہ مکرمہ سے مرحلتین کا ہے اور جدہ کا فاصلہ بھی مرحلتین ہے تو دونوں فاصلے مساوی ہونے کی وجہ سے جدہ سے احرام باندھنا جائز ہوگا۔

محاذات کی یہ تفسیر لغوی معنی کے لحاظ سے بھی اقرب ہے اور فقہا کی تفسیر سے بھی اسی کی ترجیح ہوتی ہے۔ صاحب بدائع کی ایک عبارت سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے وہ یہ ہے۔

فاما اذا قصدها من طریق غیر مسلوك فانه یحرم اذبلغ موضعًا یحاذی میقاتًا من هٰذه المواقیت لانه اذحاذی ذلك الموضع میقاتًا من المواقیت صار فی حکم الذی یحاذیه فی القرب من مکة (بدائع ص۱۶۴ ج۲)

محاذات کی ایک دوسری تفسیر

علامہ والا ملا آخوند جان مرغینانی مہاجر مکی رح [illegible] لکھا ہے جس کی تاریخ تصنیف [illegible] ہے [illegible] میں [illegible] ہے۔ یہ رسالہ حضرت حاجی شیر محمد صاحب سندھی رح مہاجر مدنی نے احقر کو عطا فرمایا تھا۔ جو احقر کے پاس موجود ہے۔ اس رسالہ میں ان کی تحقیق یہ ہے کہ جس طرح حدود حرم کے ذریعہ تمام حلقہ حرم کی تعیین کی جاتی ہے کہ حد حرم سے دوسری حد تک ایک خط ملایا جائے اسی طرح تیسری چوتھی حدود سے باہم خطوط ملا کر ان خطوط کے درمیان جو رقبہ زمین آتا ہے وہ حرم کہلاتا ہے۔

اسی طرح مواقیت کے حلقے کو سمجھنا چاہیئے ایک میقات سے دوسرے میقات تک خط ملا کر یہ خط محاذات ہوگا۔ خط سے باہر آفاق اور خط کے اندر حل کہا جائے گا۔ اس خط محاذات سے بغیر احرام کے مکہ مکرمہ کی طرف تجاوز کرنا جائز نہیں ہوگا۔ اس کی شکل بھی رسالہ کے حاشیہ پر ایک مخمس کی صورت میں یہ دی ہے۔

قرن المنازل　ذات عرق　ذوالحلیفہ　یلملم　جحفہ　جدّہ　o
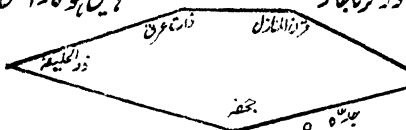
اس تغییر محاذات کے مطابق یلملم سے جو خط جحفہ کے ساتھ ملایا جائے گا۔ تو جدہ اس خط سے باہر کافی فاصلہ پر رہتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شہر جدہ سے بھی آگے، بحرہ کے قریب تک بلا احرام جا سکیں۔ محاذات کی یہ تغییر اگرچہ قواعد محاذات کی رو سے تو معقول ہے مگر فقہا کے کلام میں اس کی تائید نہیں ملتی بلکہ اس کے خلاف یہ تصریحات اوپر گذر چکی ہیں کہ اہل یمن و بلاد مشرق کے باشندے جب جدّہ کی طرف سے داخل حل ہوں تو ان پر یہ پابندی لازم ہے کہ جس قدر مسافت یلملم کی مکہ مکرمہ سے ہے اسی قدر مسافت اس طرف سے بھی ہونی چاہئے مثلاً دو مرحلتین ہے تو ادھر سے بھی مرحلتین کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے ضروری ہے اور وہ جدّہ پر ہی ہو سکتا ہے جدّہ سے آگے نہیں۔

واملاّ اخوند جان کی عبارت اس کے متعلق یہ ہے۔

ظاہر ان المسجد مشتمل على البيت وحواليه من كل جهة، ومكة مشتمل بهما والحرم مشتمل بالثلاثة ممتد من كل جهة الى الحلّ الصغير المحيط بالحرم ولا شك ان الحرم غير مختص بالعلامات الموضوعة في الطريق بل هو السطح الممتد من كل جهة قريباً وبعيداً ولا يتوهم احد ان الحرم المكانات المتصلة بالعلامات فقط وكل عاقل يفهم ان الاماكن بين العلامات من ارض الحرم مثلا العلامة عند التنعيم الى العلامة عند حديبية كلها حرم لا يقتل صيده ولا يقطع شجره۔

ثم الحل الصغير يبتدء من اطراف الحرم من كل جهة الى المواقيت كانها مخمسة الشكل والحل الصغير بين الحرم والحل الكبير الذي هو جميع الآفاق والمواقيت بعض اجزاء الحلّ ولهذا يجوز لاهلها تاخير الاحرام الى قريب حد الحرم كما يجوز لاهل الحل الصغير (الى قوله) فتحصل من ذلك ان حدود الحرم اى المواقيت مثل الحرم المحيط بما في جوفه مثل الخطوط الممتدة بين النقاط فكما ان النقاط مواقيت فكذلك الخطوط بينها والا لجاز الدخول الى الحرم بلا احرام من بين المواقيت۔

(رسالہ اخوند جان ص ۱۶۳ طبع تاشقند)

آج کل ان ممالک
پاکستان۔ ہندوستان اور مشرقی ممالک سے آنے والوں کا میقات
مشرقیہ سے آنے

والے حجاج کے لئے راستے دو ہیں، ایک ہوائی دوسرا بحری، ہوائی جہازوں کا راستہ عموماً خشکی کے اوپر سے براہ قرن المنازل ہوتا ہے۔ ہوائی جہاز قرن منازل اور ذات عرق دونوں میقاتوں کے اوپر سے گذرتے ہوئے اول حِلّ میں داخل ہو جاتے ہیں اور پھر جدہ پہنچتے ہیں۔ اس لئے ہوائی سفر میں تو قرن المنازل کے اوپر آنے سے پہلے پہلے احرام باندھنا لازم و واجب ہے۔ اور چونکہ ہوائی جہازوں میں اس کا پتہ چلنا تقریباً ناممکن ہے کہ کس وقت اور کب یہ جہاز قرن المنازل کے اوپر گذرے گا اس لئے اہل پاکستان اور ہندوستان کے لئے تو احتیاط اسی میں ہے کہ ہوائی جہاز میں سوار ہونے کے وقت ہی احرام باندھ لیں۔ اگر بغیر احرام باندھے ہوئے ہوائی جہاز کے ذریعہ جدہ پہونچ گئے تو ان کے ذمہ دم یعنی قربانی ایک بکرے کی واجب ہو جائے گی اور گناہ اس کے علاوہ ہوگا۔ جس کی وجہ سے حج ناقص رہ جاتا ہے مقبول نہیں ہوتا۔ بہت سے حجاج اس میں غفلت کرتے ہیں۔

چین، انڈونیشیا، جاوا وغیرہ کے ہوائی جہاز بھی اگر خشکی پر پرواز کریں تو ان کا بھی یہی حکم ہے ہاں اگر ان کے جہاز خشکی کے بجائے سمندر کے اوپر سے پرواز کر کے جدہ پہونچیں تو ان کا حکم وہ ہوگا جو بحری جہاز سے آنے والوں کا ابھی لکھا جائے گا۔

مشرقی ممالک کے لئے دوسرا راستہ بحری سفر کا ہے۔ اس راستہ سے جانے والے بحری جہاز قدیم زمانے میں تو یلملم کے ساحل پر اترتے تھے جو یمن کا ایک حصہ ہے اور اہل یمن کی طرح وہ بھی میقات یلملم سے گذر کر حل میں پھر حرم اور مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے تھے، اسی لئے عام فقہاء کی تصریحات بھی ہیں کہ ہندوستان پاکستان اور تمام بلاد مشرق کا میقات یلملم ہے۔ لیکن مدت دراز سے یہ ساحل متروک ہو گیا اب بحری جہاز یہاں نہیں ٹھہرتے۔ بلکہ ساحل یلملم سے پندرہ بیس میل کے فاصلہ پر محاذات یلملم سے گذرتے ہوئے سمندر ہی میں آگے بڑھ جاتے ہیں اور ساحل جدہ پر قیام کرتے ہیں۔ جدہ ہی سے سب مسافر مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔

اس صورت میں یہ تو ظاہر ہے کہ ان ممالک سے بحری جہازوں پر آنے والے مسافروں کے راستے میں عین میقات تو کوئی پڑتا نہیں البتہ محاذات میقات یلملم سے دو جگہ ہوتی ہے، ایک درمیان

سفر یلملم کے مقابل سے گذرتے ہوئے دوسرے سفر کے اختتام پر جدّہ میں، سابقہ تحریر میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ کسی میقات یا اس کی محاذات سے بلا احرام تجاوز کرنا جو ممنوع و ناجائز اور موجب دم ہے وہ اس وقت ہے جبکہ یہاں کا تجاوز الی جہۃ الحرم ہو اور اگر اس محاذات سے سمندر ہی میں آگے بڑھتا ہوا آفاق ہی کے اندر سفر کرے تو یہ تجاوز عن المیقات اور موجب دم نہیں ہو گا جیسا کہ تحفہ شرح منہاج کے حوالے سے اس کی تصریح پہلے آ چکی ہے جس کے بعض الفاظ یہ ہیں۔

وخرج بقولنا الی جہۃ الحرم ما لو جاوزہ یمنۃ او یسرۃ فلہ ان یؤخر احرامہ لکن بشرط ان یحرم من محل مسافتہ الی مکۃ مثل مسافۃ ذلک المیقات کما قالہ الماوردی وجزم بہ غیرہ وبہ یعلم ان الجائی من الیمن فی البحر لہ ان یؤخر احرامہ من محاذاۃ یلملم الی جدہ لان مسافتہا الی مکۃ کمسافۃ یلملم کما صرحوا بہ (تحفہ علی ہامش الحواشی الشروانیہ ص۴۸ ج۴)

اس کا حاصل یہ ہے کہ مشرقی ممالک سے بحری جہازوں پر آنے والوں کے لئے محاذات یلملم پر احرام باندھنا واجب نہیں ہاں کوئی پہلے ہی احرام باندھے تو افضل ہونے میں شبہ نہیں کیونکہ میقات سے جتنا پہلے کوئی احرام باندھے اتنا ہی ثواب زیادہ ہے۔

اب قابل غور سوال یہ رہ جاتا ہے کہ جب ان لوگوں پر محاذات یلملم سے احرام باندھنا واجب نہ ہوا تو پھر کس جگہ سے احرام باندھنا واجب ہو گا۔ جہاں سے تجاوز بلا احرام جائز نہیں۔

جدّہ سے احرام باندھنے کا مسئلہ

یہ بات اوپر واضح ہو چکی ہے کہ ہوائی جہاز کے ذریعہ خشکی کے اوپر سے جدہ پہونچنے کے لئے میقات قرن المنازل اور میقات ذات عرق کے اوپر سے گذرنا ہوتا ہے اس لئے ہوائی جہاز کے مسافروں کو بلا احرام جانا جائز نہیں، پاکستان، ہندوستان والوں کے لئے ضروری ہے کہ اپنے ہوائی جہاز میں سوار ہونے کے وقت ہی احرام باندھ لیں۔

البتہ غور طلب مسئلہ بحری جہازوں کا اور ان کے مسافروں کا ہے کہ جب میقات یلملم کی محاذات سے احرام واجب نہ ہوا تو اب کہاں واجب ہو گا۔

۔ والا اخوند جان کی تحریر کے مطابق تو یہ مقام جدّہ شہر سے بھی کچھ آگے چل کر آئے گا۔ مگر فقہاء

کی تصریحات اس سے مختلف ہیں۔ عام فقہاء کے نزدیک جدہ کی طرف سے جانے والے مشرقی مسافروں کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس مقام پر احرام باندھیں جس کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے اس فاصلہ سے کم نہ ہو جو یلملم اور مکہ مکرمہ کے درمیان ہے۔ اب یہ مقام کون سا ہوگا اس کے متعلق علامہ ابن حجر مکی کی کتاب تحفہ شرح منہاج کے حوالہ سے یہ تصریح ابھی گذر چکی ہے کہ یہ مقام جدہ ہے کیونکہ مسافت جدہ کی مکہ مکرمہ سے اتنی ہی ہے جتنی یلملم کی مکہ مکرمہ سے ہے۔

لہ ان یوخر احرامہ من محاذات یلملم الی جدۃ لان مسافتھا الی مکۃ کمسافۃ یلملم۔

علامہ ابن حجر مکی کی تصریحات بالا سے تو یہ معلوم ہوا کہ حقیقی محاذات اس طرف سے معلوم کرنے کا طریقہ ہی یہ ہے کہ مسافت مرحلتین کا اعتبار کیا جائے جس طرح یلملم سے مکہ مکرمہ دو مرحلے پر ہے اسی طرح جدہ سے دو مرحلہ ہے اس لئے مسافت برابر ہونے کی وجہ سے جدہ ہی محاذات یلملم قرار دیا جائے گا۔

فقہاء حنفیہ میں حضرت ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کسی قدر فرق کے ساتھ اس کی موافقت فرمائی وہ یہ کہ اگر حقیقی محاذات کا علم نہ ہو تو پھر دو مرحلے کی مسافت کا اعتبار کر کے جدہ ہی کو بحکم میقات سمجھا جائے گا۔ ان کے الفاظ مناسک ملا علی قاری میں یہ ہیں۔

وان لم یعلم المحاذاۃ فعلی مرحلتین من مکۃ کجدۃ المحروسۃ من طرف البحر۔ (ارشاد الساری ص۵۶)

اسی طرح غنیۃ الناسک میں بحوالہ طوالع لکھا ہے۔

وان لم یعلم المحاذات فعلی مرحلتین عرفیتین من مکۃ کجدۃ من طرف البحر فانھا علی مرحلتین عرفیتین من مکۃ وثلث مراحل شرعیۃ لطوالع (غنیۃ الناسک ص۲۶)

اسی طرح فقیہ العصر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اب سے پچاس سال پہلے ۱۳۲۸ھ میں یہی فتویٰ دیا تھا۔ کہ حقیقی محاذات معلوم نہ ہونے کے سبب جدہ ہی کو میقات قرار دیا جائے گا۔

امداد الفتاوی تتمہ خامسہ طبع قدیم کے ص ۴۹ پر اور طبع جدید کی جلد دوم ص ۱۴۰ میں ان کا یہ ارشاد بالفاظ ذیل منقول ہے۔

> حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سے عرض کیا کہ مدینہ کا راستہ بند ہونے کی صورت میں حج کا احرام کہاں سے باندھے گا تو اس کے جواب میں فرمایا کہ حج بدل کا احرام جدہ سے ہوگا۔ مناسک ملا علی قاری میں عبارت موجود ہے۔ وان لم یعلم المحاذات فعلی مرحلتین من مکۃ کجدۃ المحروسۃ من طرف البحر۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اہل ہند کے لئے یلملم کی محاذات کسی معتبر طریقے سے نہیں ہوتی لہذا جدہ ان کے لئے میقات ہے
>
> ۱۷ شعبان ۱۳۲۸ھ

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی دامت برکاتہم جو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ ان سے زبانی بھی اس کی تصدیق ہوئی کہ حضرت مولانا موصوف اہل ہند کے لئے بحری جہاز سے آنے کی صورت میں جدہ ہی کو ان کا میقات قرار دیتے تھے۔ یہ تمام اقوال سابقہ اس پر تو متفق ہیں کہ مکہ مکرمہ کی مسافت یلملم اور جدہ سے مساوی یعنی مرحلتین ہے علامہ ابن حجر مکی اس مرحلتین کو عین محاذات قرار دے کر جدہ سے احرام کو جائز لکھتے ہیں۔ اور ملا علی قاری اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ اس بنا پر جدہ کو قائم مقام محاذات کا قرار دیتے ہیں کہ اصل محاذات کا علم نہیں۔ اس لئے مسافت کا اعتبار کرکے مکہ مکرمہ سے دو مرحلہ پہلے احرام باندھنا واجب ہے اور جدہ چونکہ دو مرحلہ کی مسافت پر ہے اس لئے جدہ سے احرام باندھنا صحیح ہوگا۔

ان تمام عبارات مرقومہ سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ حضرات فقہاء نے اس مسافت کی تعیین میں میلوں کی کمی بیشی کا اعتبار نہیں کیا بلکہ مراحل کا اعتبار کیا ہے اور مراحل کی مسافت میلوں کے اعتبار سے کم و بیش ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فتح الباری و عمدۃ القاری میں بحوالہ ابن حزم یلملم کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے تیس میل لکھا ہے، اور بعض علماء نے چالیس میل بھی فرمایا ہے اور آجکل کے پیمائش کرنے والوں نے باون تک بتلایا ہے۔ پھر اسی کو سب نے مرحلتین بھی فرمایا ہے۔ اور قرن المنازل کا فاصلہ میلوں کے اعتبار سے مخدوم ہاشم سندھی رحنے حیات القلوب میں بحوالہ باغافی

شرح الملتقی الابحر پچاس میل تبلایا ہے اور اس کو بھی تمام فقہار نے مرحلتین ہی فرمایا ہے کما فی البحر الرائق ــــ اسی طرح ذات عرق کو بھی مکہ کرمہ سے دو مرحلہ پر لکھا ہے۔ ارشاد الساری ص ۵۵ والنووی شرح مسلم۔ تحفۃ ابن حجر مکی۔ اور میلوں میں اس کا فاصلہ قسطلانی اور فتح الباری شرح بخاری میں بیالیس میل تبلایا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ میلوں کے اعتبار سے فاصلوں کی کمی بیشی کا اعتبار نہیں کیا گیا ہے تیس میل کو بھی دو مرحلے قرار دیا۔ پچاس میل کو بھی بیالیس میل کو بھی۔ اور اعتبار مراحل کا کر کے ان کی مسافتوں کو مکہ کرمہ سے مساوی قرار دیا گیا ہے۔

جدّہ کو میقات اہل یمن و اہل مشرق قرار دینا اسی اصول پر مبنی ہے کہ مسافت مرحلتین پر ہے اب میلوں کے اعتبار سے کتنا ہے اس کی تحقیق ضروری نہیں رہی۔ آج کل کی پیمائش کے اعتبار سے جدّہ کا فاصلہ مکہ کرمہ سے تقریباً چھیالیس میل ہے۔

میقات یلملم کے فاصلہ میں اختلاف کی وجہ

یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ فقہار کے نزدیک اس جگہ مسافت میں مراحل کا اعتبار ہے۔ میلوں کی کمی بیشی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تاہم میلوں کا فاصلہ بھی اکثر فقہار و علمار لکھتے چلے آئے ہیں۔ شرح بخاری عمدۃ القاری، فتح الباری وغیرہ میں تو بحوالہ ابن حزم یہ فاصلہ تیس میل تبلایا ہے اور شیخ عبداللہ بن عبدالرحمٰن نجدی نے اپنی کتاب مفید الانام و نور الظلام ص ۵۷ ج ۱ میں یہ فاصلہ چالیس میل کا لکھا ہے۔ اور آج کل بعض اہل حق نے یہ فاصلہ باون میل کا تبلایا ہے اس اختلاف کا اصل منشا موجود ہے جو تحفہ شرح منہاج کے حاشیہ میں شیخ عبدالحمید شروانی نزیل مکہ کرمہ نے بتلایا ہے ان کے الفاظ یہ ہیں۔

وقد علمت ان یلملم جبل محاذ للسعدیۃ وسمعت ان بحذاء السعدیۃ جبلین احدھما بین طرفیھا المحاذی لمکۃ وبین مکۃ اکثر من مرحلتین والثانی ممتد لجھۃ مکۃ بینہ وبین مکۃ باعتبار طرفہ الذی بجھتھا مرحلتان فاقل۔

(حواشی شروانیہ ص ۴۲ جلد چہارم)

کے درمیان اُس کا محل وقوع بھی سامنے رکھ لیا جائے تو [illegible] کی کوئی
توجیہ اس کے سوا نہیں کی جا سکتی کہ ہماری [illegible]
محروم کر کے ہمیں یہاں تک پہونچایا ہے۔ [illegible]

ان ہی دنوں میں حضرت عمرو بن العاص کی ایک [illegible]
نے مجمع الزوائد میں طبرانی کے حوالہ سے سند کی توثیق کے ساتھ نقل کیا ہے [illegible]
یہ ہے کہ اسلامی لشکر جب حضرت عمرو بن عاص ہی کی قیادت [illegible]
وہاں کے حاکم کا پیغام آیا کہ بات کرنے کے لیے کوئی نمائندہ بھیجو [illegible]
میں نے خود ہی جانا مناسب سمجھا ۔ اُس نے [illegible]
ہو اور کیوں آئے ہو؟ — میں نے بتایا کہ ہم اصلاً عرب [illegible]
حالات اتنے خراب تھے اور ہم اتنے پسماندہ تھے کہ مردار کھا جاتے تھے اور لوٹ مار ہمارا مشغلہ
تھا — ہم میں ایک آدمی ہم ہی میں سے اُٹھا، اُس نے کہا کہ مجھے اللہ نے نبی بنایا ہے اور تمہارے
لیے اُس کے یہ احکام ہیں —— ہم نے طویل مدت تک [illegible] مخالفت کی [illegible] ہماری
جنگیں بھی ہوئیں لیکن آخر کار غلبہ اسی کو حاصل ہوا۔ پھر ہم نے بھی سمجھ لیا کہ یہ واقعۃً خدا کا رسول
ہے اور جو دین لے کر آیا ہے یہ خدا کا دین ہے ......

حضرت عمرو بن عاص فرماتے ہیں کہ اسکندریہ کے حاکم نے میری پوری بات سُن کر کہا۔
میں بھی سمجھتا ہوں کہ تمہارے ہاں کا وہ آدمی خدا کا سچا رسول تھا، ہماری قوم میں بھی اللہ کے رسول
کبھی ایسے ہی احکام لے کر آئے تھے، کچھ مدت تو قوم ان کی پیروی کرتی رہی، پھر جابر ... بادشاہ
فرمانروا پیدا ہوئے جنہوں نے نبیوں کی ہدایات اور احکام کی فرمانبرداری کے بجائے خواہشات
کی پیروی کا طریقہ اپنالیا۔ تم میری یہ بات یاد رکھنا کہ جب تک تم لوگ اس
نبی کے احکام پر چلتے رہوگے اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں تمہیں غلبہ

---

۱ یہ عمرو بن عاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے دشمنوں میں تھے۔ قریباً ۲۰ سال تک ان کا یہی حال رہا
صلح حدیبیہ کے بعد خود مدینہ طیبہ حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوئے ۱۲

اور کامیابی حاصل ہوتی رہے گی اور جب تمہارا وہ حال ہو جائے گا جو ہمارا ہو چکا ہے یعنی جب تم اپنے نبی کی ہدایت کے بجائے خواہشات کی پیروی کرنے لگو گے تو اللہ تمہاری مدد سے ہاتھ اٹھا لے گا اور تمہیں اور ہم جیسے دوسرے لوگوں کو باہم نمٹنے کے لیے چھوڑ دے گا پھر تم کوئی برتری حاصل نہ کر سکو گے۔"

بلاشبہ اسکندریہ کے اس حاکم نے حضرت عمرو بن العاص سے جو یہ آخری بات کہی تھی وہ کتب قدیمہ اور پیغمبروں کے لائے ہوئے علم ہی کا ایک حصہ تھی اور اُمت مسلمہ صدیوں سے اس کی سچائی کا تجربہ کر رہی ہے ـــــ مگر عجب حال ہے پورے عالم اسلام کا ' اور خاص کر عربوں کا 'جس ایمانی اور تاریخی حقیقت کا اوپر کی سطروں میں ذکر کیا گیا ہے اس کو عام طور سے تسلیم کیا جاتا ہے تقریروں اور تحریروں میں اس کا تذکرہ بھی کیا جاتا ہے لیکن جس طرح دوسری اسبابی تدبیروں کے لیے عملی جد و جہد کی جاتی ہے 'منصوبے بنائے جاتے ہیں ' مہمیں چلائی جاتی ہیں 'اس طرح اُمت میں ایمان اور ایمانی زندگی کو عام کرنے اور برپا کرنے کے لیے کوئی مہم نہیں چلائی جاتی۔ حالانکہ دوسری مادی اور اسبابی تدبیروں کی کامیابی بھی اس پر موقوف ہے۔ یہ ان تدبیروں کے لیے بمنزلہ روح کے ہے 'اس کے بغیر ساری تدبیریں اور کوششیں اسی طرح بے جان رہیں گی جس طرح اب تک بے جان رہی ہیں۔

معذرت

افسوس ہے کہ کئی ماہ سے الفرقان کی اشاعت میں بہت بے قاعدگی چل رہی ہے، زیر نظر شمارہ رمضان و شوال کا مشترک شمارہ ہے۔ اس کے باوجود تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ اب اس بے قاعدگی کو دور کرنے کے لیے آئندہ شمارہ بھی ذی قعدہ اور ذی الحجہ کا مشترک ہی شائع ہوگا۔ صفحات کی کمی کے لیے ہم اپنے خریداروں سے معذرت خواہ ہیں۔

منیجر

قرآن آپ سے — کیا کہتا ہے؟
از تالیف — مولانا محمد منظور نعمانی
بلاشبہ قرآن مجید کی دعوت و تعلیم پوری انسانیت کے لئے آبِ حیات ہے،
لیکن ہماری دنیا اس سے نا آشنا ہے یہاں تک کہ اسکو "کلامِ الٰہی" ماننے والی
اُمت کی غالب اکثریت بھی اس سے بیگانہ ہے
یہ کتاب
اسی صورتِ حال کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے۔
یہ قرآنی دعوت اور اسکی اہم تعلیمات کا ایک جامع خلاصہ ہے۔
جسمیں ۶۰ عنوانات کے تحت متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اور روح پرور تشریحات کیساتھ جمع کیا گیا ہے
خاص طور پر قرآن کی دعوتِ توحید کا بیان اس کتاب کا شاہکار ہے۔
یہ بالکل ایک نئے طرز کی کتاب ہے، جو قرآن کی دعوت سے روشناسی کے ساتھ ساتھ
قرآن کے اعجازِ بیان کا بھی لذت شناس کرتی ہے۔
نہایت اعلیٰ کتابت و طباعت، عمدہ کاغذ، ۴۰۲ صفحات، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۴/-
کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

Price Rs. 5/-

Regd. No L-353

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow

VOL. 36 NO. 9 10 [illegible] 1ST FABRUARY 1969

ROLEX | رولکس

OMEGA | اومیگا

WEST END | ویسٹ اینڈ

CITIZEN | سٹی زن

SARGENT | سارجنٹ

FAVRE-LEUBA | فیورلوبا

ROAMER | رومر
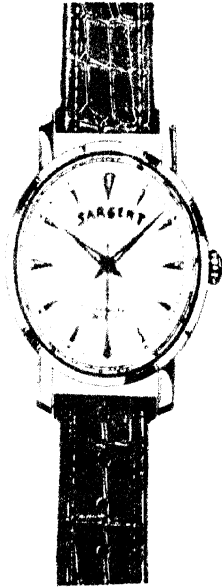
مکۃ المکرمہ ومدینۃ المنورہ میں

حج و زیارت کے لئے جب خدا
آپ کو لائے اور گھڑی کی ضرورت
محسوس ہو تو باک محل کے
کسی بھی شوروم میں تشریف لا کر
قسم کی گھڑیاں نئے ڈیزائنوں
میں بارعایت خرید فرمائیں۔ اپنے آنیوالے دوست احباب کو پتہ نوٹ کروا دیں

مرتبہ

عتیق الرحمٰن سنبھلی

پکوان کے
عمدہ تیلوں میں
آپ کی خاص پسند۔
پوسٹ مین برانڈ
صاف کیا ہوا مونگ پھلی کا تیل
۱، ۲، ۴ اور ۵ر۱۵ کیلو
عمدہ وناسپتی
۱، ۲، ۴ اور ۵ر۱۶ کیلو
تلولا، تل کا تیل
۲، ۴ اور ۵ر۱۵ کیلو
برانڈ خالص ناریل کا تیل
۲، ۴ اور ۱۹ کیلو
کوکوجار
صاف کیا ہوا ناریل کا تیل
۲، ۴ اور ۵ر۱۵ کیلو
امی سلاڈ تیل
۲، ۴ اور ۵ر۱۵ کیلو
احمد ملز، بمبئی ۸

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ... ۵۰/۷
پاکستان سے ۵۰/۷

ششماہی
ہندوستان سے ۴/-
پاکستان سے ۴/-

خاص اس اشاعت کی قیمت
ایک روپیہ ۱۰ پیسے

جلد ۳۶	بابت ماہ ذیقعدہ و ذی الحجہ ۱۳۸۸ھ مطابق فروری و مارچ ۱۹۶۹ء	شمارہ ۱۱-۱۲

اگر اس دائرہ میں سُرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ر مارچ تک آجائے، ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی، پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دیدیں، ڈاک خانہ کی رسید بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲ر تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اسکی اطلاع ۲۰ر تاریخ تک آجائے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

سخنہائے گفتنی

اس شمارہ پر "الفرقان" کی عمر کے ۳۶ سال پورے ہوگئے اور اس کی چھتیسویں جلد مکمل ہوگئی ——— اللّٰھم لک الحمد ولک الشکر ———

ان ۳۶ سالوں میں سے پہلے ۱۰ سالوں میں (یعنی ۱۳۷۰ھ تک) تحریر و ادارت کی ذمہ داری اس عاجز ہی پر رہی۔ جو احباب میرے حالات سے اچھی طرح واقف ہیں وہ تو جانتے ہیں لیکن دوسرے حضرات اس واقعہ کے اظہار کو شاید تصنع یا انکسار سمجھیں کہ مجھے فطری طور پر لکھنے سے مناسبت نہیں ہے۔ جو کچھ لکھتا ہوں بڑی مشکل سے اور گویا زبردستی لکھتا ہوں، اس لیے الفرقان کے ابتدائی ۱۰۔۲۰ سالوں میں بس گاڑی کسی طرح گھسیٹی جاتی رہی (اور صرف اسلئے گھسیٹتا رہا کہ میں اللہ کے بندوں کو اسکے ذریعہ بات پہونچانا چاہتا تھا)۔۔۔ اسکے بعد مولوی عتیق الرحمٰن سلمہ اپنی تعلیم پوری کر کے آ گئے اور انھوں نے اس کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اگرچہ عرصہ تک اسکے بعد بھی مدیر کی حیثیت سے اس پر میرا ہی نام رہا لیکن درحقیقت ادارت و تحریر کی پوری ذمہ داری بلکہ اسکے علاوہ بھی دوسری قسم کی اسکی ساری ذمہ داریاں انھوں نے سنبھال لیں اور میں اسکی طرف سے بالکل فارغ اور سبکدوش ہوگیا۔ ناظرین کرام کو یاد ہوگا اکثر و بیشتر ایسا ہوتا تھا کہ میری زیر تصنیف کتاب "معارف الحدیث" کے چند صفحات کے سوا "الفرقان" میں میرا لکھا ہوا کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ اسی طرح اس کے مالی معاملات سے بھی میں بے تعلق ہوگیا ——— لیکن اللہ کی مشیت اب سے ۵۔۶ سال پہلے (۱۳۸۳ھ میں عمر کے چھتیسویں ہی سال میں) انھیں شدید ضعفِ اعصاب کی شکایت لاحق ہوگئی اور اسوقت سے ابتک انکی صحت بحال نہیں ہوسکی۔ کئی کئی مہینے اس حال میں گزر جاتے ہیں کہ ایک صفحہ بھی نہیں لکھ سکتے۔ ختم ہونیوالا یہ پورا سال (۱۳۸۸ھ) قریب قریب اسی حال میں گزر گیا اور مجھے وہ بوجھ پھر اٹھانا پڑ گیا جس کا میں بالکل عادی نہیں رہا تھا۔ اسی وجہ سے اس میں ہر لحاظ سے انحطاط رہا، نظامِ اشاعت میں بھی ابتری رہی اور قدرتی طور پر اس کا اثر اشاعت پر بھی پڑا جسکی وجہ سے آمد و صرف میں وہ توازن نہیں رہا جو پرچہ کے زندہ اور جاری رہنے کیلئے عالمِ اسباب میں ضروری ہے۔

مولوی عتیق الرحمٰن کی رائے اپنی معذوری کی بنا پر یہ ہوگئی تھی کہ فی الحال اسکی اشاعت بند کر دی جائے اور خریداروں کا حساب بیباق کر دیا جائے لیکن اس عاجز کا احساس یہ ہے کہ اسکے جو قدردان خریدار اور ناظرین اسکو دین کا خادم اور داعی سمجھ کر معیار کے انحطاط اور نظامِ اشاعت کی ابتری کے باوجود اس سے اپنا تعلق قائم رکھے ہوئے ہیں ان کا یہ تعلق اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے جس کا شکر واجب ہے اور اس کا حق ہے کہ اسکو زندہ اور جاری رکھنے کیلئے جو تکلیف بھی اٹھانی پڑے اپنے امکان کی حد تک اٹھائی جائے اور اللہ تعالیٰ سے امید رکھی جائے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے اس موجودہ حال کو جلد ختم فرما دے گا۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝

آئندہ کیلئے ایک نیا انتظام سوچا گیا ہے۔ امید کی جا سکتی ہے کہ شروع ہونیوالے سال ۱۳۸۹ھ میں اسکی حالت انشاءاللہ ہر لحاظ سے گزرنے والے سال ۱۳۸۸ھ سے بہتر رہے گی۔ والامر بید اللہ تعالیٰ ——— ناظرین کرام سے استدعا ہے کہ مولوی عتیق الرحمٰن کی بحالیِ صحت کیلئے اور الفرقان کے حالات کی درستی کیلئے بھی دعا فرمائیں ——— والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

محمد منظور نعمانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

ـــــ محمد منظور نعمانی

سید مظہر احسن گیلانی، حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی علیہ الرحمہ کے چھوٹے بھائی ہیں۔ عثمانیہ یونی ورسٹی (حیدرآباد) کے شعبۂ معاشیات سے وابستہ ہیں ـــــ گزشتہ شمارہ کے ان ہی صفحات میں اسی عنوان کے تحت جو کچھ لکھا گیا تھا، اس کو پڑھ کے انھوں نے راقم سطور کے نام اپنے خط میں لکھا ہے۔

"آپ نے قرآنی آیات نقل کر کے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت دونوں میں اپنے ایمان والے بندوں کی مدد کرتا ہے، شرط یہ ہے کہ وہ صرف نام کے نہیں بلکہ اعمال و اخلاق کے لحاظ سے بھی ایمان والے ہوں، مگر ہم نے اپنی غفلت شعاری اور بد اعمالیوں سے اپنے کو نصرتِ الٰہی سے محروم کر رکھا ہے ـــــ افسوس قرآن پاک کے ایسے کھلے ہوئے وعدوں اور اعلانوں کے باوجود ملت ذلت اور پستی کی وادیوں میں بھٹک رہی ہے، عجیب بدقسمتی ہے ـــــ آج سے اکیس (۲۱) سال پہلے میرا ایک مضمون چھپا تھا، اُس میں یہی بات کہی گئی تھی اور یہی قرآنی دعوت دی گئی تھی مگر جو حالات اُس وقت تھے (۱۹۴۸ء) اُس کے پیش نظر میں نے آخر میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے مسلمان بھائی اپنی فلاح و بہبود کے لیے سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہیں، مثلاً جلسے، جلوس، دستخطی مہم، پارٹی سازی، نعرے بازی، شور و ہنگامہ وغیرہ وغیرہ۔ مگر نہیں کریں گے تو صرف ایک کام یعنی خدا کی طرف پلٹنا اور صلاح و تقوے والی زندگی اختیار کرنا ـــــ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ ہم سب کچھ کر سکتے ہیں اور سب کچھ کریں گے، لیکن صرف یہ ایک کام ہم سے نہیں ہو سکے گا کہ اپنے کو احکام الٰہی کا فرماں بردار اور تابعدار بنا دیں، اور اگر فلاح و کامرانی اسی پر منحصر ہے تو پھر۔ ع

یہی ٹھہری جو شرطِ وصلِ لیلیٰ　　تو استعفا مرا با حسرت و یاس

حالانکہ جیسا کہ آپ نے لکھا ہے قرآن پاک بھی پکار پکار کے کہہ رہا ہے اور ہماری تاریخ بھی بتا رہی ہے کہ حالات جب ہی بدلیں گے جبکہ ہم خود اپنے کو بدل لیں اور نصرت خداوندی کا استحقاق

پیدا کر لیں۔"

واقعی یہ بڑی عجیب بات ہے جس کی توجیہہ مشکل ہے کہ جس ایمانی حقیقت اور تاریخی تجربہ کا اوپر کی سطروں میں ذکر کیا گیا ہے، ہمارے اس دور کے مسلمان خواہ وہ دنیا کے کسی بھی حصہ کے رہنے والے ہوں، بعموم اس کا اقرار کرتے ہیں۔ کم از کم اس عاجز نے تو ساری عمر میں ایک مسلمان بھی نہیں پایا جو اس کا منکر ہو۔ لیکن یہ اقرار غالباً بس اقرار ہی ہے، اس کے ساتھ وہ یقین و اعتماد نہیں ہے جو اس کو ہماری ملی پالیسی کی بنیاد بنانے کیلئے ضروری ہو۔ حالانکہ اصل طاقت اور کارفرمائی اس یقین ہی میں ہے۔

اُمت مسلمہ کی پوری تاریخ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے درخشاں اور کامیاب دور خلفائے راشدین کا اور ان میں سے بھی خاص کر صدیق اکبر و فاروق اعظم کا ہے (رضی اللہ عنہما) ان دونوں بزرگوں کی نظر میں سب سے اہم چیز یہی تھی کہ اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری اور تقوے کی پابندی کے ذریعہ اس کی حمایت و نصرت کا استحقاق پیدا کیا جائے اور اس کے غیبی لشکروں کی مدد حاصل کی جائے ــــ وہ اپنی اسبابی جدوجہد کی روح بھی اسی کو یقین کرتے تھے اور پالیسی اور پروگرام کے بارے میں اسی کی بنیاد پر بڑے سے بڑے فیصلے کرتے تھے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اکابر صحابہ سے مشورہ کے بعد جب شام کی طرف فوجی مہم بھیجنے کا ارادہ کیا جو روم کی حکومت کے زیر اقتدار تھا جو اُس وقت دنیا کی نہایت ہی طاقتور حکومت تھی تو لشکر روانہ کرتے وقت آپ نے جو خطبہ دیا اُس کے آخری الفاظ یہ تھے۔

ولیحسن نیتکم وشربکم وأطعمتکم فان اللہ مع الذین اتقوا والذین هم محسنون۔ (کنز العمال ص۱۴۲ ج ۳)	ضروری ہے کہ تمہاری نیتیں نیک اور خالص ہوں (یعنی اس جنگ میں تمہارا مطمح نظر دنیا نہ ہو آخرت اور اللہ کی رضا ہو) اور تمہارا کھانا پینا پاک اور حلال ہو کیونکہ اللہ انہی بندوں کی مدد کرتا ہے جو پرہیزگار اور نیکوکار ہوں۔

یرموک کی جنگ میں جب مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد شہید ہوگئی تو لشکر کے سپہ سالار نے صدیق اکبر رض کی خدمت میں مزید فوجی کمک کے لیے خط لکھا، اسکے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا

إنه قد جاء فی کتابکم تستمدّ ونی وإنی أدلکم علی من هو أعز نصراً	تمہارا خط مجھے ملا۔ تم نے مجھ سے مزید فوجی کمک مانگی ہے، میں تم کو اس ذات کی طرف توجہ دلاتا ہوں اور اس کا پتہ دیتا

وأحضر جند أالله عزو جل فاستنصروه فان محمدا أقد نصر يوم بدر في أقل من عددكم۔ (کنز العمال ص۱۴۵ ج ۲)	ہوں جو تم کو بڑی طاقتور مدد دے سکتا ہو۔ اور جس کے بے پناہ لشکر ہر وقت حاضر و موجود ہیں یعنی اللہ عز و جل، بس اسی سے مدد مانگو اس نے جنگ بدر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت اپنی غیبی مدد سے دشمنوں کے مقابلہ میں کامیاب کیا تھا جب ان کے ساتھیوں کی تعداد تمہاری موجودہ تعداد سے بہت ہی کم تھی۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اس لشکر کے سپہ سالار تھے جو مصر بھیجا گیا تھا۔ یہ لشکر خلاف توقع طویل مدت تک مصر پر فتح حاصل نہ کر سکا۔ یہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت کا دور تھا۔ انھوں نے حضرت عمرو بن العاص کو لکھا۔

عجبت لابطائكم عن فتح مصر تقاتلونهم منذ سنين وما ذالك إلا بما أحدثتم وأحببتم من الدنيا ما أحب عدوكم وإن الله لا ينصر قوما إلا بصدق نياتهم۔ (کنز العمال ص۱۵۱ ج ۲)	مجھے سخت تعجب ہے مصر کی فتح میں اتنی دیر کیوں لگی کہ برس گزر گئے۔ میرے نزدیک اس کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ تم لوگوں میں تبدیلی آگئی اور نئی باتیں پیدا ہو گئیں اور جس طرح تمہارے دشمن دُنیا کی محبت اور طلب میں گرفتار ہیں تم بھی اس گندگی میں مبتلا ہو گئے اسلئے اللہ کی مدد تم کو حاصل نہیں ہو رہی ہے) اللہ تعالیٰ کسی قوم کی مدد ان کی نیتوں کی پاکبازی ہی کی وجہ سے کرتا ہے۔

ہمارے دور اوّل میں یہی نقطۂ نظر تھا جس کی بنیاد پر سارے فیصلے کیے جاتے تھے۔ پھر جو نتائج ظاہر ہوتے تھے وہ بھی تاریخ میں محفوظ ہیں۔

جس نے اللہ کی کتاب پاک قرآن مجید کو اور اسکے رسول برحق سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو غور سے دیکھا اور سمجھا ہے اور اس پر ایمان لایا ہے اور ایک مومن کی نگاہ سے جس نے اس اُمت کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اس کے لیے اس میں ذرہ بھر شک کی گنجائش نہیں ہے کہ اس امت کی صلاح و فلاح کا ضابطہ اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے یہی مقرر کیا ہے۔ و لن يصلح آخر هذه الامة إلا بما صلح به اولها۔

کِتَابُ الْاَذْکَارِ وَالدَّعْوَات

مَعَارِفُ الحَدِیث

(مُسَلسَل)

دُرُود شریف کے خَاص کلِمَات

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیجنے کا ہم بندوں کو حکم دیا اور بڑے مؤثر اور پیارے انداز میں حکم دیا، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف پیرایوں میں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے اس کے وہ برکات اور فضائل بیان فرمائے جو ناظرین کو مندرجہ سابق احادیث سے معلوم ہو چکے ہیں ــــــ پھر صحابۂ کرام کے دریافت کرنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے درود وسلام کے خاص کلمات بھی تعلیم فرمائے ــــــ اپنے امکان کی حد تک کتبِ حدیث کی پوری چھان بین کے بعد اس سلسلہ کی مستند روایات جمع کر کے ذیل میں درج کی جا رہی ہیں ــــــ واللہ ولی التوفیق ــــــ

عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ لَیْلٰی قَالَ لَقِیَنِیْ کَعْبُ بْنُ عُجْرَۃَ فَقَالَ اَلَا اُھْدِیْ لَکَ ھَدِیَّۃً سَمِعْتُھَا مِنَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ بَلٰی فَاَھْدِھَا لِیْ، فَقَالَ سَأَلْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقُلْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کَیْفَ الصَّلٰوۃُ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الْبَیْتِ فَاِنَّ اللّٰہَ

قَدْ عَلِمْنَا كَيْفَ نُسَلِّمُ عَلَيْكَ؟ قَالَ قُولُوا اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ـــ

ـــــــــــ رواہ البخاری و مسلم

مشہور جلیل القدر تابعی عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے روایت ہے بیان کرتے ہیں کہ میری ملاقات کعب بن عجرہ انصاری رضی اللہ عنہ سے ہوئی (جو اصحاب بیعتِ رضوان میں سے ہیں) انھوں نے مجھ سے فرمایا میں تمھیں ایک خاص تحفہ پیش کروں (یعنی ایک بیش بہا حدیث سناؤں) جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے، میں نے عرض کیا مجھے وہ تحفہ ضرور دیجئے! ـــ انھوں نے بتایا کہ ہم لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرتے ہوئے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ تو ہم کو بتا دیا کہ ہم آپ پر سلام کس طرح بھیجا کریں (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ نے ہم کو بتا دیا ہے کہ ہم تشہد میں "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ" کہہ کر آپ پر سلام بھیجا کریں) اب آپ ہمیں یہ بھی بتا دیجئے کہ ہم آپ پر صلوٰۃ (درود) کیسے بھیجا کریں، آپ نے فرمایا یوں کہا کرو۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ	اے اللہ اپنی خاص نوازش اور عنایت و رحمت فرما حضرت محمد پر اور حضرت محمد کے گھرانے والوں پر جیسے کہ تو نے نوازش اور عنایت و
اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ	رحمت فرمائی حضرت ابراہیم پر اور

وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰی إِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰی آلِ إِبْرَاهِيْمَ إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ۔

اور حضرت ابراہیم کے گھرانے والوں پر بیشک تو حمد و ستائش کا سزاوار اور عظمت اور بزرگی والا ہے۔ اے اللہ خاص برکتیں نازل فرما حضرت محمدؐ اور حضرت محمدؐ کے گھرانے والوں پر، جیسے تو نے برکتیں نازل فرمائیں حضرت ابراہیم پر اور حضرت ابراہیم کے گھرانے والوں پر، تو حمد و ستائش کا سزاوار اور عظمت و بزرگی والا ہے۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) حضرت کعب بن عجرہ نے عبدالرحمٰن ابن ابی لیلیٰ کو یہ حدیث جس طرح اور جس تمہید کے ساتھ سنائی اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس حدیث کو اور اس درود شریف کو کتنا عظیم اور کیسا بیش بہا تحفہ سمجھتے تھے ـــــ اور طبری کی اسی حدیث کی روایت میں یہ بھی ہے کہ کعب بن عجرہ نے یہ حدیث عبدالرحمٰن ابن ابی لیلی کو بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے سنائی تھی[۱]۔ اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں اس کی کتنی عظمت تھی۔

اسی حدیث کی بیہقی کی روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ صلوٰۃ یعنی درود کے طریقہ کے بارے میں یہ سوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت کیا گیا جب سورۂ احزاب کی یہ آیت نازل ہوئی[۲]۔ إِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ○

اس آیت میں صلوٰۃ و سلام کا جو حکم دیا گیا ہے اس کے بارے میں تفصیل سے پہلے لکھا جا چکا ہے۔

---

[۱]، [۲] فتح الباری کتاب الدعوات۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سوال کے جواب میں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر صلوٰۃ بھیجنے کا ہم کو جو حکم دیا ہے اس کا کیا طریقہ ہے اور کس طرح ہم آپ پر صلوٰۃ بھیجا کریں، صلوٰۃ کے جو کلمات اس حدیث میں اور اس کے علاوہ بھی بہت سی دوسری حدیثوں میں تلقین فرمائے یعنی اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ..... الخ۔ ان سے معلوم ہوا کہ آپ پر ہمارے صلوٰۃ بھیجنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم اللہ سے التجا اور استدعا کریں کہ وہ آپ پر صلوٰۃ بھیجے اور برکتیں نازل فرمائے ۔ یہ اس لیے کہ ہم خود چونکہ محتاج و مفلس اور تہی مایہ ہیں ہرگز اس لائق نہیں ہیں کہ اپنے محسن اعظم اور اللہ کے نبیِّ محترم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں کچھ پیش کر سکیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے حضور میں استدعا اور التجا کرتے ہیں کہ وہ آپ پر صلوٰۃ اور برکت بھیجے یعنی آپ کی تشریف و تکریم، آپ پر نوازش و عنایت، رحمت و رأفت، پیار دلار میں اور مقبولیت کے درجات و مراتب میں اضافہ فرمائے۔ اور آپ کو اپنی خاص برکتوں سے نوازے، نیز آپ کے گھر والوں کے ساتھ بھی یہی معاملہ فرمائے۔

استدعاء "صلوٰۃ" کے بعد "برکت" مانگنے کی حکمت :-

صلوٰۃ کے بارے میں پہلے بقدر ضرورت کلام کیا جا چکا ہے اور بتایا جا چکا ہے کہ اس کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے۔ تشریف و تکریم، مدح و ثنا، رحمت و رأفت، محبت و عطوفت، رفعِ مراتب، ارادۂ خیر، اعطاء خیر اور دُعائے خیر سب ہی کو صلوٰۃ کا مفہوم حاوی ہے ــــ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی بندہ پر "برکت" ہونے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس کے لیے بھرپور نوازش و عنایت اور خیر و نعمت کا اور اس کے دوام اور اس میں برابر اضافہ و ترقی کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیصلہ ہے۔ بہرحال برکت کسی ایسی چیز کا نام نہیں ہے جس کو "صلوٰۃ" کا وسیع مفہوم حاوی نہ ہو ــ اس لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے حضور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے صلوٰۃ کی استدعا کرنے کے بعد آپ کے واسطے برکت یا رحمت کی دُعا اور استدعا کرنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں دُعا اور سوال کے موقع پر یہی مستحسن ہے کہ مختلف الفاظ

عبارات میں بار بار عرض معروض کی جائے، اس سے بندہ کی شدید محتاجی اور صدق طلب کا اظہار ہوتا ہے اور سائل اور منگتا کے لیے یہی مناسب ہے۔ اس لیے اس درود شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل کے لیے اللہ تعالیٰ سے صلوٰۃ کی استدعا کے بعد برکت کی التجا بھی کی گئی ہے۔ اور بعض دوسری روایات میں (جو عنقریب درج ہوں گی) صلوٰۃ اور برکت کے بعد ترحم کا بھی سوال کیا گیا ہے۔

درود شریف میں لفظ "آل" کا مطلب :-

اس درود شریف میں 'آل' کا لفظ چار دفعہ آیا ہے، ہم نے اس کا ترجمہ "گھرانے والوں" کیا ہے ـــ عربی زبان اور خاص کر قرآن و حدیث کے استعمالات میں کسی شخص کی آل اُن لوگوں کو کہا جاتا ہے جو اس کے ساتھ خصوصی تعلق رکھتے ہوں، خواہ یہ تعلق نسب اور رشتہ کا ہو، جیسے اس کے بیوی بچے۔ یا رفاقت اور عقیدت و محبت، اور اتباع و اطاعت کا، جیسے کہ اس کے مشن کے خاص ساتھی اور محبین و متبعین[۱] ـــ اس لیے نفس لغت کے لحاظ سے یہاں آل کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں ـــ لیکن اگلے ہی نمبر پر اسی مضمون کی حضرت ابو حُمید ساعدی کی جو حدیث درج کی جا رہی ہے اس میں درود شریف کے جو الفاظ ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "آل" سے گھرانے والے ہی مراد ہیں۔ یعنی آپؐ کی ازواج مطہرات اور آپؐ کی نسل و اولاد، اور جس طرح ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خصوصی قرابت و جزئیت اور زندگی میں شرکت کا خاص شرف حاصل ہے (جو دوسرے حضرات کو حاصل نہیں ہے اگرچہ وہ درجہ میں ان سے افضل ہوں)، اسی طرح یہ بھی ان کا ایک مخصوص شرف ہے کہ رسول اللہ

---

[۱] امام راغب اصفہانی نے "مفردات القرآن" میں "آل" کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: ویستعمل فیمن یختص بالانسان اختصاصاً ذاتیا اما بقرابۃ قریبۃ او بموالاۃ قال عزوجل (وآل ابراھیم وآل عمران) وقال (ادخلوا آل فرعون اشد العذاب) صفحہ ۳

صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اُن پر بھی درود و سلام بھیجا جاتا ہے۔ اور اس سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ ازواج مطہرات وغیرہ جو لفظ "آل" کے مصداق ہیں، اُمت میں سب سے افضل ہوں، عند اللہ افضلیت کا مدار ایمان اور ایمان والے اعمال اور ایمانی کیفیات پر ہے۔ جس کا جامع عنوان تقویٰ ہے۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ۔

اس کو بالکل یوں سمجھنا چاہیئے کہ ہماری اس دُنیا میں بھی جب کوئی مخلص محب اپنے کسی محبوب بزرگ کی خدمت میں کوئی خاص مرغوب تحفہ اور سوغات پیش کرتا ہے تو اس کے پیش نظر خود وہ بزرگ اور ان کے ذاتی تعلق کی بنا پر ان کے گھر والے ہوتے ہیں اور اس مخلص کی یہ خوشی ہوتی ہے کہ یہ تحفہ ان بزرگ کے ساتھ ان کے گھر والے یعنی اہل و عیال بھی استعمال کریں، کسی کے ساتھ تعلق و محبت کا دراصل یہ فطری تقاضا ہے ——

درود شریف بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک تحفہ اور سوغات ہے اُسمیں آپ کے ساتھ آپ کے خاص متعلقین یعنی اہل و عیال کو بھی شریک کرنا بلاشبہ آپ کی محبت کا تقاضا ہے اور اس سے آپ کے قلب مبارک کا بہت زیادہ خوش ہونا بھی ایک فطری بات ہے —— اس کی بنیاد پر افضلیت و مفضولیت کی کلامی بحث کرنا کوئی خوش ذوقی کی بات نہیں ہے —— بہرحال اس عاجز کے نزدیک راجح یہی ہے کہ درود شریف میں آلِ محمد سے آپ کے گھر والے یعنی ازواج مطہرات اور ذریت مراد ہے اور اسی طرح سے آلِ ابراہیمؑ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے گھر والے۔ قرآن مجید میں حضرت ابراہیم کی زوجہ مطہرہ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے رَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الْبَیْتِ اِنَّہٗ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ بلاشبہ آلِ ابراہیم وہی ہیں جن کو اس آیت میں اہل البیت فرمایا گیا ہے ——

درود شریف میں تشبیہہ کی حقیقت اور نوعیت :-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تلقین فرمائے ہوئے اس درود شریف میں اللہ تعالیٰ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل پر صلوٰۃ اور برکت نازل کرنے کی درخواست کرتے ہوئے عرض کیا گیا ہے کہ ایسی صلوٰۃ اور برکت نازل فرما جیسی کہ تو نے حضرت ابراہیم

اور ان کی آل پر نازل فرمائی ــــ اس تشبیہ کے بارے میں ایک مشہور علمی اشکال ہو کہ تشبیہ میں مشبہ، مشبہ بہ کے مقابلہ میں کمتر ہوتا ہے اور مشبہ بہ اعلیٰ اور برتر ہوتا ہے۔ مثلاً ٹھنڈے پانی کو برف سے تشبیہ دی جاتی ہے تو پانی خواہ کتنا ہی زیادہ ٹھنڈا ہو، ٹھنڈک میں بہرحال برف سے کمتر ہوتا ہو اور برف میں اُس سے زیادہ ٹھنڈک ہوتی ہو ــــ اس اُصول پر درود شریف کی مذکورہ بالا تشبیہ سے لازم آتا ہو کہ حضرت ابراہیم اور آل ابراہیم پر نازل ہونے والی صلوات و برکات اُن صلوات و برکات سے اعلیٰ اور افضل ہوں جنکی اس درود پاک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل کیلئے استدعا اور التجا کی گئی ہو۔

شارحین حدیث نے اس اشکال کے بہت سے جوابات دیے ہیں جو فتح الباری وغیرہ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس عاجز کے نزدیک سب سے زیادہ تسلی بخش جواب یہ ہے کہ تشبیہ کبھی صرف نوعیت کی تعیین کے لیے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً ایک شخص کسی خاص قسم کے کپڑے کا ایک پرانا ٹکڑا لے کر کپڑے کی بڑی دوکان پر جاتا ہے کہ مجھے ایسا کپڑا چاہیے حالانکہ جس ٹکڑے کو وہ نمونے کے طور پر دکھا رہا ہے اور جو مشبہ بہ ہے وہ ایک پرانا اور بے قیمت ٹکڑا ہے اور اُسی قسم کا جو کپڑا وہ دوکاندار سے چاہتا ہے وہ ظاہر ہے کہ نیا اور قیمتی ہوگا اور اس لحاظ سے نمونہ والے ٹکڑے سے بہتر ہوگا ــــ پس درود شریف میں تشبیہ اسی قسم کی ہے اور مطلب یہ ہے کہ جس خاص نوعیت کی صلوات و برکات سے سیدنا ابراہیم و آلِ ابراہیم کو نوازا گیا، اسی نوعیت کی صلوات و برکات سیدنا محمد و آلِ محمد پر نازل فرمائی جائیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تمام نبیوں بلکہ ساری مخلوق میں یہ امتیازات حاصل ہیں کہ اللہ نے ان کو اپنا خلیل بنایا (وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلًا)۔ اُن کو امامت کبریٰ کے عظیم شرف سے مشرف اور سرفراز فرمایا (اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا) اُن کو بیت اللہ کا بانی بنایا۔ ان کے بعد سے قیامت تک کے لیے نبوت و رسالت کا سلسلہ اُن ہی کی نسل اور اُن ہی کے اخلاف میں منحصر کر دیا گیا ــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سوا کسی پر بھی اللہ تعالیٰ کی یہ نوازشیں اور عنایتیں نہیں ہوئیں اور کسی کو بھی محبوبیت و مقبولیت کا یہ مقام عالی عطا نہیں ہوا۔ پس درود شریف میں اللہ تعالیٰ سے یہی دُعا اور التجا کی جاتی ہے کہ اسی قسم کی اور اسی نوع کی عنایتیں اور نوازشیں

اپنے حبیب حضرت محمد اور ان کی آل پر بھی فرما اور محبوبیت و قبولیت کا ویسا ہی مقام انکو بھی عطا فرما ـــــ الغرض یہ تشبیہ صرف نوعیت کی تعیین اور وضاحت کے لیے ہے جس میں بسا اوقات مشبہ مشبہ بہ کے مقابلہ میں اعلیٰ اور برتر ہوتا ہے اور اس کی مثال وہی ہے جو اوپر کپڑے کی دی گئی ہے۔

درُود شریف کا اوّل و آخر اَللّٰھُمَّ ـــ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ

درود شریف کو اَللّٰھُمَّ سے شروع کرکے اللہ تعالیٰ کے دو مبارک اور پاک ناموں حمید و مجید پر ختم کیا گیا ہے۔ بعض جلیل القدر ائمہ سلف سے نقل کیا گیا ہے کہ اَللّٰھُمَّ اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء حسنیٰ کے قائم مقام ہے۔ اور اس کے ذریعہ دعا کرنا ایسا ہے جیسا کہ تمام اسماء حسنیٰ کے ذریعہ دعا کی جائے۔ شیخ ابن القیم نے جلاء الافہام میں اس پر بڑی نفیس فاضلانہ بحث کی ہے جو اہل علم کے لیے قابل دید ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ یہ معنیٰ اَللّٰھُمَّ کی میم مشدد سے پیدا ہوتے ہیں اور اس کو فلسفۂ لغت سے ثابت کیا ہے۔ پھر اس دعوے کی تائید میں چند ائمہ سلف کے اقوال بھی نقل کیے ہیں[1]۔ اور حمید و مجید اللہ تعالیٰ کے یہ دو مبارک نام اس کی تمام صفاتِ جلال و جمال کے آئینہ دار ہیں۔ حمید وہ ہے جس کی ذات میں سارے وہ محاسن و کمالات ہوں جن کی بنا پر وہ ہر ایک کی حمد و ستائش کا مستحق اور سزاوار ہو ـــــ اور مجید وہ ہے جس کو ذاتی جلال و جبروت اور عظمت و کبریائی بدرجۂ کمال حاصل ہو۔ اس بنا پر اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ۔ کا مطلب یہ ہوا کہ اے اللہ تو تمام صفاتِ جمال و کمال اور شان جلال کا جامع ہے اس لیے سیدنا محمد اور آلِ محمد پر صلوٰۃ اور برکت بھیجنے کی تجھ ہی سے استدعا ہے ـــــ قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے گھر والوں پر اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت و برکت کا جہاں ذکر کیا گیا ہے وہاں بھی ان دو اسماءِ الٰہیہ

---

[1] قریباً ۲ صفحہ پر یہ بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں "وھذا القولُ الّذی إختر ناہ قد جاء عن غیر واحد من السلف قال الحسن البصری اللھم مجمع الدعاء وقال ابو رجاء العطاردی ان المیم فی قولہ اللھم فیھا تسعۃ وتسعون إسماً من اسماء اللہ تعالیٰ وقال النضر بن شمیل من قال اللھم فقد دعا اللہ بجمیع اسماءہ ـــ جلاء الافہام ص۹۴

کی اسی خصوصیت اور امتیاز کی وجہ سے انہی کلمات پر اسی طرح خاتمہ کلام بنایا گیا ہے۔ سورۂ ہود میں فرشتوں کی زبانی فرمایا گیا ہے رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ اِنَّهُ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ۝

الغرض اَللّٰهُمَّ سے درود شریف کا آغاز اور اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ پر اُس کا اختتام اپنے اندر بڑی معنویت رکھتا ہے اور ان دونوں کلموں کی اس معنویت کا لحاظ کرنے سے درود شریف کا کیف بہت بڑھ جاتا ہے۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ۝

اس درود شریف کے الفاظ کی روایتی حیثیت :-

حضرت کعب بن عجرہ کی روایت سے درود شریف کے جو الفاظ اوپر نقل کیے گئے وہ ہیں جو امام بخاریؒ نے صحیح بخاری کی "کتاب الانبیاء" میں روایت کیے ہیں۔ (جلد اول صـ۴۷۷) اس کے علاوہ کم سے کم دو جگہ اور یہ حدیث امام بخاری نے روایت کی ہے۔ ایک سورۂ احزاب کی تفسیر میں (صـ۷۰۸ ج ۲) اور دوسرے کتاب الدعوات میں (صـ۹۴۰ ج۲) ان دونوں جگہوں پر درود شریف میں "کما صلیت" اور "کما بارکت" کے بعد "علی ابراھیم و علی آلِ ابراھیم" کی جگہ صرف "علیٰ آلِ ابراھیم" روایت کیا ہے اور صحیح مسلم کی روایت میں بھی اسی طرح ہے، لیکن حافظ ابن حجرؒ نے اس حدیث کی صحیحین اور غیر صحیحین کی تمام روایات کو سامنے رکھتے ہوئے فتح الباری میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ کعب بن عجرہ کی روایت میں درود شریف کے پورے الفاظ یہی ہیں جو یہاں نقل کیے گئے ہیں۔ اور جن روایات میں صرف "علی ابراھیم" یا "علیٰ آل ابراھیم" وارد ہوا ہے وہاں بعض راویوں کے حافظہ کے فرق سے ایسا ہو گیا ہے۔[۱] (فتح الباری جزء ۲۶ صـ۱۰۵)

---

[۱] شیخ ابن القیمؒ کی کتاب "جلاء الافہام" کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔ یہ درود و سلام کے (باقی اگلے صفحہ پر)

حضرت کعب بن عجرہ کے علاوہ اور بھی متعدد صحابہ کرام سے قریب قریب یہی مضمون اور درود شریف کے قریباً یہی الفاظ کتب حدیث میں روایت کیے گئے ہیں۔ وہ تمام روایات آگے پیش کی جا رہی ہیں۔

عَنْ اَبِیْ حُمَیْدِ نِ السَّاعِدِیْ قَالَ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ کَیْفَ نُصَلِّیْ عَلَیْكَ ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قُوْلُوْا " اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاَزْوَاجِهٖ وَذُرِّيَّتِهٖ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ وَبَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاَزْوَاجِهٖ وَذُرِّيَّتِهٖ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ـ

——————— رواہ البخاری

حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ حضرت! ہم آپ پر صلوٰۃ (درود) کس طرح پڑھا کریں؟ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ سے یوں عرض کیا کرو " اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی

(حاشیہ بسلسلہ صفحہ گزشتہ) کے موضوع پر ان کی بہترین تالیف جو ان کے کمال علمی کی آئینہ دار ہے۔ لیکن درود شریف کے الفاظ کے بارے میں اس میں ان سے یہ بھول ہوگئی ہے کہ " کما بارکت علی ابراہیم و علیٰ آل ابراہیم " کے بارے میں انھوں نے لکھ دیا ہے کہ یہ الفاظ کسی صحیح روایت میں وارد نہیں ہوئے۔ صحیح روایات میں یا صرف " علیٰ ابراہیم " روایت کیا گیا ہے یا صرف " علیٰ آل ابراہیم " (جلاء الافہام صفحہ ۲۴۲) ـــ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ الفاظ صحیح بخاری ہی میں کعب بن عجرہ کی اس روایت میں موجود ہیں جس کو امام بخاری نے کتاب الانبیاء میں روایت کیا ہے (صفحہ ۴۷۷ جلد ۱) اور اسی طرح صحیح بخاری ہی کی ابو سعید خدری کی روایت میں بھی موجود ہیں (صفحہ ۹۴۰ جلد ۲) ـــ درود شریف کے ان الفاظ کے بارے میں قریب قریب یہی سہو شیخ ابن القیم کے استاذ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کو بھی ہوا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ " کما بارکت علی ابراہیم وعلیٰ آل ابراہیم " کی کوئی سند میرے علم میں نہیں (فتاویٰ ابن تیمیہ صفحہ ۲۴۱ جلد ۱) ـــ اس طرح کے سہو بڑے بڑے اکابر سے ہو جاتے ہیں اور اس سے انکی جلالت شان میں کوئی فرق نہیں آتا۔ سہو و نسیان سے پاک صرف ایک ہی ذات ہے " لَا يَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا يَنْسٰی " ۱۲ م

مُحَمَّدٍ وَاَزْوَاجِہٖ وَذُرِّیَّتِہٖ ..... الخ" اے اللہ! اپنی خاص نوازش اور عنایت ورحمت فرما حضرت محمد پر اور آپ کی (پاک) بی بیوں اور آپ کی نسل پر جیسے کہ آپ نے نوازش اور عنایت و رحمت فرمائی آلِ ابراہیم پر اور خاص برکت نازل فرما حضرت محمد پر اور آپ کی (پاک) بی بیوں اور آپ کی نسل پر جیسے کہ آپ نے برکتیں نازل فرمائیں آلِ ابراہیم پر، اے اللہ! تو ساری حمد و ستائش کا سزاوار ہے اور تیرے ہی لیے ساری عظمت و بڑائی ہے۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث میں درود شریف کے جو الفاظ تلقین فرمائے گئے ہیں وہ کعب بن عجرہؓ والی پہلی حدیث سے کچھ مختلف ہیں۔ پہلی حدیث میں "اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ" اور "اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ" فرمایا گیا تھا۔ اور اس حدیث میں دونوں جگہ "وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ" کے بجائے "وَاَزْوَاجِہٖ وَذُرِّیَّتِہٖ" فرمایا گیا ہے، اسی بنا پر اس عاجز نے پہلی حدیث کی تشریح میں ان حضرات کے قول کو راجح قرار دیا تھا جنھوں نے کہا ہے کہ درود شریف میں آلِ محمد سے مراد ازواج مطہرات اور آپ کی ذریت طیبہ ہے۔ ایک دوسرا خفیف لفظی فرق یہ بھی ہو کہ پہلی حدیث میں "کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ" اور "کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ" فرمایا گیا تھا اور اس حدیث میں دونوں جگہ صرف "عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ" ہے۔ اور حضرت ابو حمید ساعدی کی اس روایت کے علاوہ دوسرے اکثر صحابہ کی حدیثوں میں بھی جو آگے درج ہوں گی، اسی طرح صرف "عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ" وارد ہوا ہے۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا یہ صرف لفظی فرق ہے۔ اس سے معنیٰ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ عربی محاورات میں جب کسی کا نام لے کر اس کی آل کا ذکر کیا جائے اور خود اس کا ذکر الگ نہ کیا جائے تو وہ بھی اس میں شامل ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے "اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰٓی اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرَاھِیْمَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ" (اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ساری قوموں میں

برگزیدہ کیا آدم کو اور نوح کو اور آل ابراہیم کو۔ ظاہر ہے کہ یہاں آل ابراہیم میں خود حضرت ابراہیم بھی شامل ہیں۔ اسی طرح "وَاَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ" اور "وَاَدْخِلُوْا آلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ" میں خود فرعون بھی شامل ہے۔

بہرحال ان دونوں حدیثوں میں درود شریف کے جو کلمات وارد ہوئے ہیں ان میں خفیف سا فرق صرف الفاظ میں ہے۔ اسی لیے علماء و فقہاء نے تصریح کی ہے کہ ان میں سے ہر ایک درود نماز میں پڑھا جا سکتا ہے۔ اور اسی طرح دوسرے صحابہ کرام کی روایتوں سے آئندہ درج ہونے والی حدیثوں میں درود شریف کے جو کلمات آرہے ہیں جن میں الفاظ کی کچھ کمی بیشی ہے، وہ سب بھی نماز میں پڑھے جا سکتے ہیں۔

عَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدٍ الْاَنْصَارِیِّ قَالَ اَتَانَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ فِیْ مَجْلِسِ سَعْدِ بْنِ عُبَادَۃَ فَقَالَ لَہٗ بَشِیْرُ بْنُ سَعْدٍ اَمَرَنَا اللّٰہُ اَنْ نُّصَلِّیَ عَلَیْكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ فَکَیْفَ نُصَلِّیْ عَلَیْكَ؟ قَالَ فَسَکَتَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَتّٰی تَمَنَّیْنَا اَنَّہٗ لَمْ یَسْأَلْہُ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قُوْلُوْا اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ وَبَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ فِی الْعَالَمِیْنَ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔" وَالسَّلَامُ کَمَا قَدْ عَلِمْتُمْ ـــــــ رواہ مسلم

حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم کچھ لوگ سعد بن عبادہ کی نشست گاہ میں بیٹھے تھے، وہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے تو (حاضرین مجلس میں سے) بشیر بن سعد نے آپ سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو آپ پر صلوٰۃ بھیجنے کا حکم دیا ہے۔ (ہمیں بتائیے کہ) ہم کس طرح آپ پر صلوٰۃ بھیجا کریں؟۔ حدیث کے راوی ابو مسعود انصاری کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ دیر تک خاموش رہے اور آپ نے بشیر بن سعد

کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا، جس سے ہمیں یہ شبہ ہوا کہ شاید یہ سوال آپ کو اچھا نہیں لگا) یہاں تک کہ ہمارے دل میں آیا کہ کاش یہ سوال نہ کیا گیا ہوتا، پھر (کچھ دیر خاموشی کے بعد، اس سوال کا جواب دیتے ہوئے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یوں کہا کرو۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ وَبَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ فِي الْعَالَمِيْنَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ۔ وَالسَّلَامُ كَمَا قَدْ عَلِمْتُمْ ۔

اے اللہ اپنی خاص نوازش و عنایت اور رحمت فرما حضرت محمد پر اور ان کے گھرانے والوں پر جس طرح تو نے نوازش و عنایت اور رحمت فرمائی حضرت ابراہیم کے گھرانے پر اور اپنی خاص برکتیں نازل فرما حضرت محمد اور ان کے گھرانے پر، جس طرح تو نے برکتیں نازل فرمائیں حضرت ابراہیم کے گھرانے پر ساری دنیا میں، تو حمد و ستائش کا سزاوار ہے اور تیرے ہی لیے ساری عظمت و بزرگی ہے — اور سلام اس طرح جس طرح کہ تمھیں معلوم ہو چکا ہے۔

(صحیح مسلم)

(تشریح) حضرت ابو مسعود انصاری کی اس حدیث کی طبری کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ جب بشیر بن سعد نے آپ سے سوال کیا کہ ہم آپ پر کس طرح درود بھیجا کریں؟ تو آپ خاموش رہے۔ یہاں تک کہ آپ پر وحی آئی (فسکت حتی جاءہ الوحی) اس کے بعد آپ نے مندرجۂ بالا درود تلقین فرمایا — اس اضافہ سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آپ کی خاموشی وحی کے انتظار میں تھی۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ درود شریف کے کلمات آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعلیم فرمائے گئے تھے — اور مزید یہ بھی معلوم ہو گیا کہ

درود کے بارے میں یہ سوال آپ سے پہلی دفعہ سعد بن عبادہ کی مجلس ہی میں کیا گیا تھا۔ جس کے جواب میں آپ کو وحی کا انتظار کرنا پڑا ۔ دوسرے بعض صحابہ (کعب بن عجرہ اور ابو حمید ساعدی وغیرہ) کی روایات میں جو اسی طرح کے سوال کا ذکر ہے وہ یا تو اسی مجلس کے واقعہ کا بیان ہے ۔ یا مختلف حضرات نے مختلف موقعوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں سوال کیا تھا اور آپ نے جواب میں ان کو درود شریف کے وہ کلمات تلقین فرمائے جو ان کی روایات میں وارد ہیں۔ اکثر احادیث کے سیاق اور الفاظ و کلمات کے فرق سے اسی دوسرے احتمال کی تائید ہوتی ہے ۔ واللہ اعلم۔

حضرت ابو سعید انصاری کی اس حدیث کی امام احمد اور ابن خزیمہ اور حاکم وغیرہ کی روایات میں ایک اضافہ یہ بھی ہے کہ بشیر بن سعد نے درود بھیجنے کے بارے میں سوال کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا تھا

كَيْفَ نُصَلِّيْ عَلَيْكَ اِذَا نَحْنُ صَلَّيْنَا عَلَيْكَ فِيْ صَلٰوتِنَا؟ — ہم جب نماز میں آپ پر درود بھیجیں تو کس طرح بھیجا کریں؟

اس سے معلوم ہوا کہ یہ سوال خاص طور سے نماز میں درود پڑھنے کے بارے میں کیا گیا تھا اور یہ درود ابراہیمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصیت سے نماز میں پڑھنے کے لیے تلقین فرمایا۔

حضرت ابو مسعود انصاری کی اس روایت میں بھی ابو حمید ساعدی کی حدیث کی طرح "كَمَا صَلَّيْتَ" اور "كَمَا بَارَكْتَ" کے بعد صرف "عَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ" روایت کیا گیا ہے اور آخر میں "اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ" سے پہلے "فِي الْعَالَمِيْنَ" کا اضافہ بھی ہے۔

عَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ الْخُدْرِيْ قَالَ قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هٰذَا السَّلَامُ عَلَيْكَ فَقَدْ عَلِمْنَا فَكَيْفَ نُصَلِّيْ عَلَيْكَ قَالَ قُوْلُوْا اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَرَسُوْلِكَ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَبَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ

عَلٰى إِبْرَاهِيمَ وَآلِ إِبْرَاهِيمَ ــــــــــ رواہ البخاری

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہم نے عرض کیا کہ حضرت! آپ پر سلام بھیجنے کا طریقہ تو ہم کو معلوم ہو گیا (یعنی تشہد کے ضمن میں بتا دیا گیا "السَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ"۔ اب ہمیں یہ بھی بتا دیا جائے کہ ہم آپ پر "صلوٰۃ" کس طرح بھیجا کریں؟ ــ آپ نے فرمایا ــ اللہ تعالیٰ سے یوں عرض کیا کرو۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَرَسُولِكَ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيمَ وَبَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّآلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيمَ، وَآلِ إِبْرَاهِيمَ۔

ــــــــ رواہ البخاری

اے اللہ اپنی خاص عنایت و نوازش اور محبت و رحمت فرما اپنے خاص بندے اور رسول (حضرت محمد) پر، جیسی تو نے نوازش و عنایت اور محبت و رحمت فرمائی (اپنے خلیل حضرت) ابراہیم پر اور خاص برکتیں نازل فرما حضرت محمد و آل محمد پر جس طرح تو نے برکتیں نازل فرمائیں حضرت ابراہیم و آل ابراہیم پر۔

ــــــــ (صحیح بخاری)

عَنْ طَلْحَةَ أَنَّ رَجُلًا قَالَ لِرَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَيْفَ نُصَلِّي عَلَيْكَ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ؟ قَالَ "قُولُوا اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيمَ إِنَّكَ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ"

ــــــــ رواہ النسائی

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ اے پیغمبر خدا ہم آپ پر کس طرح صلوٰۃ بھیجا کریں؟ ــ آپ نے فرمایا یوں کہا کرو۔ اے اللہ نوازش و عنایت اور محبت و رحمت فرما محمد پر جیسی نوازش و عنایت اور محبت و رحمت فرمائی تو نے

ابراہیم پر، تو حمد و ستائش کا سزاوار ہے اور ہر طرح کی عظمت و بزرگی تیرے لیے ہے۔ (سنن نسائی)

عَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللهِ قَدْ عَلِمْنَا السَّلَامَ عَلَيْكَ فَكَيْفَ الصَّلوٰةُ عَلَيْكَ؟ قَالَ قُوْلُوْا اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ صَلَوَاتِكَ وَرَحْمَتَكَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا جَعَلْتَهَا عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ——— رواہ احمد

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہم لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت آپ پر سلام بھیجنے کا طریقہ تو ہمیں معلوم ہو چکا اب بتا دیجئے کہ آپ پر صلوٰۃ کس طرح بھیجی جائے؟ — آپ نے ارشاد فرمایا، اللہ کے حضور میں یوں عرض کیا کرو،

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ صَلَوَاتِكَ وَرَحْمَتَكَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّآلِ مُحَمَّدٍ كَمَا جَعَلْتَهَا عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ۝

اے اللہ اپنی خاص نوازشیں، عنایتیں اور اپنی مخصوص رحمت نازل فرما حضرت محمد اور ان کے گھر والوں پر، جیسے تو نے نازل فرمائیں حضرت ابراہیم پر، تو ہر حمد و ستائش کا مستحق و سزاوار ہے اور عظمت و کبریائی تیری ذاتی صفت ہے۔

(مسند احمد)

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَيَّ فَقُوْلُوْا اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ وَعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى آلِ اِبْرَاهِيْمَ وَبَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ وَعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى آلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ۝ ——— رواہ احمد و ابن حبان والدارقطنی والبیہقی فی السنن

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم مجھ پر صلوٰۃ بھیجو تو اس طرح کہا کرو اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی آلِ اِبْرَاھِیْمَ وَ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی آلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ○

(مسند احمد، صحیح ابن حبان، سنن دار قطنی، سنن بیہقی)

[چونکہ درود پاک کے ان کلمات کا ترجمہ بار بار کیا جا چکا ہے اس لیے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں سمجھی گئی]

(**تشریح**) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے روایت کردہ اس درود میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام پاک آپ کی امتیازی صفت اور خاص لقب "اَلنَّبِیُّ الْاُمِّیُّ" کے اضافہ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، قرآن مجید میں آپ کی یہ صفت ایک خاص نشانی اور پہچان کے طور پر ذکر کی گئی ہے (اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰۃِ وَالْاِنْجِیْلِ ـــــ الاعراف) اس آیت میں اشارہ ہے کہ توراۃ و انجیل میں آپ کا ذکر اس صفت کے ساتھ کیا گیا تھا۔ "اُمّی" کے معنی ہیں "بے لکھے پڑھے" مطلب یہ ہے کہ جو علم و ہدایت آپ لے کر آئے وہ آپ نے کسی استاذ یا کتاب سے حاصل نہیں کیا ہے بلکہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی تعلیم سے حاصل ہوا ہے۔ لکھنے پڑھنے کے لحاظ سے آپ بالکل ویسے ہی ہیں جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ آپ کی اس صفت اور اس لقب میں ایک خاص محبوبیت ہے۔ اور اس چھوٹے سے لفظ میں آپ کی نبوت و رسالت کی ایک بڑی روشن دلیل پیش کر دی گئی ہے ○

نگارِ من کہ بمکتب نہ رفت و خط نہ نوشت
بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہٗ

اپنی وصایا اور نصائح کے آئینے میں

از مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی

قافلہ سالار سلسلۂ سہروردیہ قطب العارفین حضرت شیخ شہاب الدین ابو حفص عمر بن محمد صدیقی سہروردی رح اپنے وقت کے امام طریقت اور پیشوائے راہ سلوک تھے۔ اخلاق و تصوف میں ایک بلند مقام رکھتے تھے۔ ان کی کتاب عوارف المعارف طالبین و سالکین کے لئے ایک رہنما مینار کی حیثیت رکھتی ہے۔ بعد کے ہر ہر سلسلے کے مشائخ نے اس سے استفادہ کیا۔ حضرت شیخ الاسلام بابا فریدالدین گنج شکر رح اور حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء رح جیسے اکابر طریقت کی خانقاہوں میں اس کتاب کے درس و تدریس اور مطالعہ و مذاکرہ کا سلسلہ جاری رہا۔ حضرت شیخ سعدی شیرازی رح کی نصائح کا راز بھی غالباً اس خوش نصیبی میں مضمر ہے۔ کہ وہ "پیر دانائے فرخ شہاب رح" کے مرید اور ان کے روحانی فیوض سے مستفیض تھے۔ انھوں نے گلستاں میں اپنے پیر و مرشد کی دو اہم نصیحتیں دو شعروں میں نظم کی ہیں جن کو انھوں نے براہِ راست سنا تھا اور جن کے متعلق ماہر رموز طریقت حضرت شاہ غلام علی نقشبندی دہلوی رح اور قاسم العلوم والمعارف حضرت نانوتوی رح کی رائے یہ ہے کہ ان دونوں میں تصوف کا خلاصہ آگیا ہے۔

وہ دو شعر یہ ہیں ؎

مرا پیر دانائے فرخ شہاب رح دو اندرز فرمود بر روئے آب
یکے آنکہ بر خویش خود بیں مباش دوم آنکہ بر غیر بد بیں مباش

یعنی مجھ کو میرے مرشد حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رح نے ساحل دریا پر (جبکہ وہ غالباً دریائی سفر کے لئے کشتی میں سوار تھے یا سوار ہونے والے تھے) مجھے یہ دو نصیحتیں فرمائیں:-
(۱) خود بینی نہ کرنا یعنی اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر غرور و تکبر نہ کرنا (۲) دوسرے کو برا نہ سمجھنا۔ اور خواہ مخواہ اس کے عیب تلاش کرنے کا طریقہ اختیار نہ کرنا۔

مولانا علاء الدین صاحب صدیقی بہلتی مدظلہ کی عنایت سے مجھے کتب خانہ مدرسہ منبع العلوم بہلت کے ایک قلمی نسخے کے مطالعہ کا موقع ملا جو وصایائے قطب العارفین حضرت سہروردی پر مشتمل ہے۔ اور عربی زبان میں ہے۔ یہ وصایا متعدد مریدین، متعلقین اور خلفاء کو کی گئی ہیں۔ ان میں عقائد و اخلاق اور اعمال و کردار کے سنوارنے کی باتیں بھی ہیں اور شریعت و طریقت کے اسرار و رموز بھی، سلوک و تصوف کی اہم اور ضروری ہدایات بھی ہیں اور سلسلۂ سہروردیہ کے خصوصی و امتیازی نشانات بھی ـــ میں نے مناسب سمجھا کہ ان وصایا میں سے بطور اقتباس و انتخاب ان کلمات کا ترجمہ ناظرین الفرقان کی خدمت میں پیش کردوں جن کو میں سمجھ سکا ہوں اور جن سے عمومی دینی فائدہ پہونچنے کی امید ہے۔

سب سے پہلے میں حضرت شیخ سہروردی رح کے حالات حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامی رح کی کتاب نفحات الانس سے پیش کرتا ہوں۔

مختصر حالات حضرت شیخ شہاب الدین ابو حفص عمر بن محمد صدیقی سہروردی رح خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے۔ تصوف و سلوک میں آپ کا انتساب آپ کے چچا حضرت ابو النجیب سہروردی رح کی طرف ہے، مرشدِ اعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح نے آپ سے فرمایا تھا کہ تم عراق کے مشاہیر میں آخری شخص ہو۔ اس طرح آپ کی بہت سی تصانیف ہیں۔ جیسے عوارف المعارف، رشف النصائح اور اعلام التقی وغیرہا۔
عوارف کو مکہ معظمہ میں تصنیف کیا ہے، اثنار تصنیف میں جب کوئی اشکال پیش آتا تو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے اور طوافِ خانہ کعبہ کر کے طلبِ توفیق کرتے تھے تاکہ اشکال دور ہو اور حق واضح ہو جائے

آپ بغداد میں اپنے وقت کے شیخ الشیوخ تھے۔ دور و نزدیک کے ارباب طریقت آپ سے مسائل دریافت کرتے تھے آپ کو ایک شخص نے لکھا تھا ـــــ یا سیدی! اگر میں عمل چھوڑ دوں تو (ڈرتا ہوں کہ) تعطل و بیکاری کی طرف چلا جاؤں گا اور اگر عمل کروں تو (یہ ڈر ہے کہ) مجھ میں تکبر و غرور آجائے گا۔ (پھر میں کیا کروں) آپ نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا۔

"(بیشک) عمل کر اور تکبر و غرور سے استغفار کر"

رسالۂ اقبالیہ میں مذکور ہے کہ شیخ رکن الدین علاء الدولہ رح نے فرمایا ہے کہ شیخ سعد الدین حموی رح سے لوگوں نے دریافت کیا کہ شیخ محی الدینؒ کو تم نے کیسا پایا؟ انھوں نے جواب دیا کہ وہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا ایک سمندر ہیں جس کا کہیں کنارہ نہیں ہے۔ پھر ان سے دریافت کیا گیا۔ کہ شیخ شہاب الدین سہروردی رح کو کیسا پایا؟ جواب دیا کہ متابعتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نور جو شیخ شہاب الدین سہروردی رح کی پیشانی میں چمک رہا ہے وہ چیز ہی کچھ اور ہے۔

آپ کی ولادت رجب ۵۳۹ھ میں اور وفات ۶۳۲ھ میں ہوئی۔ امام یافعی رح نے اپنی کتاب میں آپ کو، مطلع الانوار، منبع الاسرار، دلیل الطریقۃ، ترجمان الحقیقۃ، قدوۃ العارفین عمدۃ السالکین، العالم الربانی وغیرہ القاب سے یاد کیا ہے۔ (نفحات الانس)

ایک وصیت۔ (جو جامع رسالہ نے حضرت سہروردیؒ کے قلم سے لکھی ہوئی تحریر سے نقل کی ہے)

جس کسی کا قلب، نورِ ایمان سے منور ہو گیا اور جس کو اسلام کے متعلق شرح صدر ہو گیا، اس کے تمام اعضاء و جوارح میں نور سرایت کر جاتا ہے اور وہ شرع کے دائرے میں اپنے آپ کو مقید کر دیتا ہے . . . . پھر وہ بندہ اس مقام پر ہو جاتا ہے کہ اس کی زبان میں نور پیدا ہو جاتا ہے، پس وہ حق بولتا ہے، . . . . صادقین کے قلوب اس کے قول کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اس کے قول اور نصائح سے راہِ استقامت پر آجاتے ہیں . . . . اِنابتِ قلب اس کے اندر متحقق ہو جاتی ہے . . . . . اور جس کو انابت حاصل ہو جاتی ہے وہ ان وسوسوں کی نفی کرتا ہے جو دل میں گھومتے ہیں اور ان افکار کو دور کرتا ہے جو سویدائے قلب کو گھیرے رہتے ہیں۔ وہ "حدیثِ نفس" کو دور کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے مناجات اور اس کے سامنے تضرع و زاری

اس کے قلب کی عادت بن جاتی ہے ـــــ بجائے "حدیثِ نفس" کے معانی قرآن اس کے قلب میں جاگزیں ہوتے ہیں۔ اور بسا اوقات کمالِ نورانیت قلب کے ساتھ ساتھ "معانی القرآن" اور مطالعۂ عظمتِ متکلم" بھی اس کے اندر جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ حال ہو جاتا ہے تو وہ قرآن کا بڑا حصہ بغیر وسوسہ اور بغیر حدیث النفس کے ـــ پڑھتا ہے ـــــ ......

اللہ تعالیٰ کا یہ انعام ان رجالِ صدیقین اور مشائخِ صوفیہ کی صحبت کی برکت سے حاصل ہوتا ہے۔ جو ائمۃ المتقین اور صاحب احوال ہوتے ہیں اور جن کو علم دراستہ (علم ظاہر) پر عمل کرنے سے علمِ وراثت (علم حقیقی) حاصل ہو جاتا ہے ـــــ اور جو صادقین کے قلوب اپنی جانب کھینچتے ہیں ـــــ یہ حضرات، زمین پر اللہ کا لشکر ہیں ـــــ احوال، اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں مگر یہ بطریقِ صحبت حاصل کئے جاتے ہیں، وجود الاحوال بطریق صحبت کی مثال ایسی ہے جیسا کہ بیج کہ اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے اگنے اور سرسبز ہونے کی خاصیت رکھی ہے لیکن پہلے بیج بونے والا محنت کرتا ہے اپنی قوت کو فعل میں لاتا ہے ....

شکر، اشرف الاعمال ہے اور سب اعمال کے مقابلے میں کم پایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وقلیل من عبادی الشکور (میرے بندوں میں شکر گذار بندے کم ہیں)

اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے کہ بندے کا قلب ان چیزوں میں مشغول ہو جن میں اعضاء و جوارح مشغول ہیں اس لئے کہ شکر (قلب کا) ایک مستقل عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اعملوا آل داؤد شکرا ـــــ (اے داؤد کے گھر والو شکر کا عمل جاری رکھو)

اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ "ہمت" کو اسی کی طرف مجتمع رکھا جائے اور قلب کی توجہ اسی کی جانب ہو ـــــ مراقبہ، مشاہدہ، اللہ تعالیٰ کی محبت اور یہ تصور کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ امور ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس امر سے چشم پوشی اور درگذر نہیں کرتا۔ کہ بندے کا قلب (کلیتہً) کسی چیز کے ساتھ ہو ـــ چاہیئے کہ اعضاء و جوارح کا عمل اپنے دائرہ تک محدود ہو اور قلب اللہ تعالیٰ کے ساتھ رہے۔ اس لئے کہ قلب اللہ تعالیٰ کے لئے ہے نہ کہ اس کے سوا کے لئے ـــ ...... قلوب، زمین پر اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں اور ان پر اللہ کی نظر ہے، پس ان کے بارے میں کوئی مسامحت اور کوتاہی نہ ہونے پائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے ارشاد فرمایا ہے کہ "اللہ تعالیٰ تمھاری صورتوں کی طرف نہیں دیکھتا بلکہ تمھارے قلوب کی طرف نظر رکھتا ہے،، (الحدیث)

اگر بندہ (بالفرض) کسی بکرہ وہ جگہ بھی ہو مگر اس کا قلب اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو تو وہ اللہ سے قریب ہے اور اگر وہ کعبہ میں ہو لیکن اس کا دل اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ نہ ہو تو وہ بعید ہے۔ میری عادت نہیں ہے کہ شطحیات (خواہ مخواہ کی جذباتی اور جوشیلی باتیں) بیان کروں۔ میں یہ جو کہہ رہا ہوں بات کو اچھی طرح واضح کرنے کے لئے کہہ رہا ہوں۔

خیر پورے طریقے پر "جمعیت" کے اندر ہے اور شر کلّی طور پر تفرقے میں ہے۔ بندہ جمعیت قلب کی طرف اسی وقت متوجہ ہو سکتا ہے جبکہ اس کو اتحادِ مقصود حاصل ہو — اور جب کسی کے مطلوبات کثیر ہوئے تو اس کے افکار متفرق ہو گئے۔ اور جب مطلوب میں اتحاد آیا تو نصب العین مجتمع اور متعین ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ اس قلب کو پسند نہیں کرتا جس میں تفرقہ ہو۔ دو ذکر ایک قلب میں جمع نہیں ہوتے۔ قلب کی وحدانیت وحدانیتِ رب کو پیش نظر رکھ کر — ضروری ہے — .... بندے کے لئے زیبا نہیں ہے کہ اس کا مقصود سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی اور ہو اور زیادہ کسی کی طرف سوائے اس کے متوجہ ہو۔ چاہیئے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے وہ کسی کا بھی مشتاق نہ ہو۔ اللہ کے ماسوا کی طرف نظر ڈالنے کو اچھا نہ سمجھے یہاں تک کہ اس کے سِرّ، قلب اور روح پر اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس کی طلب غالب آجائے، اس کا کوئی سانس طلب حق کے بغیر نہ نکلے۔ یہ ادبِ انفاس ہے۔

طلب میں صدق کی علامت یہ ہے کہ کسی بچّے کی زبان سے بھی کوئی کلمۂ ناصحہ سنے تو اس سے روگرداں نہ ہو۔

...... اللہ تعالیٰ کے اولیاء، رجال و نساء (مرد و عورت) دونوں ہوتے ہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو صفات صاحبِ صدق مردوں کی بیان فرمائی ہیں وہی صاحبِ صدق عورتوں کی بھی بیان کی ہیں — میں اپنی پسماندگی اور اپنی تقصیر پر مقصر اور پسماندہ سے زیادہ دیکھتا ہوں، یہ بات تشریح کی محتاج نہیں،

اور یہ کوئی شطحیات کی قسم کی بات بھی نہیں کہہ رہا ہوں۔ شیخ ابو علی دقاق کا یہ ارشاد میرے حسب حال ہے

"میرا جی چاہتا ہے کہ ماتمی لباس پہن کر شہروں میں گھوموں اور اللہ کے بندوں میں آواز لگاؤں اور ان کو اطلاع دوں کہ کتنے حقوق ان سے فوت ہو رہے ہیں اور ان کے سامنے کیا کیا خطرات ہیں، اس کے ساتھ ہی ساتھ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میری تقصیرات کتنی ہیں،،

وصیت ۔ شمس الدین سمرقندی رح کو

طالب کو لازم ہے کہ اپنے نفس کے احوال کا خیال رکھے اور اس کی لغزشوں خواہشوں، اور اس کے اخلاقِ مذمومہ سے غافل نہ ہو۔ اگر اس نفس کی طرف سے غفلت ہوئی تو یہ اپنی تمام صفات اور اخلاق کے ساتھ نمودار ہوگا۔ نفس کی صفات یہ ہیں۔ دنیا کی طرف متوجہ ہونا، حُبِّ جاہ اور مخلوق میں رفعت و منزلت کی تمنا، نیز اس بات کا خیال رکھنا کہ مخلوق کس چیز کو اچھا سمجھتی ہے اور کس چیز کو بُرا (اس کا خیال نہ رکھنا کہ شرع کے نزدیک کونسی چیز اچھی اور کونسی بری ہے) موت کی یاد اور لزوم خلوت و عزلت سے اس کا علاج ہوسکتا ہے۔ سوائے جمعہ اور جماعت کے لوگوں کے ساتھ اختلاط نہ رکھے، علاوہ ازیں بندے کو لازم ہے کہ اپنے اوقات کو غنیمت سمجھے اور اپنے ایام و ساعات کو اوراد سے مزین کرے اس لئے کہ یہ طریقہ، واردات کو کھینچنے والا ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ریا، نفاق، سُمعہ اور مخلوق کے سامنے سجاوٹ اور بناوٹ سے بھی اپنے آپ کو دور رکھے اس لئے کہ یہ طرزِ عمل، طریق صادقین میں شرک کی مانند ہے۔ پس لازم ہے کہ اس شخص کے پاس بیٹھے جس کے تقویٰ اور زہد کا یقین ہو

وصیت ۔ صفی الدین علی بن رشید کو

میں نے صفی الدین علی بن رشید کو ان کے وطن جانے کی اجازت دی تاکہ

وہ اپنے والدین کے حقوق ادا کریں۔ میں اللہ تعالیٰ سے امید کرتا ہوں کہ وہ مجھ کو اور ان کو قولِ ثابت پر جمائے رکھے گا اور شیطان اور اس کے لشکروں سے نیز نفس امارہ کے مکر و فریب سے محفوظ رکھے گا۔ مشارٌ الیہ کو لازم ہے کہ جب اپنے وطن جائیں تو حفظِ اوقات کی جانب متوجہ رہیں۔ بطالت و بیکاری کو ترک کر دیں اور گوشۂ تنہائی کو غنیمت سمجھیں۔ نصب العین، عبودیت اور ضبطِ اوقات رہے۔ مخلوق کی جانب اس گمان سے نہ جھکیں کہ یہ اخلاقِ صحیحہ کا تقاضا ہے اور مدارات کی یہ ایک شکل ہے اور اس ظاہر داری اور میل ملاپ کو لوگوں کے قلوب کو اچکنے کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ . . . . .

وہ عقل جو پختہ کار ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل ہے وہ دنیا اور دنیا والوں سے بے پرواہ رہنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ عاقل کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے قلب سے آخرت کی طرف متوجہ ہو۔ اسی کی طرف اس کا ٹھکانہ ہے۔ عاقل کو اِس فانی دنیا کی ٹیپ ٹاپ غافل نہیں کرتی۔ دنیا کی چمک دمک تو بیوقوفوں کو متاثر کرتی ہے اور ان کی عقلوں پر چھا جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ان میں کا ایک شخص بھی ایسا نہیں ہوتا جو اپنی توجہ کو کسی نہ کسی درجے میں جاہ و مال کے حصول کے اندر نہ لگائے ہو اور یہ دونوں (یعنی جاہ و مال) فانی ہیں۔ جس کے سامنے علمِ زہد آشکارا ہوا اور اس کے فائدے سے واقف ہوا وہ اپنے اعضاء و جوارح کو قابو میں رکھ کر ممنوعاتِ شرع سے بچنے کی صورت پیدا کر لیتا ہے۔ اس راستے سے نفس کا تزکیہ ہوگا اور جب تزکیۂ نفس ہوگا تو آئینۂ قلب روشن ہو جائے گا۔ اور اس کے اندر گناہ کی برائی ظاہر ہونے لگے گی نیز توجہ الیٰ اللہ کا ارادہ قلب میں پیدا ہو جائے گا۔ وہ اللہ کے ماسوا کو نظر انداز کر دے گا۔ اس وقت بدن بھی اسی طرح نرم ہو جائیں گے جس طرح دل نرم ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ ۚ

(پھر ان کے بدن اور دل اللہ تعالیٰ کے ذکر کے وقت نرم ہو جاتے ہیں)

انسان اپنے اعضاء و جوارح پر پورا پورا کنٹرول اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک قلب ایسا بیدار نہ ہو جائے جو برابر محاسبہ کرتا رہے۔ . . . . .

وصیت

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔ اللّٰہ یجتبی الیہ من یشاء ویھدی الیہ من ینیب۔ (اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے چھانٹ لیتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی طرف دل سے متوجہ ہوتا ہے اس کو ہدایت دیتا ہے) انسان اپنے نفس امّارہ اور کھانے پہننے میں اس کی خواہشوں اور لذتوں کی رعایت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے محجوب اور بعید ہوجاتا ہے ۔ اور اس کے اوقات (بیں کی (بے ضرورت) مخالطت و مجالست سے برباد ہوتے ہیں ۔ جس کے لئے اللہ تعالیٰ خیریت چاہتا ہے اس کو رشد و صواب کا الہام کرتا ہے ۔ اور اس کے سامنے یہ امر واضح کردیتا ہے کہ دنیا اور اہل دنیا عنقریب فنا ہونے والے ہیں اور سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی باقی رہنے والا نہیں ہے ۔ بندہ اپنی قبر میں اپنے اعمال کے ساتھ اپنے مولا و خالق کے سامنے ہوگا ۔ (یہ بات اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ذہن نشین ہوجاتی ہے تو) انسان غفلت کی نیند سے بیدار ہوجاتا ہے اور اپنے اوقات کو غنیمت سمجھنے لگتا ہے اور یہ جان لیتا ہے کہ وہ اپنے نفس پر اس وقت تک غلبہ حاصل نہیں کرسکتا جب تک اپنے اوقات کی حفاظت نہ کرے ۔ ......

دین کا معاملہ، صنائع میں سے کسی صنعت سے کم نہ سمجھا جائے ۔ کوئی صنعت بھی بغیر استاد کے حاصل نہیں ہوتی (پھر دین بغیر سیکھے کیسے حاصل ہوسکے گا) ...... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "میری اُمت کے علماء انبیاء بنی اسرائیل کی مانند ہیں" اس ارشاد میں علماء سے مراد وہ علماء ربانی ہیں جو متقی اور زاہد ہوں ـــــ جس کا قدم راہِ مشیخت میں صحیح اٹھا وہ نائبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے ـــــ وہ لوگوں کو اللہ کی طرف بصیرت کے ساتھ دعوت دیتا ہے ۔

جو شخص مخلوق سے اللہ کے لئے محبت کرتا ہے اس کے لئے لازم ہے کہ ایسے شیخ کی طرف متوجہ ہو جس کے متعلق اسے پورا اطمینان ہو کہ وہ مشیخت کا اور اللہ کی طرف دعوت دینے کا اہل اور مستحق ہے ۔ اگر وہاں کئی شخص ہوں جو مسندِ مشیخت پر بیٹھے ہوں اور یہ طالب یہ نہ جان سکتا ہو کہ ان میں کون صحیح طور پر مشیخت کا اہل ہے تو اس کو چاہیئے کہ توقف کرے جلدی نہ کرے

اس لئے کہ ممکن ہے وہ کسی مشیخت کے مدعی کا قصد کرے اور وہ درحقیقت اس منصب کا اہل نہ ہو۔ ایسے شخص کا قول، طالب کو فتنے میں، مبتلا کر دے گا اور وہ طالب کے لئے راہزن ثابت ہوگا۔ ایسی صورت میں طالب اس طور پر برباد ہوگا کہ پھر صلاح پذیر نہ ہو سکے گا۔ پس اس حالت میں طالب اپنی روح کو اللہ کی طرف متوجہ کرے۔ اور اللہ کے سامنے خوب گریہ وزاری کرے اور عرض کرے کہ اے میرے رب تو خوب جانتا ہے کہ میں تیری طرف چلنے کا قصد کر رہا ہوں اور تو اپنے بندوں کو خوب جانتا ہے۔ میں ایک صاحب طریق اور ایسے شیخ کو چاہتا ہوں جس سے دینی و روحانی نفع حاصل کروں اور اس کے ذریعے تیری اطاعت و فرمانبرداری کی طرف ہدایت پاؤں۔ تو مجھے ایسا شخص بتا دے جو اس کام کی اہلیت رکھتا ہو۔ پس اللہ تعالیٰ اس کو خواب میں ایسا شخص دکھلا دے گا یا حالت بیداری میں اس کا سینہ کھول دے گا۔ اس کی آہ و بکا پر رحم اور اس کی دعا قبول فرمائے گا اور ایسے شخص کی جانب رہنمائی فرمائے گا جو اس وقت کا واقعی شیخ کامل ہو۔ جب اللہ تعالیٰ ایسے شخصِ کامل کی طرف رہنمائی فرما دے تو پھر یہ مرید اس کامل کے ساتھ عمدہ وطیرہ اختیار کرے اور پورے طریقے سے اس سے محبت رکھے۔

ایک شخص اس شیخ کامل سے بھی منتفع ہو سکتا ہے جس سے روزانہ ملاقات کر سکے اور اس سے بھی نفع حاصل کر سکتا ہے جس سے ایک ہفتہ یا ایک مہینہ یا ایک سال میں ملاقات کرے اور کبھی شیخ سے اس طرح بھی نفع حاصل کر سکتا ہے کہ اس سے اللہ کے لئے محبت کرے، اگرچہ اس سے ملاقات نہ کر سکے۔ مگر شیخ کا ارشاد اور عبادت کا طریقہ اور سلوکِ طریق حق اس تک پہونچا ہو اور وہ شیخ کے باطن سے ہدایت یاب ہوتا ہو، اس کا ادب اچھی طرح کرتا ہو۔ اور اس کے طریقے کی اقتدار کرتا ہو نیز شیخ کی محبت کی برکت سے اس کی جانب باطن میں، شیخ کے انوار سرایت کر جائیں۔ جس کی وجہ سے اس کا ظاہر و باطن مفید ہو جائے اور آداب مع اللہ صحیح اور درست ہو جائیں، پس اس طرح سے بھی وہ طریقِ استقامت کی طرف ہدایت پا جائے گا۔

(باقی)

معارف الحدیث جلد پنجم

کتاب الاذکار والدعوات

جس کی متفرق قسطیں تین سال سے الفرقان میں شائع ہو رہی ہیں۔

الحمد للہ پریس میں طباعت کے آخری مرحلہ میں ہے

امید ہے کہ انشاء اللہ شروع اپریل میں شائقین و طالبین کو روانہ کی جا سکے گی۔

اُمت کو جو دینی اور روحانی نعمتیں اور دولتیں اللہ کے نبی اعظم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ملی ہیں اُن میں قرآن پاک کے بعد سب سے بلند درجہ ذکر اللہ کے اُن کلمات اور اُن دعاؤں کا ہے جو آپ نے تلقین فرمائیں اور جو آپ کے معمولات میں شامل تھیں۔

اللہ کے ذکر اور اُس کی حمد و تسبیح اور توحید و تمجید کے جو کلمے آپ نے تعلیم فرمائے اسی طرح آپ نے اُس کے جو اسماء حسنیٰ اور بابرکت نام بتائے اور مختلف احوال و اوقات اور مقاصد و حاجات کے لیے جو سیکڑوں دعائیں تلقین فرمائیں، اسی طرح ہر قسم کے شرور و فتن اور آفات و بلیات سے حفاظت کے لیے استعاذہ کی جو دعوات اور اللہ تعالیٰ کے دریائے رحمت میں تلاطم برپا کر دینے والے توبہ و استغفار اور درود و سلام کے جو کلمات آپ نے تعلیم و تلقین فرمائے ——— غور کرنے اور سمجھنے والوں کے لیے اُن میں سے ہر ایک بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک عرفانی معجزہ ہے۔

اس سلسلہ کی حدیثوں کو حدیث شریف کے وسیع ذخیرہ سے چُن کے اُردو زبان میں اُن کی جیسی شرح معارف الحدیث کی اس جلد میں ہو گئی ہے، وہ مصنف پر اور اُردو داں طبقہ پر بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا خاص الخاص انعام ہے۔

مصنف نے دیباچہ میں اُمید ظاہر کی ہے کہ انشاء اللہ یہ کتاب میرے لیے اور اپنے اُن پڑھنے والوں کے لیے جو اُس سے وہ فائدہ اٹھائیں جس کے لیے یہ لکھی گئی ہے، مغفرت اور رحمت کا وسیلہ بنے گی۔

شروع میں ہمارے ملک کے مشہور صاحب قلب و قلم فاضل، ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی (سابق صدر شعبہ فلسفہ عثمانیہ یونیورسٹی) کا ایمان افروز اور وجد انگیز مقدمہ ہے جو ایمان و روح والوں کے لیے بجائے خود ایک نعمت ہے۔

چار سو سے زیادہ صفحات۔ کتابت طباعت دیدہ زیب اور معیاری۔ کاغذ نہایت اعلیٰ۔ قیمت غیر مجلد ۴/۷۵ مجلد ۶/۵۰ مجلد ریگزین

(منیجر) کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

یک دو ساعت صحبتے با اہلِ دل

مجلس حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی مدظلہ

بارھویں مجلس

مرتبہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

یکم ذی قعدہ ۱۳۸۸ھ مطابق ۲۰ جنوری ۱۹۶۹ء کو اورنگ آباد سے بھوپال حاضری ہوئی، یہ بھوپال کے سالانہ تبلیغی اجتماع کا دوسرا دن تھا، لوگ بہ کثرت زیارت کے لیے حاضر ہوتے، اور کچھ دیر بیٹھ کر چلے جاتے، خانقاہ کا اندرونی و بیرونی دالان اس طرح کھچا کھچ بھرا تھا کہ حضرت تک پہونچنا بھی مشکل تھا، مولانا انعام الحسن صاحب (امیر جماعت تبلیغ) کی ملاقات کے لیے تاج المساجد جانے، اور سفر کے تکان کی وجہ سے مجلس میں حاضری و استفادہ اور کچھ قلم بند کرنے کی نوبت نہ آئی، اس مرتبہ راقم الحروف حضرت ہی کا مہمان تھا، اور حضرت نے از رہ عنایت و شفقت دولت خانہ کے اس حصہ میں جس میں مولانا عبد الشکور صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قیام رہا کرتا تھا ٹھہرایا،

۲ ذی قعدہ ۱۳۸۸ھ مطابق ۲۱ جنوری ۱۹۶۹ء کو بھی زائرین و واردین و صادرین کی کثرت ہی، معمول قدیم کے مطابق اطمینان کی مجلس، اور منضبط و مسلسل گفتگو نہ ہو سکی، کتب تصوف و صوفیہ و عارفین کے کلام کے سمجھنے میں جو غلط فہمیاں، التباس اور تضاد واقع ہوا ہے، اور جس طرح لوگوں نے ان کے کلام کو مختلف محملوں پر حمل کیا ہے، اور متضاد نتائج نکالے

ہیں، اس کی توجیہہ فرماتے ہوئے ارشاد ہوا کہ کسی طبقہ یا گروہ کا کلام سمجھنے کے لیے اس کے اصطلاحات و محاورات کا سمجھنا بہت ضروری ہے، کلام کے سمجھنے کے لیے نہایت ضروری ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ متکلم کی مراد کیا تھی، محض الفاظ کے معنی جاننا کافی نہیں، اس کا لہجہ اور انداز، اور موقعہ و محل سمجھنا بھی ضروری ہے۔ ایک شخص نے ایک خادم سے کہا "روکو، مت جانے دو" اس نے اس جملہ کے معنی یہ سمجھے کہ "روکو مت، جانے دو۔" اس نے کوئی روک ٹوک نہیں کی، اور سب لوگ چلے گئے، ان بزرگ نے اس شخص سے محاسبہ کیا کہ میں نے تو پاسبان اور چوکیدار بنا کے کھڑا کیا تھا، تم نے سب کو جانے دیا، اس نے اسی جملہ کی سند پکڑی کہ آپ نے تو خود فرمایا تھا کہ "روکو مت، جانے دو۔" اہل کلام، اور ادیب معمولی تصرف سے عبارت کو کچھ سے کچھ کر دیتے ہیں، ایک صاحب کا نام محمد کالے تھا، کسی ادیب و شاعر نے اس کا کتنا عمدہ سجع بنایا،

ہر دم نام محمد کالے

ان اصطلاحات و مقاصد کو نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگوں نے خواجہ حافظ کے کلام سے کیا کیا سمجھا، اور کس کس چیز کی سندیں لیں!

فرمایا کہ طرق و سلاسل طبائع و زمانے کے اختلاف کے مطابق وضع ہوتے رہے، جس زمانہ میں جس طرح کی طبیعتیں اور حالات تھے، اس زمانہ میں اسی کے مطابق بزرگوں نے اصلاح و تربیت کے طریقے وضع کیے، اور اسی کے مطابق ان میں تغیر و تبدل ہوتا رہا، اس کی مثال لباس کی سی ہے۔ سردی کا ایک لباس ہوتا ہے، گرمی کا ایک لباس، ہر موسم کے لیے ایک ہی لباس کو پکڑا نہیں جا سکتا، میں سردی میں جبہ اور دگلا پہنتا ہوں، لیکن مستقل "صاحب جبہ" نہیں ہو سکتا، لوگوں نے طرق کو مقصود بالذات سمجھ لیا اور ان میں ان کے بارے میں عصبیت و حمیت پیدا ہو گئی، ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے، بلکہ دوسرے کی تحقیر کرنے لگے،

شام کو خانقاہ میں ملاقات و زیارت کرنے والوں کی وجہ سے حضرت بھی بیٹھ گئے اور مجلس شروع ہو گئی، بمبئی کے ایک دیندار تاجر، اور تبلیغی جماعت کے ایک ممتاز کارکن حاجی علاء الدین صاحب پالن پوری نے عرض کیا، کہ میرے ایک دوست نے چلتے وقت حضرت

سے اپنی ایک پریشانی دور ہونے کے لیے دعا کی درخواست کی تھی، اور کچھ پڑھنے کو پوچھا تھا، ان کا ایک ۱۳-۱۴ برس کا لڑکا ۷-۸ ماہ سے گم ہوگیا ہے، وہ سخت پریشان ہیں، حضرت نے سورہ والطارق پڑھنے اور خاص طور پر "انہ علی رجعہ لقادر" کا زیادہ سے زیادہ ورد رکھنے کی ہدایت فرمائی، اور فرمایا کہ ایسے کام ایجنٹوں اور خطوط کے ذریعہ ٹھیک نہیں ہوتے، تاثیر کم ہو جاتی ہے، ان اوراد و اذکار کے لیے جتنا اہتمام کیا جائے گا، اور طالب سے جس قدر اُن کی عظمت و طلب صادق کا اظہار ہوگا، اسی قدر ان میں قبولیت و تاثیر پیدا ہوگی، مولانا عبدالشکور صاحب ایک مرتبہ حج سے واپسی پر بہت دن ٹھہرے، لکھنؤ جا کر لکھا کہ میں مُدّ کی سند لینے کے لیے آنے والا ہوں، میں نے لکھا کہ آپ تو اتنے دن یہاں مقیم رہے، فرمادیا ہوتا تو اس کی بھی تعمیل کردیا، جواب میں تحریر فرمایا کہ اس مقصد کے لیے مستقل سفر ہی مناسب ہے، میں اس کو ضمنی طور پر نہیں کرنا چاہتا تھا، چنانچہ مستقل سفر فرمایا اور سند حاصل کی۔

فرمایا کہ بعض لوگ کثرت سے وظائف پڑھتے ہیں، ان کا سارا وقت وظائف سے گھرا رہتا ہے، جس بزرگ نے جو بتا دیا، اور کسی کتاب میں جو کچھ دیکھ لیا اس کو بھی پڑھنا شروع کردیا، پھر شکایت کرتے ہیں کہ وظائف میں تاثیر نہیں، میں اتنے دن سے وظائف پڑھ رہا ہوں، میرا کام نہیں ہوا، وظائف پر اعتماد ایسے ہی ہے جیسے کسی کو اپنی مزدوری اور محنت پر ناز ہو، اور اس پر بھروسہ کرے، پھر کریم کے کرم، بے استحقاق عطا، اور اس کے جود وسخا پر اعتماد کہاں رہا، اپنے فقر و بے بضاعتی پر نظر ہونی چاہیے، کہ میں تو خالی ہاتھ ہوں، البتہ وہ کریم بندہ نواز اور گدا پرور ہے (اللّٰھُمَّ اِنَّ مغفرتك اوسع من ذنوبي ورحمتك أرجى عندي من عملي)[1]

یہاں ایک منشی مبارک علی صاحب تھے، ہم سے تعلق رکھتے تھے، بہت اوراد و وظائف پڑھتے تھے، ایک دن میں دوپہر کو سو رہا تھا، پریشان ہو کر خانقاہ میں آئے، کہا کہ جگا دیجئے میں بہت پریشان ہوں، میں اٹھ کر آیا تو معذرت کرنے لگے کہ تکلیف دی، میں نے کہا کہ اگر یہ ذرا سی تکلیف بھی ہوئی تو آپ کے احسانات تو بہت ہیں، ان کے مقابلہ میں یہ کوئی تکلیف

---

[1] اے اللہ تیری مغفرت میرے گناہوں سے زیادہ وسیع ہے اور مجھے اپنے اعمال سے زیادہ تیری رحمت سے امید ہے۔ ۱۲

نہیں، کہنے لگے کہ اب برداشت نہیں ہوتا، جو لوگ میرے ممنونِ احسان درپردہ تھے، اب مجھ سے کترانے اور آنکھیں چرانے لگے، میں نے کہا سب وظائف چھوڑ دیجیے، اور اللہ کے کرم پر اعتماد کیجیے، انھوں نے ایسے ہی کیا، میں دہلی گیا ہوا تھا، ان کا خط آیا کہ اللہ نے بڑا فضل فرمایا، میری پریشانی دور ہو گئی۔

فرمایا کہ لوگوں کو نئی نئی دعاؤں، اور سریانی و عبرانی زبان کے وظائف کا شوق ہوتا ہے۔ ایک صاحب نے مجھ سے دعائے مشبخ کی فرمائش کی، میں نے کہا کہ مجھے تو قرآن کی سورتیں اور دعائیں آتی ہیں، دعائے مشبخ سے میں ناواقف نہ تھا، یہ سریانی زبان کی ایک دعا ہے، میں جب نوجوانی میں حیدرآباد میں تھا تو مجھے اس کے سیکھنے کا شوق ہوا، حیدرآباد میں ایک بزرگ ملال علی شاہ صاحب تھے وہ پرانے پل سے آگے کاغذی گوڑہ میں رہتے تھے، میں اپنے ایک دوست کیساتھ وہاں پہونچا، معلوم ہوا کہ حضرت شہر گئے ہوئے ہیں، بہت دور سے آیا تھا، ان کے انتظار میں وہیں بیٹھ گیا، وہاں عُرس کی تیاریاں ہو رہی تھیں، کمانیں لگ رہی تھیں، کچھ دیر کے بعد حضرت تشریف لائے، خدام پر بہت ناراض ہوئے، کہ تم بہت ناسمجھ اور بے سلیقہ ہو، تمہیں کوئی ڈھنگ نہیں، یہ کیا لگا رہے ہو، یہ کس طرح بنا رہے ہو؟ بہت دیر تک ان پر غصہ و عتاب فرماتے رہے، پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے کہ کیوں کھڑے ہو؟ ہم لوگ گھبرائے کہ اب ہماری شامت آئی، عرض کیا کہ دعائے مشبخ سیکھنے اور اس کی اجازت حاصل کرنے کے لیے آئے ہیں، بہت ناراض ہوئے، اور کہا کہ جس نے تم کو یہ راستہ بتایا اس کو لٹا کر پانچ جوتے مارو، یہ کوئی مذاق ہے، جب کسی کو خلافت دی جاتی ہے، تو اس وقت اس دعا کی اجازت دی جاتی ہے، ہم اپنا سا منہ لے کر چلے آئے، اور ہم نے کہا کہ سورہ اخلاص، سورہ کوثر جیسی عظیم سورتیں تو بلا خلافت کے مل جاتی ہیں۔ اور یہ دعائے سریانی بغیر خلافت کے نہیں ملتی۔

فرمایا کہ کتب تصوف و مکتوبات شریف وغیرہ میں جو بڑے بڑے مراقبات آئے ہیں، غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سب قرآن شریف کی آیات میں موجود ہیں، اسی طرح ادعیہ ماثورہ اور اذکار مسنونہ میں تفکر کرنے، اور ان کو شعور و استحضار کے ساتھ پڑھنے سے وہ سب مقاصد حاصل ہوتے ہیں جو ان مراقبات سے مقصود ہیں، ایک سوتے وقت

کی اس دعا ہی کے الفاظ و معانی پر غور کیجیے، جس کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو تلقین کی[1] کیسی جامع مراقبات دعا ہے، اور اس سے تسلیم و رضا، توکل و اعتماد اور کیسی فنائیت حاصل ہوتی ہے۔ "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْلَمْتُ وَجْھِیْ اِلَیْكَ وَفَوَّضْتُ أَمْرِیْ اِلَیْكَ وَالْجَأْتُ ظَھْرِیْ اِلَیْكَ رَغْبَةً وَّرَھْبَةً اِلَیْكَ لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجَأَ مِنْكَ اِلَّا اِلَیْكَ اٰمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِیْ اَنْزَلْتَ وَنَبِیِّكَ الَّذِیْ أَرْسَلْتَ"[2]

فرمایا کہ قاعدہ ہے کہ آدمی جتنا بلندی کی طرف جاتا ہے [illegible] ثقیل اجزا اور غیر ضروری اور بوجھل اشیا کو نیچے چھوڑ جاتا ہے، میں نے ماسٹر بدیع الحسن صاحب [illegible] ریاضی و طبعیات کے استادوں سے چاند کی طرف جانے والے راکٹ کا پورا حال پوچھا [illegible] کی تفصیلات معلوم کیں، معلوم ہوا کہ راکٹ اپنے بہت سے حصوں کو نیچے گراتا ہوا گیا، اور جب وہ چاند کے مدار میں داخل ہوا تو اس کا صرف ضروری اور مناسب حصہ رہ گیا، اسی طرح صوفیہ کرام نے اپنے مراقبات و روحانی عروج میں عالم علوی کی سیریں کی ہیں، وہ بھی اس پرواز میں اپنے کثیف و ثقیل اجزا کو پیچھے چھوڑ دیتے تھے، اور صرف اپنی لطافت روح اور قوت عروج سے اس عالم میں پہونچتے تھے، اور ملکوت السموات کی سیر کرتے تھے، اس سیر میں [illegible] چاند کو [illegible] سے آتنا نیچا دیکھتے تھے جتنا اس زمین پر رہنے والے [illegible] شیخ اکبر حضرت مجدد وغیرہ نے اپنے ان عروجات و سیر آفاقی کے منازل کو [illegible]

---

[1] صحیح بخاری کتاب الدعوات کے آخر میں یہ روایت موجود ہے۔

[2] اے اللہ میں نے اپنے کو تیرا فرمانبردار بنا دیا، اور اپنا معاملہ بس تیرے سپرد کر دیا، اور تجھ ہی کو اپنا پشت پناہ بنا لیا، تیری نظر کرم کے شوق اور امید میں تیرے غضب اور عذاب سے ڈرتے ہوئے، تیرے سوا کوئی جائے پناہ نہیں اور کوئی نجات کی صورت نہیں، میں ایمان لایا تیری نازل فرمائی ہوئی کتاب پر اور تیرے بھیجے ہوئے رسول پاک پر۔

تیرھویں مجلس

۳ ذی قعدہ ۱۳۸۸ھ مطابق ۲۲ جنوری ۱۹۶۹ء وقت صبح ۹½ بجے (چہارشنبہ)

آج حضرت کی طبیعت کچھ مضمحل تھی، کمر میں کئی روز سے درد تھا، آج اس میں غالباً کچھ زیادتی ہوگئی، اشراق پڑھ کر خلاف معمول لیٹ گئے اور آنکھ لگ گئی، مولانا انعام الحسن صاحب چند رفقاء و خدام کے ساتھ ملنے آئے، یہ معلوم کرکے کہ حضرت آرام فرما رہے ہیں، راقم سطور کے پاس اندر مہمان خانہ میں آگئے، کچھ دیر کے بعد جلسہ میں شرکت کرنے والے مہمانوں اور خانقاہ میں آنے والوں کا ہجوم ہوگیا، اندر کا دالان بالکل بھر گیا، باہر بھی فرش کا انتظام کرنا پڑا، حضرت بیدار ہوئے اور مولانا کے میرے پاس تشریف رکھنے کا علم ہوا، تو بجائے باہر خانقاہ میں جانے کے، اندر ہی تشریف لے آئے، اور دالان کے کنارہ جہاں جوتے اتارے جاتے ہیں، اس کے پاس ہی بیٹھ گئے، حاضرین نے صدر مجلس میں تشریف رکھنے کے لیے عرض کیا، تو فرمایا کہ مجھے یہیں راحت ہے، بے تکلفی بڑی راحت کی چیز ہے، میں بے تکلفی کو بہت پسند کرتا ہوں، آدمی کو چاہیے کہ جیسی ضرورت ہو، اور ساتھی کو جس خدمت و راحت کی ضرورت ہو پہونچائے، میرے ساتھ حیدرآباد سے ایک لڑکا چلا آیا تھا، وہ میرے ہی پاس رہتا تھا، ایکدن اس کو تکلیف تھی، میں اس کی کمر دبانے لگا، منشی حلیم الدین صاحب بڑے زور سے چونکے، اور کہا کہ میں یہ خدمت انجام دوں گا، گویا ان کو حضرت قدوۃ السالکین کا یہ کام کرنا پسند نہ آیا، میں نے کہا کہ یہ مجھے آرام پہونچاتا ہے۔ اگر میں اس کو آرام پہونچا دوں تو کیا حرج ہے؟ اسلام خصوصیات کو مٹاتا ہے،

مولانا انعام الحسن صاحب اور انکے بعض رفقاء نے یورپ میں تبلیغی اثرات جماعتوں کی نقل و حرکت اور مساجد کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہونے کا ذکر کیا، یہ بھی تذکرہ فرمایا کہ جماعت کے لوگوں نے پیرس میں ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کی، اس مرتبہ رمضان مبارک میں وہاں تراویح ہوئی، ساٹھ ستر آدمی تراویح میں شریک ہوتے تھے۔ اخیر عشرہ میں ایک صاحب نے اعتکاف بھی کیا، خط میں تھا کہ پیرس کی تاریخ میں شاید یہ پہلا اعتکاف ہے، حضرت نے ان واقعات پر بڑی مسرت کا اظہار کیا، اور

فرمایا کہ خدا کی شان ہے کہ کفر و ظلمت کے مرکزوں میں یہ تبدیلیاں ہو رہی ہیں، اور اسلام و ایمان کے مرکزوں میں، اور بزرگوں کے خاندانوں میں جہاں پشتوں سے دینداری، اور بزرگی چلی آرہی تھی مغرب کی نقالی، دین سے بے رغبتی بلکہ دین کی تحقیر اور شعائر اسلام سے وحشت، اور ان کے ساتھ تمسخر کے مناظر دیکھنے میں آتے ہیں، ع چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی، فرمایا کہ ہم تو اسی وقت سے معتقد ہیں، جب نظام الدین کی یہ مسجد بہت مختصر، اور کچی بنی تھی، اور کچھ معذور و اپاہج سے میواتی وہاں پڑے رہتے تھے، ہمیں تو یہ باغ اسی وقت لہلہاتا نظر آتا تھا، میں ایک مرتبہ نظام الدین زیارت کے لیے گیا، زیارت سے فارغ ہو کر جانے لگا، تو کسی نے کہا کہ ایک چھوٹی سی مسجد اور ہے، وہاں ایک چھوٹا سا مدرسہ، اور ایک بزرگ رہتے ہیں، وہاں بھی چلیے، میں حاضر ہوا، اور ان بزرگ (مولانا الیاسؒ) کو دریافت کیا، کہا گیا کہ وہ اس وقت مسجد کے باہر گئے ہوئے ہیں، ظہر کی نماز کے وقت ملیں گے، میں ٹھہر گیا، ظہر کی نماز کا وقت آیا، وہ تشریف لائے، میں نے ان کے پیچھے نماز پڑھی یا تو اپنے والد صاحب کے پیچھے (ایسے اطمینان کی) نماز پڑھی تھی، یا ان کے پیچھے پھر میں نے مولانا یوسف صاحب کا دور بھی دیکھا، ایک دن میں نے ان سے کہا کہ میں نے آپ کو اس وقت دیکھا تھا کہ جب آپ صفوۃ المصادر پڑھتے تھے، بڑی سادگی سے بولے کہ اب بھی تو وہی پڑھ رہا ہوں،

محمد رفیق صاحب کانپوری نے جو حضرت سے ملے ہوئے بیٹھے تھے، پوچھا کہ حضرت مزاج کیسے ہیں؟ فرمایا کہ الحمد اللہ بہت اچھے ہیں، اور اچھے ہی رہتے ہیں، ہاں جس دن قرآن مجید نہ پڑھوں، اس دن مزاج ٹھیک نہیں رہتا "ومن یعش عن ذکر الرحمٰن نقیض لہ شیطاناً فھو لہ قرین[1]" مزاج ہی پر سب انحصار ہے۔

ایک بزرگ نے (مکاشفہ میں) دیکھا کہ ایک بچھو ان کے بائیں مونڈھے پر بیٹھا ہوا ہے، اس کا ڈنک ان کے قلب پر ہے، اور وہ موت کا خیال ان کے دل سے ہٹاتا رہتا ہے، موت کے خیال اور آخرت کے یقین سے عمل صالح کی فکر، اور زاد راہ کا اہتمام لازماً پیدا ہوتا ہے قرآن شریف میں آتا ہے کہ "فمن کان یرجو لقاء ربہ فلیعمل عملاً صالحاً ولا یشرک[2]"۔

---

[1] اور جو غافل رہے خداوند رحمٰن کی یاد سے اس پر ہم مقرر کر دیتے ہیں، ایک شیطان پھر وہ اس کے ساتھ لگا رہتا ہے ۱۲

بعبادة ربه أحدا"۔ لوہے کا گولہ یا گیند ڈھلوان کی طرف خود بخود جائے گا، اس کو دھکا دینے یا لڑھکانے کی ضرورت نہیں، حضرت عمرؓ کی انگوٹھی پر نقش تھا "کفی بالموت واعظاً"____
ڈاکیہ کے تھیلے میں پندرہ۱۵ ہزار [illegible] کا ایک بے تکلف دوست پندرہ۱۵ روپے مانگتا ہے، وہ نہیں دے سکتا، حالانکہ اس کے پاس [illegible] انہیں پندرہ۱۵ ہزار روپے ہیں، کیوں؟ اس لیے کہ اسکو معلوم ہے کہ اس کو ڈاکخانہ میں پائی پائی کا حساب دینا ہے، وہ غنی بھی ہو، مفلس بھی، مختار بھی ہے، مجبور بھی، یہی اس انسان کا حال ہے جس کو آخرت کا کھٹکا لگا ہوا ہے، وہ بھی ڈاکیہ کی طرح غنی بھی ہے، قلاش بھی، آزاد بھی ہے، غلام بھی، مختار بھی ہے، مجبور بھی، اپنے اختیار سے کام لے سکتا ہے، اور اپنی ملک میں آزادانہ تصرف بھی کر سکتا ہے، مگر آخرت کے حساب وکتاب کا خوف لگا رہتا ہے،
فرمایا کہ موت کے وقت بعض لوگوں کو بڑا اضطراب ہوتا ہے، یہ گھبراہٹ کیسی؟ اسی وقت کے لیے تو ساری کوشش اور تیاری ہوتی ہے، ایک شخص روئی دھنکوا تا ہے، صاف کرتا ہے، پھر رزائی بنا تا ہے، اب جب سونے اور سردی کا وقت آیا تو رزائی سے گھبراہٹ کیوں؟ آرام اٹھانے کا تو اب وقت آیا ہے، [illegible] وقت جتنا قریب آتا جا رہا ہے، فرحت بڑھتی جا رہی ہے، ایک نوجوان [illegible] کے وقت میں اسے دیکھنے گیا، بولا اماں مجھے پکڑیے، میں چلا، [illegible] کو آواز دے [illegible] ایک سن رسیدہ بزرگ بہت بیمار تھے، میں دیکھنے گیا، کہنے لگے کہ ایسی دنیا دیکھ رہا ہوں، جس میں نہ دن ہے نہ رات، میں سمجھ گیا کہ دوسرا عالم شروع ہو گیا ہے، ایسے وقت میں کلمہ پڑھنے کو کہا جائے تو اعزا برا مانتے ہیں کہ بدشگونی کر رہا ہے، میں نے کہا کہ آپ کے دل پر گھبراہٹ معلوم ہوتی ہے؟ کہنے لگے ہاں، میں نے کہا کلمہ اس کا علاج ہے، گھبراہٹ دور ہو جائے گی، آپ کلمہ پڑھیے۔
فرمایا قرآن مجید میں ایسی چوٹیں ہیں، اور ایسے کوڑے ہیں کہ پہاڑ بھی پاش پاش ہو جائیں، انسان تو انسان جنوں نے کہا کہ "انا سمعنا قرآنا عجبا" جنوں کی طاقت سب جانتے ہیں، اس پر آپ نے واقعہ سنایا کہ حضرت شیخ محمد غوث گوالیاری ابتدائی دور میں زبردست عامل تھے، بہت سے

۱؎ جسے امید ہو اپنے رب سے ملنے کی وہ نیک اعمال کرے [illegible] اپنے رب کی عبادت اور بندگی میں کسی کو شریک نہ کرے ۱۲

جنوں کو تابع کر رکھا تھا، وہ متوکل تھے، کبھی فرماتے کہ اُس شہر میں نماز پڑھنا چاہتا ہوں، دم کے دم میں وہاں پہونچا دیتے، کتنے جنوں کو انھوں نے جلا کر راکھ کر دیا، کتنوں کو درخت سے لٹکا کر مارا، ایک ایسے ہی جن کو انھوں نے جلا دیا تھا، اس کا ایک بیٹا تھا، اس کی ماں نے اس سے کہا، کہ اگر تو اپنے باپ کا بیٹا ہے، تو اپنے باپ کا انتقام لے کر دکھا، وہ ملک مغرب میں جہاں جنوں کے عملوں، اور سحر وغیرہ کا بڑا رواج تھا، اِس فن کو سیکھنے گیا، اور بڑے بڑے عملیات حاصل کیے تھے، واپس آیا تو ماں نے کہا کہ نہیں، ابھی خامی ہے، پھر جا، پھر سیکھ کرکے آیا، پھر ماں نے واپس کیا، تیسری مرتبہ سیکھ کر آیا، ماں نے کہا کہ اب ٹھیک ہے، اپنا کام کر، محلہ میں ایک عورت پر اس کا تسلط ہوا، حضرت شیخ محمد غوث کو اطلاع کی گئی، پیغام بھیجا کہ جان کی اماں چاہتا ہو تو چھوڑ کر چلا جا، اس نے کہا کہ میں تو حضرت کی قدمبوسی کے لیے حاضر ہوا ہوں، انھوں نے فرمایا کہ اگر جاتا نہیں تو میں خود آتا ہوں، کہا کہ مجھے تو حضرت ہی سے ملاقات کا اشتیاق ہے، وہ تشریف لائے، عمل کیا، مگر کچھ اثر نہیں ہوا، وہ خود انھیں کے پیچھے پڑ گیا، آخر میں وہ سمجھ گئے کہ زبردست ہے، فرمایا کہ ایک چلّہ کی مہلت دے (تاکہ میں اپنے عملیات تازہ کر لوں) اس نے کہا تین چلّوں کی مہلت ہے، مہلت ختم ہونے پر ان کو اندازہ ہوا کہ ان کا اس سے بس نہیں چلتا، آخر میں انھوں نے شکست قبول کر لی، اُس نے کہا کہ درخت میں اُلٹا لٹکا کر ماروں گا، آپ تڑپ تڑپ کر جان دیں گے، وہ زندگی سے مایوس ہوئے، اگلے دن صبح کی نماز انھوں نے ایک مسجد میں پڑھی، وہاں ایک گمنام درویش کس مپرسی میں پڑے رہتے تھے، کبھی انھوں نے اُن کی طرف التفات نہیں کیا تھا، دل میں آیا کہ اب دنیا سے رخصت ہو رہا ہوں، ان کو بھی سلام کر لوں، سلام کیا اور کہا کہ اب ملاقات نہ ہوگی، فرمایا، کیوں؟ کہا کہ یہ (جن) نہیں مانتا، اُن درویش نے اس کو مخاطب کرکے کہا کہ اپنی ماں سے کہدینا کہ تمہاری بات پوری ہوگئی، اب اِن کی جان صدقہ کر دے، اس کا اجر آخرت میں ملے گا، اُس نے جواب دیا کہ ماں تابعدار ہیں، حضرت کا حکم سر آنکھوں پر، اُن کی جان بچ گئی، انھوں نے دیکھا کہ اخلاص سے اللہ کا نام لینا کیا اثر رکھتا ہے، جو کام زبردست عملیات نہ کر سکے، وہ چند سیدھے سادے لفظوں نے کر دیا، اس سے وہ سارا شغل چھوڑ کر فقر و درویشی کی طرف رجوع ہوئے اور شیخ کامل

بن گئے)

فرمایا کہ طالبین و سالکین کی تجلیات و مقامات پر نظر رہتی ہے، اپنے معاصی و کمزوریوں پر نظر نہیں رہتی، اگر معصیت پر نظر ہو تو سلوک تمام ہو جائے، مجھے بعض بھولے بھالے طالبین اپنے مقامات کی اطلاع دیتے رہتے ہیں، کہ میں مسمیٰ کا مراقبہ کر رہا ہوں، میں فلاں لطیفہ میں مشغول ہوں، مجھے ہنسی آتی ہے، فرمایا کہ احکام شریعت کو نظر انداز کرنے، اور انکو پس پشت ڈالنے سے لوگ نہیں گھبراتے، میں مسجد کے محراب میں کھڑا ہو کر کچھ بیان کر رہا ہوں، ایک بچہ مجھے ٹوک دیتا ہے، کہ آپکے پیچھے طاق پر قرآن و حدیث کی کتابیں رکھی ہوئی ہیں، قرآن و حدیث کو پیٹھ ہو رہی ہے، میں اس کو مان لیتا ہوں، اور قرآن و حدیث کا ادب کرتا ہوں، لیکن حکم شرعی کی مخالفت کرنے والوں، اور خدا و رسول کو نظر انداز کرنے والوں سے کہا جائے، کہ کیا یہ قرآن و حدیث کی طرف پشت کرنے سے کچھ کم ہے؟ کیا یہ اہانت اور بے ادبی نہیں ہے؟ تو اس کا کچھ جواب نہیں۔

آج شام کو خلاف معمول بعد مغرب پھر مجلس شروع ہو گئی، فرمایا کہ تقابل سے حقیقت کھلتی ہے، اور نعمت کی قدر ہوتی ہے، بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیبت میں سامری کے بہلانے پھسلانے سے جب بچھڑے کی پوجا کی تو ان کے لیے توبہ کا طریقہ یہ تجویز ہوا کہ جو گوسالہ پرستی سے محفوظ رہے، وہ اُن کو قتل کریں جو اُس میں ملوّث ہوئے، لیکن امت محمدیہ صلعم کے لیے گناہ سے توبہ کا طریقہ، یہی توبہ اور استغفار ہے، اب کسی کو اگر بنی اسرائیل کے ساتھ خدا کے اس معاملہ کا علم نہیں، تو اس کو توبہ و استغفار کے اس اسلامی طریقہ کی قدر کیا آئے گی؟ اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی کو نسخہ لکھ کر دیدیا گیا، اور کہہ دیا گیا کہ جڑی بوٹیاں چھال اور پتیاں، جنگلوں اور پہاڑ کے دامنوں سے تلاش کر کر کے لاؤ، پھر ان کو کوٹو، چھانو، جوش دو، اور پیو، اور ایک شخص کو بنی بنائی معجون دیدی گئی، اور کہدیا گیا کہ استعمال کرو، اس معجون کی خاصیت یہ ہے کہ اس کو کھا کر کوئی آدمی (ہمیشہ کے لیے) مرتا نہیں، فنائے ابدی اور موت حقیقی اس پر حرام ہے، "لا یذوقون فیھا الموت" اس معجون کا استعمال کرنے والے موت کے ذائقہ سے بھی آشنا نہیں ہونگے البتہ معجون کی تھوڑی سی کڑواہٹ، اور بدمزگی (نفس کی گرانی اور عادات کی مخالفت) گوارہ کرنا پڑے گی، کہ اس سے مفر نہیں "الا الموتۃ الاولیٰ" یہ نوش دارو، اور آب حیات استعمال

کرکے، عالم برزخ میں کچھ دن رہنا پڑے گا، پھر بقائے دوام ہے، استعمال کرنے کے اوقات بتائے گئے، کہ کچھ طلوع آفتاب سے پہلے استعمال کرلیا کرو، تھوڑی سی زوال آفتاب کے بعد، ایک خوراک عصر کو، ایک مغرب کو، ایک عشا کو (نماز کے پانچ اوقات) نورالصباح میں تمہنے کی قدر جب آئے گی، جب آدمی کچھ دن جھونپڑے میں رہا ہو، برسات کی رات ہو، جھڑی لگی ہو، چھپّر اِدھر سے ٹپکا تو کھٹیا اُدھر لے گئے، اُدھر ٹپکا تو اِدھر گھسیٹ لائے، اور جب سب طرف سے ٹپکنے لگا تو گدڑی لپیٹ کر بیٹھ گئے اور رات آنکھوں میں کاٹ دی، اب اسی غریب آدمی کو جب امیروں کے محل میں رہنا نصیب ہوگا، تب اس نعمت کی قدر آئے گی، اُمم سابقہ کے احکام و شرائع سے تقابل کرکے دیکھا جائے گا، تو معلوم ہوگا کہ اللہ نے احکام شریعت کی شکل میں کیا نعمت عطا فرمائی ہے اور کن کن زحمتوں اور مشقتوں سے بچایا ہے، اونٹ جب پہاڑ کے نیچے آتا ہے تو بلی کا بچہ نظر آتا ہے۔

فرمایا کہ لوگوں کے لیے عبادات و نوافل سبھی سہل ہیں، لیکن شریعت کے احکام کا احترام، جنت کی عظمت، اور دوزخ سے جو وحشت اور دہشت ہونی چاہیے، وہ بعض اوقات نہیں ہوتی، ایک صاحب اعتکاف میں بیٹھے ہوئے تھے، خود بھی نیک تھے، اور ان کے والد بھی بہت نیک تھے، پاجامہ ٹخنے سے نیچے رہتا تھا، میں نے کہا کہ آپ ماشاء اللہ نماز روزہ کے پابند ہیں، اعتکاف میں بھی بیٹھ رہے ہیں، پائنچوں کو ٹخنوں سے اونچا رکھنا چاہیے یہ خلاف شریعت امر ہے، بے ساختہ جواب دیا کہ ہاں مجھے معلوم ہے کہ اس کے لیے دوزخ ہے، اللہ اکبر! دوزخ ایسی معمولی چیز ہے، دوزخ کی حقیقت ان کو معلوم ہے، قرآن و حدیث میں اس سے کتنا ڈرایا گیا ہے، اس کے کیسے ہولناک مناظر بیان کیے گئے ہیں، اور اس کا کیسا ہیبت ناک نقشہ کھینچا گیا ہے۔ مومن کو اس سے کیسی دحشت ہونی چاہیے۔

میں اکثر اس لفظ پر چونک جاتا ہوں، کہ نماز پڑھ لی، قرآن شریف پڑھ لیا، وعظ سُن لیا گویا فراغت ہوگئی، حالانکہ فراغت نہیں ہوئی، کام شروع ہوا ہے، ذمہ داری

ے احمد آباد بھوپال میں علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال کی کوٹھی۔

عائد ہوئی ہے، بعض لوگ وعظ سُن لینے ہی کو مقصود سمجھنے لگتے ہیں، حالانکہ وعظ مقصود نہیں ہے، وعظ پر عمل، اور وعظ سے زندگی میں تغیر پیدا ہونا، اور دینی ترقی مقصود ہے، روغن بادام کا استعمال، اور لذیذ کھانا مقصود نہیں، ان کے فوائد مقصود ہیں، مقصود یہ ہے کہ غذا جزو بدن بنے، اور خون صالح پیدا ہو:

قاعدہ اور تجربہ ہے کہ جو چیز روح سے جتنی زیادہ متعلق اور ذات سے اس کی نسبت جتنی قوی ہوتی ہے، اتنی ہی محبوب ہوتی ہے، بالذات محبوب اپنی ذات ہی ہے، جو چیز جتنی روح سے دور ہوتی جائے گی، اتنی ہی مکروہ و مبغوض ہوتی جائے گی، دیکھیے جیتا ناخن کوئی نہیں کٹواتا، اس کے کٹنے سے کتنی تکلیف ہوتی ہے، لیکن جب ناخن بڑھ جاتا ہے، اور ان کا روح سے اتصال ختم ہو جاتا ہے، تو ان سے کتنی وحشت ہونے لگتی ہے، اور آدمی اُن کو کتنی جلد اپنے سے جدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

فرمایا کہ ہارون رشید کے پاس کچھ ڈاکو لائے گئے، جو سزائے موت کے مستحق تھے، انھوں نے کہا کہ امیر المومنین ہم پر دو عذاب جمع نہ کیجیے، ایک موت کا عذاب اور ایک بھوک کا عذاب، خلیفہ نے ان کے لیے کھانا منگوایا ہے اور ان کو کھلایا، انھوں نے کہا کہ امیر المومنین اب آپ کا ہم پر بس نہیں چل سکتا، ہم آپ کے مہمان ہو گئے، ہارون رشید نے یہ سُن کر کہا کہ انھوں نے مجھے بے بس اور لاجواب کر دیا، قرآن شریف میں آتا ہے۔ "تتنزل علیهم الملائكة أن لا تخافوا ولا تحزنوا وأبشروا بالجنة التي كنتم توعدون نحن اولياءكم في الحياة الدنيا وفي الآخرة ولكم فيها ما تشتهي انفسكم ولكم فيها ما تدّعون نزلاً من غفور رحيم"[1] یہ کتنی بڑی بشارت اور کیسی نوید جانفزا ہے۔

---

[1] ان بندوں پر نازل ہوتے ہیں فرشتے، اللہ کی طرف سے یہ پیغام لیکر کہ نہ ڈرو اور نہ غم کھاؤ، اس جنت کی بشارت لو جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، ہم تمہارے رفیق ہیں۔ دنیا اور آخرت میں اور جنت میں تمہارے لیے وہ سب ہو جسے تمہارے جی چاہیں گے اور جو تم مانگو گے، مہمانی ہوگی غفور رحیم پروردگار کی طرف سے۔ ۱۲

المیۂ فلسطین

پس منظر اور مستقبل

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ

ترجمہ از مولوی سید محمد الحسنی مدیر "البعث" و "تعمیر حیات"

(پیش نظر مضمون دراصل مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ایک نئی کتاب "ما قبل النکبۃ وما بعدھا۔" (المیۂ فلسطین، پس منظر اور مستقبل) کا مقدمہ ہے۔ یہ کتاب (جو انکے اس سلسلہ کے مختلف مضامین اور تقاریر کا مجموعہ ہے) عنقریب بیروت سے شائع ہونے والی ہے۔ اس مقدمہ کی نوعیت محض رسمی پیش لفظ کی نہیں ہے بلکہ یہ بجائے خود ایک مستقل مضمون ہے جسمیں متعلقہ مسئلہ کی اصل نوعیت اور اساس پوری طرح واضح ہو گئی ہے۔ اسی لیے اس کا ترجمہ قارئین الفرقان کے لیے پیش کیا جا رہا ہے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝

ہر اس شخص کی نظر میں جو اس کائنات میں خدا کے جاری کردہ قوانین فطرت اور سنت اللہ سے واقف ہے اور اس کی ابدی اور لافانی کتاب قرآن مجید میں غور اور تدبر کا عادی اور تاریخ عالم سے باخبر ہے، یہ قومی سانحے اور تاریخی حوادث جو دنیا کے مختلف ملکوں میں اور مختلف قوموں کے ساتھ پیش آتے رہتے ہیں محض اتفاقات یا اچانک اور بے سبب واقعات کہلانے کے مستحق نہیں بلکہ یہ اُن واقعات و حوادث، تنبیہوں اور تازیانوں کے طویل سلسلہ

کا قدرتی اور حتمی نتیجہ ہیں۔ جن کو بروقت سمجھنے اور اُن سے ٹھیک ٹھیک نتائج اخذ کرنے کی توفیق اللہ تعالیٰ کے اُن ہی بندوں کو ملتی ہے جو کسی درجہ میں مومنانہ فراست کے حامل ہوتے ہیں اور فہم صحیح کی دولت سے محروم نہیں ہوتے اور یہ وہ لوگ ہیں جنکی صفت اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس طرح بیان فرمائی ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِیْنَ — اس میں صاحب فراست بندوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔

یہ حوادث و مصائب زیادہ تر اُن عوامل کا نتیجہ ہیں جو نفسیاتی اور اندرونی طور پر قوم و معاشرہ کی زندگی میں برابر اپنا عمل کرتے رہتے ہیں۔ ان عوامل و اسباب کے مزاج و انداز اور انکے تیوروں کو دیکھ کر ہر سلیم الطبع آدمی اس بات کی پیشین گوئی کر سکتا ہے کہ اس قوم اور معاشرہ کا یہ انجام ہونے والا ہے۔ اس کے لیے نہ اُس کو کسی وحی و الہام کی ضرورت ہے، نہ کسی غیر معمولی ذہانت اور باریک بینی کی۔ وہ محض ان عوامل کو اپنے پیش نظر رکھ کر اُس کے انجام کو اسی طرح بتا سکتا ہے جس طرح وہ شخص جو بارش کے اوقات و علامات جانتا ہے۔ اُس کے آثار دیکھ کر بارش کی پیشنگوئی کر سکتا ہے بلکہ اُس کا وقت بھی متعین کر دیتا ہے۔ حالانکہ اُس کی معلومات صرف موسم کے تغیرات سے باخبری، ملک کی آب و ہوا کے صحیح علم اور اپنے مسلسل تجربوں پر مبنی ہوتی ہیں یا جس طرح قدیم زمانہ میں عرب کے بدّو اپنے تجربہ کی مدد سے بارش اور آندھی کے اوقات بتا دیا کرتے تھے یا آج کی جدید رصدگاہوں کے ماہرین فلکیات و موسمیات پہلے سے اُس کی خبر دے دیتے ہیں۔

پانچویں صدی ہجری میں بیت المقدس پر صلیبیوں کا تسلط اور اس کے بعد ساتویں صدی ہجری میں عالم اسلام پر تاتاریوں کی یورش اور بغداد کی پامالی محض بے سرپیر کے واقعات نہیں تھے جن کو صرف تقدیر کی گردش اور قسمت کی خرابی اور اتفاق زمانہ کہہ کر اپنا پیچھا چھڑا لیا جائے ــــ یہ دونوں واقعات دراصل اس طویل سلسلہ اسباب کا نتیجہ تھے جس میں اخلاقی امراض، حد سے بڑھی ہوئی بے اعتدالی و کج روی، مجرمانہ افعال و حرکات، مسلسل مغالطے اور خود فریبیاں اور ایسے حالات کی موجودگی شامل ہے جس میں کسی زمانہ اور کسی جگہ بھی باقی رہنے کی صلاحیت نہیں اور سب سے بڑھ کر زندگی کا وہ طرز جو خدا و رسول کو

ناپسند ہے اور جو دین صحیح اور عقلِ سلیم کسی اعتبار سے بھی جائز نہیں۔

اگر ہم تاریخ و تراجم، سیر و سوانح اور شعر و ادب کے اُس ذخیرہ پر نظر ڈالیں جس میں اس عہد کے معاشرہ کی عکاسی اور اُس کے رجحانات و میلانات کی سچی تصویر موجود ہے، تاریخ کی ان کتابوں کا مطالعہ کریں جن میں ہر سنہ کے اہم واقعات قلمبند ہیں یا صرف سقوطِ بغداد سے قبل اور سقوط کے بعد کی تاریخ دیکھ لیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ تاتاریوں کی تباہ کاری اور بغداد کی تباہی (نعوذ باللہ) قدرت کا کوئی اندھا بہرا فیصلہ نہیں تھا بلکہ خدائے عزیز و علیم کی حکمت و اندازہ کا نتیجہ اور تقاضا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ چند سطریں ہمارے لیے کافی ہیں جو ابوالحسن خزرجی نے بغداد پر تاتاریوں کے قبضہ سے پہلے اہل بغداد کی حالت بیان کرتے ہوئے قلمبند کی ہیں۔

> "انھیں صرف اپنی جائدادیں بنانے اور آمدنی بڑھانے کی فکر تھی، ملک کے اجتماعی مصالح اور مفادِ عامہ سے ان کو کچھ دلچسپی نہ تھی وہ اُن دُنیاوی امور میں مشغول تھے جن کا کوئی جواز نہیں، حکام کا ظلم بہت بڑھ چکا تھا اور وہ صرف استحصال و انتفاع میں لگے ہوئے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ حکومت کفر سے تو چل سکتی ہے لیکن ظلم کے ساتھ زیادہ دنوں تک باقی نہیں رہ سکتی۔" [1]

دسویں صدی کے ایک مشہور عالم و مؤرخ مفتی قطب الدین پٹنی کی مستعصم کے عہد میں اہل بغداد کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "نرم و گرم بستروں میں آسودہ بغداد کے کنارے چین کی بانسری بجانے والے، آبِ رواں اور صحنِ گلشن کے عادی دوست احباب کی محفلیں گرم اور دسترخوان میووں اور مشروبات سے پر انھوں نے نہ کبھی حرب و ضرب سے واسطہ رکھا نہ جنگ کی تلخی سے اُن کے کام و دہن آشنا ہوئے۔" [2]

ذرا ۱۹۴۸ء سے لے کر ۱۹۶۷ء تک کے درمیانی وقفہ میں عالم عربی پر نظر ڈالیے

---

[1] العسجد المسبوک [2] الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام ص ۱ (یورپین اڈیشن)

آپ کو کیا نظر آئے گا؟ عرب ملکوں کا سیاسی عدم استحکام، قوت فیصلہ کا فقدان، مغربی ملکوں کی ذہنی غلامی و مرعوبیت، ان کے سربراہوں، حکمرانوں اور لیڈروں کی اخلاقی کمزوریاں، اُن کی راحت طلبی، عیش کوشی اور لذت پرستی۔ خاص طور پر مصر (جو عالم عربی کا امام اور فکری، ادبی، علمی اور دینی تحریکوں کا قائد ہے) کے ادبا ر و اہل قلم کی[1] دینی بنیادوں اور قدروں پر تیشہ زنی، اخلاقی و اجتماعی قدروں کی پامالی، تاریخی مسلّمات و حقائق کا انکار اور صالح معاشرہ اور پاکیزہ کردار کی بنیادوں کو جڑ سے ہلا دینے اور ایسی فکری انارکی و لاقانونیت پھیلانے کے لیے (جس میں معروف و منکر اور حق و باطل سب ایک ہو جائیں) ادب و قلم کی ساری قوتوں کو متحد و صف آرا کر دینا، موقع پرستی، ابن الوقتی، لذت پرستی، علاقائی عصبیت، فرعونیت، مغز زدگی اور ایک ایسے ادب کا فروغ جس کو قرآن مجید میں "زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا" (خوش نما اور چکنی چپڑی باتیں جو صرف دھوکا ہیں) کہا گیا ہے ـــــ عقائد میں شکوک و شبہات، اخلاق و رجحانات میں حد سے بڑھی ہوئی بے راہ روی، اذواق و طبائع میں انتہا درجہ کی کج روی اور بے اعتدالی، دلوں میں بزدلی اور پست ہمتی، ارادہ و عمل میں انفعالیت اور جذباتیت، اور نازک سے نازک وقت اور سخت سے سخت گھڑی میں بھی لہو و لعب اور عیش و طرب کی گرم بازاری، علماء و اہل دین کا حق بات کہنے اور تنقید و احتساب سے گریز، جھوٹے اور مصنوعی معیاروں کے سامنے اُن کی سپر اندازی اور معیار زندگی کو بلند کرنے، اپنے اہل و عیال اور اپنے گھرانے کو خوشحال بنانے اور جائز و ناجائز طریقہ سے اُن کے ہر مطالبہ اور فرمائش کو پورا کرنے کے لیے ان کی بے ضمیری، عوام و محنت کش طبقہ کا لہو و لعب گانے باجے (ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سینما) اور ہر اُس چیز سے والہانہ اور روز افزوں عشق جس سے باصرہ اور سامعہ لطف اندوز ہوں یا جس کے تصور ہی سے تمتع حاصل ہوتا ہو۔ اور اس کے بعد اُن تمام طبقوں کا (اپنی سطح اور معیار تعلیم کے اختلاف کے باوجود)

---

[1] اس سلسلہ میں مسلمانوں میں سے ڈاکٹر طٰہٰ حسین، محمد حسین ہیکل، احمد لطفی السید، اور عیسائی اہل قلم میں سے سلامہ موسیٰ وغیرہ کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑا نقصان ڈاکٹر طٰہٰ حسین سے پہونچا۔

ایک واحد نقطہ، پر اجتماع یعنی زندگی سے عشق اور موت سے گھبراہٹ اور فرار۔ ہر قسم کے اقدام جرأت اور بروقت اور صحیح فیصلہ سے محرومی و معذوری۔

جس شخص کے سامنے یہ حقائق اور ذاتی مشاہدات ہوتے وثوق اور جزم کے ساتھ یہ فیصلہ کر سکتا تھا کہ یہ قومیں دشمن کا پہلا وار بھی برداشت نہیں کر سکتیں اور ایک معمولی صدمہ بھی ان کے لیے ضرب کاری ثابت ہو سکتا ہے اور اُن کے لیے اپنے دین، اپنی عزت، اپنے مقدس مقامات اور اپنے ملّی وجود کو برقرار رکھنا بہت مشکل ہے۔

یہ وہ حقیقت تھی جو اللہ کے اُن بہت سے بندوں کے زبان و قلم پر بے ساختہ جاری ہو گئی جن کو تدبر قرآن، سنت اللہ کے علم اور تاریخ عالم سے واقفیت کا کچھ حصّہ نصیب تھا اور انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ پہلے ہی ان حالات کے اس حتمی اور یقینی انجام کی پیشین گوئی کر دی جو اب ایک واقعہ اور المیہ بن کر ہمارے سامنے ہے۔ یہ کوئی کشف و الہام یا پھر کسی بڑی غیر معمولی ذہانت کی نہیں بلکہ حالات کے مطالعہ سے صحیح نتیجہ نکالنے اور اسباب سے مسببات، مبادی و مقدمات سے نتائج و ثمرات تک پہونچنے کی ایک عام فطری بات ہے جس کی صلاحیت ہر سلیم الطبع انسان میں موجود ہے۔

۵ جون ۱۹۶۷ء کی ہزیمت بھی اسی فساد کا نقطۂ عروج تھا جس کی طرف ابھی ہم نے اشارہ کیا ہے اور جس نے اب بہت سی آنکھوں سے پردہ اٹھا دیا ہے۔ پورا عالم اسلام اُس پر بےچین و سوگوار ہے۔ بہت سے اہل قلم و اہل نظر اور اسلام و عالم اسلام کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے ان عوامل و اسباب پر پوری بحث کر چکے ہیں جنھوں نے مسلمانوں کو یہ روز بد دکھایا ہے۔ اس پر اتنی بڑی تعداد میں کتابیں شائع ہو چکی ہیں کہ ایک پورا کتب خانہ تیار ہو گیا ہے اور اُس کا پورے طور پر احاطہ و جائزہ بھی دشوار ہے۔

مصنف کتاب نے اس المیہ کے وقوع سے کئی سال قبل اس موضوع پر کچھ لکھا اور کہا تھا اور اس کی زبان و قلم پر بعض ایسے حقائق جاری ہوئے تھے جو بعد میں امر واقعہ بن کر سامنے آئے۔ یہ درحقیقت کوئی الجھا ہوا پیچیدہ اور مبہم مسئلہ نہیں ہے، اس کے لیے صرف قرآن مجید سے کسی درجہ کی مناسبت، قوانین فطرت اور سنت اللہ سے کسی قدر

واقفیت اور اس منطقہ اور علاقے کے حالات سے باخبری شرط ہے جس پر دفاع کی سب سے بڑی اور براہ راست ذمہ داری تھی۔

جب یہ المیہ پیش آیا تو قدرتی طور پر مصنف کے بحث و نظر کا موضوع بنا اور اس سلسلہ میں متعدد مضامین اُس کے قلم سے نکلے اور عالم عربی کے متعدد اہم مقامات اور مواقع پر اُس کو اظہار خیال کا موقع ملا۔ ان تمام تحریروں و تقریروں میں مرکزی نقطہ قرآن مجید کی روشنی، سنت اللہ اور قوانین فطرت اور اقوام عالم کے تاریخی تجربات اور اسباب و مسببات کا باہمی ربط ہے۔

مصنف نے اس میں اس کی کوشش ہے کہ جن حالات سے اس وقت یہ عرب اقوام دوچار ہیں، ان کی کوئی مبالغہ آمیز مصنوعی اور خیالی تصویر سامنے نہ آئے بلکہ ان کے حقیقی امراض اور اصل کمزور پہلوؤں پر انگلی رکھ دی جائے اور ان کا موثر اور کارگر علاج بتایا جائے۔ یہ تحریریں اور تقریریں مختلف موقعوں پر کی گئیں لیکن ایک وحدت ان سب کو ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہے اور وہ ہے ناکامی کے حقیقی اسباب کی تلاش، اور صراحت اور صفائی کے ساتھ اس سے آگاہی جس میں نہ ابہام ہے نہ الجھاؤ، نہ مداہنت نہ نفاق ——— آخر میں "فتح بالآخر اسلام کے حلقہ بگوش عربوں کی ہے۔" کے عنوان سے ایک نئے مضمون کا اضافہ کیا جارہا ہے جس سے یہ کتاب دل شکستگی اور مایوسی پیدا کرنے کے بجائے زندگی اور اُمید کا ایک نیا پیام دیتی ہے۔

مواقیت الحرام کا مسئلہ

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم

(۲)

اس مقالے کی پہلی قسط میں مواقیتِ احرام کا مفصل تعارف کرا کے اس کے متعلق ضروری احکام بیان کئے گئے تھے، اور اس مسئلے پر مفصل بحث کی گئی تھی ۔ کہ محاذاتِ میقات کس طرح معلوم کی جائے ۔ نیز یہ مسئلہ زیر بحث آیا تھا کہ پاکستان و ہندوستان سے بحری جہاز میں جانے والے حجاج جدّہ سے احرام باندھ سکتے ہیں یا نہیں ؟ اور چونکہ برصغیر کے حجاج کے لئے یلملم کو میقات قرار دیا گیا ہے، اس لئے اس بات کی تحقیق کی گئی تھی کہ مکہ مکرمہ سے یلملم کا فاصلہ کتنا ہے ؟ اور اس سلسلے میں مختلف اقوال ذکر کئے گئے تھے، اور اس پر پہلی قسط ختم ہو گئی تھی لیکن اس کے بعد کی چند سطریں جو اسی بحث سے متعلق ہیں، غلطی سے پچھلی اشاعت میں شامل نہ ہو سکیں، وہ یہ ہیں!

"مگر میلوں کے اس اختلاف کے باوجود اس پر سب فقہا متفق نظر آتے ہیں کہ اس فاصلہ کو باعتبار مراحل کے دو مرحلے ہی قرار دیا ہے اور مسافت مواقیت میں میلوں کے جزوی فرق کو نظر انداز کیا ہے، اس لئے مکہ مکرمہ سے یلملم، قرن ذات عرق اور جدّہ سب کی مسافتیں چونکہ مرحلتین مانی گئی ہیں تو ان سب کو بحکم مساوی قرار دیا گیا "

زیر نظر قسط میں اس کے بعد میقات جدّہ کے متعلق علماء کے اختلاف پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔

میقاتِ جدّہ کے متعلق علماء کا اختلاف

تحفہ شرح منہاج ابن حجر مکیؒ کے حوالہ سے جوبات اوپر لکھی گئی ہے

کہ جدّہ کی مسافت بھی یلملم کی مسافت کے مساوی ہے، اس لئے جدّہ سے احرام باندھنا صحیح ہے۔ اسی کتاب کے حاشیہ میں شیخ عبد الحمید شروانی نزیل مکہ مکرمہ نے اس وقت کے علماء کا اختلاف بھی نقل کیا ہے اور فرمایا ہے کہ علامہ شبلی مفتی مکہ اور فقیہ احمد بلحاج اور ابن زیاد یمنی وغیرہ علماء نے اسی پر فتویٰ دیا ہے جو تحفہ میں لکھا ہے یعنی جدّہ سے احرام باندھنے کو درست و جائز قرار دیا ہے۔ لیکن اس کے بالمقابل یمن کے بعض علماء عبداللہ بن عمر بالحزم محمد بن ابی بکر اشحر، شیخ عبد الرؤف کا اختلاف بھی نقل کیا ہے۔ ان حضرات کا قول یہ ہے کہ جدّہ کی مسافت مکہ مکرمہ تک بہ نسبت مسافت یلملم کے کم ہے اس لئے حجاج کو چاہئے کہ ساحل جدّہ میں اترنے سے پہلے جس جگہ جہاز ساحل جدہ اور حرم کی طرف رُخ موڑتا ہے وہاں سے احرام باندھ لیں ساحل جدّہ تک مؤخر نہ کریں، ان کے الفاظ بحوالہ وفائی یہ ہیں۔

> عبارة الوفائی فله ان یؤخر احرامه من محاذاة یلملم الی راس العلم المعروف قبل مرسیٰ جدة وهو حال توجه السفینة الی جهة الحرم ولیس له ان یؤخر الی جدّة لانها اقرب من یلملم بنحو الربع وقولهم ان جدة ویلملم مرحلتان مرادهم ان کلا لاینقص عن مرحلتین وان تفاوتت المسافتان کما حققه من سلك الطریق الخ (ص۴۵ ج۴)

علماء عصر کی مجلس میں اس مسئلہ پر بحث

دار العلوم کراچی، مدرسہ اسلامیہ نیوٹاؤن کراچی، مدرسہ اشرف المدارس کراچی

کے اہل علم و فتویٰ نے عرصہ سے ایک مجلس کی تشکیل کی ہوئی ہے جس کی غرض ایسے ہی جدید و قدیم مسائل پر بحث کرکے کوئی جہت متعین کرنا ہے جس کا کوئی صریح حکم قرآن و سنت و ائمہ فقہا کے کلام میں موجود نہیں اور علماء عصر کی رائیں ان میں مختلف ہیں۔ اب تک اس مجلس میں بہت سے اہم مسائل پر بحث ہو کر متفقہ رائے سے احکام مع تفصیل دلائل لکھ دیئے گئے جو مستقل رسالوں کی صورت میں ہیں۔ اور

ان شاء اللہ تعالیٰ عنقریب ان کی اشاعت کا انتظام کیا جائے گا۔

یہ مسئلہ بھی مجلس میں زیر بحث آیا اور متعدد مجالس میں بحث و تمحیص کے باوجود سب کا اتفاق کسی جانب نہیں ہو سکا۔ کچھ رائیں مختلف رہیں۔ چونکہ ایسا اختلاف کوئی نئی چیز نہیں ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے مگر آج کل اس طرح کے اختلاف کو عموماً ایک افتراق بنا لیا جاتا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس مختلف فیہ مسئلہ میں جن حضرات نے اختلاف کیا ہے ان کی رائے مع ان کے دلائل کے لکھ دی جائے۔ تاکہ لوگوں کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ علماء کا اختلاف کس طرح ہوا کرتا ہے اور اختلاف علماء کے وقت عوام کے لئے طریقہ کار کیا ہے۔

حضرت علامہ مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کی رائے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔

رسالہ الیواقیت فی احکام المواقیت مصنفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دامت برکاتہم و زیدت حسناتہم کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا اور کچھ حصہ حضرت مصنف سے زبانی سنا۔ اور بحری حجاج مسافروں کے لئے جدّہ سے جواز احرام کا مسئلہ ہماری مجلس فقہی کے متعدد مجالس میں زیر بحث آیا اور کافی غور و خوض ہوا۔ اور تحفۃ المحتاج شرح المنہاج کی عبارت اور مخدوم ہاشمی سندھی وغیرہ کی عبارات و آراء پر بھی غور ہوا۔ اور بہت عرصہ پہلے انفرادی طور پر بھی بار ہا غور کیا کبھی انشراح صدر نہیں ہوا کہ جدّہ سے احرام کی جواز کی صورت درست ہو سکتی ہے، جو کچھ فہم قاصر میں آیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

سرزمین حرم یا مکہ معظمہ میں آنے والوں کے لئے جو دنیا کے کسی گوشے سے آئیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدود مقرر فرما دی ہیں بلا احرام ان سے تجاوز کرنا جائز نہیں، بیت اللہ الحرام کے شمال سے آنے والوں کے لئے ذی الحلیفہ ہے۔ مغرب سے آنے والوں کے لئے جحفہ ہے (جدید نام رابغ) جنوب سے آنے والوں کے لئے یمن کی سرزمین پر جبل یلملم ہے (جدید نام جبل سعدیہ) جنوب مشرق سے آنے والوں کے لئے

قرن المنازل ہے اور شمال مشرق سے آنے والوں کے لئے ذاتِ عرق ہے (جدید نام مقام عقیق) اب یا تو انہی مقامات پر گذر ہو گا، تو انہی مقامات سے احرام باندھنا ہو گا یا ان سے فاصلے سے گذرنا ہو گا تو دائیں یا بائیں یہ مقامات واقع ہوں گے۔ ان کی محاذات و مسافت سے احرام باندھنا ہو گا۔

اگر محاذات کی جگہ متعین نہ ہو سکے اور علم یا ظن غالب سے تعین ممکن نہ ہو تو اس وقت ایسے مقام سے احرام باندھنا ہو گا جس کا فاصلہ کم از کم دو مرحلہ عرفیہ یا تین مراحل شرعیہ ہوں کیونکہ قریب ترین مواقیت کا فاصلہ اتنا ہی ہے، ظاہر ہے کہ میقات یا محاذات میقات سے تجاوز جائز ہونے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ محاذات میقات مجہول ہو۔ نیز جدہ تمام فقہاء حنفیہ کی تصریحات کے مطابق داخل میقات ہے اب جو شخص بحری سفر کر رہا ہو محاذات میقات سے بلا احرام گذرے گا اور داخل میقات کے مقام پر پہنچے گا اس پر تجاوز عن المیقات بلا احرام کا حکم لگے گا۔ رہا یہ کہ محاذات کا علم صحیح طریقہ سے ممکن نہیں یہ بات صحیح نہیں۔ آجکل کے [illegible] اور جہاز رانوں کے معلومات کے پیش نظر یہ محض خیالِ خام ہے۔ نیز آج کل پاکستان سے جو جہاز جاتے ہیں جہاز ران تمام مسلمان ہوتے ہیں اطلاع دینے والے کافر کا سوال بھی ختم ہو جاتا ہے۔

شیخ ابن حجر ہیتمی مکی کا یہ فرمانا کہ جب تجاوز یمنۃً و یسرۃً یعنی دائیں بائیں ایسے حال میں ہو کہ مسافر کا رخ مکہ کے سمت میں نہ ہو اور جب رخ مکہ کی طرف ہو اس وقت محاذات میقات سے احرام باندھنا ہو گا قابل اطمینان نہیں ہے جب مسافر کا قصد مکہ ہی ہے اور آگے چل کر صحیح تعین محاذات مشکل ہو پھر متعین محاذات کو چھوڑنا غیر معقول ہے جبکہ میقات سے اور محاذات میقات سے احرام باندھنا زیادہ بہتر ہو۔ اور اسی وجہ سے ابن حجر مکی کے چند شارحین نے ان کی رائے کی مخالفت کی ہے اگرچہ مدارِ خلاف کچھ اور ہے صرف اتنی بات تجاوز عن المیقات کے لئے کہ مسافت جدہ و یلملم برابر ہے جدہ سے احرام باندھنے کے لئے کافی نہیں۔

یہ تو صرف اسی وقت حکم ہے کہ محاذات میقات کا تعین نہ ہوسکے، بہرحال جو کچھ ابن حجر ہیثمی نے فرمایا ہے وہ میرے سمجھ سے بالاتر ہے اور تعجب ہے کہ موصوف نے دعویٰ کی تائید میں کوئی فقہی یا حدیثی دلیل پیش نہیں فرمائی اس لئے موصوف کا دعویٰ بلا دلیل پر اتنی بڑی بنیاد قائم کرنا صحیح نہیں اور میرے نزدیک فقہی مسئلہ یہی ہے کہ بحری مسافر کو یلملم کی محاذات ہی سے احرام باندھنا ضروری ہے ورنہ دم لازم آئے گا۔ اور توبہ بھی کرنا پڑے گا۔

مولانا مفتی رشید احمد صاحب مدرسہ اشرف المدارس کی رائے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم

بندہ نے مسئلہ محاذات میقات پر قدیماً وحدیثاً۔ اجتماعاً وانفراداً جب بھی غور کیا تو ہر دفعہ یہی نتیجہ نکلا کہ محاذات بصورت دائرہ لی جائے گی یعنی مکہ مکرمہ سے جس مقام کا فاصلہ میلوں کے اعتبار سے میقات کے فاصلے سے برابر ہوگا وہ مقام محاذی میقات کہلائے گا۔ اس نظریہ پر مختصراً چند دلائل عرض کرتا ہوں۔

(۱) محاذات میقات کے اصل معنی یہ ہیں کہ مکہ مکرمہ کی طرف جاتے ہوئے میقات کے دائیں بائیں جانب برابر ہوجائے۔ کما فی التحفۃ "ای سامتہ بان کان علی یمینہ اویسارہ" اور ظاہر ہے کہ یہ معنی اس صورت میں متعین ہوسکتے ہیں کہ مسافت کی مساوات میلوں کے اعتبار سے لی جائے البتہ میقات سے بہت دور سے گذر ہو تو دونوں میں تفاوت ہوگا۔

حضرت فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول۔ فانظروا حذوھا من طریقکم سے بھی ظاہر ہے کہ اصل اعتبار میقات کے دائیں یا بائیں جانب سے مسافت کا ہے جو کہ مساواۃ بعد بحسب الامیال کو مستلزم ہے الا یہ کہ

میقات سے بہت دور سے گذر ہو۔ بلکہ من طریقکم کا لفظ بتلا رہا ہے کہ مسافت
انسان کی بجائے محاذاۃ مقام یعنی مساواۃ مسافت کا اعتبار کیا جائے گا اور
مسافت کی صحیح مساواۃ مراحل کے ترک کسور سے نہیں ہو سکتی۔

(۲) وان لم یعلم المحاذاۃ فعلی مرحلتین من مکۃ کجدۃ المحروسۃ من طرف البحر (ارشاد الساری)

اس سے ثابت ہوا کہ محاذاۃ میں مساواۃ مسافت کا اعتبار میلوں سے
کیا جائے گا نہ کہ مراحل سے۔ کیونکہ اکثر مواقیت مرحلتین پر ہیں۔ پس اگر محاذات
میں بُعد بحساب مراحل لیا جائے تو عبارت مذکور کا حاصل یہ نکلے گا۔ وان
لم یعلم بعد المرحلتین فعلی مرحلتین، وھو بین البطلان۔

(۳) عبارۃ الوفائی۔ فلہ ان یوخر احرامہ من محاذاۃ یلملم الی راس العلم المعروف قبیل مرسیٰ جدۃ وھو حال توجہ السفینۃ الی جھۃ الحرم ولیس لہ ان یوخر الی جدۃ لانھا اقرب من یلملم بنحو الربع وقولھم ان جدۃ ویلملم مرحلتان مرادھم ان کلا لا ینقص عن مرحلتین وان تفاوتت المسافتان کما حققہ من سلک الطریقین وھم عدد کادوا ان یتواتروا الخ (حاشیہ شروانی علی تحفہ) اس سے معلوم ہوا کہ جن حضرات نے مرحلتین
کا اعتبار کرتے ہوئے جدہ کو یلملم سے محاذی قرار دیا ہے۔ ان کا بھی یہ مقصد
نہیں کہ میلوں کا فرق غیر معتبر ہے بلکہ ان کے نظریہ کی بنیاد اس پر ہے کہ انھوں نے
مرحلتین کے اطلاق سے دونوں کی مسافت کو مساوی سمجھ لیا لہٰذا اس پر تنبیہ کی
گئی کہ دونوں کی مسافت مساوی نہیں بلکہ یلملم ابعد ہے۔

(۴) قال الشروانی الاحرام الاول وھو ان مبنی المواقیت علی التقریب کلام التحفۃ والنہایۃ یلزم صریح خلافہ (حاشیہ شروانی ج۴ ص۴۲)
حضرات فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ مختلفۃ المسافات مواقیت کو دو مرحلے لکھتے ہیں

اس پر کوئی دلیل نہیں کہ محاذاۃ میں میلوں کا فرق غیر معتبر ہے۔ اس سے تو صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ مسافت کو شمار کرتے وقت مراحل کی کسور کو چھوڑ دیا جاتا ہے اس میں کوئی مراحل کی خصوصیت نہیں بلکہ ہر حساب میں ترک کسور کی عام عادت تھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان مواقیت کی مسافت کو برابر قرار دیا ہے ورنہ قرن المنازل کو آخر المواقیت قرار دینے کے کیا معنیٰ؟ ڈھائی یا پونے تین مراحل کو بحذف کسر دو مرحلہ تو کہا جا سکتا ہے۔ مگر دو اور پونے تین مراحل کی مسافت کو برابر کہنا معقول نہیں جیسے دو ہزار اور پونے تین ہزار کو برابر نہیں کہا جا سکتا۔ یہ امر ویسے بھی بدیہی ہے اور مسلم ہے کہ مساواۃ باہم بالکل برابری کو کہا جاتا ہے۔ البتہ اتنا قلیل فرق کہ جس کا حساب مشکل ہو عرفاً ہدر ہوتا ہے چونکہ احکام شرعیہ کا مدار یسر پر ہے لہذا مسافت کی مساواۃ معلوم کرنے میں فرلانگ وغیرہ کا حساب لگانا تو ضروری نہیں بلکہ ایک آدھ میل کا فرق بھی نظر انداز کیا جا سکتا ہے مگر میلوں کا حساب تو سہل ہے ہاں اگر کہیں میلوں کا حساب بھی مشکل ہو تو اسے بھی ہدر کیا جا سکتا ہے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرن المنازل کی محاذاۃ میں ذات عرق کی تعیین اسی طرح فرمائی تھی۔ بعض حضرات کا جدہ اور یلملم کی مسافت کو برابر کہنا بھی اسی پر مبنی ہے۔

آگے یہ بحث رہ جاتی ہے کہ یلملم اور جدہ میں کسی کی مسافت زیادہ نہیں ہے سو جدید تحقیقات کے علاوہ متقدمین نے بھی یلملم کی مسافت زیادہ ہونے کی تصریح فرمائی ہے۔ وان لم یعلم المحاذاۃ فعلی مرحلتین من مکۃ کجدۃ اور حضرت تھانوی رح اور حضرت سہارنپوری قدس سرہما کے فتاویٰ بھی اسی پر مبنی ہیں کہ یلملم کی محاذاۃ جدہ پہنچنے سے قبل ہو جاتی ہے۔ اگر کسی نے دونوں کو برابر کہا ہے تو دوسرے حضرات نے اسے عدم العلم پر مبنی قرار دیا ہے۔ یلملم کی ابعدیت قول الاکثر اور احوط ہونے کے علاوہ ارجح بھی ہے۔ اس لئے کہ قول مساواۃ تو اندازاً بھی کہا جا سکتا ہے اور حکم تفاوت خصوصاً مقدار زیادہ کی تعیین اور دوسرے پر عدم علم

کا حکم (کما فی حاشیۃ الشروانی) بدون کامل تحقیق کے نہیں لگایا جا سکتا بلکہ قول الوفائی وکما حققہ من سلک الطریقین وھو عدد کادو أن بتو انزوا ۔
میں اس کی تصریح ہے کہ یہ فیصلہ جم غفیر نے کامل تحقیق کے بعد کیا ہے۔ شروانی نے وفائی اور عبد الرؤف تلمیذ شارح رحمہ سے جو مقدار زیادہ کی تعیین نقل فرمائی ہے تحقیقات جدیدہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے ۔

نتیجہ یہ نکلا کہ محاذاۃ یلملم کا علم ہوتے ہوئے (جو اس زمانہ میں مشکل نہیں) جدّہ تک تجاوز بدون احرام ناجائز ہے ۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

رشید احمد عفی عنہ، از اشرف المدارس ناظم آباد کراچی
۱۸ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۸ھ

مذکورہ بالا دونوں بزرگوں کے علمی اور عملی کمالات مجھ پا پر کاب ضعیف کے لئے قابل عظم ہیں۔ زادہم اللہ تعالیٰ علماً نافعاً وعملاً متقبلاً زیادات لا متناہی ۔

لیکن جن وجوہ کی بنا پر ان حضرات نے بحری مسافروں کے لئے جدہ سے احرام باندھنے کو ناجائز موجب دم قرار دیا ہے ان پر احقر کا قلب منشرح نہیں ۔ احقر نے جہاں تک غور و فکر کیا۔ ترجیح اسی کی معلوم ہوئی کہ بحری مسافروں کے لئے جدہ تک احرام کو مؤخر کرنا جدہ سے باندھنا نہ کوئی گناہ ہے نہ اس سے دم لازم آتا ہے ۔

اس کی تفصیلی وجوہ کا بیان پہلے ہو چکا ہے اجمالاً پھر اختصار کے ساتھ یہ ہے کہ ۔

(۱) یلملم کی محاذات سے جو تجاوز بحر میں ہوتا ہے وہ تجاوز آفاق کے اندر رہے حل یا جہت حرم کی طرف نہیں ہے ۔ اس کو موجب دم قرار دینا سمجھ میں نہیں آتا جن لوگوں کا راستہ یلملم سے مکہ معظمہ کی طرف براہِ راست جانے کا تھا یا اب ہے وہ اگر یلملم کی محاذات سے جانب مکہ مکرمہ تجاوز کریں تو بیشک دم واجب ہوگا، لیکن آج کل بحری جہاز کے مسافر سمندر میں یلملم سے نفر تیا بیس میل کے فاصلے سے آفاق کے اندر سفر کرتے ہیں ان کا یہ سفر تجاوز عن المیقات یا عن ذات المیقات نہیں کہلا سکتا ۔

(۲) جدّہ کو فقہاء کا داخلِ میقات کہنا بھی اس کے منافی نہیں کہ جدّہ سے احرام باندھنے

کو جائز قرار دیا جائے کیونکہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ جتنے بھی مواقیت ہیں وہ سب اجزاء حل ہوتے ہیں۔ باہر سے بقصد مکہ مکرمہ آنے والا یہاں سے احرام باندھ سکتا ہے اور یہاں کا یا اس کے قرب وجوار کا رہنے والا حلّی کہلاتا ہے اس کے لئے دخول مکہ بلا احرام جائز ہے اسی لئے فقہاء نے ضرورت کے مواقع کے لئے یہ حیلہ لکھا ہے کہ جو شخص باہر سے بقصد جدّہ جدّہ میں داخل ہو اس پر احرام لازم نہیں۔ پھر جدّہ میں مقیم ہو کر اگر وہ مکہ مکرمہ میں بلا قصد حج وعمرہ جانا چاہے تو اس وقت بھی اس پر احرام کی پابندی نہیں۔

(۳) بحری جہاز یلملم کی محاذات سے آگے جو جدّہ کی طرف سفر کرتا ہے وہ تمام سفر آفاق میں ہے جب جہاز بڑے سمندر سے ساحل جدّہ کا رخ کرتا ہے اس وقت یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اب محاذات میقات کس جگہ ہو گی اس کے متعلق عام فقہاء کا یہ ارشاد ہے کہ حقیقی محاذات کا علم ہونا مشکل ہے اس لئے اقرب مواقیت کی مسافت کا اعتبار کر لیا جائے یعنی جس جگہ سے مکہ مکرمہ کا فاصلہ دو مرحلہ ہو وہاں سے احرام باندھنا ضروری ہو گا۔ اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ جدّہ سے مکہ مکرمہ کا فاصلہ دو مرحلہ ہے۔ اسی لئے شیخ ابن حجر مکیؒ، ملّا علی قاری۔ مخدوم ہاشم سندھی و ملا اخوند جان وغیرہ اکابر علماء نے جدّہ کو بحکم میقات قرار دیا۔

رہا یہ معاملہ کہ آج کل حقیقی محاذات کا علم کچھ دشوار نہیں کیونکہ فاصلوں کی پیمائش اور زاویوں کی تحقیق کے ایسے جدید آلات موجود ہیں جن کی وجہ سے حقیقی محاذات معلوم کرنے کو مشکل کہنا بے معنی ہے اس میں قابل نظر یہ بات ہے کہ بلاشبہ پیمائش کے آلات وذرائع تو اس زمانے میں بہت موجود ہیں سیاروں کے فاصلے اور زاوئے ان سے صحیح لگائے جا سکتے ہیں۔ زمین کی مسافتوں کا تو کہنا کیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ مبدأ و منتہیٰ کا تعین تو آلات سے نہیں وایات سے ہو گا۔ منتہیٰ تو متعین ہے کہ بیت اللہ ہے لیکن مبدأ یعنی میقات جس کی محاذات دیکھنا ہو وہ کیا ہے اس کا عرض وطول کتنا ہے اس کے کس گوشہ سے محاذات دیکھی جائے گی یہ کام تو جدید آلات کا نہیں۔ اس میں تو قدیم فقہاء کا قول ہی مستند ہو سکتا ہے۔ تحفہ شرح منہاج کے حواشی سے یہ بات اوپر لکھی جا چکی ہے کہ یلملم جس کی محاذات کا یہاں اعتبار کرنا زیر بحث ہے وہ حسب تصریح فقہاء سعدیہ کے بالمقابل پہاڑ ہے اور یہ پہاڑ دو ہیں ایک پہاڑ سے

مکہ مکرمہ کی مسافت دو مرحلہ سے بھی زائد ہے اور دوسرے پہاڑ سے مسافت لی جائے تو دو مرحلے یا اس سے بھی کچھ کم ہے۔

فتح الباری۔ عمدۃ القاری اور تمام کتب معتبرہ میں بحوالہ ابن حزم یلملم سے جو مسافت مکہ مکرمہ کی بیان کی گئی ہے وہی قابل اعتماد ہے۔ آج کل کے نئے پیمائش کرنے والوں میں کسی نے تو خود سعدیہ ہی کو یلملم قرار دے کر وہاں سے مسافت لی ہے کسی نے کسی دوسری جگہ سے۔ ان کے آلات اور پیمائش کے حسابات کتنے ہی صحیح ہوں مگر مبدأ کے تعین میں ان کا قول بمقابلہ علماء متقدمین کے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اور ان حضرات کا اس پر اتفاق ہے کہ یلملم کی محاذات بھی مکہ مکرمہ سے دو مرحلہ ہے اور جدہ کی مسافت بھی۔ اب رہا میلوں کا فرق سو احکام شرعیہ کا مدار کسی جگہ بھی اس طرح کی تدقیقات پر نہیں ہے۔ مواقیت کے مسائل و احکام پر نظر کرنے سے یہ بات بہت واضح ہو جاتی ہے کہ اس معاملہ میں اتنی تدقیق کا اعتبار نہیں کیا۔ یہ سطور اتفاق سے ایسے حال میں لکھ رہا ہوں جبکہ ایک شدید مرض کی وجہ سے اٹھنے بیٹھنے پر قدرت نہیں لیٹے ہوئے لکھی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ آراء مختلف مع وجوہ کے علماء کے سامنے آجائیں تاکہ ان میں غور کر کے وہ کوئی فیصلہ فرمادیں۔

عوام کے لئے

ایسے حالات میں کہ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف رائے ہے احتیاط اسی میں ہے کہ بحری جہاز میں یلملم ہی سے احرام باندھ لیں۔ یا ساحل جدہ پر اترنے سے پہلے احرام باندھ لیں کیونکہ حسب تصریح فقہاء محل اختلاف میں احتیاط کا پہلو اختیار کرنا بہتر ہے تاکہ اپنی عبادت کے جواز میں کسی کا اختلاف نہ رہے اس کے علاوہ احرام کو میقات سے پہلے باندھنا سب ہی کے نزدیک افضل ہے بلکہ بعض روایات حدیث میں اپنے گھر سے ہی احرام باندھ کر چلنے کی فضیلت آئی ہے شرط یہ ہے کہ محظورات احرام میں مبتلا ہونے کا خطرہ نہ ہو اور جس کو یہ خطرہ ہو کہ محظورات احرام سے بچنا اس تمام عرصہ میں اس کے لئے مشکل ہوگا اس کے لئے آخری حد تک مؤخر کرنا بہتر ہے ایسے شخص کو آخری حد میں اتنی احتیاط کر لینا چاہئے کہ اس کا احرام علماء کے اختلاف سے

(باقی صفحہ پر)

"تفسیر تدبر قرآن" (جلد اول)

از مولانا امین احسن اصلاحی

اردو کے تفسیری کتب خانے میں تابناک اضافہ۔ یہ تفسیر مولانا اصلاحی کے چالیس سالہ تدبر قرآن کا نتیجہ ہے۔ قرآن پاک کی تفہیم کے بارے میں اس کو بجا طور پر اس دور کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔

آفسٹ کی طباعت بڑا کتابی سائز ... ۹۰۰ صفحات نہایت حسین اور مضبوط جلد، قیمت -/۳۰

تفسیر ماجدی (جلد اول)

از مولانا عبد الماجد دریابادی

مشتمل بہ سورۂ فاتحہ و بقرہ و آل عمران' نیا اڈیشن مکمل نظر ثانی اور بکثرت اضافوں کے ساتھ۔

ضخامت ...۷ صفحات، بڑا سائز، مضبوط جلد قیمت -/۱۶

قصص القرآن

(از مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم)

امم سابقہ کے سلسلے میں قرآن کے بیانات پر تاریخ و حدیث اور علوم عمرانی کی مدد سے تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے اور ان واقعات کے ہر ہر پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اپنے موضوع پر پورا ایک کتب خانہ ہے۔ قیمت مکمل چار جلد غیر مجلد -/۲۸

درس قرآنی (مکمل سات جلدوں میں)

گھر بیٹھے قرآن سمجھئے اور سمجھائیے

نہایت سادہ انداز میں قرآن کی تعلیم کو پیش کرنے والا ایک قابل قدر سلسلہ، اس کے ذریعہ ہر گھر میں درس قرآنی جاری کیا جا سکتا ہے۔ عوامی افادیت کی غرض سے ایک ایک صفحہ کے سبق کی شکل میں مرتب کیا گیا ہے

ہر منزل کی الگ الگ جلد قیمت مکمل سیٹ

مسند حمیدی (عربی) مکمل ۲ جلد -/۱۸

"حجۃ اللہ البالغہ" (مترجم)

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی اس کتاب کا موضوع اگرچہ اسرار شریعت کا بیان ہے لیکن اس کے مطالعہ سے احادیث نبویؐ کی روح کو سمجھنے کا ایک خاص دروازہ کھل جاتا ہے۔ قیمت کامل دو جلد -/۳۴

ازالۃ الخفا کامل (اردو)

حضرت شاہ صاحبؒ کی بے نظیر اور معرکۃ الآرا کتاب کا اردو ترجمہ دو ضخیم جلدوں میں قیمت مجلد -/۳۰

مشارق الانوار۔ بخاری و مسلم کی قولی احادیث

کا مجموعہ ...... قیمت مجلد ...... -/۱۸

حصن حصین۔ (اردو ترجمہ مع عربی متن)

حضور پر نورؐ سے منقول دعاؤں کا مجموعہ۔ قیمت مجلد مع گرد پوش .. .. -/۱۵

عجالۂ نافعہ شرح فوائد جامعہ

یہ کتاب فن حدیث پر حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ کی بے نظیر تصنیف ہے۔ اس شرح نے اس کی افادیت میں بیحد اضافہ کر دیا ہے۔ قیمت مجلد مع گرد پوش -/۱۵

محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے

(مولانا تقی الدین ندوی مظاہری)

ائمہ اربعہ اور اصحاب صحاح ستہ کا تذکرہ اور تدوین حدیث کی تاریخ، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے مقدمہ سے مزین .... قیمت ۵۰/۴

زاد سفر۔ از امۃ اللہ تسنیم، امام نووی کی

کتاب ریاض الصالحین کا اردو ترجمہ مکمل ۲ حصے

قیمت مجلد ۵۰/۷

زبدۃ البخاری (اردو) بخاری شریف کا

مکمل خلاصہ .. .. .. قیمت -/۱۲

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

روضۂ اقدس پر عرضِ سلام کے بعد طلبِ شفاعت کے بارہ میں ایک سوال کا جواب

—— محمد منظور نعمانی

ایک مخلص عنایت فرمانے لندن سے لکھا ہے

"..... اس وقت میرے پیشِ نظر آپ کی کتاب "آسان حج" ہے۔ اس کی مندرجہ ذیل عبارت میرے لیے خلش کا سبب بنی ہے۔

" اس کے بعد حضور سے اپنے لیے اور اپنے والدین کے لیے دُعا اور شفاعت کی درخواست کیجیے اور جن لوگوں کے آپ پر احسانات ہوں یا جنھوں نے آپ سے کہہ دیا ہو اور آپ نے اُن سے وعدہ کر لیا ہو اُن کیلئے بھی دُعا اور شفاعت کی درخواست کیجیے۔"

" اس کے بعد تقریباً ایک ہاتھ داہنی جانب ہٹ کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے چہرۂ مبارک کے سامنے آجائیے اور اُن کی خدمت میں سلام عرض کیجیے اور کہیے " اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا خَلِيْفَةَ رَسُوْلِ اللهِ " پھر ایک ہاتھ داہنی جانب ہٹ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے آجائیے اور ان کی خدمت میں سلام عرض کیجیے۔ " اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ "۔ صفحہ ۱۱۲-۱۱۱

مجھے جہاں تک معلوم ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اگر دور سے درود بھیجا

جائے تو وہ آپ تک پہونچایا جاتا ہے۔ لیکن اگر قریب سے بھیجا جائے تو وہ آپ سنتے ہیں۔ لیکن پھر یہ دُعا کی درخواست اور شفاعت کی درخواست وغیرہ کی بات کچھ حد سے تجاوز معلوم ہوتی ہے۔ قبرستان میں" اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا اَهْلَ الْقُبُوْرْ" تو معلوم، لیکن پھر یہ انفرادی خطاب یَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ وغیرہ کی کیا گنجائش۔

تائید میں احادیث اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا عمل چاہیئے۔

اُمید ہے کہ آپ زحمت فرما کر جواب عنایت فرمائیں گے ۔۔ والسّلام

چونکہ سوال ایک چھپی ہوئی کتاب سے متعلق تھا، اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اُس کا جواب الفرقان میں بھی شائع کر دیا جائے۔ ملحوظ رہے کہ جواب چونکہ خط ہی کی صورت میں لکھا گیا ہے اس لیے اس میں اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ جن بعض احادیث کی طرف خط میں اشارہ کیا گیا ہے وہ یہاں فٹ نوٹ میں درج کر دی گئی ہیں۔

مخلص مکرم! سلام و رحمت۔

"آسان حج" جیسا کہ اس کے دیباچہ میں ظاہر کر دیا گیا ہے، میری کتاب "آپ حج کیسے کریں" کا آسان خلاصہ ہے۔ یہ دونوں کتابیں عام اُردو خواں عازمین حج کے لیے لکھی گئی ہیں۔ جو عموماً حنفی المسلک ہوتے ہیں۔ ان دونوں کتابوں میں مناسک حج اور زیارت کے آداب وغیرہ کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بنیادی طور پر دسویں صدی ہجری کے مشہور مستند عالم اور فقیہ و محدث مُلّا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کی شرح مناسک سے ماخوذ ہے جو فقہ حنفی کے مطابق مناسک کے موضوع پر مستند ترین کتابوں میں مانی جاتی ہے۔ اور جو بعد کے دور میں لکھی جانے والی مناسک کی اکثر کتابوں کا ماخذ ہے ــــــ اس میں پہلے زیارت کا طریقہ اور آداب لکھے ہیں، اس کے بعد ایک نہایت ایمان افروز طویل سلام لکھا ہے جو دُعا و استغفار کی آیات پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں۔

ثم يطلب الشفاعة فيقول	پھر آپ سے شفاعت کی درخواست
يارسول الله أسئلك	کرے اور عرض کرے، اے اللہ کے
الشفاعة، ثم يتأخر إلى	رسول! میں آپ سے شفاعت کا
صوب يمينه قدر ذراع	سائل ہوں۔ پھر قریباً ایک ہاتھ اپنے
فيسلم على خليفة رسول	داہنی جانب ہٹ کے خلیفۂ اول
الله صلى الله عليه وآله	حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ
وسلم أبي بكر الصديق	کو سلام عرض کرے اور کہے "اَلسَّلَامُ
رضي الله عنه فيقول السلام	عَلَيْكَ يَا خَلِيفَةَ رَسُولِ اللهِ"
عليك يا خليفة رسول الله	اس کے بعد پھر قریباً ایک ہاتھ
ثم يتأخر إلى يمينه قدر	اپنے داہنی جانب ہٹ کر خلیفۂ ثانی
ذراع فيسلم على خليفة رسول	حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ
الله صلى الله عليه وسلم عمر بن	کی خدمت میں سلام عرض کرے اور
الخطاب رضي الله عنه فيقول السلام	کہے اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ
عليك يا امير المؤمنين عمر الفاروق	عُمَرَ الْفَارُوقِ ...... الخ

(ارشاد الساری الی مناسک الملا علی قاری ص ۳۳۹ ـ ملخصاً من المتن للشیخ العلامہ رحمۃ اللہ السندی)

اس کے بعد عرض کرتا ہوں کہ جہاں تک میرے علم میں ہے علماء شریعت کی اکثریت زیارت کے موقع پر صلوٰۃ و سلام عرض کرنے کے ساتھ اس طرح شفاعت کی درخواست کو صحیح اور درست جانتی ہے۔ مناسک کی بہت سی دوسری کتابوں میں بھی زیارت کے بیان میں یہی لکھا ہے۔ اور ان حضرات کے اس موقف کی بنیاد ان چند حقائق پر ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ کے اذن سے شفاعت اور دوسروں کے لیے دعا و استغفار کا حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بلاشبہ ثابت ہے اور اسی بنا پر آپ کی حیات میں

آپ سے شفاعت اور دُعا و استغفار کی استدعا کی جا سکتی تھی ـــــ اس میں غالباً کسی کو بھی کلام نہ ہوگا۔

(۲) دلائل شرعیہ سے ثابت ہے اور اسی لیے جمہور اُمت کا مُسلّمہ ہے کہ قبر مبارک میں آپؐ کو ایک خاص قسم کی حیات حاصل ہے (اگرچہ اس حیات کی نوعیت میں علماء کی رائیں مختلف ہیں۔ لیکن اس بنیادی بات پر سب کا اتفاق ہے کہ ایک خاص نوعیت کی حیات جو شہداء کی حیات سے بھی اعلیٰ قسم کی ہے، قبر مبارک میں آپ کو حاصل ہے) اور اس حیات کے آثار میں سے یہ بھی ہے کہ آپ ان لوگوں کا سلام بہ نفسِ نفیس سنتے ہیں جو روضۂ اقدس پر حاضر ہو کر سلام عرض کرتے ہیں اور اُن کے سلام کا جواب بھی دیتے ہیں جیسا کہ احادیث سے معلوم ہوا ہے[۱] (اور خود آپ نے بھی لکھا ہے) ـــ اور یہ بھی اسی خاص نوعیت کی حیات کا نتیجہ ہے کہ آپ کا جسم مبارک جوں کا توں محفوظ ہے، اور سب پیغمبروں کا یہی حال ہے جیسا کہ احادیث صحیحہ سے معلوم ہو چکا ہے[۲]۔

(۳) مزید برآں یہ بھی احادیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آپ کی اُمت کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں، نیک اعمال پر آپ اللہ کا شکر ادا کرتے

---

[۱] "من صلّی علیّ عند قبری سمعتہ ومن صلّی علیّ نائیاً ابلغتہ"۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔ مشکوٰۃ المصابیح
بلکہ قبر پر سلام کرنے والے کا سلام سننا اور اس کا جواب دینا تو عام مؤمنین کے لیے بھی ثابت ہے۔ "ما من احد یمر بقبر اخیہ المومن کان یعرفہ فی الدنیا فیسلم علیہ الا عرفہ ورد علیہ السلام۔
(رواہ ابن عبد البر وصححہ ابو محمد عبد الحق زرقانی ص ۳۳۴ ج ۵)

[۲] عن اوس بن اوس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان من افضل ایامکم یوم الجمعۃ فاکثروا علیّ من الصلوٰۃ فیہ فان صلواتکم معروضۃ علیّ قال فقالوا یا رسول اللہ وکیف تعرض صلواتنا علیک وقد ارمت؟ (قال یقولون بلیت) قال ان اللہ حرّم علی الارض اجساد الانبیاء۔
(رواہ ابو داؤد والنسائی وابن ماجہ)

ہیں کہ اس نے آپ کے اُمتیوں کو اعمالِ صالحہ کی توفیق دی اور جب ان کی بداعمالیاں سامنے آتی ہیں تو آپ اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے معافی اور مغفرت کی استدعا کرتے ہیں۔[۱]

جب مندرجۂ بالا یہ تینوں باتیں دلائلِ شرعیہ اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں تو روضۂ اقدس پر صلوٰۃ و سلام عرض کرنے کے ساتھ آپ سے شفاعت یا دُعاء و استغفار کی استدعا کرنے میں کوئی اشکال نہیں رہتا، جس طرح حیاتِ دُنیا میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کے لیے آپ سے استدعا کی جا سکتی تھی، اسی طرح قبری اور برزخی حیات کے اس دوسرے دور میں بھی روضۂ اقدس پر حاضر ہو کر آپ سے یہ استدعا اور درخواست کی جا سکتی ہے ـــــ جب روضۂ اقدس پر حاضر ہو کر عرض کرنے والوں کی بات آپ سُن لیتے ہیں (یعنی اللہ تعالیٰ آپ کو سُنوا دیتا ہے) اور آپ کو شفاعت اور دعاء و استغفار کا حق بھی باذن اللہ حاصل ہے تو پھر وہاں حاضر ہونے والوں کے لیے اس طرح کی استدعا اور درخواست کرنا بالکل صحیح ہے ـــــ یہ دعویٰ کرنا کہ آپ صرف سلام سنتے ہیں اس کے سوا کچھ نہیں سُن سکتے ناقابلِ فہم بات ہے اور اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

رہی یہ بات کہ روضۂ اقدس پر حاضر ہو کر اس طرح شفاعت یا دُعا کی آپ سے درخواست کرنا صحابۂ کرام سے ثابت نہیں ہے ـــــ مجھے تسلیم ہے (اور یہ واقعہ ہے کہ جو بعض حکایتیں اس سلسلہ میں بعض کتابوں میں نقل کی گئی ہیں ان کی کوئی قابلِ اعتماد سند نہیں ہے) ـــــ لیکن میں عرض کرتا ہوں کہ ایسے بہت سے اعمال ہیں جن کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے فضائل بیان فرمائے ہیں اور ان کی بڑی ترغیب دی ہے۔ لیکن کہیں ذکر نہیں ملتا کہ وہ صحابہ کرام کے معمولات میں تھے ـــــ مثال کے طور پر

---

[۱] عن ابن مسعود قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حیاتی خیر لکم ومماتی خیر لکم تعرض علیّ اعمالکم فما کان من حسن حمدت اللہ علیہ وما کان من سیئ استغفرت اللہ لکم ـــــ
رواہ البزار بسند جید ۔ زرقانی شرح مواہب لدنیہ ج ۵ ص ۳۳۲

صلوٰۃ وسلام ہی کو لے لیجئے، قرآن مجید میں اس کا حکم دیا گیا ہے اور بڑے مؤثر اور غیر معمولی انداز میں یہ حکم دیا گیا ہے، سورۂ احزاب میں ارشاد فرمایا گیا ہے "اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا"

—— پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کے بڑے غیر معمولی فضائل و برکات بیان فرمائے جو احادیث کے ذخیرہ میں محفوظ ہیں، لیکن اگر کوئی یہ معلوم کرنا چاہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ حضرت فاروق اعظمؓ اور دوسرے اکابر صحابہ کا اس بارہ میں کیا معمول تھا تو وہ معلوم نہ کر سکے گا —— اسی طرح جہاں تک میرا مطالعہ ہے صفِ اول کے صحابۂ کرام میں سے کسی ایک سے بھی ثابت نہیں کہ انھوں نے کبھی قبر مبارک پر حاضر ہو کر سلام عرض کیا ہو۔ صرف ایک صحابی حضرت عبداللہ بن عمر کے متعلق پتہ چلتا ہے اور وہ بھی صرف اتنا کہ جب کبھی وہ سفر سے مدینۂ طیبہ واپس آتے تو مسجد نبویؐ میں حاضر ہوتے اور اس کے بعد قبر مبارک پر حاضر ہو کر عرض کرتے۔

"اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ، اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا اَبَا بَکْرٍ، اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا اَبَتَاہُ"[۵]

اس سادہ اور مختصر سلام سے زیادہ، خود عبداللہ بن عمر سے اور کسی بھی صحابی سے کسی ضعیف روایت میں بھی منقول نہیں ہے۔

تو اگر یہ اصول مان لیا جائے کہ دلائلِ شرعیہ سے ثابت ہونے کے بعد کوئی عمل اسی صورت میں صحیح اور قابلِ عمل ہوگا جب صحابۂ کرام سے اس کا عملی ثبوت مل جائے تو بہت سے ایسے اعمال کو غیر صحیح اور ناقابلِ عمل ماننا پڑے گا جن کا اعمالِ خیر میں سے ہونا اُمت میں برابر مسلّم رہا ہے —— صحابۂ کرام سے اس طرح کے بہت سے اعمال کے منقول نہ ہونے کی متعدد توجیہیں کی جا سکتی ہیں اور مصنفین نے اپنی تصانیف میں بیان کی ہیں لیکن میں یہاں ان کا بیان کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔

---

۵ زرقانی شرح مواہب لدنیہ صفحہ ۳۰۶ ج ۸

آخر میں یہ بھی عرض کرتا ہوں کہ زیارت کے موقع پر صلوٰۃ وسلام عرض کرنے کے ساتھ شفاعت یا دُعا و استغفار کی استدعا کرنے کا یہ مسئلہ جس کے بارہ میں آپ کا اصل سوال ہے اور جس کا میں نے جواب دیا ہے یہ علماء اُمت کے اختلافی مسائل میں سے ہے، میں نے اُن بزرگوں کے مسلک کی ترجمانی اور وضاحت کی ہے جو اس کو صحیح سمجھتے ہیں ـــ لیکن اُمت کے اکابر علماء میں سے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور ان کے ہمخیال حضرات کی رائے اس کے خلاف ہے وہ اس کو صحیح نہیں سمجھتے۔ ایسے مسائل میں کسی طرف بھی تشدد کی گنجائش نہیں صرف ترجیح دی جاسکتی ہے ـــ قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ۝

آپ نے حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی خدمت میں انفرادی طور پر اور خصوصی خطاب کے ساتھ سلام عرض کرنے کے بارے میں اپنے خلجان کا ذکر کیا ہے۔ امید ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے اوپر جو نقل کیا گیا ہے اس کے مطالعہ کے بعد یہ خلجان نہیں رہے گا۔

آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ کے اخلاص نامہ کی وجہ سے اس مسئلہ کی وضاحت کا موقع پیدا ہوگیا۔

والسلام

(بقیہ مواقیت احرام) نکل جائے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ نسأل ان یھدینا لما اختلف فیہ الی الحق باذنہ وھو ولی التوفیق والسداد والصواب وبہ نستعین ولاحول ولاقوۃ الا باللہ

(البلاغ کراچی سے شکریہ کے ساتھ)

الفرقان کی ملکیت و دیگر تفصیلات سے متعلق اعلان

(مطابق فارم ۴ دیکھئے قاعدہ ۸)

مقام اشاعت	لکھنؤ
وقفہ اشاعت	ماہانہ
پرنٹر کا نام	محمد منظور نعمانی
پرنٹر کی قومیت	ہندوستانی
پرنٹر کا پتہ	کچہری روڈ لکھنؤ
پبلشر کا نام	محمد منظور نعمانی
پبلشر کی قومیت	ہندوستانی
پبلشر کا پتہ	کچہری روڈ لکھنؤ
ایڈیٹر کا نام	محمد منظور نعمانی
ایڈیٹر کی قومیت	ہندوستانی
ایڈیٹر کا پتہ	کچہری روڈ لکھنؤ
مالک کا نام و پتہ	محمد منظور نعمانی۔ کچہری روڈ لکھنؤ

میں محمد منظور نعمانی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین میں بالکل صحیح ہیں۔

(دستخط) محمد منظور نعمانی

یکم مارچ ۱۹۶۹ء

اکبر کا دینِ الٰہی اور اُس کا پس منظر

پروفیسر محمد اسلم

علماء و مشائخ کی صحبت میں رہ کر اکبر اپنے ابتدائی دورِ حکومت میں ایک راسخ العقیدہ مسلمان بن گیا تھا۔ ان ایام میں رواداری نام کو بھی نہ پائی جاتی تھی، بلکہ اس کا مذہبی تعصب اس انتہا کو پہونچا ہوا تھا کہ ۹۷۷ ہجری میں جب حسین خاں والیٔ کشمیر کا سفیر میر یعقوب بن بابا علی اس کے دربار میں حاضر ہوا تو اکبر نے اسے شیعہ ہونے کے جرم میں قتل کروا دیا۔[1] اکبر کے مصاحب علماء بھی اسی کی طرح متعصب سُنّی تھے۔ مخدوم الملک مولانا عبد اللہ سلطانپوری مہدویوں کو جو سزائیں دیا کرتے تھے۔ اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اکبر کے صدر الصدور شیخ عبد النبی بھی غیر سنّیوں کے معاملہ میں بڑے متعصب واقع ہوئے تھے۔ ان کے خلاف بھی میر حبش کو "رفض" کے جرم میں قتل کروانے کا ثبوت مل گیا ہے۔[2]

اکبر کو اولیائے کرام کے ساتھ جو عقیدت تھی وہ اسے اپنی والدہ کی جانب سے ودیعت ہوئی تھی۔ اس کی والدہ حمیدہ بانو بیگم مشہور صوفی اور شاعر شیخ احمد جام زندہ پیل کی اولاد سے تھی۔ اسی لیے اکبر کی سرشت میں بزرگوں کے لیے عقیدت کے جذبات تھے۔ کئی بار وہ پاکپٹن میں حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے مزار پر خراجِ عقیدت پیش کرنے کی غرض سے حاضر ہوا۔[3] دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر بھی وہ اکثر جایا کرتا تھا۔[4] جب خان زمان نے

---

[1] تاریخ محمدی، ورق ۵۵، بسبب رفض بفرمان اکبر بادشاہ کشتہ شد۔ [2] بدایونی، جلد ۲، ص ۲۵۵

[3] روضۃ الطاہرین، ورق ۱۴۵ ب [4] اکبر دی گریٹ مغل، ص

۹۶۵ء میں اکبر کے خلاف بغاوت کی تو اس کے مقابلہ پر نکلنے سے پہلے اکبر دہلی کے تمام اولیاء اللہ کے مزارات پر بغرض دعا حاضر ہوا۔ اس کے عہد میں شیخ نظام نارنولی ابھی حیات تھے اور بہت دُور دور تک اُن کے زہد و اتقا کا شہرہ پھیلا ہوا تھا۔ ایک بار اکبر بھی اجمیر جاتے ہوئے ان کی خدمت میں حاضر ہوا[۶] ۹۷۵ء میں اکبر ہمیں اجمیر میں سید حسین خنگ سوارؒ کے مزار پر فاتحہ خوانی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس واقعہ کے پانچ سال بعد ہم اُسے ہانسی میں حضرت قطب جمال کے مزار پر جبینِ نیاز جھکائے ہوئے دیکھتے ہیں[۷] یہ صوفیائے کرام کے ساتھ عقیدت کا ہی نتیجہ تھا کہ اکبر نے فتح پور سیکری میں شیخ سلیم چشتیؒ کے قرب میں نیا دارالحکومت تعمیر کرایا تھا۔

مولانا عبداللہ سلطان پوری اس عہد کے ایک جید عالم تھے[۸] اور شیر شاہ نے اپنے عہدِ حکومت میں ان کی علمیت سے متاثر ہو کر انھیں صدرالاسلام کا خطاب دیا تھا[۸] شیر شاہ کا بیٹا سلیم شاہ انھیں اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا کرتا تھا[۹] ہمایوں نے جب دوبارہ دہلی پر قبضہ کیا تو انھیں شیخ الاسلام کا خطاب دیا۔ بیرم خاں نے اکبر کے ابتدائی دورِ حکومت میں ان کا ایک لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کیا[۱۰]

مولانا عبداللہ بڑے راسخ العقیدہ بزرگ تھے اور شیخ الاسلام کی حیثیت سے رفعِ بدعت اور ترویجِ شریعت کے لیے کوشاں رہتے تھے[۱۱] اکبر نے بھی انھیں ان کے منصب پر برقرار رکھا۔

شیخ طاہر پٹنی اس عہد کے بڑے نامور محدث تھے اور مخدوم الملک کی طرح وہ بھی رفعِ بدعت اور ترویجِ شریعت کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ جب ان کی قوم نے مہدوی فرقہ کے عقائد اپنائے تو شیخ طاہر نے اپنے سر سے دستار اتار لی اور یہ عہد کیا کہ جب تک وہ ان کو راہِ راست

---

[۶] اکبر نامہ جلد ۳۔ ص ۲۲۷		[۷] ایضاً، ص ۲۳۲
[۸] تذکرۃ الامراء، ورق ۱۱۲ الف		[۸] مآثر الامراء، جلد ۳، ص ۲۵۲
[۹] شعرالعجم، جلد ۳، ص ۴۰		[۱۰] ایضاً
[۱۱] بدایونی، جلد ۳ ص ۷۰		[۱۱] تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۰۳

پر نہیں رہے آتے اس وقت تک وہ اپنے سر پر دستار نہیں باندھیں گے۔ جب ۹۸۰ ہجری میں اکبر نے گجرات فتح کیا تو ان کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ اس موقع پر اکبر نے "نصرت دین متین بر دفق ارادۂ شما بر ذمہ معدلت من لازم است" کہتے ہوئے ان کے سر پر اپنے ہاتھ سے دستار باندھی۔[۱۲]

سید محمد میر عدل کا بھی اکبر پر بڑا اثر تھا۔ عبد القادر بدایونی رقمطراز ہے کہ وہ فرائض کی انجام دہی میں کسی کی پرواہ نہیں کیا کرتے تھے۔ عوام تو عوام خود بادشاہ بھی ان سے گھبراتا تھا۔[۱۳] ایک بار جب حاجی ابراہیم سرہندی نے یہ فتویٰ دیا کہ مردوں کے لیے سرخ لباس پہننا جائز ہے تو میر عدل نے بادشاہ کی موجودگی میں حاجی کو برا بھلا کہا اور عصا لے کر اسے مارنے پر آمادہ ہو گئے۔[۱۴] جب اکبر راہ راست سے بھٹکا اور اس نے علماء سے کہا کہ وہ جواز متعہ پر مزید تحقیق کریں تو اس نے مصلحتاً میر عدل کو آگرہ سے بھکر تبدیل کر دیا۔[۱۵]

مذہب کے ساتھ اکبر کی دلبستگی اور علوم اسلامیہ کے ساتھ لگاؤ نے اسے فتح پور سیکری میں عبادت خانہ بنانے پر آمادہ کیا۔[۱۶] جب یہ عمارت بن کر تیار ہوئی تو ہر ہفتے جمعہ کی نماز کے بعد علماء وہاں جمع ہونے لگے۔[۱۷] اکبر خود رات کے وقت اکثر وہاں جا بیٹھتا اور یا ھو اور یا ھادی کا ورد شروع کر دیتا۔ صبح سویرے وہ ایک پتھر کی سل پر بیٹھ کر مراقبہ کیا کرتا تھا۔[۱۸]

عبادت خانہ کی تعمیر سے اکبر کا مقصد قال اللہ اور قال الرسول کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اس لیے اس نے علماء اور مشائخ کو وہاں آکر اپنے مواعظ حسنہ سے مستفیض کرنے کی درخواست کی۔[۱۹] اسی سلسلے میں شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کے صاحبزادے کو دعوت خصوصی بھیج کر فتح پور سیکری بلایا گیا اور ان کے لیے ایک نشست مخصوص کر دی گئی۔[۲۰]

---

۱۲ مآثر الکرام، جلد ۲، ص ۱۹۵ ۱۳ بدایونی، جلد ۲، ص ۲۱۰،

۱۴ ایضاً ص ۲۱۰، ۲۱۱ ۱۵ ایضاً، ۲۱۰ ۱۶ بدایونی جلد ۲، ص ۱۹۸

۱۷ ایضاً، ص ۲۰۱ ۱۸ ایضاً ص ۲۰۰ ۱۹ ایضاً ص ۲۰۰

۲۰ ایضاً ص ۲۰۱

بدقسمتی سے بعض جاہ پسند علما مخصوص نشستوں کے لیے جھگڑنے لگے کیونکہ ان میں سے ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ اسے بادشاہ کے قریب جگہ ملے۔ بادشاہ نے ان کے جھگڑے ختم کرنے کی غرض سے یہ حکم دیا کہ امرا مشرق کی جانب بچھی ہوئی مسندوں پر بیٹھا کریں اور سادات عظام مغرب کی جانب۔ اسی طرح علمائے کرام جنوب کی جانب بچھی ہوئی مسندوں پر بیٹھیں، اور مشائخ کرام شمال کی جانب[21]

جب مذہبی مباحثے شروع ہوئے تو علما مختلف مسائل میں ایک دوسرے سے جھگڑنے لگے اور بات بڑھتے بڑھتے گالی گلوچ تک جا پہنچی[22] اکبر نے ان حرکات پر خفگی کا اظہار کرتے ہوئے بدایونی سے کہا کہ جو عالم اس مجلس میں بے ہودہ پن کا مظاہرہ کرے اُسے وہاں سے اٹھا دے[23]

مولانا عبداللہ سلطان پوری کو تنگ کرنے کی غرض سے عبادت خانہ میں مدعو کیا گیا۔ علماء انھیں خواہ مخواہ مختلف مسائل میں اُلجھانے لگے۔ حاجی ابراہیم سرہندی اُن کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ اکبر نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ ابوالفضل جو اُن دنوں نوعمر ہی تھا وہ بھی مولانا کے منھ آنے لگا۔ اکبر نے اس کا بھی حوصلہ بڑھایا[24] جب حاجی ابراہیم سرہندی زیادہ ہی منھ زور ہوا تو اکبر نے بدایونی کو آگے بڑھایا، اور اس نے حاجی کے منہ میں لگام دی۔ بدایونی کے مناظرے دیکھ کر اکبر اکثر اپنے مصاحبوں سے کہا کرتا تھا کہ یہ نوجوان عبداللہ سلطانپوری کا سر پھوڑے گا[25]

ان مذہبی مباحثوں میں شاید اتنی ناخوشگواری پیدا نہ ہوتی۔ اگر اکبر ابوالفضل، حاجی ابراہیم اور بدایونی جیسے منھ زور عالموں کی پیٹھ نہ ٹھونکتا۔ اس لیے عبادت خانہ میں پیدا ہونے والی تمام بدمزگی کی ذمہ داری براہ راست اکبر پر عاید ہوتی ہے۔

ان ہی مباحثوں میں ایک بار خان جہاں نے مولانا عبداللہ سلطانپوری سے پوچھ لیا کہ کیا ان پر ابھی حج فرض ہوا ہے یا نہیں؟ مولانا نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے تمام

---

[21] ایضاً، ص ۲۰۲ — [22] بدایونی، جلد ۲، ص ۲۰۲

[23] ایضاً — [24] ایضاً

[25] ایضاً، ص ۲۰۳

حاضرین کو بتایا کہ اس زمانے میں دو وجوہات کی بنا پر فریضۂ حج ساقط ہو چکا ہے۔

اول یہ کہ جو شخص سمندر کے راستے جدہ روانہ ہونا چاہے اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ پرتگیزوں سے پاسپورٹ حاصل کرے۔ چونکہ اس پاسپورٹ پر صلیب کے نشان کے علاوہ حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی تصاویر بھی ہوتی ہیں۔ اس لیے کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اس طرح کی دستاویزات اپنے پاس رکھے۔

ثانیاً یہ کہ اگر کوئی شخص سمندر کی بجائے خشکی کے راستے حجاز جانا چاہے تو اس کے لیے ایران سے گزرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں۔ ایران پر چونکہ شیعوں کا قبضہ ہے۔ اس وجہ سے کسی سُنّی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ "ملحدوں" کے ملک میں سفر کرے۔"

ان دو صورتوں کے علاوہ اور کسی طریقے سے حجاز پہونچنا ممکن نہیں۔ اس لیے فریضۂ حج ساقط ہو چکا ہے[26] زکوٰۃ کی ادائیگی سے بچنے کے لیے بھی اسی طرح کے حیلۂ بیہودے کام نکالا گیا۔[27] علماء کی نجی زندگی اور ان کے کرتوت دیکھ کر بادشاہ کا ان پر سے اعتماد اُٹھ گیا۔ مولانا عبداللہ سے گلو خلاصی کرانے کی غرض سے انھیں جبراً مکہ مکرمہ بھیج دیا گیا۔[28] کچھ عرصہ گزرنے کے بعد مولانا بلا اجازت ہندوستان چلے آئے لیکن آگرہ پہونچنے سے پہلے ہی احمد آباد میں انتقال ہو گیا۔ بادشاہ نے جاسوسوں کی اطلاع پر ان کے "آبائی قبرستان" کو کھدوایا تو ان "قبروں" سے تین کروڑ روپے کی مالیت کی طلائی اینٹیں برآمد ہوئیں۔[29] ان کا زکوٰۃ کی ادائیگی سے بچنے کا عذر اور حج پر نہ جانے کا بہانہ اور اسی طرح کے حیلہ ہائے بیہودہ پڑھ کر دَورِ حاضر کے بعض مؤرخوں کو مولانا عبداللہ پر شائیلاک کا گمان گزرتا ہے۔[30]

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے پوتے شیخ عبدالنبی صدر الصدور اپنے دَور کے بہترین محدث مانے جاتے تھے۔ آپ نے حجاز میں اس دَور کے جید علماء سے تعلیم حاصل کی تھی[31] ہر

---

[26] ایضاً۔ ص ۲۰۳؛ از دبستان مذاہب، ص ۲۶۳؛ [27] بدایونی، جلد ۲، ص ۲۰۳

[28] ایضاً، ۲۰۴		[29] ایضاً بحوالہ ۳۔ از منتخب اللباب، جلد اول، ص ۲۴۰

[30] ریلجس پالیسی آف اکبر۔ ورق ۸۴		[31] روضۃ الطاہرین، ورق ۵۰ ب

کس و ناکس ان کا دل وجان سے احترام کرتا تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ اکبر خود ان کے گھر جاکر درس حدیث میں شریک ہوا کرتا تھا۔[۳۲] اکبر نے ایک بار اپنے ہاتھوں سے ان کے جوتے سیدھے کیے، اور شاہزادہ سلیم کو سماعت حدیث کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔[۳۳] انھوں نے بھی ادائیگی زکوٰۃ سے بچنے کا ایک حیلہ تلاش کر لیا تھا۔ اکبر نے انھیں بھی جبراً حج پر روانہ کر دیا۔ لیکن آپ بھی مولانا عبداللہ سلطانپوری کے پیچھے پیچھے ہندوستان چلے آئے۔ جب اکبر سے ملاقات ہوئی تو جن ہاتھوں سے وہ آپ کے جوتے سیدھے کیا کرتا تھا ان ہی ہاتھوں سے اس نے آپ کے منھ پر ایک گھونسہ رسید کیا۔[۳۴] اکبر کے حکم سے آپ کو زندان میں ڈالدیا گیا جہاں ابوالفضل نے طرح طرح کی اذیتیں دے کر انھیں مرواڈالا۔

مولانا عبداللہ سلطان پوری اور شیخ عبدالنبی کو ٹھکانے لگاکر اکبر علماء کے اثر سے نکل گیا۔ اور پھر من مانی کارروائیاں کرنے لگا۔[۳۵] حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خیال میں مولانا عبداللہ سلطانپوری شیخ عبدالنبی، حاجی ابراہیم سرہندی، تاج العارفین تاج الدین، شیخ مبارک اور اس کے بیٹے جیسے علماء بادشاہ کو گمراہی کے راستے پر ڈالنے کے ذمہ دار ہیں آپ ایک مکتوب میں رقمطراز ہیں:[۳۶]

"والحق دریں زمان ہر سستی و داہنی کہ در امور شرعیہ واقع شدہ است وہر فتوری کہ در ترویج ملت و دین ظاہر گشتہ است ہمہ از شومئ علماء سوست، و فساد نیات ایشان۔"

ان کے شرعی حیلے اور طلب جاہ خود ان کے لیے اور ان کی وجہ سے اسلام کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ انھیں "لصوص دین" کے لقب سے یاد کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:[۳۷]

"معلوم شریف است کہ در قرن سابق ہر فساد یکہ پیدا شد از شومئ علماء سو بظہور آمدہ .....

علمائے سو لصوص دین اند۔ مطلب ایشان حب جاہ و ریاست و منزلت نزد خلق است۔"

۳۲؎ بدایونی، جلد ۲، ص ۲۰۴ ۳۳؎ ایضاً

۳۴؎ ایضاً۔ ص ۳۱۱ ۳۵؎ مراۃ جہان نما، ورق ۱۲۸ ب

۳۶؎ مکتوبات امام ربانی، جلد اول، مکتوب نمبر ۳۳ ۳۷؎ ایضاً

آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ علمائے سوء کے اختلافات نے امت کو ایک مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ اصل الفاظ یہ ہیں[۳۸]

"در قرن سابق اختلاف علماء عالم را در بلا انداخت۔"

علما کے زوال کے بعد بادشاہ صوفیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ اس زمانے میں ہندوستان روحانی طور پر دیوالیہ ہو چکا تھا اور پورے ہندوستان میں ایسا بزرگ کوئی نہ تھا جو عوام کی راہ نمائی کر سکتا۔ اور جو صوفی ان دنوں میں حیات تھے وہ وحدۃ الوجود کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اور ان کا بیشتر وقت سکر کے عالم میں گزرتا تھا۔ بدایونی رقمطراز ہے کہ قاضی امان اللہ پانی پتی کے بھتیجے شیخ تاج الدین بادشاہ کے سامنے قرآن کی تفسیر وحدت وحدت الوجود کے رنگ میں کیا کرتے تھے[۳۹] خود شیخ امان اللہ، شیخ محی الدین اکبر ابن عربی کے بے حد مداح تھے اور وہ ہمیشہ وحدۃ الوجود کے موضوع پر ہی درس دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اس موضوع پر کئی کتابیں بھی لکھی تھیں[۴۰] ہندوستان میں صوفیا کے حلقوں میں ان کا بڑا احترام کیا جاتا تھا۔

اسی طرح شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ بھی اپنے عہد میں وحدت الوجودی صوفیوں کے سرخیل تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے اپنی مسجد میں اسی موضوع پر درس دیا۔ جب ان کا درس ختم ہوا، تو ان کے بیٹوں نے نظریات قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر شیخ عبدالقدوس بڑے ناراض ہوئے اور ناراضگی کے عالم میں آپ نے یہ فرمایا کہ وہ ایسے شہر میں رہنے کے لیے تیار نہیں جہاں کے باشندے وحدۃ الوجود پر ایمان نہ رکھتے ہوں[۴۱] ان کے فرزند شیخ رکن الدین رقم طراز ہیں کہ اس واقعہ کے بعد شیخ بزرگؒ نے اپنے بیٹوں کی اقتدا، میں نماز پڑھنا ترک کر دی اور جب اُن سے اس کا سبب پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ میرا دین اور ہے، اور ان کا دین اور[۴۲]

۳۸ھ ایضاً، مکتوب نمبر ۵۳ ۳۹ھ بدایونی۔ جلد دوم۔ ص
۴۰ھ اخبار الاخیار، ورق ۱۸۷ ب ۴۱ھ لطائف قدوسی ص ۵۹، ۴۲ھ ایضاً ص ۶۰

ایک بار شیخ عبد القدوسؒ کے جلیل القدر مرید شیخ جلال الدین تھانیسریؒ اُن سے ملنے آئے،
جب آپ نے انھیں دُور سے آتے دیکھا تو فرمایا: "ہاں کجا باشی وبگو کہ چہ دین داری وچہ مشرب داری"
جب انھوں نے بتایا کہ ان کا بھی وہی دین اور مشرب ہے جو شیخ کا ہے تو آپ نے آگے بڑھ کر ان کا
استقبال کیا اور ان سے گلے ملے۔

ان امثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس دَور کے تمام صوفیا وحدۃ الوجود کے
رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے اور اٹھتے بیٹھتے اسی نظریہ کا پرچار کرتے تھے۔ ہر چند کہ شیخ عبد القدوس
کا انتقال اکبر کی تخت نشینی سے کئی سال پہلے ہو چکا تھا۔ لیکن ہندوستان کی فضا میں ان
کے درس کی صدائے بازگشت ہنوز گونج رہی تھی۔

ڈاکٹر یوسف حسین رقم طراز ہیں کہ اکبر کے زمانے میں وحدۃ الوجود کا نظریہ
اسلامی ہندوستان میں عام ہو چکا تھا اور صوفیائے کرام پر صحو کے بجائے سکر غالب
آگیا تھا۔[۴۳] اکبر کے دین الٰہی کا اس نظریہ سے قریبی تعلق تھا۔[۴۴] ڈاکٹر تارا چند فرماتے ہیں کہ اس
نظریہ سے یہ بات اکبر پر عیاں ہو چکی تھی کہ خدا کی پرستش کے بہت سے طریقے ہیں اور یہ کہ تمام مذاہب
مبنی بر صداقت ہیں اور جب تمام موجودات مظاہر الٰہی ہیں تو پھر پتھر ے اور ستارے کی صورت
میں بھی خدا ہی کی پوجا ہو گی۔[۴۵] اس عقیدے کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ دیگر مذاہب کے ماننے والوں
کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم ہو جائیں گے! اور انسان میں برداشت کا مادہ پیدا ہو جائے گا۔[۴۶]

ہم یہ بتا چکے ہیں کہ ہندوستان اُس عہد میں روحانی طور پر دیوالیہ ہو چکا تھا اور اس
وقت کوئی مرد خدا اس قابل نہ تھا کہ وہ عوام کی روحانی رہنمائی کر سکتا۔ شیخ عبد القدوس
گنگوہیؒ اور شیخ سما ء الدین سہروردیؒ عوام الناس میں زیادہ مقبول نہ ہو سکے۔ تاریخ شاہی
مخزن افغانی کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ صحو پر سکر غالب آ چکا تھا اور ملک

---

[۴۳] ایضاً
[۴۴] گلمپسز آف دی مڈیول انڈین کلچر، ص ۵،
[۴۵] ایضاً
[۴۶] دی انفلوئنس آف اسلام ان انڈین کلچر، ص ۴۷،
[۴۷] ایضاً

میں مجاذیب کی بھرمار تھی نعمت اللہ ہروی نے ایسے بے شمار مجاذیب کا ذکر کیا ہے جو اس عہد میں موجود تھے۔ ان میں سے میاں قاسم خلیل، شیخ علی سرمست، شیخ حمزہ، شیخ جمال کاکر، علی مجذوب، شاہ محمد، شیخ ننگی، شیخ داؤد مکمر دانی اور شیخ عارف قابل ذکر ہیں[۴۸] مفتی سرور لاہوری نے بھی شیخ حسین لاہوری کا شمار ان ہی مجاذیب میں کیا ہے[۴۹] ان کے علاوہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار کے خاتمہ پر ان جیسے بے شمار مجاذیب کا ذکر کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ہوش مند صوفیوں کا فقدان تھا اور ملک میں جابجا مجاذیب پھیلے ہوئے تھے جو شریعت کی قید سے آزاد تھے۔ ان کی آزاد مشربی اور خلاف شریعت حرکات دیکھ کر عوام بھی آزاد مشرب اور بے شرع ہو رہے تھے۔ نیز ان مجاذیب کی اکثریت عشق مجازی میں پھنسی ہوئی تھی۔ تاریخ شاہی کے مصنف نے ان کی بے شمار عشقیہ داستانیں مزے لے لے کر بیان کی ہیں۔

اکبر کے ایک ہم عصر بزرگ، اخوند درویزہ اپنی مشہور تصنیف ارشاد الطالبین میں اس عہد کے سجادہ نشینوں کے متعلق تحریر فرماتے ہیں "خصوصاً در این زمانہ فساد کہ اکثر آدم صورت و شیطان سیرت بر سجادہ پدر و پدر کلاں خود نشستہ اند۔"[۵۰] ایسے ہی پیشہ ور صوفیوں نے اس عہد میں عوام کے اخلاق کو بگاڑنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ایک جگہ حضرت مجدد الف ثانی ان کے متعلق لکھتے ہیں: "و اکثر جہلائے صوفی نمائے ایں زمانہ حکم علماء سو دارند، فساد ایں ہا نیز فساد متعدی است[۵۱]"

اخوند درویزہ نے اپنی ایک دوسری تصنیف تذکرۃ الابرار والاشرار میں ایسے بے شمار صوفیوں کا ذکر کیا ہے جو پہلے خود گمراہ ہوئے اور پھر دوسروں کو بھی خوب گمراہ کیا۔ ان "اشرار" میں سے ایک "شریر" پیر طیب نامی افغان تھا جو مسئلہ آواگون کا پرچار کیا کرتا تھا[۵۲] اسی طرح ایک

---

[۴۸] مخزن افغانی مورق ۱۹۴ ب، ۲۰۰، ۲۰۱ الف، ۲۰۴، ۲۰۴ الف، ۲۰۷ الف، ۲۱۹ ب۔

[۴۹] خزینۃ الاصفیاء۔ جلد اول، ص ۱۴۱ [۵۰] ارشاد الطالبین، ص ۲۹۹

[۵۱] مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب نمبر ۴۷ [۵۲] تذکرۃ الابرار والاشرار، ص ۱۶۲

نام نہاد پیر ملا عبدالرحمٰن قیامت کا منکر تھا[53] ایک اور "شریر" ایاس افغان برہمنوں کی طرح زنار پہنا کرتا تھا[54] اسی طرح محمد ضیا نامی ایک افغان مسئلہ تناسخ پر ایمان رکھتا تھا اور "اباحت" کا پرچار کیا کرتا تھا[55] اسی عہد میں دلی نامی ایک افغان پیر نے مسئلہ تناسخ کا پرچار کر کے بے شمار لوگوں کو گمراہ کر دیا۔ اخوند درویزہ فرماتے ہیں کہ اول اول اس نے نبوت کا دعویٰ بھی کیا تھا لیکن بعد ازاں وہ خدائی کا دعویٰ کرنے لگا تھا[56] جس طرح خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے اسکی دیکھا دیکھی غرغشتی قبیلہ کے ایک افغان کریم داد نے بھی ایسے ہی دعوے کر کے کافی لوگوں کو غلط راستہ پر ڈال دیا[57]

ٹھیک اسی زمانے میں پیر پہلوان نامی ایک شخص خراسان سے آ کر چکدرہ کے قریب آباد ہوا۔ اس نے افغانوں میں "علی پرستی" شروع کر وادی۔ علاوہ ازیں اس نے نماز پنجگانہ اور ماہ رمضان کے روزے منسوخ کر کے اپنے مریدوں کے لیے شراب اور زنا کو حلال کر دیا[58] اسی طرح محمد زئی قبیلہ کے ایک فرد، شیخ یوسف نے طریقہ اباحتیہ اپنا لیا[59] ۹۸۱ ہجری میں مراد نامی ایک شخص نے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا[60] اس سے قبل محمود نامی ایک ایرانی نبوت کا دعویٰ کر چکا تھا[61] مندرانام افغان قبیلہ کے بہت سے لوگوں نے قطب اور غوث ہونے کے دعوے کیے ان میں سے ملا میر دنامی ایک "قطب" یہ کہا کرتا تھا کہ عرش کے اوپر ایک فرش ہے اور اس پر ایک بہت بڑا پتھر دھرا ہوا ہے، اس پتھر کے اوپر ایک بڑا خیمہ تنا ہوا ہے جس کے ستر ہزار دروازے ہیں۔ اس خیمہ کے اندر ایک تخت رکھا ہوا ہے۔ جس پر خدا بیٹھتا ہے۔ اور یہ ایک راز ہے جسے علماء نہیں جانتے[62]

ان "اشرار" میں غالباً سب سے زیادہ "شریر" پیر روشن تھا جسے مغلیہ عہد کے

---

[53] ایضاً ص ۱۷۰ [54] ایضاً ص ۱۶۵ [55] ایضاً ص ۱۷۱

[56] ایضاً، ص ۱۶۳ [57] ایضاً، ص ۱۶۴ [58] ایضاً ص ۱۶۲

[59] ایضاً، ص ۱۷۱ [60] تاریخ الفی، ورق ۲۰۰ ب

[61] ایضاً [62] تذکرۃ الابرار والاشرار ص ۱۶۸

مورخ پیر تاریک کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ مشرقی پنجاب کے مشہور شہر جالندھر میں افغانوں کے آخری دورِ حکومت میں پیدا ہوا۔ مغلوں کے ابتدائی ایام حکومت میں وہ اپنی ماں کے ساتھ آزاد علاقے میں چلا گیا۔ لیکن ہوش سنبھالتے ہی حصولِ تعلیم کے لیے وہ دوبارہ ہندوستان آیا۔ اس زمانے میں کالنجر میں ملّا سلیمان نامی ایک اسمٰعیلی کے درس کا بڑا شہرہ تھا۔[64] پیر روشن نے اس کے مدرسہ میں داخلہ لیا اور اسمٰعیلی استاد کی صحبت میں رہ کر عجیب و غریب عقاید اپنا لیے۔ تعلیم سے فراغت پاتے ہی پیر روشن آزاد علاقے کی طرف لوٹ گیا۔[65] محسن فانی کے قول کے مطابق اس نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ نبی ہے اور اس پر وحی نازل ہوتی ہے۔[66] علاوہ ازیں پیر روشن کے خیال میں نماز میں قبلہ کی طرف رُخ کرنا ضروری نہ تھا۔[67] اسی طرح اس نے غسلِ جنابت بھی منسوخ کر دیا۔[68] اخوند درویزہ کے بیان کے مطابق "ایں ملعون بر عقیدۂ مذہب تناسخ رفتہ بود۔"[69] اس کے علاوہ پیر روشن "دُزدی و رہزنی را پیشہ گرفتہ فقرا و مسافران را می کشتہ خون ہائے ایشاں و مالہائے ایشاں را حلال می داشت۔"[70] اس کے افغان ساتھیوں کو اس کی تعلیمات میں فائدے ہی فائدے نظر آئے اور اُن کی اکثریت اس کی طرف دار ہو گئی۔ اس نے اپنے ماننے والوں کی "ہدایت" کے لیے خیر البیان نامی ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ اخوند صاحب اُس کتاب کو اپنی تحریروں میں "شر البیان" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ آپ نے اپنی تحریروں میں پیر روشن اور اس کی تحریک کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دیے ہیں۔

تذکرۃ الابرار والاشرار اور مخزن اسلام اخوند درویزہ کی مشہور تصانیف ہیں اور ان میں آپ نے اپنے عہد کے تمام ملحدوں کے نظریات کی تکذیب کرتے ہوئے مسلمانوں کو ان کی صحبت سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ آپ ہی وہ بزرگ ہیں جنھوں نے آزاد قبائل میں فتنۂ ارتداد و الحاد کو بڑھنے سے روکا۔ مخزن اسلام میں آپ تحریر فرماتے ہیں۔ "یقین می باشد کہ اگر فقیر را در میان نمی بود از افغانان یوسف زئی کسے مسلمان نمی ماند۔"[71] آپ کے بعد آپ کے خلف الرشید نور محمد

[64] ا۔ ایضاً، ص ۲۴۔ ۲۔ دی سپرٹ آف اسلام، ص ۳۴۳، ۳۴۴

[65] ا۔ نیو فیز آف دی افغانز آف جالندھر بستیز، ص ۴۲ [66] دبستان مذاہب، ص ۲۴۰، ۲۵۰

[67] ایضاً [68] ایضاً، ۲۵۰ [69] تذکرۃ الابرار والاشرار، ورق ۱۲۵ ب [70] ایضاً [71] مخزن اسلام، ورق ۲ الف

نے آپ کا شن جاری رکھا۔ ان کی روحانی تربیت خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ نے کی لیکن انھیں خرقہ خلافت شیخ آدم نبوریؒ نے عطا فرمایا تھا۔

یہ تھی سولھویں صدی کے اختتام پر ہندوستان کی مذہبی فضا جس میں اکبر دینِ اسلام سے برگشتہ ہوا اور اس نے دین الٰہی کی بنیاد رکھی میرے خیال میں ہندوستان کی یہ فضا اکبر کے لیے سازگار تھی اور اس نے بھی دوسروں کی دیکھا دیکھی ایک نئے دین کی طرح ڈالی۔

جن دنوں اکبر علماء سے بیزار ہوا، ان ہی ایام میں بدقسمتی سے ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ اس نے صورت حال کو بد سے بدتر بنا دیا۔ بدایونی رقم طراز ہے کہ متھرا کے قاضی عبدالرحیم نے تعمیر مسجد کے لیے سامان جمع کیا لیکن ایک چالاک برہمن نے راتوں رات وہ سامان اٹھا کر مندر کی تعمیر میں لگا دیا۔ جب مسلمانوں نے اس سے باز پرس کی تو وہ اسلام اور بانیٔ اسلام کی شان میں گستاخیاں کرنے لگا۔ قاضی صاحب نے صدر الصدور ملا عبد النبی کی عدالت میں برہمن کے خلاف مقدمہ دائر کیا۔ صدر الصدور نے برہمن کے نام عدالت میں حاضر ہونے کا سمن جاری کیا لیکن اس نے تعمیل سمن سے صاف انکار کر دیا۔ اکبر نے موقع کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے بیربل اور ابوالفضل کو متھرا بھیجا اور وہ برہمن کو سمجھا بجھا کر دربار میں لے آئے۔

اکبر نے ابوالفضل کو اس واقعہ کی چھان بین پر مامور کیا۔ ابوالفضل کی تحقیق کے بعد برہمن مجرم قرار پایا۔[۱] علما اس شاتم رسولؐ کو پھانسی دینے پر تلے ہوئے تھے۔ اتفاق سے وہ نابکار اکبر کی بیوی جودھا بائی کا پروہت تھا۔ اور بیوی کے زیر اثر اکبر اسے بچانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ صدر الصدور کے اختیارات میں مخل ہونا بھی پسند نہ کرتا تھا۔ لہٰذا اس نے یہ معاملہ ملا عبد النبی پر چھوڑ دیا اور انھوں نے بھی بادشاہ کی ناراضگی کی پروا نہ کرتے ہوئے اس برہمن کو تختۂ دار پر لٹکا دیا۔ اس پر اکبر ملا عبد النبی سے بہت برہم ہوا۔ ایک طرف تو "دختران راجہائے ہند" نے اس کے کان بھرے کہ اس نے ملاؤں کو اتنا سر پر چڑھا لیا ہے کہ وہ اُس کی مرضی کی بھی پروا نہیں کرتے۔ دوسری طرف ملا

---

[۱] بدایونی، جلد ۳۔ ص ۸۰

عبدالنبی کے کسی مخالف نے موقع پاتے ہی بادشاہ کے حضور میں یہ سوال اٹھایا کہ گو ملا صاحب امام اعظم ابو حنیفہؒ کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن وہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ ان کے جدِ امجد کے نزدیک شاتمِ رسولؐ سزائے موت پانے کا مستحق نہیں۔[۴۳] اس پر بادشاہ مزید بگڑا۔

اتفاق سے ان ہی دنوں بادشاہ کی سالگرہ کی تقریب منعقد ہوئی۔ اس موقع پر شیخ مبارک ناگوری بادشاہ کی خدمت میں تہنیت پیش کرنے کی غرض سے دربار میں حاضر ہوا۔ اس نے بادشاہ کو مغموم پا کر اس کا سبب دریافت کیا تو بادشاہ نے اسے برہمن کے قتل کے واقعہ سے آگاہ کیا۔ اس پر شیخ مبارک نے بادشاہ کو بتایا کہ وہ چونکہ خود امام عادل ہے اس لیے وہ علما کے فتاویٰ کا محتاج نہیں بلکہ وہ خود مجتہد ہے اور مذہبی امور میں اس کا فیصلہ قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بات سنتے ہی بادشاہ نے شیخ مبارک سے کہا کہ وہ اسے علمار کے چنگل سے چھڑانے کی کوئی تدبیر سوچے۔ اس پر شیخ مبارک نے ایک محضر تیار کیا اور اس پر تمام علمار کے دستخط کرا لیے۔ اس محضر کی رُو سے اکبر کو امام عادل قرار دیا گیا اور مذہبی امور میں اس کا فیصلہ حرفِ آخر قرار دیا گیا۔[۴۴]

جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے، محضر نامہ کی تیاری سے پہلے ہی اکبر کے خود غرض مصاحبوں نے اس کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ وہ خلفائے راشدین کی طرح مذہبی امور کا بھی سربراہ ہے اس لیے اسے جمعہ کے روز ان کی تقلید کرتے ہوئے خطبہ بھی دینا چاہیے۔ چنانچہ یکم جمادی الاول ۹۸۰ ہجری کو اکبر فتح پور سیکری کی مسجد میں خطبہ دینے کی غرض سے منبر پر چڑھ گیا۔[۴۵] بدایونی رقم طراز ہے کہ منبر پر چڑھتے ہی بادشاہ پر کپکپی طاری ہو گئی اور وہ فیضی کے دو تین اشعار پڑھ کر منبر سے اتر آیا۔[۴۶]

شیخ مبارک جس نے محضر نامہ کی رُو سے اکبر کو امام عادل بنا کر لامحدود اختیارات کا مالک بنا دیا تھا، بڑا چالاک عالم تھا۔ اکثر لوگ اسے شیعہ سمجھتے تھے۔[۴۷] اور یہ حقیقت

---

۴۳ ایضاً۔ ص ۷۳ ۴۴ مآثر رحیمی، جلد اول، ص ۶۶۸-۶۷

۴۵ زبدۃ التواریخ۔ ورق ۲۰۲ الف؛ از فیضی سرہندی، اکبر نامہ، ورق ۱۴۹ ب ۴۶ بدایونی جلد دوم، ص ۲۶۸،

۴۷ اے لٹریری ہسٹری آف پرشیا، جلد ۴، ص ۱۸۔

ہے کہ اس کے آباد اجداد یمن کے رہنے والے تھے جو زیدی اور سلیمانی شیعوں کا مرکز تھا۔ شیخ مبارک کا مورث اعلیٰ یمن سے سندھ آکر ریل نامی ایک قصبہ میں آباد ہوا۔ سندھ اور گجرات اس زمانے میں اسمٰعیلی شیعوں کی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز تھے۔ اس کے آباد اجداد مدت تک اس ماحول میں آباد رہے۔ شیخ مبارک کا والد شیخ خضر ریل کی سکونت ترک کرکے ناگور میں جا بسا اور وہیں شیخ مبارک پیدا ہوا۔[48]

پٹھانوں کے آخری ایام حکومت میں جب راجستھان میں راجپوتوں نے سر اٹھایا اور ان کا راہنما رانا سانگا ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنے کے خواب دیکھنے لگا تو راجپوتوں نے راجستھان کی مسلم بستیوں پر حملے شروع کر دیے۔ ان حالات میں شیخ مبارک ناگور سے احمد آباد چلا گیا۔ جو مدتوں سے اسمٰعیلی اور بوہرہ مبلغوں کی سرگرمیوں کا مرکز چلا آرہا تھا۔[49] کچھ عرصہ بعد وہ آگرہ چلا گیا اور وہاں ایک مدرسہ میں درس و تدریس میں مشغول ہو گیا۔[50] جن دنوں مہدوی تحریک نے زور پکڑا اور مہدوی معتوب ہوئے ان ایام میں بھی اس کی دوستی مہدوی راہ نما شیخ علائی کے ساتھ قائم رہی۔ اس پر لوگ اسے بھی مہدویوں میں شمار کرنے لگے۔ اکبر کے ابتدائی دور حکومت تک مہدویوں کی پکڑ دھکڑ جاری تھی اور ملا عبداللہ سلطان پوری اور ملا عبدالنبی انھیں چن چن کر قتل کروا رہے تھے۔ اس زمانے میں ان کی توجہ شیخ مبارک پر بھی مبذول ہوئی لیکن وہ پولیس کے پہونچنے سے پہلے ہی اپنے خاندان سمیت کہیں روپوش ہو گیا۔[51]

اکبر کے زمانے میں جب صوفی مقرب بارگاہِ سلطانی ہوئے تو شیخ مبارک نقشبندی سلسلہ کا درویش مشہور ہوا۔[52] ابوالفضل نے بھی ایک موقعہ پر اسے نقشبندی لکھا ہے۔[53]

---

[48] آثار الامراء، جلد ۲، ص ۵۰۴ [49] ایضاً [50] ایضاً

[51] دی ہسٹری آف انڈیا، ص ۵۲۱ [52] آثار الامراء، جلد ۲، ۵۰۵

[53] آئین اکبری، جلد ۲، ص ۲۶۰

اس کے کچھ عرصہ بعد وہ نقشبندیوں سے قطع تعلق کر کے درویشیوں کے ہمدانیہ سلسلے سے منسلک ہو گیا[۸۴]۔ لیکن جب دربار میں شیعہ اثر و رسوخ بڑھا تو شیخ کے لباس اور اطوار کو دیکھ کر لوگ اسے بھی شیعہ سمجھنے لگے[۸۵]۔ بدایونی کے قول کے مطابق اس کی شیعوں کے ساتھ رشتہ داری بھی تھی اور اس کا ایک داماد خداوند خاں بڑا متعصب شیعہ تھا[۸۶]۔ تاریخ پنجاب کے مصنف بھنڈے شاہ نے شیخ مبارک کا شمار "ملاحدہ" میں کیا ہے[۸۷]۔ سر ولزلی ہیگ رقم طراز ہے کہ شیخ مبارک مختلف ادوار میں سُنّی، شیعہ، صوفی اور مہدوی کے علاوہ اور خدا جانے کیا کیا رہ چکا تھا[۸۸]۔ میری ناقص رائے میں شیخ مبارک آزاد خیال اور وسیع المشرب عالم تھا اس لیے وہ مختلف مکاتب فکر کے علما سے بڑی آزادی سے ملتا جلتا تھا۔ کبھی کبھی میرے ذہن میں یہ بات بھی آتی ہے کہ اس کے آباد اجداد یمنی النسل شیعہ تھے اور وہ خود بھی شیعہ ماحول میں بڑھا پلا تھا۔ اس لیے حاکم وقت کا مزاج دیکھ کر وہ تقیہ کر لیتا تھا اس کا ایک ناقابلِ تردید ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ عبادت خانہ کے مباحثوں میں اپنے مخالفین پر ہمیشہ شیعہ اور اسمٰعیلی ہتھیاروں سے حملہ کیا کرتا تھا۔

اکبر کے دادا بابر کے عہد میں ترکی کے سلطان سلیم کو چونکہ دنیائے اسلام نے خلیفہ تسلیم کر لیا تھا۔ اور دنیا بھر کے سُنّی اُسے نبی اکرمؐ کا جانشین مان چکے تھے۔ اس لیے ایک خلیفہ کی موجودگی میں اکبر کے لیے دعوائے خلافت کرنا آسان نہ تھا۔ اس لیے شیخ مبارک نے اپنی چالاکی سے اُسے "امام عادل" بنا دیا۔ اور یہ بات یاد رہے کہ خلیفہ کی موجودگی میں شیعہ حضرات کے عقیدہ کے مطابق امام ہو سکتا ہے۔ جیسے شیخین کے زمانے میں حضرت علیؓ باقاعدہ امام تھے۔

اس زمانے میں سیدھے سادے سُنّیوں کے لیے یہ معمولی لقب کی حیثیت رکھتا ہوگا لیکن اصل میں لقب کی حیثیت اس سے کہیں زیادہ تھی۔ مغرب میں نے خصوصاً ایرانیوں نے، اپنے حاکموں کو بعض خدائی صفات سے متصف کر کے انھیں خدائی حقوق (DIVINE RIGHTS) دے رکھے تھے۔ اکبر کو امام عادل اور امام زمان بنانے میں شیخ

---

۸۴ مآثر الامرا، جلد ۲، ص ۵۸۵ ۸۵ ایضاً ۸۶ بدایونی، جلد ۲، ص ۲۰۲

۸۷ تاریخ پنجاب، ورق ۱۳۱ الف ۸۸ دی کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، جلد ۴، ص ۱۸

مبارک کا یہی مقصد تھا۔[۸۹]

جب اکبر کے حکم سے مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ ہوا تو ابوالفضل نے اس کا دیباچہ لکھا تھا۔ اس دیباچہ کو بغور پڑھ کر یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ شیخ مبارک اور اس کے بیٹوں کا اکبر کو امام عادل بنانے سے کیا مقصد تھا۔ دراصل وہ اکبر کو فاطمی امام کے پورے اختیارات دلوانا چاہتے تھے۔[۹۰] ابوالفضل نے اس دیباچہ میں اکبر کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: "آن سلطان عادل برہان کامل دلیل قاطع خدا دانی حجت ساطع رحمت رحمانی قافلہ سالار راہ حقیقی و مجازی۔"[۹۱] اس کے علاوہ وہ اکبر کو "ہادی علی الاطلاق و مہدی باستحقاق" "خلیفۃ اللہ" کے القابات سے بھی یاد کرتا ہے۔[۹۲] شاید اسی "باریک تر ز مو نکتہ" کو سمجھتے ہوئے بدایونی، ابوالفضل کے متعلق لکھتا ہے: "آتش در جہان انداختہ و چراغ صباحیاں کہ چراغ گرفتن در روز روشن داشت روشن گردانیدہ۔"[۹۳]

بدایونی کی اس عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابوالفضل حسن ابن صباح کی مشعل لے کر دربار میں آیا اور اس نے پورے جہان کو آگ لگا دی۔ مشعل صباحیان سے بدایونی اسمٰعیلی ترکیبیں مراد لیتا ہے۔ شاید ابوالفضل کی اسی چالاکی اور ہوشیاری کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا بھائی عبدالصمد اس کے متعلق لکھتا ہے: "شیخ ابوالفضل وزیر خاقان [illegible]"[۹۴]

ڈاکٹر احمد بشیر صاحب اپنے تحقیقی مقالہ میں یہ تحریر فرماتے ہیں کہ عبادت خانہ کے مباحثوں میں ابوالفضل کا انداز بحث اور اکبر کو مہدی بنانے کا نظریہ علمی طور پر اسمٰعیلی ہیں۔ اس نے اکبر کو جو لامحدود مذہبی اختیارات دیے ہیں اور اُسے علم لدنی کا حامل بتاتے ہوئے اس کے ساتھ جو معجزات منسوب کیے ہیں وہ اکبر کو اسمٰعیلی امام کا ہم پلہ بنا دیتے ہیں۔[۹۵]

---

[۸۹] لٹریری ہسٹری آف پرشیا، جلد ۴، ص ۱۸۰۔　[۹۰] مہابھارت، ورق ۴ الف تا ۴ ب
[۹۱] ایضاً ورق ۴ الف، ب　[۹۲] ایضاً　[۹۳] بدایونی، جلد ۲، ص ۱۹۸
[۹۴] مکاتبات علامی، ورق [illegible]　[۹۵] ریلجس پالیسی آف اکبر، ورق ۹۵، ۹۶

ڈاکٹر احمد بشیر صاحب شیخ مبارک اور اس کے فرزندوں کی اکبر کو امام عادل بنانے کی چال کو سمجھ گئے ہیں۔ اسی روشنی میں اگر ہم ابوالفضل کی اکبر کے متعلق تمام تحریروں کو جمع کریں تو یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ابوالفضل واقعی اکبر کو شیعہ یا اسمٰعیلی امام کی جملہ صفات سے متصف کر دیتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ ابوالفضل رقم طراز ہے کہ اکبر کی پیدائش سے پہلے اس کی ماں کو حضرت مریمؑ کی طرح بشاراتِ غیبی، بشاراتِ قدسی ہوا کرتے تھے[۹۶] گویا وہ اکبر کو شیعہ یا اسمٰعیلی امام کی طرح مادرزاد ولی دکھانا چاہتا ہے۔ ایک موقع پر بدایونی رقم طراز ہے کہ اکبر کے بعض معتقد اسے "صاحب زمان" کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے[۹۷] اور یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ لقب صرف شیعہ یا اسمٰعیلی امام یا مہدی کیلیے ہی استعمال ہو سکتا ہے۔ ایک دوسرے موقع پر ابوالفضل لکھتا ہے کہ اکبر اپنے عہد طفولیت میں آغوش مادر میں مسیح وار باتیں کیا کرتا تھا[۹۸] اسی طرح جب اس کے چچا کامران میرزا نے ہمایوں کی قلعۂ بالاحصار پر گولہ باری کے دوران اکبر کو قلعہ کی فصیل پر بٹھا دیا تو اس کا بچ نکلنا ایک بڑا معجزہ تھا[۹۹] ابوالفضل کے ایک ہم عصر مؤرخ عباس شروانی نے تو یہ کہہ کر خوشامد کی حد ہی کر دی ہے کہ اکبر پر وحی نازل ہوا کرتی تھی[۱۰۰] یہ سب باتیں اکبر کو شیعہ یا اسمٰعیلی امام کی طرح مادرزاد ولی ثابت کرنے کے لیے گھڑی گئی ہیں۔

ایک بار جب اکبر پنجاب میں نندنہ کے نواح میں شکار میں مصروف تھا تو ایک درخت کے نیچے اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی[۱۰۱] اس نے فوراً شکار سے ہاتھ کھینچ لیا اپنا سر منڈوا دیا غرباء و مساکین میں نقد و جنس تقسیم کیے اور اس مقام پر ایک عمارت بنانے اور اس کے گرد باغ لگانے کا حکم دیا[۱۰۲] بدایونی لکھتا ہے کہ اس واقعہ کی خبر آناً فاناً پورے ملک میں پھیل گئی اور لوگ اس کے متعلق چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ بس پھر کیا تھا جتنے منہ تھے اتنی ہی باتیں تھیں[۱۰۳] مولانا مناظر احسن مرحوم کا یہ خیال تھا کہ اکبر نے یہ قصہ سنا ہوا تھا کہ مہاتما بدھ کو ایک بدرخت

---

[۹۶] اکبرنامہ۔ جلد اول، ص ۱۶ تا ۱۷ [۹۷] بدایونی، جلد ۲، ص ۲۷۰

[۹۸] اکبرنامہ جلد اول، ص ۱۸۷ [۹۹] ایضاً، ص ۲۶۶ [۱۰۰] تحفۂ اکبرشاہی، ورق ۱۲ الف

[۱۰۱] بدایونی جلد ۲، ص ۲۵۳ [۱۰۲] ایضاً، ص ۲۵۴ [۱۰۳] ایضاً

کے نیچے گیان حاصل ہوا تھا، اکبر نے بدھ کی نقالی کی تھی۔[104]

مشہور شیعی مؤرخ سید امیر علی لکھتے ہیں کہ اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ شیعوں کے بعض فرقے مثلاً نعمانیہ، خطابیہ اور اسحاقیہ تناسخ پر یقین رکھتے تھے۔[105] ہمارا ایک ہمعصر اسمٰعیلی مؤرخ علی محمد جان محمد چنارا اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ اسمٰعیلیوں کے بعض فرقے نہ صرف یہ کہ تناسخ کے قائل ہیں بلکہ وہ فاطمی خلیفہ حاکم کو خدا کا اوتار بھی مانتے ہیں۔[106] حاکم کے عہد میں مصر کے یہودی، عیسائی اور قبطی اُسے "یا وحدہٗ" کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ اسی طرح دروزیا فرقہ کے پیرو بھی تناسخ کے قائل ہیں۔[107]

جن دنوں اکبر دینِ اسلام سے برگشتہ ہوا، ان ہی ایام میں مسلمانوں کی بدقسمتی سے دکن کا ایک برہمن بادن نام مشرف بہ اسلام ہوا، اس نے ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کے فارسی تراجم بادشاہ کی خدمت میں پیش کیے اور اکثر بعض دقیق مسائل کی تشریح بھی بادشاہ کے حضور میں کیا کرتا تھا۔ اس نے ہندوؤں کے عقاید کو مسلمانوں کے عقاید کے ساتھ ملا کر ایک معجون مرکب تیار کیا۔ بدایونی کے خیال کے مطابق بادن نے بادشاہ کے عقاید بگاڑنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔[108]

اکبر تناسخ پر یقین کامل رکھتا تھا[109] اور ابوالفضل بادشاہ کے حکم سے امراء کو تناسخ کا مسئلہ سمجھایا کرتا تھا۔[110] بدایونی اور دوسرے سبھی مؤرخ اس پر متفق ہیں کہ بادشاہ اکثر رات کے وقت تنہائی میں دیوی نامی برہمن سے ملا کرتا تھا، یہ وہی شخص تھا جس نے بادشاہ کو آفتاب اور کواکب پرستی کی تعلیم دی تھی۔[111] اسی طرح ایک اور برہمن پرکھوتم نام بھی بادشاہ کا منظورِ نظر تھا۔ اور بقول بدایونی اسی کے زیرِ اثر بادشاہ تناسخ کا قائل ہوا تھا۔[112]

---

[104] تذکرۂ مجدد الف ثانی، ص ۵۳ [105] دی اسپرٹ آف اسلام، ص ۳۴۳

[106] نور المبین حبل اللہ المتین، ص ۲۹۰ [107] ایضاً، ص ۲۹۹،

[108] بدایونی، جلد ۲، ص ۲۱۲ [109] ایضاً، ص ۳۰۰، مرآۃ جہان نما، ورق ۱۱۲۸ الف، آئین اکبری، جلد ۲، ص ۲۳۹، اور مینٹل کانفرنس پیپرز ص ۴۰ [110] بدایونی جلد ۲، ص ۳۰۰،

[111] ایضاً، ص ۲۵۰، ذخیرۃ الخوانین؟ اخبار محبت، ورق ۸۹ الف [112] بدایونی جلد ۲، ص ۲۵۸۔

ان برہمنوں اور ہندو بیویوں کے زیر اثر اکبر نے ہندوؤں کی بہت سی رسومات اپنالی تھیں۔ اس کے محل میں راکھی، دسہرہ، دیوالی، بسنت اور جنم اشٹمی کے تہوار بڑے تزک و احتشام سے منائے جاتے تھے۔ وہ کبھی کبھی ہندوؤں کی طرح اپنے ماتھے پر تلک بھی لگا لیتا تھا۔[113] ان وجوہات کی بنا پر ہندو اسے "اپنا" ہی سمجھتے اور جگت گورو کہہ کر اسے مخاطب کیا کرتے تھے[114] بقول بدایونی "ہندوؤں میں ایک ایسا طبقہ بھی پیدا ہو چکا تھا جو اسے رام اور کرشن کا اوتار سمجھتا تھا۔[115] ہندوؤں کو مزید خوش کرنے کے لیے اس نے جزیہ معاف کر دیا اور ان کو بھی مسلمانوں کے مساوی حقوق دے دیے۔"[116]

کرم چند نامی ایک جینی عالم مہاراجہ بیکانیر کا وزیر تھا۔ اس نے کسی وجہ سے مہاراجہ کی ملازمت سے استعفا دے دیا، اور اکبر کی ملازمت اختیار کر لی۔ اس نے جے چند سوری نامی ایک جینی عالم سے اکبر کا تعارف کر دیا۔[117] اس کے ساتھ نشست و برخاست کا اکبر پر یہ اثر ہوا کہ اس نے پیاز اور گوشت کھانا چھوڑ دیا۔[118] اس کے علاوہ اس نے مختلف ایام میں لوگوں کو جانور ذبح کرنے سے منع کر دیا۔

عام ہندوؤں کی طرح بادشاہ بھی بڑھ کے روز گائے کے درشن کرنا سعادت جانتا تھا۔ اس کے علاوہ مختلف ہندو تہواروں پر بھی وہ گائے کی زیارت سے مشرف ہوا کرتا تھا۔[119]

ایک بار گجرات میں سورت کے قریب اس کی ملاقات مشہور پارسی موبد دستور جی مہرجی رانا سے ہوئی۔ اکبر نے اسے اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی۔[120] چنانچہ وہ ۱۵۷۸ء میں فتح پور سیکری پہونچا اور عبادت خانہ کے مباحثوں میں سرگرم حصہ لینے لگا۔ اس کے زیر اثر اکبر آفتاب پرستی کے علاوہ آگ کی تعظیم بھی کرنے لگا اور اس چیز نے بہت سے لوگوں

---

[113] دی مغل ایمپائر، ص ۱۸۵ [114] مغل ایڈمنسٹریشن، ص ۱۵۰۔

[115] بدایونی جلد ۲، ص ۳۲۶ [116] بدایونی، جلد ۲، ص ۳۲۶

[116] دی ریلیجس پالیسی آف دی مغل ایمپررز، ص ۲۲ [117] ایضاً، ص ۲۲

[118] بدایونی جلد ۲، ص ۲۴۱ [119] ایضاً ۱۹۳ [120] اسٹڈیز ان مڈیول انڈین ہسٹری، ص ۲۲۲

کو اس شبہ میں ڈال دیا کہ وہ پارسی مذہب اختیار کر چکا ہے[۱۲۱] اس کے علاوہ اس نے یہ حکم دیا کہ شام کے وقت جب دربار میں چراغ جلائے جائیں تو سب درباری احتراماً کھڑے ہو جایا کریں[۱۲۲] اکبر کی ان حرکات کو دیکھتے ہوئے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ اگر کوئی شخص کلمہ پڑھنے کے بعد نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کے خلاف کام کرے یا کسی بُت کے آگے جھکے یا زنّار باندھے، وہ یقیناً کافر ہے[۱۲۳] امام الہند شاہ ولی اللہؒ اکبر کے متعلق رقمطراز ہیں کہ وہ ملحد ہو چکا تھا اور اس نے زندیقوں جیسے طور طریقے اپنا لیے تھے[۱۲۴]

ڈوجیرک لکھتا ہے کہ اکبر نے گوا کے پرتگیز حکام سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ اس کے دربار میں چند عیسائی مبلغ بھیجیں۔ اس کی درخواست منظور ہوئی اور گوا سے چند دریڈہن پادری فتح پور سیکری روانہ کیے گئے جو ۱۸ فروری ۱۵۸۰ کو دربار میں حاضر ہوئے[۱۲۵]

ایک بار اکبر کو کسی نے بتایا کہ پرتگیزوں نے توراۃ اور انجیل کا فارسی ترجمہ کر لیا ہے۔ یہ سنتے ہی اس نے سید مظفر کو گوا روانہ کیا "تاکہ وہ "دانایانِ فرنگ" سے یہ تراجم لے آئے"[۱۲۶] اس کے علاوہ اس نے گوا کے پادریوں سے یہ التماس کی تھی کہ وہ اس کے ساتھ باقاعدہ خط و کتابت جاری رکھیں۔ بادشاہ کی درخواست پر ۱۵۸۰، ۱۵۹۰، اور ۱۵۹۵ میں پادریوں کے تین وفد دربار میں بھیجے گئے جہاں ان کا خیر مقدم کیا گیا اور بادشاہ نے بڑے ذوق و شوق سے ان کی باتیں سنیں۔ بادشاہ کے اس رویہ سے پادریوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ عنقریب ہی عیسائی ہو جائے گا[۱۲۷]

ڈوجیرک کی کتاب "اکبر اینڈ دی جیسوائٹس" کے دیباچہ میں پین صاحب رقمطراز ہیں

---

[۱۲۱] دی کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، جلد ۴، ص ۱۲۱

[۱۲۲] آئین اکبری، جلد ۲، ص ۴۴ ، از دی کورٹ مینرز آف دی گریٹ مغلز، ص ۱۹

[۱۲۳] اشعۃ اللمعات، ص ۲۶

[۱۲۴] انفاس العارفین، ص ۱۵۴

[۱۲۵] اکبر اینڈ دی جیسوائٹس، ص ۱۷، ۱۸

[۱۲۶] مکتوبات علامی، ورق ۱۱ب

[۱۲۷] دی مغلز اینڈ دی پرتگیز، ص ۵۹، ۶۰

کہ پادریوں کے جو وفد اکبر کی خدمت میں روانہ کیے گئے ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ اسے عیسائی بنا کر اس کی سلطنت میں تعلیماتِ انجیل کی داغ بیل ڈالیں۔[128] یہ عیسائی پادری اپنے ساتھ قرآن حکیم کا فارسی ترجمہ اس غرض سے لے گئے کہ وہ بادشاہ کے سامنے "قرآن کی اغلاط" اس کی غلط بیانیوں اور اختلافی مسائل" کی تردید کر سکیں۔[129] یہ پادری اکبر کو "قانون اسلام کے رطب و یابس" سے آگاہ کرنے کے علاوہ یہ بھی بتایا کرتے تھے کہ محمد مصطفےٰ کا دیا ہوا قانون "جھوٹ کا پلندہ" ہے۔[130] انھوں نے بادشاہ سے یہ بھی درخواست کی تھی کہ وہ اپنی مملکت میں قرآن کے درس و تدریس پر پابندی لگا دے کیونکہ وہ "اغلاط سے بھرا پڑا ہے"۔[131]

قرآن حکیم کے متعلق ابوالفضل بھی کم و بیش ایسے ہی خیالات رکھتا تھا۔ جہانگیر نے ایک موقع پر یہ کہا تھا کہ اس نے یہ بات میرے والد کے ذہن نشین کرا دی تھی کہ قرآن وحی الٰہی نہیں بلکہ یہ حضورؐ کی تصنیف ہے۔[132] ابوالفضل کے والد شیخ مبارک کے بھی قرآن کے متعلق قریب قریب ایسے ہی خیالات تھے۔ بدایونی لکھتا ہے کہ ایک بار شیخ مبارک نے اکبر کے سامنے بیربل سے کہا تھا کہ جس طرح ہندوؤں کی کتابوں میں رد و بدل ہوا ہے ایسے ہی ہمارے قرآن میں بھی کئی بار تحریف ہو چکی ہے۔ اور اب اگر سچ پوچھو تو اس پر سے میرا یقین اُٹھ چکا ہے۔[133] میری ناقص رائے میں باپ بیٹے کے قرآن کے متعلق شبہات ہی یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ وہ سنی نہیں تھے ــــ اور اگر یہ بات صاف ہو جائے تو پھر اکبر کو امام عادل بنانے کا منصوبہ بآسانی سمجھ میں آ جائے گا۔

اکبر نے پرتگیزوں اور ارمنیوں کو اپنی مملکت میں گرجے بنانے کی اجازت دے کر اسلامی قانون توڑ ڈالا۔ جب آگرہ میں پہلا گرجا تعمیر ہوا تو اکبر بنفس نفیس وہاں پہونچا اور عیسائیوں کے ساتھ عبادت میں شریک ہوا۔ اس نے اپنی پگڑی اتار کر رکھ لی اور گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر دعا مانگی۔[134] ایک زمانہ تھا کہ وہ شہزادہ سلیم کو ملّا عبدالنبی کے گھر سماعت حدیث کے

---

[128] اکبر اینڈ دی جیسوائٹس، ص ۴۴ [129] اکبر اینڈ دی جیسوائٹس، ص ۲۱، [130] ایضاً ص ۱۶

[131] ایضاً، ص ۲۲، ۲۳ [132] مآثر الامراء جلد ۲، ص ۲۱۷ [133] بدایونی، جلد ۲، ص ۳۱۲
[134] اکبر اینڈ دی جیسوائٹس، ص ۲۵۔

لیے بھیجا کرتا تھا اور اب یہ دن بھی آئے کہ اس نے شہزادہ مراد کو حکم دیا کہ وہ پادریوں سے انجیل کی تعلیم حاصل کرے[۱۳۵] ابو الفضل کے نام یہ فرمان جاری ہوا کہ وہ اکبر کی خاطر انجیل کا فارسی ترجمہ کرے[۱۳۶] بدایونی اس کا عینی شاہد ہے کہ اکبر کے پاس حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی تصاویر تھیں اور اس نے عیسائیوں کے بعض طریقے بھی اپنا لیے تھے[۱۳۷]

بعض خود غرضوں نے اکبر کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ اسلام کی میعاد صرف ہزار سال ہے[۱۳۸] یہ نظریہ "عقیدۂ الفی" کے نام سے مشہور ہوا۔ اکبر کے حکم سے ۱۰۰۰ ہجری میں یادگاری سکے ڈھالے گئے اور اس موقع پر اس نے تاریخ الفی کے نام سے ایک تاریخ مرتب کرنے کا کام ملا نظام الدین احمد کو سونپا۔ عقیدۂ الفی کا بڑے زور شور سے پروپیگنڈہ کیا گیا اور یہ بات عوام کے ذہن نشین کرائی گئی کہ دورِ اسلام اب ختم ہو گیا ہے اور اب ایک نئے دین کی ضرورت ہے۔ بدایونی لکھتا ہے کہ یار لوگ عقیدۂ الفی کی تائید میں ناصر خسرو کے کلام سے ایک رباعی بھی تلاش کر لائے تھے۔ اور اسے جا بجا گنگناتے پھرتے تھے۔

در نہصد و نہ نُہ تعین دو قراں می بینم
وز مہدی و دجال نشاں می بینم
یا ملک بدل گردد یا گردد زمین
سرّے کہ نہاں است عیاں می بینم

اکبر عقیدۂ الفی کا قائل تھا۔ چنانچہ اس نے دورِ اسلام "ختم ہونے" کے بعد اس کی جگہ دینِ الٰہی رائج کرنے کا عزم کر لیا۔ اکبر سے پہلے بھی مامون الرشید کی مذہب میں دلچسپی نے معتزلی مذہب کو سرکاری مذہب قرار دے کر راسخ العقیدہ مسلمانوں کو ابتلا میں ڈال دیا تھا[۱۳۹] اکبر کی مذہب میں دلچسپی نے بھی راسخ العقیدہ مسلمانوں کو ابتلا میں ڈال دیا اور اس بار احمد ابن حنبلؒ کی طرح امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کو ایک بار پھر دینِ حق کے غلبہ کے لیے جدوجہد کرنی پڑی۔　(جاری)

---

[۱۳۵] اکبر اینڈ دی جیسوائٹس ص ۲۵!! بدایونی جلد ۲، ص ۲۶۰　[۱۳۶] بدایونی جلد ۲، ص ۲۶۰
[۱۳۷] ایضاً ۲۰۲　[۱۳۸] دبستان مذاہب، ص ۲۶۰　[۱۳۹] ہسٹری آف دی عربز، ص ۴۲۹

اسلام کیا ہے
تالیف: مولینا محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان لکھنؤ
مصنف نے ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں کی دینی ضرورت اور خاص وقتی تقاضوں کو
سامنے رکھ کر توجہ اور محنت سے یہ کتاب لکھی ہے، اسلامی تعلیمات پر ایسی مفید اور جامع کتاب اردو
زبان میں کم از کم ہمارے علم میں نہیں ہے، اسلام کے متعلق ضروری واقفیت حاصل کرنے کیلئے ہی
نہیں، بلکہ کامل مسلمان اور اللہ کا ولی بننے کے لیے بھی اس کتاب کا مطالعہ اور اس پر عمل انشاء اللہ کافی
ہے، اسلام کی ضروری تعلیمات کو بیس سبقوں کی شکل میں مرتب کر کے اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے،
ہر سبق اپنے موضوع پر ایک مستقل مضمون اور مؤثر خطبہ ہے، زبان کو آسان بنانے کی خاص
کوشش کی گئی ہے کہ بے پڑھے لوگ اور کم عمر بچے بھی آسانی سے سمجھ سکیں، خود پڑھ کر ایمان تازہ
کیجیے، بیوی بچوں کو پڑھا کر انھیں پکا اور کامل مسلمان بنائیے، مسجدوں اور مجلسوں میں سنا کر
تبلیغ کا حق ادا کیجیے، اور مسلمانوں میں ایمانی روح اور دینی زندگی پیدا کرنے کا بے انتہا ثواب
حاصل کیجیے، اور اگر آپ کا کوئی غیر مسلم دوست اسلام کو جاننا اور سمجھنا چاہے تو اس کے ہاتھ
میں بھی بے تکلف یہی کتاب دے دیجیے۔۔۔۔۔ کاغذ و طباعت اعلیٰ۔
ملنے کا پتہ کتب خانہ الفرقان، گوئن روڈ لکھنؤ

Price Rs. 2-50

Regd. No L-353

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow

VOL. 36 NO. 10 11 8 th MARCH 1969.